باسمہٖ تعالیٰ

حیاتِ عُثمانی

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی نور اللہ مرقدہٗ ایکے از بانیانِ پاکستان
کی حیاتِ طیبہ جس میں آپؒ کے حالاتِ زندگی اور علمی و عملی
کارناموں پر از پیدائش تا وفات مفصل بحث کی گئی ہے
اور روشنی ڈالی گئی ہے جو اہلِ علم کے لئے سامانِ بصیرت و بصارت ہے

تالیف
پروفیسر محمد انوار الحسن شیرکوٹی

ناشر
مکتبہ دار العلوم کراچی ۱۴

باسمہٖ تعالیٰ

حیاتِ عثمانی

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی نور اللہ مرقدہٗ یکے از بانیانِ پاکستان کی حیاتِ طیبہ جس میں آپ کے حالاتِ زندگی اور علمی و عملی کارناموں پر از پیدائش تا وفات، مفصل بحث کی گئی ہے اور روشنی ڈالی گئی ہے جو اہلِ علم کے لئے سامانِ بصیرت و بصارت ہے

تالیف
پروفیسر محمد انوار الحسن شیر کوٹی

ناشر
مکتبہ دار العلوم کراچی ۱۴

حیات عثمانی

سوانح حیات حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ

تصنیف: پروفیسر محمد انوار الحسن شیرکوٹی

کتابت: حسین احمد نجیب

تصحیح وترتیب مولانا اشفاق احمد قاسمی گیاوی

طباعت: مشہور آفسٹ پریس کراچی

طبع: اوّل شوال المکرم ۱۴۰۵ھ مطابق جولائی ۱۹۸۵ء

تعداد: ایک ہزار

قیمت:

ناشر

مکتبہ دارالعلوم کراچی ۱۴

باہتمام:

فاروق القاسمی

فاضلِ دیوبند۔ ایم، اے (عثمانیہ)

ملنے کے پتے

مکتبہ دارالعلوم کراچی ۱۴

ادارہ اسلامیات ۱۹۰، انارکلی لاہور

دارالاشاعت، مولوی مسافر خانہ کراچی ۱

ادارۃ المعارف، ڈاکخانہ دارالعلوم کراچی ۱۴

فہرست مضامین

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

پیش لفظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى

شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی قدس سرہ اُن بزرگوں میں سے ہیں جن کی نظیریں ہر دور میں گنی چُنی ہوا کرتی ہیں۔ ان کے علمی و تحقیقی کارنامے اور ان کی عملی جدوجہد پوری امتِ مسلمہ کے لئے بالعموم، اور مسلمانانِ برصغیر کے لئے بالخصوص، ہماری تاریخ کا گرانقدر سرمایہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو بیک وقت وسیع و عمیق علم، شگفتہ اور سیّال قلم، دلنشین خطابت اور ملّتِ مسلمہ کے اجتماعی مسائل میں معتدل اور مدبّرانہ فکر سے نوازا تھا، اور اُن کے یہ تمام ملکات دین کی صحیح خدمت اور امتِ مسلمہ کی فلاح و بہبود کے لئے اس طرح استعمال ہوئے کہ آج ہم سب کی گردنیں ان کے احسانات سے جھکی ہوئی ہیں۔

تحریکِ پاکستان میں حضرت علامہ عثمانیؒ نے جو سرگرم حصہ لیا، اور جس کی بدولت اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس آزاد مسلم مملکت سے نوازا، اس کے حالات ہر پڑھے لکھے شخص کو معلوم ہیں، لیکن اُن کی وفات کے بعد ہم نے انہیں فراموش کردیا، وہ ہماری قدرناشناسی کی بدترین مثال ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے بزرگ مولانا انوار الحسن صاحب شیرکوٹی رحمۃ اللہ علیہ کے درجات بلند فرمائے کہ انہوں نے ناقدری کے اس ماحول میں حضرت علامہ عثمانیؒ کی شخصیت اور ان کے کارناموں کو اپنی تحقیق کا موضوع بنا کر ان کی خدمات کو اجاگر کرنے کا فرضِ کفایہ بڑی محنت، عرق ریزی اور والہانہ محبت

کے ساتھ انجام دیا۔ انہوں نے پہلے "تجلیاتِ عثمانی" کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھ کر اس میں حضرت علامہؒ کی علمی خدمات کا مبسوط تعارف کرایا، اور اُن کی تحقیقات پر مفصّل تبصرہ کیا۔ پھر "انوارِ عثمانیؒ" کے نام سے حضرت علامہؒ کے نادر علمی اور سیاسی مکاتیب اور اُن کے اہم خطبات کا ایک مجموعہ تیار فرمایا۔ یہ دونوں کتابیں مصنفؒ کی حیات ہی میں شائع ہو کر خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

اس کے بعد مولانا نشیر کوٹی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علامہؒ کی مفصّل سوانح حیات "حیاتِ عثمانیؒ" کے نام سے لکھنی شروع کی، اور اس میں بڑی نادر معلومات جمع فرمائیں۔ اُن کی اس زیرِ تالیف کتاب کے کچھ حصے "البلاغ" میں بھی شائع ہو چکے ہیں لیکن ہماری شامتِ اعمال سے ابھی یہ کتاب مکمل نہیں ہو پائی تھی کہ مولانا انوار الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اُن کی وفات کے بعد میں نے فیصل آباد میں اُن کے صاحبزادے ڈاکٹر انصار الحسن صاحب سے بات کی کہ ان کا یہ مسودہ نشنۂ تکمیل ہونے کے باوجود اس لحاظ سے بہت قیمتی ہے کہ اس میں فراہم کردہ معلومات کا کسی اور جگہ دستیاب ہونا مشکل ہے۔ میری رائے یہ تھی کہ اس کتاب کو اسی حالت میں شائع کرنا مناسب، بلکہ ضروری ہے۔ چنانچہ انہوں نے یہ مسودہ از راہِ کرم مکتبہ دار العلوم کو عنایت فرما دیا۔ اور اب مکتبہ دار العلوم اس کی اشاعت کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

اگرچہ یہ کتاب اس لحاظ سے نامکمل ہے کہ اس میں حضرت مولاناؒ کی زندگی کے آخری تین سالوں کا تذکرہ نہیں ہے، لیکن ۱۹۴۶ء تک کے جو حالات مصنّف رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمائے ہیں، وہ بجائے خود بڑے اہم اور مفید ہیں۔ بلکہ حضرت علامہؒ کی سوانح میں اسی دور کے حالات کی جستجو زیادہ مشکل تھی، اب آخری تین سالوں کے حالات کی تکمیل کوئی اور بھی کر سکتا ہے۔ لہٰذا امید ہے کہ

انصار الحسن

انشاء اللہ یہ کتاب اپنی موجودہ صورت میں بھی نہایت مفید، اور آئندہ ہماری تاریخ کے طالب علموں اور محققین کے لئے بہترین رہنما ثابت ہوگی، اور اس سے نہ صرف حضرت علامہ عثمانیؒ کے حالات زندگی معلوم ہوں گے، بلکہ قیام پاکستان سے پہلے مسلمانوں کی بہت سی ایسی تنظیموں اور تحریکات کے بارے میں مستند معلومات بھی حاصل ہوسکیں گی جن کے حالات پردۂ خفاء میں ہیں۔

اس وقت اس احساس سے دل مغموم ہے کہ فاضل مصنفؒ کی یہ کتاب اُن کی حیات میں شائع نہ ہوسکی۔ تاہم یہ انشاء اللہ اُن کے لئے ذخیرۂ آخرت اور صدقۂ جاریہ ثابت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اُن کو اور صاحبِ سوانح کو جنت الفردوس میں درجاتِ عالیہ عطا فرمائیں، اور ہمیں اُن کے فیوض سے مستفید ہونے کی توفیق بخشیں۔ آمین۔

میں جناب مولانا اشفاق احمد صاحب قاسمی گیاوی کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کی ترتیب اور تصحیح کے لئے اپنی قابل قدر کوشش سے اس کتاب کو لائقِ اشاعت بنایا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائیں۔ آمین۔

وما توفیقی الا باللہ!

محمد تقی عثمانی

خادم طلبۂ دار العلوم کراچی ۱۴

دار العلوم کراچی ۱۴

یکم جمادی الاولیٰ ۱۴۰۳ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ النبیّ الکریم۔

پیش لفظ

میں اس خدائے کریم کا بے حد و بے حساب شکر گذار ہوں کہ اس نے "حیاتِ عثمانی" سوانح حیات علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف کی توفیق عطا فرمائی اور حق تو یہ ہے کہ اگر وہ جذبۂ تسوید و تحریر اور عزم تالیف و تصنیف عطا نہ فرمائے تو اس کے بغیر کوئی بھی کام منظر عام اور منصۂ شہود پر جلوہ گر نہیں ہو سکتا۔ شیخ الاسلام علامہ عثمانی کے یوں تو کتنے ہی لائق و قابل اور عالم و فاضل صاحب قلم شاگرد گذرے اور اب بھی بقید حیات ہیں لیکن راقم الحروف کے دل میں جوان کا ایک درد رکھ دیا ہے وہ مجھے یہ لکھنے پر مجبور کر رہا ہے کہ قدرت نے یہ قرعۂ تسوید میرے نام پر ڈالا تھا جس کو راقم الحروف کا قلم بارِ امانت کا امین بن کر صفحات قرطاس پر امانت کو ادا کر رہا ہے۔

تجلّیات عثمانی ۱۹۵۷ء

چنانچہ سب سے پہلے علامہ عثمانی کی علمی سوانح سات سو بارہ صفحات پر "تجلیات عثمانی" کے نام سے میرے قلم سے دسمبر ۱۹۵۷ء میں طبع ہو کر شائع ہوئی اور اس کی طباعت کا بار منشی عبدالرحمٰن صاحب مدیر ادارہ نشر المعارف چھلیک ملتان نے اٹھایا۔ یہ کتاب دراصل علامہ کی علمی سوانح ہے جس میں موصوف کے علوم و فنون تفسیر و حدیث، فقہ، منطق و فلسفہ، علم کلام، اردو، فارسی اور عربی ادب، تقریر و تحریر اور سیاسیات پر مفصل اور مبسوط بحثیں

کی گئی ہیں ۔ گویا اگرچہ یہ کتاب پہلے چھپی ہے لیکن اس کو حیات عثمانی جلد اوّل کے بعد تجلیات عثمانی جلد دوم قرار دیجئے گا تو مناسب ہوگا ۔

مکتوبات عثمانی بنام انوار عثمانی ۱۹۶۶ء "تجلیات عثمانی" کے بعد دوسرا کام جو اس راقم الحروف سے قدرت نے لیا وہ علامہ کے علمی، فقہی، سیاسی اور نجی مکتوبات کے مجموعہ کی ترتیب تھی۔ جس کو انوار عثمانی مکتوبات علامہ شبیر احمد عثمانی کے نام سے محرم الحرام ۱۳۸۶ھ یعنی مئی ۱۹۶۶ء تک مرتب کیا گیا اور ۱۹۶۶ء میں ہی جناب مولانا محمد یوسف صاحب بنوری شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ نیوٹاؤن کراچی کی سعیِ مسلسل کے باعث مکتبہ اسلامیہ مولوی مسافر خانہ بندر روڈ کراچی نے چھپوا کر شائع کیا جو دو سو ستاسی صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں ۔

خُطبات عثمانی مارچ ۱۹۷۲ء، صفر المظفر ۱۳۹۲ھ مکتوبات عثمانی کے بعد پھر "خطبات عثمانی" کی ترتیب پر خیال گیا چنانچہ ایک سال کی شبانہ روز مساعی سے یہ کام بھی ۱۹۷۰ء میں مکمل ہوا اور مارچ ۱۹۷۲ء میں پنجاب کے مشہور پبلشر نذر سنز کے ادارے نے اس کو طبع کرا ڈالا ۔ در اصل ان خطبات کی طبع کا سہرا شیخ شفیق احمد مالک ادارہ کے سر ہے جو ایک دردمند اور قومی جذبات سے لبریز دل کے مالک ہیں ۔ یہ مجموعہ شیخ الاسلام کے ان خطبات کا مجموعہ ہے جو انہوں نے ترک موالات، مسلم لیگ، نظریہ پاکستان استصواب صوبہ سرحد، مکالمۃ الصدرین، پیغام کلکتہ، خطبہ مسلم لیگ میرٹھ کانفرنس، خطبہ صدارت جمعیۃ العلمائے لاہور، خطبہ صدارت ڈھاکہ، قرارداد مقاصد، خطبہ عید الفطر کراچی، نیز علامہ کے فتووں، پیغامات، ارشادات، پاکستان پر معترضین کے جوابات اور خطوط پر مشتمل ہے جس میں اہل پاکستان

کے لئے موجودہ دور میں زندگی جاوید کا سامان فراہم کیا گیا ہے۔ گویا یوں سمجھئے کہ نظریۂ پاکستان سے متعلق شیخ الاسلام کے ان خطبوں اور تقریروں، مکالموں اور پیغامات کا یہ مجموعہ ایک جامع مگر مختصر انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں پاکستان کے اطراف و جوانب، نشیب و فراز اور اس کے منافع اور مضار پر سیر حاصل بحثیں ہیں۔

راقم الحروف نے ان خطبات کے علاوہ اپنی طرف سے ہندو پاک کی سو سالہ سیاست، مسلم لیگ اور کانگریس کی آویزش اور کشمکش، پاکستان کے عالم شہود میں آنے، قتل عام ہونے نیز پاکستان میں اسلامی آئین اور دستور سازی، ستمبر ۱۹۶۵ء اور دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ، سقوط مشرقی پاکستان، مشرقی پاکستان میں قتل و خونریزی، آتش زنی اور لوٹ مار، صدر یحییٰ کے زوال اور استعفے نیز مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی مسند صدارت پر جلوہ گری، شیخ مجیب الرحمٰن کی رہائی اور لندن، روس، دہلی ہوتے ہوئے ڈھاکہ کو روانگی تک کے مختصر مختصر حالات بھی لکھ دیتے ہیں۔ بالخصوص دستور سازی پر تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ غرض یہ ہے کہ "خطباتِ عثمانی" کا مجموعہ الحمدللہ تاریخ و سیاست کا ایک بہترین مرقع بن گیا ہے۔ جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

حیاتِ عثمانی ۱۹۷۲ء ۱۳۹۲ھ

"تجلیات عثمانی" "مکتوبات عثمانی" اور "خطبات عثمانی" کے بعد "حیاتِ عثمانی" کی کتابت تیزی سے ہو رہی ہے اور امید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ اس سال کے آخر میں یا ۱۹۷۳ء کے آغاز میں یہ کتاب بھی زیور طبع سے آراستہ ہو کر ہدیۂ ناظرین ہوگی۔ اس کتاب کو "تجلیات عثمانی" کی پہلی جلد سمجھنا چاہیئے کہ اس میں شیخ الاسلام حضرت عثمانی کی پوری زندگی یعنی پیدائش سے وفات تک کے حالات کہیں پوری تفصیل اور کہیں اجمال سے لکھے گئے ہیں۔ اجمال صرف اس جگہ ہے جس کی

تفصیل "تجلیات" میں پیش کی جا چکی ہے۔ چنانچہ ایسے مواقع پر تجلیات کا حوالہ دیا گیا ہے۔

بعض مضامین یا تقریریں یا حالات ان چاروں کتابوں میں مکرر بھی آئے ہیں جن کا تکرار ضرورت سے خالی نہ تھا۔ مثلاً موتمر مکہ کی فقہی اور علمی وادبی بحثیں تجلیات میں فقر کے ماتحت آنی ضروری تھیں۔ نیز خطبات عثمانی میں بھی ان تقریروں کا خطبات کے ضمن آنا لازمی تھا کہ وہ خطبے یا تقریریں ہی تو ہیں جو موتمر مکہ میں کی گئیں۔ اس لئے بعض مضامین وتقاریر کے مکرر لانے پر معذرت خواہ ہوں۔

بہرحال شیخ الاسلام کی شخصیت پر ان چار متنوع الموضوعات پر جو کچھ کام ناچیز کے ہاتھوں ہوا اس میں راقم الحروف نے علامہ کا کچھ حق ادا کیا ہے اور ان کی ذات پر یہ کام میرے جگر پارے اور دل پارے ہیں جو میں نے شائقین کے لئے پیش کر دیئے ہیں۔

لختے دہم از دل گذر دہر کہ پیشم
من قاش فروش دل صد پارۂ خویشم

اگر غور سے دیکھا جائے تو شیخ الاسلام پاکستان کے بانیوں میں سے ایک ہیں۔ اگر قائداعظم اور حضرت علامہ اقبال نے پاکستان کا نقشہ بنایا تو اس نقشے میں علامہ عثمانی نے شریعت کا رنگ بھرا ہے۔ اس لئے ان کی زندگی پر ان کتابوں کا سرمایہ پاکستانی قوم اور ملک پاکستان کے لئے ایک بڑا قیمتی سرمایہ ہے۔ ضرورت ہے کہ قائداعظم، علامہ اقبال اور شیخ الاسلام پر اہل علم نے جو کام کیا ہے اس کو کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب کا جزو بنایا جائے۔

الغرض شیخ الاسلام پر یہ چاروں کتابیں میرے لئے بھی سرمایہ سعادت ہیں اور مسلمانوں کے لئے بھی بالخصوص پاکستان والوں کے لئے۔

تجلیات پر تبصرے | سب سے پہلے کتاب جب "تجلیات" شائع ہوئی!

تبصرہ کے لئے اخبارات اور رسائل کے مدیر صاحبان اور اہل قلم کی نظروں کے سامنے آئی تو جناب مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے صدق میں تحریر فرمایا:

فخر العلماء مولانا عبدالماجد دریا آبادی کا تبصرہ :

"آنکھیں مدت سے منتظر و مشتاق تھیں کہ علامہ کا مفصل تذکرہ قلمبند کرنے کی سعادت ان کے کسی شاگرد کے حصے میں آئی ہے۔ مقام شکر و مسرت ہے کہ بالآخر یہ سعادت لائل پور اسلامیہ کالج کے ایک استاذ انوار الحسن صاحب شیر کوٹی کے حصے میں آئی اور انہوں نے ایک جامع مرقع علامہ کی پبلک زندگی کا سات سو صفحات میں پیش کر دیا جس کے اندر ان کے علمی، دینی، سیاسی، تدریسی، تصنیفی سب ہی زندگیوں کے پہلو آگئے۔ اور شروع کے دو چار صفحوں میں بہت ہی اختصار سے ان کی ذاتی زندگی کے سوانح بھی۔ معاصر شخصیتوں اور معاصر تحریکوں کا بھی ذکر آجانا ناگزیر تھا اور اس طرح کتاب ادھر پچیس تیس سال کے اسلامی ہند کی ایک سرسری سی تاریخ بھی ہوگئی ہے۔

یقین ہے کہ مولانا کے ماننے والے ہندوستان اور پاکستان دونوں مملکتوں میں کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔" (صدق جدید لکھنؤ ۱۴ نومبر ۱۹۵۸ء)

ماہر القادری صاحب کا تجلیات پر تبصرہ

نامور ادیب و ناقد مولانا ماہر القادری نے اپنے "فاران" رسالے میں مفصل تبصرہ کیا جس کا بعض حصہ یہ ہے:۔

"جناب پروفیسر انوار الحسن انور (شیر کوٹی) نے علامہ عثمانی مرحوم کے علم تفسیر، حدیث، فقہ، علم کلام، فلسفہ، منطق، مناظرہ، تقریر، اردو،

فارسی، عربی ادب اور سیاسیات پر بڑی تحقیقات کے ساتھ تبصرہ کیا ہے۔ کتاب کی رنگا رنگی اور تنوع کا یہ عالم ہے کہ سات سو سے اوپر ذیلی عنوانات پر یہ مبسوط تصنیف مشتمل ہے۔

پروفیسر انوار الحسن صاحب نے علامہ عثمانی کی تصانیف کو کھنگال ڈالا ہے۔ اس بحر مواج کے وہ کامیاب شناور ہیں۔ انہوں نے اس دریا کے ایک ایک صدف کو جانچا اور اس "اکیڈمی" کے ایک ایک صفحے کو پڑھا ہے۔ "علوم عثمانی" کے شاید اس دور میں وہ سب سے بڑے محقق اور اسکالر ہیں۔" (فاران مئی ۱۹۵۸ء)

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی تجلیات کے متعلق رائے:

"حضرت (مولانا شبیر احمد) مرحوم کے کمالات علمیہ و ادبیہ کا یہ تذکرہ (تجلیات عثمانی) سات سو صفحات کی ضخیم کتاب میں تمام ہوا ہے جو بے شبہ معلومات آفریں بھی ہے اور بصیرت افروز بھی۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ لائق مصنف نے حضرت مرحوم کی تمام چھوٹی بڑی تصانیف اور مقالات اور تقاریر و خطبات کے فراہم کرنے اور ان کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے اور پھر اپنے خیالات و افکار کو مرتب کرنے میں بڑی محنت و کاوش کی ہے۔ فجزاہ اللہ عنا احسن الجزاء۔ زبان و بیان شگفتہ، مؤثر اور دلنشیں ہے۔" (برہان جولائی ۱۹۵۹ء)

حضرت مولانا عماد الدین صاحب شیرکوٹی رفیق خاص علامہ عثمانی کی تجلیات پر خامہ فرسائی

"تجلیات عثمانی پہنچی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ جس چیز کے دیکھنے

کی تمنا تھی پوری ہوئی۔ جس محنت اور عرق ریزی سے سیکڑوں کتابوں، رسالو اور اخبارات سے آپ نے مواد حاصل کیا در حقیقت آپ کے عشق استاد کا پتہ دے رہا ہے۔ آپ نے شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی میرے خاص کرم فرما دوست کے جس وصف اور کمال پر تبصرہ کیا اس کا حق ادا کر دیا۔ اس وصف کی پوری تحقیق اور اس کے دلائل و براہین سے پڑھنے والے کو اس صفت میں یا اس علم میں پوری رہنمائی کر دی ہے۔ آپکے مضامین سطحی نہیں محققانہ ہیں۔ ہر چیز ۔ نا اور ذہن میں اتار دی ہے پڑھنے والا اس کی کسی بحث کو پڑھتا ہے تو اس میں پوری رہنمائی ہوتی چلی جاتی ہے۔ میرے نزدیک یہ مضامین وہبی، من جانب اللہ القاء اور حضرت مولانا عثمانی کی زندہ کرامت ہیں۔ آپ نے علامہ کے کمالات کو ہی دائمی بقاء کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ اپنے لئے بھی بقائے دوام کی یادگار بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سلجھا ہوا دماغ عطا فرمایا اور قلم میں قوت عطا کی۔ مضمون میں آورد نہیں آمد ہے۔ فالحمد للہ علی احسانہ؟

(مکتوب مولانا عماد الدین رحمۃ اللہ علیہ ۱۲ ر مارچ ۱۹۵۸ء)

اگر تجلیات پر تمام تبصروں کو اور ان خطوط کو جو حوصلہ افزائی اور تحسین میں موصول ہوئے یہاں درج کیا جائے تو ایک اچھا خاصہ رسالہ بن سکتا ہے اس لئے تمام کو جگہ دینا مشکل ہے۔ البتہ ایک مکتوب کا کچھ حصہ پیش کرنے کو دل ضرور چاہتا ہے جو مولانا بشیر احمد صاحب مدرس مدرسہ عربیہ قاسم العلوم فقیر والی ضلع بہاولنگر نے ارسال فرمایا ہے، لکھتے ہیں:۔

" یہ پڑھ کر کہ آپ نے "سوانح عثمانی" کی تالیف سے فراغت پائی ہے، انتہائی مسرت حاصل ہوئی۔ نیز آپ نے جو مشاہیر علمائے دیوبند کے سوانح

لکھنے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے اس سے بھی مجھے بے انتہا بہجت حاصل ہوئی۔ اس کارنامے پر سارے پاکستان میں مجھ سے زیادہ خوش ہونے والا آپ کو کم ملے گا۔ یہ حقیقت ہے کہ مجھے علمائے دیوبند سے انتہائی عقیدت اور محبت ہے۔ چونکہ آپ علمائے دیوبند کے سوانح لکھ رہے ہیں اس لئے مجھے آپ سے بھی عقیدت ہو گئی ہے۔ خصوصاً آپ کی تصنیف "تجلیات عثمانی" کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک ایک لفظ سے اس عقیدت میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔

آپ کو اللہ تعالیٰ نے علم و قلم کی صلاحیتوں سے نوازا ہے آپ انہیں خوب اجاگر کریں۔ آپ کی تحریر میں جو سلاست، فصاحت، بلاغت، شگفتگی، پختگی زور اور روانی پائی جاتی ہے وہ میں نے بہت کم اہل قلم حضرات کی تحریروں میں دیکھی ہے۔ آپ کو چاہئے کہ آپ اپنے قلم سے ملک و ملت کو خوب سیراب کریں"۔ (مکتوب مؤرخہ ۲۸ رمضان المبارک ۱۳۸۱ھ)

میں ان سب تبصرہ نگاروں اور محبین کا شکر گزار ہوں بہرحال اب تک میرے قلم سے بفضل ایزدی حسب ذیل کتابیں طبع ہو کر شائع ہو چکی ہیں:

"[۱] تجلیات عثمانی، [۲] انوار قاسمی جلد اول (سوانح بانی دارالعلوم دیوبند) [۳] حیات امداد (سوانح سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب) [۴] روح رمضان (روزوں پر جامع اور مبسوط کتاب) [۵] سیرت پیغمبر اعظم، [۶] انوار الشہادت تذکرہ شہید کربلا، [۷] انوار عثمانی (یعنی مکتوبات علامہ عثمانی) [۸] خطبات عثمانی (حضرت مولانا عثمانی کے سیاسی خطبات، بیانات، فتووں، پیغامات، مکالمات اور تقریروں کا مجموعہ) ان کے علاوہ [۹] حیات عثمانی، [۱۰] انوار قاسمی جلد دوم، [۱۱] قاسم العلوم فارسی مکتوبات حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ بعنوان انوار النجوم بھی طبع ہو چکے ہیں۔ البتہ عربی کے ایک زبردست ادیب مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ والد بزرگوار حضرت شیخ الہندؒ

کے سوانح زندگی اور حضرت مولانا مملوک علی صاحب اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہما کے حالاتِ زندگی[1] پر دونوں کتابیں مسودوں کی شکل میں تیار رکھی ہیں۔ یہ دونوں دیکھئے کب چھپتی ہیں اور کب طبع ہوتی ہیں ؎

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

بہرحال حیات عثمانی قارئین کی ضیافتِ طبع کے لئے حاضر ہے۔ صرف دعائے خیر کا طالب ہوں اور اغلاط سے تسامح کا متمنی۔ والسلام

یہ بھی اک زندگی کا کام ہوا
جس سے انوارؔ تیرا نام ہوا

محمد انوار الحسن پروفیسر شیرکوٹی

تحریر دیباچہ مورخہ ۱۷ رجب ۱۳۹۲ھ
بروز پیر ۲۸ اگست ۱۹۷۲ء

[1] "سیرت یعقوب و مملوک" کے نام سے مکتبہ دار العلوم کراچی ۱۴ سے طبع ہو چکی ہے۔ نجیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

حیاتِ عثمانیؒ

پیدائش اور نام نامی : آپ کی ولادت ۱۰ محرم ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۹ء کو بجنور میں ہوئی جہاں آپ کے والد محترم ان دنوں میں ڈپٹی انسپکٹر تعلیمات کے عہدے پر سرفراز تھے۔ علامہ نے اپنی تصانیف، مضامین اور خطوط میں اپنے نام اور نسب کا شبیر احمد عثمانی کے الفاظ سے جا بجا ذکر کیا ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کا نام نامی شبیر احمد ہے اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے آپ کا سلسلہ نسب ملتا ہے۔ لیکن آپ کی معرکۃ آراء تصنیف فتح الملہم شرح مسلم کے ٹائٹل اور آپ کی تفسیر یا فوائد قرآنی کے اختتام پر اپنے قلم سے تحریر کئے ہوئے الفاظ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ دراصل آپ کے والد محترم نے آپ کا نام فضل اللہ رکھا تھا۔ چنانچہ فوائد قرآن کریم کے آخر میں لکھتے ہیں :-

"العبد الفقیر فضل اللہ المدعو بہ شبیر احمد[1]

---

[1] عبد فقیر فضل اللہ المدعو بہ شبیر احمد ابن مولانا فضل الرحمٰن عثمانی۔ اور میرے والد نے میرا نام فضل اللہ رکھا تھا اور یہ شعر پڑھا کرتے تھے :- یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہے عطا کرے اگرچہ دشمن حاسد کو ناگوار گذرے۔ (مصنف)

ابن مولانا فضل الرحمٰن العثمانی۔ قد کان ابی سمّانی فضل اللہ وکان ینشد

ذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء
ولو کرہ الاعداء من کل حاسد

اور اسی طرح کی عبارت فتح الملہم کے ٹائٹل پر ہے لکھتے ہیں:۔
فتح الملہم للعبد الفقیر الخاطیٔ الجانی فضل اللہ المدعو بہ شبیر احمد الدیوبندی العثمانی۔

ان عبارتوں سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو گئی کہ آپ کا اصل نام فضل اللہ ہے جو آپ کے پدر بزرگوار نے رکھا تھا لیکن شبیر احمد کے نام سے آپ لوگوں کی زبان پر آتے رہے حتیٰ کہ یہی زیادہ مشہور اور رائج ہوا کہ خود بھی اپنے آپ کو اسی نام سے موسوم کرتے تھے۔ نیز ادنیٰ غور سے باخبر انسان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ کے والد نے بعض صاحبزادوں کا نام عزیز الرحمٰن، حبیب الرحمٰن، مطلوب الرحمٰن، خلیل الرحمٰن رکھا اور دوسری اہلیہ کے لڑکوں میں بعض کا فضل الرحمٰن کی مناسبت سے فضل حق اور آپ کا[۱] فضل اللہ تجویز فرمایا۔ لیکن شبیر احمد کے نام سے کس نے پکارا پردۂ گمنامی میں ہے میرا قیاس ہے کہ چونکہ آپ بروز عشرۂ محرم پیدا ہوئے اس لئے حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے یوم شہادت کے باعث ان کے لقب یعنی شبیر کے نام سے مشہور ہو گئے۔

---

[۱] فتح الملہم عبد فقیر خطا کار گناہگار فضل اللہ المدعو بہ شبیر احمد عثمانی دیوبندی کی مصنفہ شرح ہے۔

مذکورہ بالا فوائد قرآن اور فتح الملہم کی خود نوشتہ تحریروں سے آپ کے والد کا نام فضل الرحمٰن اور سلسلۂ نسب عثمانی اور وطن کا دیوبند ہونا بھی ثابت ہو گیا۔

والد محترم

ضروری اور مناسب ہے کہ قدرے یہاں آپ کے والد محترم سے بھی تعارف کرایا جائے جو اپنے ہم عمروں اور ابنائے زمانہ میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ ان کی تعلیم کی ابتدائی منزلیں تو اپنے وطن دیوبند میں طے ہوئیں لیکن بعد ازاں وہ دہلی کالج میں داخل ہوئے اور مولانا مملوک علی صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا جہاں سے ملک کے مشاہیر آسمانِ علم پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ آپ بھی اسی کالج کے سند یافتہ تھے۔ فارسی ادب میں خصوصیت سے مہارت رکھتے تھے بلکہ زبردست شاعر تھے حضرت استاذ مولانا سید اصغر حسین صاحب سابق استاذِ ابوداؤد و معلم اعلیٰ دار العلوم دیوبند نے اپنی کتاب "حیات شیخ الہند" میں ان کو خاقانی ہند سے یاد کیا ہے حضرت قاسم العلوم مولانا محمد قاسم صاحب بانی دار العلوم دیوبند کے مرثیے اور تاریخ وفات کے سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

"حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب مفتی مدرسہ (دار العلوم) اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مدظلہم (رحمہم اللہ) کے والد ماجد خاقانی ہند مولانا فضل الرحمٰن صاحب قدیم رکن مدرسہ نے ایک دل گداز طویل مرثیہ نظم فرمایا۔" (حیات شیخ الہند ص ۱۷)

خاندانی شرافت اور علمی لیاقت کے باعث حکومت ہند نے آپ کو ڈپٹی مدارس کے عہدۂ جلیلہ پر فائز کیا چنانچہ یو پی کے مختلف اضلاع بالخصوص

ضلع بجنور میں ڈپٹی انسپکٹر محکمہ تعلیم رہے اور پھر پنشن لیکر فارغ ہوئے۔

ملازمت سے فارغ ہو کر علمی شغل سے خالی نہ رہے بلکہ جب حضرت مولانا محمد قاسم صاحب علیہ الرحمہ دار العلوم کی تحریک میں مصروف تھے اس وقت آپ ان کے معاون کی حیثیت سے آگے بڑھے اور مدرسہ عالیہ کی بنیادی تعمیر میں پیش پیش رہے۔ علامہ شبیر احمد مرحوم اپنے ایک مکتوب بنام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ میں جو میرے پاس موجود ہے تحریر فرماتے ہیں :۔

"دار العلوم بہر حال سب مسلمانوں کی متاع ہے۔ جنہوں نے دو چار حرف وہاں رہ کر پڑھے ہیں ان کا عزیز ترین مربّی ہے۔ اکابر رحمہم اللہ کی امانت ہے۔ ان بزرگوں کا لگایا ہوا پودا ہے جن میں ایک نام میرے والد مرحوم کا تھا"

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سابق مہتمم دار العلوم دیوبند ۱۳۲۴ھ کی روئداد میں ان کی وفات حسرت آیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"علم ادب میں خاص ملکہ تھا۔ فارسی میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے تھے۔ نظم و نثر عربی و فارسی نہایت پاکیزہ و متین ہوتی تھی۔ تاریخ گوئی میں اس زمانے میں ایسا ملکہ دیکھا نہیں گیا۔ آپ کی نظم و نثر کا عمدہ مجموعہ مرتب موجود ہے"

آپ نے ۱۲۸۳ھ سے ۱۳۲۵ھ تک بیالیس سال دار العلوم کی مخلصانہ اور بے لوث خدمات انجام دیں اور عمر کے آخری لمحوں تک مدرسہ کے رکن رکین رہے تاآنکہ ۳ رجمادی الاولیٰ ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۵ر جون ۱۹۰۷ء کو بروز ہفتہ بوقت ظہر انتقال فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میرے

خیال میں دارالعلوم کے صدقہ جاریہ کے سلسلے میں جن لوگوں کو بے انتہا ثواب سے روزِ جزا نوازا جائے گا ان میں مولانا فضل الرحمٰن صاحب بھی ہوں گے۔

خاندان علامہ شبیر احمد کا سلسلۂ نسب حضرت عثمان غنی خلیفہ سوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے۔ دیوبند کی آبادی میں سادات اور صدیقی و عثمانی خاندان کے صحیح النسب اصحاب اپنی امتیازی شان کے ساتھ بکثرت موجود ہیں۔ اس قصبہ میں خاندان عثمانی کی بنیاد کب پڑی اس کے متعلق تاریخ دیوبند کے مصنف مولانا سید محبوب رضوی وہاں کے بزرگوں کے حالات لکھتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:۔

"پانچویں بزرگ خواجہ ابوالوفا عثمانی ہیں ...... خواجہ صاحب، شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتیؒ ابن عم (چچازاد بھائی) ہیں۔ حضرت کبیر الاولیاء پانی پتی کا زمانۂ وفات ۷۶۵ھ / ۱۳۶۳ء ہے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ شیخ ابوالوفاؒ دیوبند میں آٹھویں صدی ہجری کے کسی حصے میں سکونت پذیر ہوئے تھے۔ محلہ محل میں ان کا مزار ہے۔ شیخ ابوالوفا کی اولاد میں اللہ نے بڑی برکت دی۔ دیوبند کے تمام عثمانی شیوخ ان کی ہی اولاد میں ہیں .... شیخ عبدالرحمن اکبر جو حضرت عثمانؓ کی چھٹی پشت میں ہیں حسب روایت اقتباس الانوار مدینہ منورہ سے ترک وطن کر کے گازرون علاقہ ماوراء النہر میں سکونت پذیر ہوئے ان کی تیرھویں پشت میں شیخ ابوالوفا دیوبند آئے اور یہیں مقیم ہو گئے۔"

(تاریخ دیوبند ص ۲۸ - ۲۹)

شجرۂ نسب اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ علامہ شبیر احمد رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلہ نسب حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے

جا ملتا ہے۔ یہاں ہم آپ کے سامنے وہ شجرہ پیش کرتے ہیں جو علامہؒ کے خاندان میں محفوظ چلا آتا ہے اور جو مجھے آپ کے برادر اصغر مولوی سعید احمد صاحب عثمانی نے اپنے قلم سے لکھ کر دیا ہے جو آج کل دارالعلوم دیوبند کے دفتر میں ملازم ہیں۔ شجرہ یہ ہے:

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد[1] عثمانی بن مولانا فضل الرحمٰن[2] بن مراد بخش[3] بن غلام محمد[4] بن غلام نبی[5] بن لطف اللہ[6] بن محمد عاشق[7] بن شیخ فرید[8] عثمانی بن ابو محمد[9] بن محمد[10] حافظ بن شیخ مولانا محمد[11] بن خواجہ عبد الملک[12] بن عبد العزیز[13] بن عبد الحکیم[14] بن سعید[15] بن شیخ احمد[16] بن خواجہ فضل اللہ[17] بن خواجہ ابو الوفا[18] بن عبید اللہ[19] بن حسین[20] بن عبد الرزاق[21] بن عبد الحکیم[22] بن حسن[23] بن عبد اللہ[24] عرف ضیاء الدین بن یعقوب[25] عرف معز الدین بن عیسیٰ[26] بن اسمٰعیل[27] بن محمد[28] بن ابا بکر[29] بن علی[30] بن عثمان[31] بن عبد اللہ[32] حرمانی ابن عبد الرحمٰن[33] گارزونی بن عبد العزیز[34] ثالث بن خالد[35] بن ولید[36] بن عبد العزیز[37] ثانی بن شہاب الدین[38] المعروف عبد الرحمٰن اکبر بن عبد اللہ[39] الثانی بن عبد العزیز[40] بن عبد اللہ[41] الکبیر بن عمرو[42] بن امیر المومنین حضرت عثمان[43] رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

مذکورہ بالا شجرے کی ترتیب سے معلوم ہوا کہ علامہ عثمانی حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے تینتالیسویں پشت میں واقع ہیں۔ اس شجرے کا اختتام خلیفہ ثالث پر اُن افراد کے لئے اور بالخصوص علامہ کے لئے باعث فخر ہے کہ اُن کی رگوں میں حضرت عثمانؓ کے خون کی آمیزش ہے۔ علامہ اپنے خطبۂ ترک موالات میں جو آپ نے جمعیۃ العلمائے ہند دہلی کے عظیم الشان اجلاس منعقدہ ۱۹، ۲۰ و ۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء زیر صدارت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ میں پڑھا تھا ایک جگہ اپنے سلسلۂ نسب پر فخر یا فرط بہجت و مسرت میں علماء اور شرکائے جلسہ

کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

" میں اس سے زیادہ ایک لفظ بھی بولنا نہیں چاہتا جو میرے جدِ بزرگوار خلیفۂ ثالث حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ نے مدینہ کے منبر پر فرمایا تھا کہ :

اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّکُمْ اِلٰی اِمَامٍ فَعَّالٍ اَحْوَجُ مِنْکُمْ اِلٰی اِمَامٍ قَوَّالٍ ۔	" اے لوگو! یقیناً تم کو بہت زیادہ کلام کرنے والے پیشوا سے بڑھ کر بہت زیادہ کام کرنے والے پیشوا کی ضرورت ہے "

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

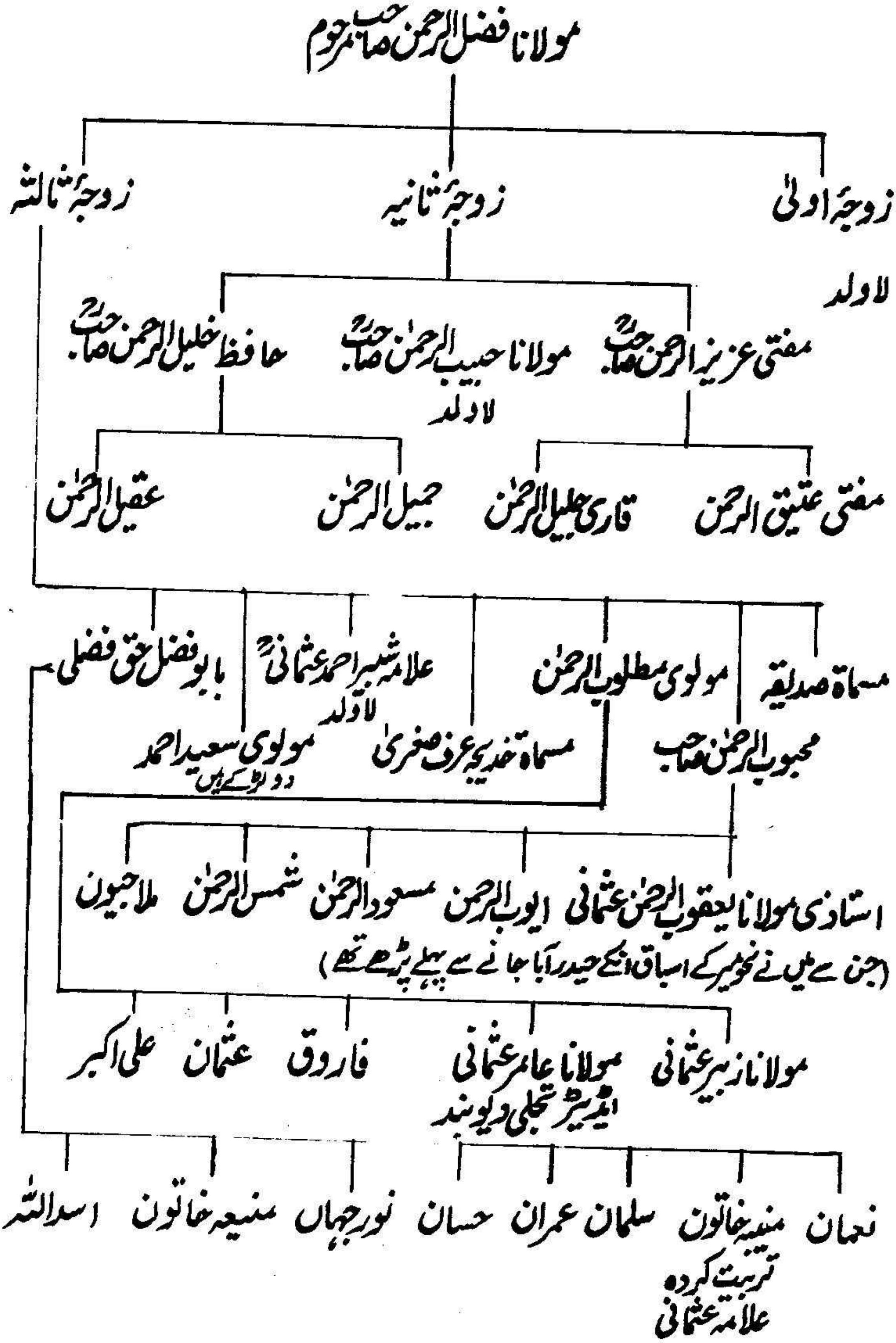
(خطبۂ ترک موالات ص ۲ و ۳)

" میرے جدِ بزرگوار خلیفۂ ثالث حضرت عثمان ذوالنورین " کے الفاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت علامہ کی رُوح میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے سلسلۂ نسب کے تصوّر نے اہتزاز پیدا کر دیا ہے۔ بہرحال خوش نصیب ہیں وہ اشخاص جن کی رگوں میں شریف اور پاکیزہ خون دوڑتا ہے۔

شجرۂ زیریں

ہم نے علامہ عثمانی کا بالائی شجرہ تو پیش کر دیا مگر آپ کے بھائیوں، بہنوں اور برادرزادگان کے متعلق بھی معلومات فراہم کرنا مناسب ہے۔ اس سلسلے میں علامہ عثمانی کے بھائی بابو فضل حق صاحب عثمانی کی تحریر سے بقیہ نیچے کا شجرہ پیش کیا جاتا ہے :

(شجرہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)


مولانا فضل الرحمٰن صاحب مرحوم
زوجۂ اولیٰ
لاولد
زوجۂ ثانیہ
زوجۂ ثالثہ
مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ
مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ
لاولد
حافظ خلیل الرحمٰن صاحبؒ
مفتی عتیق الرحمٰن
قاری جلیل الرحمٰن
جمیل الرحمٰن
عقیل الرحمٰن
مسماۃ صدیقہ
محبوب الرحمٰن صاحب
مولوی مطلوب الرحمٰن
مسماۃ خدیجہ عرف صغریٰ
علامہ شبیر احمد عثمانیؒ
لاولد
مولوی سعید احمد
دو لڑکے ہیں
بابو فضل حق فضلی
استاذی مولانا یعقوب الرحمٰن عثمانی
(جن سے میں نے نحو میر کے اسباق ایکے حیدرآباد جانے سے پہلے پڑھے تھے)
ایوب الرحمٰن
مسعود الرحمٰن
شمس الرحمٰن
ملا جیون
مولانا زبیر عثمانی
مولانا عامر عثمانی
ایڈیٹر تجلی دیوبند
فاروق
عثمان
علی اکبر
نعمان
منیبہ خاتون
تربیت کردہ
علامہ عثمانی
سلمان
عمران
حسان
نور جہاں
منیعہ خاتون
اسد اللہ

قابلِ فخر برادر اور برادر زادے

علامہؒ کے والد محترم کتنے خوش نصیب انسان تھے کہ ان کی اولاد میں کئی ہستیاں نہ صرف فخرِ خاندان تھیں بلکہ ان کو اگر فخر اسلام کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ایسی مقتدر ہستیوں میں فخر الفقہاء جناب استاذ محترم مفتی عزیز الرحمٰن صاحب، فخر العلماء جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اور خود علامہ شبیر احمد عثمانی آسمان علم و فضل کے آفتاب اور ماہتاب تھے۔ اور بھتیجوں کے متعلق پوچھئے تو ان میں مولوی محبوب الرحمٰن کے صاحبزادہ مولانا یعقوب الرحمٰن عثمانی مرحوم اور مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کے صاحبزادہ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب سلمہٗ نہایت فہیدہ، سنجیدہ اور صاحبان علم و فضل سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ برادر زادوں میں مولانا عامر عثمانی اور زبیر عثمانی ماہنامہ رسالہ تجلی دیوبند کے مدیر اور ایڈیٹر ہونے کی حیثیت میں چمک رہے ہیں۔

علامہ کے بھائیوں کے سلسلے میں صرف اتنا لکھ دینا کہ وہ فخر خاندان تھے میرے خیال میں ناانصافی اور گستاخی ہے اس لئے حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمہما اللہ کا ذکر خیر مختصر طور پر کرنا بصیرت سے خالی نہ ہوگا۔

مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ

نہایت ہی عابد و زاہد، متقی اور پرہیزگار تھے۔ علم فقہ میں زبردست بصیرت رکھتے تھے۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کی خدمت میں رہ کر علم حدیث اور فقہ میں مہارت حاصل کی۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ جو اپنے زمانے کے ولی صفت انسان تھے ان سے حضرت مفتی صاحب بیعت تھے تاآنکہ ان کے خلیفۂ اعظم بنے۔

مفتی صاحب اگرچہ دارالعلوم دیوبند میں درس و تدریس کے عہدے پر بھی مامور تھے لیکن آپ کے اصل فرائض منصبی میں فتویٰ نویسی کی خدمات کا انجام دینا تھا۔ جہاں آپ نے ہزاروں طلبہ کو حدیث و تفسیر کی تعلیم دی وہاں دارالعلوم کے دوران ملازمت میں تقریباً اٹھارہ ہزار فتوے لکھے۔ مہتمم صاحبان کی عدم موجودگی میں اہتمام کا کام بھی انجام دیتے تھے۔ دارالعلوم کے خزانے کی ایک چابی آپ کے پاس ہوتی تھی جو آپ کی دیانت اور امانت پر واضح اور روشن دلیل تھی۔ نہایت سیدھے سادے، بھولے بھالے، خاموشی پسند، مرنجاں مرنج بزرگ تھے۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ تم نے فرشتے کو دیکھا ہے تو میں اس کا جواب صرف اتنا ہی دوں گا کہ دیکھا ہے۔ اور اگر کوئی مجھ سے اس فرشتے کی شکل و صورت، وضع قطع، سیرت و عادت اور نام کے متعلق سوال کرے تو میں کہوں گا کہ اس فرشتے کا نام عزیز الرحمٰن ہے۔ سفید باشرع ریش مبارک، نورانی چہرہ، چھوٹا قد، سر پر ٹیڑھے، بغل میں کرتا، مغلئی پاجامہ، کرتے پر صدری، صدری میں جیبی گھڑی، آنکھوں پر عینک، ہاتھ میں بید یا لکڑی کی چھڑی، گھر سے دارالعلوم اور مدرسے سے گھر تشریف لاتے اور لے جاتے نظر میں اکثر آیا کئے۔ راقم الحروف نے ان سے جلالین شریف اور طحاوی دو کتابیں پڑھیں اس لئے میں اپنے لئے ان کی شاگردی کو باعث فخر و سعادت یقین کرتا ہوں۔ اور دل کی بات تو یہ ہے کہ مجھے دارالعلوم دیوبند کے اکابر اور اساتذہ کی جوتیوں کے صدقے میں جو کچھ ملا وہ کہیں سے نہ مل سکا۔ جو علوم و فنون کی تحقیقات وہاں سننے میں آئیں وہ کہیں بھی نہ سُنی جاسکیں۔ وہیں کے دریائے علم سے جو پانی پیا اس نے کہیں اور کی پیاس باقی نہ چھوڑی، ہر شعبۂ علم میں وہاں کی حاصل کی ہوئی چمک کے سامنے

ساری شمعیں بجھی بجھی اور پھیکی پھیکی نظر آئیں۔

دارالعلوم کے دوران تعلیم میں مجھے جن اساتذہ سے شرف تلمذ حاصل ہوا ان میں بتدریج مولوی[1] محمد علی صاحب حیدر آبادی، مولوی[2] یعقوب الرحمٰن صاحب عثمانی، مولوی[3] افتخار علی صاحب برادر زادہ مولانا اعزاز علی صاحب، بھائی[4] جی بھائی سعید صاحب گنگوہی، مولانا[5] بدر عالم صاحب میرٹھی مہاجر مدنیؒ، مولانا[6] محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا[7] نبیہ حسن صاحبؒ ماہر نحو، مولانا[8] احمد شیر صاحب ہزاروی، مفتی[9] محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان، مولانا[10] محمد ادریس صاحبؒ سگروڈھوی، مولانا[11] محمد ادریس صاحبؒ کاندھلوی، مولانا[12] گل محمد خان صاحبؒ، مولانا[13] سراج احمد صاحبؒ، مولانا[14] عبدالسمیع صاحبؒ، مولانا[15] اعزاز علی صاحبؒ، حکیم[16] محمد حسن صاحب برادر اصغر شیخ[18] الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ، مولانا[17] محمد ابراہیم صاحبؒ بلیاوی، مولانا رسول خان صاحبؒ، مولانا[19] میاں سید اصغر حسین صاحبؒ، مولانا[20] مرتضیٰ حسن صاحبؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحبؒ اور حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ جیسے علم و فضل کے دریائے ناپیدا کنار تھے جن کے دیکھنے سے آنکھوں میں نور اور دل میں سرور پیدا ہونا فطری تقاضا تھا۔

دارالعلوم سے فارغ ہوا تو پنجاب یونیورسٹی کے مولوی فاضل کی طرف رخ کیا اور اسے پاس کرنے کے بعد لاہور کے ٹریننگ کالج میں جا داخل ہوا۔ وہاں صوفی غلام مصطفیٰ صاحب تبسم ایم۔اے، مولوی ظفر اقبال صاحب ایم۔اے، پروفیسر محمد منیر صاحب ایم۔اے لیکچرر تاریخ، لالہ سوہن لال جغرافیہ، وغیرہم کی شاگردی حاصل ہوئی۔ پھر منشی فاضل، ادیب فاضل،

سے فراغت حاصل کی اور بعد ازاں میٹرک ، ایف ۔ اے اور بی ۔ اے کے امتحانات دیتا ہوا ایم ۔ اے کی کلاس کے لئے گورنمنٹ کالج لاہور کی ایم ۔ اے کلاس میں پروفیسر مقبول احمد صاحب فارسی پروفیسر ، پروفیسر معراج الدین صاحب پروفیسر سعید صاحب ، پروفیسر محی الدین صاحب ، پروفیسر آفتاب احمد، پروفیسر اشفاق احمد ، صوفی غلام مصطفیٰ صاحب تبسم ، ڈاکٹر صادق اور خواجہ منظور صاحب علیگ سے بھی فیضیاب ہونے کا شرف حاصل ہوا ۔ لیکن ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است ۔ عالم معنی اور عالم رنگ و بو دونوں میں زندگی کے سانس لئے مگر علمائے دیوبند کی صحبتوں میں جو حقیقی لطف آیا وہ اور کہیں نظر نہ آیا ۔ وہاں قال اللہ اور قال الرسول کی مجلسیں گرم رہتی تھیں اور یہاں شکسپیئر، ورڈس ورتھ ، گوئٹے ،کولرج ، بائرن کے چرچے تھے ۔ وہاں دین اور مذہب کی بحثیں تھیں مگر یہاں دنیا اور جاہ و منصب کے افسانے تھے ۔ وہاں نماز کے لئے پنجگانہ صف بستگی تھی اور یہاں ڈراموں اور گانوں کے پروگرام تھے ۔ وہاں عقیدت و خلوص کے پھول کھلتے تھے یہاں بے باکی ، شوخی اور آزادی کی کلیاں چٹکتی تھیں ۔

ہماری آنکھوں نے بھی تماشہ عجب عجب انتخاب دیکھا
برائی دیکھی بھلائی دیکھی عذاب دیکھا ثواب دیکھا

مگر جو کچھ لطف زندگی دیوبند میں دیکھا وہ اور کہیں نہ پایا اور نہ دیکھا ۔ درحقیقت بقول حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ ہمارے اکابر کی تحقیقات کا توازن متقدمین سے کیا جائے تو یہ حضرات کسی سے کم نہ تھے ۔

بات کہاں سے کہاں جا نکلی ۔ تذکرہ تو حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا تھا کہ دیکھنے میں فرشتہ تھے اور صورت میں انسان ، فقہ اور تقویٰ کی جیتی جاگتی تصویر تھے ۔ آخر دنیا جہاں انقلاب کروٹیں بدلتا رہتا ہے آپ

کی زندگی میں بھی انقلاب آیا اور قدرت کو آپ سے اب کسی اور سرزمین میں کام لینا تھا اس لئے سنہ ۱۳۴۶ھ مطابق سنہ ۱۹۲۸ء میں آپ نے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (سملک) ضلع سورت کی ملازمت اختیار فرمائی اور آخر ۷، رجمادی الاخریٰ سنہ ۱۳۴۷ھ کو دیوبند میں وفات پائی اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہم اللہ کے قریب دفن ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم

نحیف الجسم، متوسط قد، سر پر پٹھے، لمبا کرتا، ٹخلئی پاجامہ، بوقت ضرورت جھکلیا اچکن، گندمی رنگ، چلتے پھرتے اور فراغت کے عالم میں ہاتھ میں تسبیح اور زبان پر ذکر الٰہی، چہرے سے رعب ٹپکتا تھا۔ غذا بہت قلیل مگر چائے بکثرت پیتے تھے۔ مہمان نوازی میں عربوں سے دو چار قدم آگے۔ تنخواہ کا اکثر حصہ مہمانوں اور احباب واعزا پر خرچ کر دیتے تھے۔

آپ کی تمام تر تعلیم دیوبند میں ہوئی۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن اسیر مالٹا اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہما اللہ کے فیض یافتہ تھے۔ عرصہ تک گنگوہ خدمت میں رہے۔ سنہ ۱۹۰۸ء مطابق سنہ ۱۳۲۵ھ میں دارالعلوم دیوبند کے نائب مہتمم بنائے گئے۔ اپنی خداداد قوتِ انتظامیہ سے دارالعلوم کو چار چاند لگا دئے۔ اگرچہ اس وقت مہتمم حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب فرزند رشید حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے لیکن یہ بات مسلم ہے کہ دارالعلوم کی ترقی کا سہرا آپ کے سر تھا۔

فہم وفراست، علم وفضیلت، دانائی اور سیاست میں بلند شخصیت کے مالک تھے۔ اساتذہ اور طلبہ کے دلوں پر آپ کی جلالت وعظمت کا سکہ

بیٹھا ہوا تھا۔ اپنی زندگی دار العلوم کی خدمات کے لئے شبانہ روز وقف کر رکھی تھی۔ یہ بات نہ تھی کہ اوقات مدرسہ کے علاوہ اپنے آپ کو آزاد تصور کرتے بلکہ دار العلوم کو اپنا گھر سمجھ کر اس کی بہبودی اور ترقی میں شب و روز منہمک رہتے۔

علم ادب میں پوری مہارت اور بصیرت رکھتے تھے۔ عربی نثر و نظم پر بے تکلف قدرت تھی۔ آپ کا مشہور عربی قصیدہ "لامیۃ المعجزات" تقریباً تین سو اشعار پر مشتمل آپ کی عربی زبان دانی پر روشن دلیل ہے۔ اردو نثر میں موتی پروتے تھے۔ اردو کے بھی بہترین انشار نگار تھے۔ ان کی معرکہ آرار تصنیف "دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا"۔ تاریخ، علم اور ادبیت کا بہترین شاہکار ہے۔ اس کے علاوہ "تعلیمات اسلامیہ" کے دو نمبر اپنی نوعیتِ مضمون میں قابل قدر رسالے ہیں۔

سیاست ملکی میں بھی ان کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ جمعیۃ علمار ہند دہلی کے مقتدر اور صاحب اثر ممبر تھے۔ آپ نے جمعیۃ العلمار کے سالانہ اجلاس منعقدہ گیا ۱۹۲۲ء میں زبردست خطبۂ صدارت پیش کیا جس کو سن علمار اور قوم کے لیڈر عش عش کر اٹھے۔ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۳۰ء تک بائیس سال دار العلوم کی خدمات انجام دے کر ۴ رجب ۱۳۴۸ھ مطابق دسمبر ۱۹۲۹ء میں اس جہان فانی سے رحلت فرمائی۔

علامہ کی پیدائش

گذشتہ صفحات میں حضرت علامہ عثمانی کے نام نامی خاندان، والد مرحوم اور بھائیوں وغیرہم کے حالات پر ہم نے مناسب اور حسب ضرورت روشنی ڈالی ہے۔ اب پھر صاحب سوانح کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

آپ کا اگرچہ آبائی وطن دیوبند تھا لیکن پیدائش خاص بجنور میں

۱۰ محرم الحرام ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۵ء کو ہوئی۔ بجنور یو۔ پی کا مشہور ضلع ہے جس کے ایک بڑے قصبے یعنی شیر کوٹ میں اس راقم الحروف کے بھی آبائی مکانات ہیں اور یہی میری جائے پیدائش ہے لیکن کسے معلوم تھا کہ ۱۹۴۷ء کے زبردست انقلاب میں یہ وطن بے وطنی میں بدل جائے گا اور وہ وقت آجائے گا کہ اس کے دیکھنے کو آنکھیں ترسا کریں گی اور دل تڑپا کرے گا۔

ہاں تو علامہ عثمانی کے والد محترم ضلع بجنور میں مدارس کے ڈپٹی انسپکٹر تھے، اسی دوران قیام میں علامہ یہاں پیدا ہوئے۔ اور یہ بات انہوں نے مسلم لیگ کے ایک شاندار جلسے میں بجنور میں تقریر کرتے ہوئے بھی فرمائی تھی۔ خود دیوبند جو آپ کا آبائی وطن ہے ہند اور بیرون ہند میں اتنی شہرت رکھتا ہے کہ تعارف کا محتاج نہیں لیکن تاریخی اور جغرافیائی حیثیت سے اس پر مزید روشنی ڈالنا سوانح نگاری کے فرائض کی ایک اہم کڑی ہے اور اس لئے بھی کہ یہ آبادی مسلمانان ہند و پاکستان اور دیگر ممالک اسلامیہ کے مسلمانوں کا دینی اور مرکزی مقام ہے جس سے تمام کی مذہبی روایات وابستہ ہیں۔ لہذا اس سلسلے میں آپ کے سامنے دیوبند کی تاریخی حیثیت پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

تاریخ دیوبند

ہم دیوبند کی تاریخ کے لئے " تاریخ دیوبند " مصنفہ مولانا سید محبوب رضوی دیوبندیؒ سے بعض اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ فاضل مصنف نے جو دیوبند کے باشندے اور دارالعلوم کے فرزند ہیں پوری تحقیق اور تجسس کے ساتھ یہ کتاب تحریر کی ہے لیکن ہم نے اس میں ترتیب بدل کر اتنا تصرف کر دیا ہے کہ پہلے دیوبند کی جغرافیائی حیثیت کو پیش کیا ہے اور بعد ازاں تاریخی پوزیشن کو، جو حسب ذیل ہے۔ مصنف تاریخ دیوبند لکھتے ہیں:۔

"محل وقوع

دیوبند شمالی ہند میں ۲۹ درجہ ۵۸ دقیقہ عرض البلد اور ۷۷ درجہ ۳۵ دقیقہ طول البلد پر دہلی سے ۹۱ میل شمال کی جانب ضلع سہارنپور میں ایسٹرن پنجاب ریلوے پر واقع ہے۔ دیوبند کے شمال میں سہارنپور، جنوب میں مظفرنگر، مشرق میں بجنور اور مغرب میں کرنال ہے۔ اس کے مشرق میں دریائے گنگا بہتا ہے اور مغرب میں دریائے جمنا۔ دیوبند ان دونوں مشہور دریاؤں کے وسط میں واقع ہے۔ شیر شاہ سوری کی وہ شاہراہِ اعظم جو کلکتہ سے پشاور تک پھیلی ہوئی ہے دیوبند سے گذرتی ہے۔ یہ وہی شاہی سڑک ہے جس کی تعریف خواجہ الطاف حسین حالی نے اپنے مسدس کے اس بند میں کی ہے ؎

یہ ہموار سڑکیں یہ راہیں مصفا ؛ دو طرفہ برابر درختوں کا سایا

نشاں جا بجا پھل و فرسخ کے برپا ؛ سر راہ کنوئیں اور سرائیں مہیا!

واقعہ یہ ہے کہ شیرشاہ کا یہ تعمیری کارنامہ اپنے زمانے کے لحاظ سے بالکل عدیم المثال ہے ۔ یہ سڑک چار مہینے کی مسافت پر پھیلی ہوئی ہے۔ سات سات کوس کے فاصلہ پر پختہ سرائیں بنی ہوئی تھیں۔ مسافروں کو آرام پہنچانے کے لئے ہندو اور مسلمان نوکر رکھے ہوئے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف میوہ دار درخت لگوائے تھے۔ جن کے پھل مسافروں کے کام آتے تھے۔ راستہ کے اندازہ کے لئے ہر کوس پر مینار بنا ہوا تھا۔ سڑک پر جابجا مسجدیں اور کنویں بنے ہوتے تھے۔ مسجدوں میں سرکاری امام اور مؤذن مقرر تھے۔ غرضیکہ اس زمانے کے لحاظ سے مسافروں کو سفر میں جن چیزوں کی ضرورت پیش آتی تھی۔ ان سب کا انتظام حکومت کی طرف سے مفت کیا جاتا تھا۔

دیوبند میں بھی اس قسم کی سرائے کے آثار اور نشانات سڑک سے متصل موجود ہیں۔ مظفرنگر اور سہارنپور کے درمیان کا ٹکڑا اب تک پختہ نہیں تھا۔ اب چند سالوں سے اس سڑک کی تعمیر کا کام جاری ہے۔ ابتدائی کام مکمل ہوچکا ہے صرف سیمنٹ بچھانا باقی ہے۔ امید ہے کہ عنقریب ہی یہ کام بھی پایہ تکمیل تک پہنچ جائے گا[1]۔ اس سڑک کے علاوہ نارتھ ویسٹرن ریلوے کی وہ مین لائن بھی دیوبند سے گذرتی ہے جو دہلی سے سہارنپور ہوتی ہوئی پشاور تک جاتی ہے۔ تقسیم ملک کے بعد اب یہ ایسٹرن پنجاب ریلوے کے نام سے موسوم کردی گئی ہے اور پشاور کی بجائے اب امرتسر تک جاتی ہے۔ یہ ریلوے لائن ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۷ء میں تعمیر ہوئی اور یکم جنوری ۱۲۸۶ھ / ۱۸۶۸ء سے اس پر ریل گاڑیاں چل رہی ہیں۔"

---

[1] اب یہ سڑک پختہ ہوگئی ہے ۱۲ اشفاق احمد قاسمی

طرزِ آبادی

دیوبند کی آبادی کا طرز بھی قابلِ ذکر ہے جس کی نظیر بہت کم دوسری جگہ ملے گی۔ جہاں کی آبادی کی تقسیم اس طرح پر ہے کہ ایک جانب مسلمان آباد ہیں اور دوسری جانب ہندو۔ درمیان میں شمالاً جنوباً ایک بازار ہے جو بمنزلہ حدِ فاصل کے ہے۔ بازار کی جانبِ مغرب مسلمان آباد ہیں اور مشرق کی جانب ہندو۔ اور پھر مسلمان اور ہندوؤں میں ہر قوم علیحدہ علیحدہ اور ایک جگہ آباد ہے۔ اگرچہ امتدادِ زمانہ اور نقل وتبدیل سے اب یہ حالت بہت کچھ بدل گئی ہے۔ تاہم یہ ترتیب ابھی تک ظاہر اور محسوس ہوتی ہے۔ قوموں اور محلوں کی یہ ترتیب و تقسیم سلطان شہاب الدین غوری کے عہد کی بتلائی جاتی ہے۔ (تاریخ سہارنپور ص ۱۶۱)

موجودہ آبادی ۳۶ محلوں پر مشتمل ہے۔ ستمبر ۱۹۴۶ء کے راشننگ سسٹم کے اعداد و شمار کے مطابق مکانوں کی تعداد ۵۴۰۶ ہے۔

دیوبند کو کس نے اور کب آباد کیا

دیوبند کو کب اور کس نے آباد کیا؟ اس کا فیصلہ کُن جواب دینا بہت مشکل ہے۔ قدامت کے باعث اب تک اس کے زمانۂ تعمیر کا ٹھیک تعین نہیں کیا جا سکا ہے۔ کسی نے ایک ہزار برس کی آبادی بیان کی ہے، اور کسی نے سمبت بکرماجیت سے پہلے کی جس کو دو ہزار سال سے زائد گزر چکے ہیں۔

ایک روایت میں طوفانِ نوح کے قریب ترین زمانے میں آباد ہونا بتلایا جاتا ہے۔ تاہم پرانی عمارتوں اور کتبوں سے اس قدر یقین معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ابتدائی عہدِ حکومت کے بہت پہلے سے آباد ہے۔ دوآبہ

کا علاقہ تاریخ کے قدیم ترین زمانہ سے ہندوستان کی تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا ہے۔

موجودہ آبادی سے مشرق کی جانب تقریباً دو میل کے فاصلہ پر پختہ عمارتوں اور غیر مسلم عبادت گاہوں کے بکثرت نشانات ملتے ہیں۔ پرانے لوگوں کا بیان ہے کہ ڈیڑھ دو ہزار سال قبل دیوبند کی قدیم آبادی یہی تھی، میرا خیال ہے کہ اگر اس سلسلہ میں تجسس و تحقیق اور چھان بین سے کام کیا جائے اور یہاں کے کھنڈروں کی اینٹوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا جائے تو یقیناً کچھ نہ کچھ انکشافات ہو سکتے ہیں۔

دیوبند سے متعلق یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ بدھ مت کے عروج کے آخری زمانے میں جبکہ برہمن اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کو حاصل کرنے کے لئے خفیہ جدوجہد کر رہے تھے تو یہ مقام بھی ان کے خفیہ انقلابی مرکزوں میں سے تھا۔

بہر حال اس کا افسوس ہے کہ دیوبند کی قدامت کے لحاظ سے اس کے حالات کا پتہ لگانے کے ذرائع مجھے دستیاب نہیں ہو سکے اس لئے جو معلومات حاصل ہو سکے وہ پیش کئے جا رہے ہیں۔

مولانا فصیح الدین صاحبؒ اپنے جغرافیہ ضلع سہارنپور میں دیوبند کی آبادی کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"آبادی نہایت پرانی سمبت بکرماجیت سے پہلے کی ہے"

تاریخ سہارنپور کا مصنف بھی زمانۂ آبادی کا ٹھیک تعین نہیں کر سکا اس نے لکھا ہے کہ:۔

"یہ قصبہ قدیمی ہے تخمیناً ایک ہزار برس کی آبادی بیان کرتے

ہیں ایک قلعہ بھی اس میں تھا کہ اب اس پر عمارت سابق کا انکشاف نہیں ہے، اب مثل ایک کھیڑے کے ہے۔ سرکار انگریزی نے مقام تحصیل اس پر بنایا ہے۔ اس قلعہ کے دروازے پر ایک مسجد بہ عمارت پختہ کہنہ تعمیر موجود ہے اور پیش دروازہ اس کے پتھر پہ یہ عبارت اس کے سن و تاریخ کی کندہ ہے۔

۶۱۶ھ / ۱۲۱۹ء سلطان سکندر بن بہلول شاہ —— ۳(قط ۲۶ و ۱۶۰)

حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبند کو طوفان نوح کے بعد کی ابتدائی بستیوں میں شمار کرتے ہیں۔ انہوں نے ذیل کے ادیبانہ انداز میں اس کی قدامت کا ذکر کیا ہے:

فکورة قديمة، وقصبة عظيمة ومدينة كريمة وبلدة فخيمة كانها اول عمران، عُمِّرَ بعد الطوفان، ذات المعاهد الوسيعة والمساجد الرفيعة ومعالم المشهورة والمقابر المزورة، والآثار المحمودة والاخيار المسعودة وابنية مرصوصة وامكنة مخصوصة۔
(الهدية السنية ص۱)

”یہ ایک قدیم آبادی ہے بہت بڑا قصبہ اور عظیم الشان شہر ہے، معلوم ہوتا ہے کہ طوفان نوح کے بعد کی ابتدائی بستیوں میں سے ہے، اس کی عمارات اور مساجد نہایت وسیع اور بلند واقع ہوئی ہیں، آثار قدیمہ اور مزارات اولیاء اللہ سے بھرا ہوا ہے۔ اس کے آثار محمودہ اور حالات مبارکہ مشہور ہیں اس میں پختہ اور مستحکم عمارتیں ہیں۔“

ہندی زبان کے " ہندوسنسکرت کا ایک کیندر " کے مصنف نے لکھا ہے کہ :

" دیوبند کا ذکر مارکنڈے پُران میں ملتا ہے جس سے دیوبند کی قدامت ثابت ہے نیز یہ بھی مشہور ہے کہ کوروں پانڈوں کے عہد حکومت میں دیوبند آباد تھا "

(ہندوسنسکرت کا ایک کیندر ص ۲ شائع کردہ نرائن نند سرستی)

شہر سے باہر جنوب کی جانب ایک محلہ سرائے پیرزادگان ہے ۔ اس محلہ کے ایک کنویں میں سنسکرت رسم الخط کا ایک کتبہ اینٹوں پر کُھدا ہوا ہے ۔ اس کتبہ کو پڑھنے کی بے حد کوشش کی گئی مگر اینٹوں کے گھس جانے کی وجہ سے حروف صاف طور پر معلوم نہیں ہوتے ۔ صرف نیچے کی جانب کسی قدر سن کا پتہ چلتا ہے ۔ غالباً ۱۱۹ سنہ بکرماجیت ہے ۔ سو سال سے کچھ زائد ہوئے کہ تعمیر مکان کے سلسلہ میں ایک بہت پرانے بند کنویں سے ایک سنگین کتبہ برآمد ہوا تھا ۔ جس کو سکندر اعظم کے زمانہ کا بتایا جاتا ہے ۔ اس کتبہ پر برآمدگی کے بعد ماہرین آثار قدیمہ نے قبضہ کر لیا معلوم نہیں کہ اب کہاں ہے ۔ اگر یہ کتبہ ہاتھ آتا تو شائد مزید انکشاف ہوسکتا تھا ۔

یہاں ایک قلعہ بھی راجگان ہستناپور کے زمانہ کا بیان کیا جاتا ہے سلطان سکندر شاہ کے عہد میں حسن خان صوبہ دار نے قدیم عمارت کو مسمار کرا کر از سر نو پختہ اینٹوں کا تعمیر کرایا تھا ۔ حسن خان کے نام کی نسبت سے قلعہ کا مقام اب تک حسن گڈھ کہلاتا ہے ۔

اس قلعہ کے متعلق آئین اکبری میں ہے کہ :

"دیوبند قلعہ از خشت پختہ دارد" (آئین اکبری جلد دوم ص۱۴۳)

قلعہ اور اس کی عمارتوں کا اب کوئی نشان نہیں ملتا صرف ایک اونچا مقام ہے جس پر زیادہ تر سرکاری عمارتیں تحصیل، عدالت منصفی، دفتر رجسٹری، ڈاک خانہ، اسکول بنے ہوئے ہیں۔ اس قلعہ کے ایک کنویں کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ اس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں دیوؤں کو قید کیا گیا تھا۔

قدیم آبادی میں یہ خصوصیت عام طور پر پائی جاتی ہے کہ ان کی آبادی ہموار سطح پر نہیں ہے۔ کہیں نشیب ہے کہیں فراز۔ اس کا سبب ماہرین آثار قدیمہ (Archaeology) کے نزدیک یہ ہے کہ حوادث زمانہ زمانہ سے جب کوئی آبادی نیست و نابود ہوتی ہے تو زمین پر اپنا ارتفاعی نشان ضرور چھوڑتی ہے۔ بعد کے لوگ اسی جگہ آباد ہونے کی خواہش کے ماتحت اس پر دوبارہ تعمیر کرتے ہیں اور جب یہ سلسلہ ہزاروں سال تک جاری رہتا ہے اور آبادیاں بگڑتی اور بنتی رہتی ہیں۔ تو سطح میں ناہمواری اور نشیب و فراز کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ کے نزدیک یہ نہیں ہوتا کہ جو ابتدائی آبادی ہو اس وقت وہ جگہ ناہموار ہو بلکہ ارتفاعی امر ہوتا ہے۔ اور اس کے لئے ہزاروں سال کی گردش درکار ہوتی ہے۔

اس اصول کے مطابق دیوبند کو دیکھا جاتا ہے تو اس کی آبادی میں بکثرت نشیب و فراز نمایاں نظر آتے ہیں اور بعض تو یہ تفاوت پچاس فٹ تک پہنچ جاتا ہے۔

وجہِ تسمیہ

دیوبند کی وجہ تسمیہ میں ذیل کی متعدد اور مختلف روایتیں بیان کی جاتی ہیں :

۱ــــ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دیوبند کو پہلے " دیوی بلاس " کہتے تھے۔ کیونکہ یہاں پر سندری دیوی کا ایک مندر معروف بہ " دیوی کنڈ" اور ایک جنگل موسوم بہ " بلاس " واقع تھے۔

۲ــــ پنڈت نند کشور نے ضلع سہارنپور کی تاریخ میں دیوبند کی وجہ تسمیہ کے متعلق لکھا ہے کہ :

" وجہ تسمیہ قصبہ میں بہت سی روایات زبان زد ساکنین قصبہ کے ہیں مگر قرین قیاس وجہ تسمیہ کی یہ معلوم ہوئی ہے کہ پہلے اس موقع پر جنگل لق ودق تھا۔ ایک مکان معروف " دیوی کنڈ" اور دوسرا جنگل " بلاس " اس موقع پر واقع تھے ان دونوں مکانوں کے سبب سے بنام نہاد دیوبند مشہور ہوا پہلے اس مقام کو " دیبی بن " کہتے تھے۔ کثرت استعمال سے دیوبند ہو گیا۔ (تاریخ سہارنپور مطبوعہ ۱۸۶۸ء ۱۲۸۵ھ ص ۲۷، ۱۶۰)

۳ــــ بعض کا قول یہ ہے کہ "سلیمان پیغمبر نے اس کے قلعہ میں دیووں کو بند کیا ہے اس واسطے دیوبند نام ہے"۔ اس واسطے ہندی میں " دیو " بمعنی دیوتا اور " بن " معنی " جنگل سے " ہے۔

(تاریخ سہارنپور صفحہ ۲۷ و ۱۶۰)

۴ــــ بعض لوگ ایران کی تاریخ کے حوالہ سے ایک اور سبب تسمیہ

بیان کرتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ :

" ایران کے آریہ نسل کے باشندوں کی زبان میں لفظ "دیو" کا اطلاق وحشی اور جنگلی جانوروں پر کیا جاتا تھا۔ چنانچہ یہی لفظ ہندوستان میں آکر بعد کو "مہادیو" بن گیا "۔

پھر ہندوستان کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ :

" ان ہی آریہ نسلوں نے ہندوستان آکر یہاں کے اصلی باشندوں کو کھلے میدانوں اور آبادیوں سے بزور شمشیر نکال کر گنجان جنگلوں اور دشوار گذار پہاڑوں میں مار بھگایا "۔

پس چونکہ دیوبند میں جنگلات کی کثرت تھی قرین قیاس ہے کہ نووارد آریوں نے وحشی اقوام کو جنگل میں بند کر دیا ہو ۔

۵ ـــ ایک روایت (جس کا پہلے ذکر آچکا ہے) یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ " حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد میں دیوبند کے باشندوں کی فریاد پر آپ کے عُمّال نے یہاں آکر ایذا دہندہ دیوؤں کو قید کر دیا اور دیوؤں کا یہ تقید آگے چل کر سبب تسمیہ بن گیا۔ چنانچہ اسی روایت کی بناء پر ایک بند کنویں کو دوبارہ کھودنے کے وقت ایک مہیب صورت دیو کا نکلنا بھی عوام الناس کے زبان زد ہے "۔

(مقدمہ حیات شیخ الہند مصنفہ مولانا اصغر حسین صاحبؒ)

تاریخی اور حقیقی طور ان میں سے ہر ایک روایت پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا البتہ روایات کے اختلاف سے تین ناموں کا یقین ہوتا ہے۔ "دیوی بلاس"[۱] ، "دیوی بن"[۲] ، "دیوبند"[۳] اب دیکھنا یہ ہے کہ تاریخ اور جغرافیہ کی کتابوں میں یہ مقام کس نام سے ملتا ہے ۔

جہاں تک تلفظ کا تعلق ہے اس میں مؤخر الذکر دو نام مروج ہیں۔ تاریخ سے بھی انہی دو ناموں کا ثبوت ملتا ہے مگر وہ بھی بہت زیادہ قدیم نہیں۔ میرے اجداد میں سے بعض بزرگوں کے نام جہانگیر اور شاہجہان نے جاگیریں عطا کی ہیں ان میں دیوبندہی تحریر ہے۔ آئین اکبری جو عہد اکبر کی تصنیف ہے اس میں بھی دیوبندہی لکھا گیا ہے۔

(ملاحظہ ہو آئین اکبری جلد دوم مطبوعہ نولکشور ۱۸۹۳ء ص ۲۸ و ۱۴۲)

کتب خانہ دار العلوم دیوبند میں زیچ الغ بیگی کا ایک مخطوطہ ہے، اس کے آخر میں تحریر ہے:

"ایں اوراق زیچ الغ بیگی در روز یوم السبت در قلعۂ دیوبند بتاریخ نوزدہم شہر ربیع الاول ۱۱۹۸ھ / ۱۷۸۳ء صورت تحریر یافت"

دیوبند میں ایک بزرگ قالو قلندر گذرے ہیں جن کا مزار تحصیل کے قریب سبزی فروشوں کے بازار میں واقع ہے۔ تذکرۃ العابدین صفحہ ۲۷۹ پر ان کا سن وفات ۸۲۵ھ / ۱۴۲۱ء لکھا ہے۔ ان قالو قلندرؒ کا ایک شعر عام طور پر زبان زد ہے جس میں دیوبندہی نظم کیا گیا ہے۔ اس شعر کا پہلا مصرعہ یہ ہے ؎

قالو قلندر رست بدروازۂ دیوبند

مجدد الف ثانیؒ کی سیرت "زبدۃ المقامات" جو اوائل گیارھویں صدی کی تصنیف ہے اس میں ایک مکتوب بنام شیخ احمد دیبنیؒ کے ذیل میں تحریر ہے:۔

"دیبن موضعی ست از مضافات سہارنپور میان دوآب"۔

(مطبوعہ محمود پریس لکھنو ص ۳۸۴)

۱۳۰۱ھ / ۱۸۸۳ء میں دیوبند میں ایک زبردست پلیگ پھیلا تھا۔ اس پلیگ کی تباہ کاریوں کو مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے فارسی میں نظم کیا ہے۔ اس نظم کا تاریخی نام " قصہ غم دیبن " ہے۔

۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۵ء میں جیمس ڈکسن لاٹوش لفٹینٹ گورنر صوبہ متحدہ کے معائنہ دار العلوم دیوبند کے خیر مقدم میں جو نظم پڑھی گئی اس میں بھی " دیبن " نظم کیا گیا ہے، شعر یہ ہے ؎

ہے یہ دار العلم شاہا! یادگار مسلمیں
کورده دیبن سا جس سے رشک شہر طوس ہے

مذکورہ بالا تحریری اسناد سے یہ واضح ہوتا ہے کہ " دیبن " اور " دیوبند " دونوں نام مدت مدید سے مروج اور زبان زد ہیں۔ اس لئے قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں اولیت کس کو حاصل ہے تاہم میرے نزدیک وجہ تسمیہ کی پہلی دو روایتیں عقل اور قیاس کے اعتبار سے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہیں کہ دیوبند " دیوی " اور " بن " سے مرکب ہے۔ ان دونوں لفظوں کی آمیزش نے اس کو اولاً " دیوی بن " سے موسوم کرایا جو بعد ازاں کثرت استعمال سے " دے بن " اور پھر رفتہ رفتہ تصرف متکلمین سے دیوبند ہو گیا۔ اس روایت کے آثار و قرائن بھی فی الجملہ پائے جاتے ہیں۔ یعنی دیوی کا مندر اور " بن "۔ گو ان میں سے آخری چیز ختم ہوتے ہوتے اب قریب قریب معدوم ہو چکی ہے مگر اس کے وجود کا ثبوت (وجہ تسمیہ کے علاوہ) متعدد روایات کے سبب سے " خبر متواتر " کی حیثیت رکھتا ہے نیز دیوبند کے شمالی جانب کا ایک مقام قاضی فضل اللہ شیر کی بنی " کے نام سے موسوم ہو گیا تھا جو اسی بن کا ایک حصہ ہونے کی وجہ سے بصیغہ تصغیر " بنی " کہلاتا ہے۔ اس بنی کے کچھ کچھ آثار اب بھی باقی رہ گئے ہیں "

عہدِ تعلیم

۱۳۱۱ھ سے ۱۳۲۵ھ تک
۱۸۹۴ء ۱۹۰۸ء

یہاں تک علامہ عثمانیؒ کے نام، پیدائش، ولدیت، شجرۂ نسب، خاندان اور وطن پر حسب ضرورت لکھا جا چکا۔ پیدائش کے بعد عام طور پر حالات کے سلسلے میں تعلیم کی ابتدار تک شاذ و نادر ہی بچوں کے ایسے واقعات ہوتے ہیں جو سوانح کی زینت بن سکتے ہیں اس لئے یہاں سے ہم ان کے تعلیمی حالات کا سلسلہ شروع کرتے ہیں۔

بسم اللہ آپ کے سب سے پہلے استاد جنہوں نے آپ کی بسم اللہ کرائی حافظ محمد عظیم صاحب دیوبندی مرحوم تھے۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق غالباً عربی کا قاعدہ شروع کیا ہوگا جو قاعدۂ بغدادی کے نام سے مشہور ہے لیکن اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ ہو سکتا ہے کہ اردو قاعدے سے تعلیم کا آغاز ہوا ہو۔ لیکن قیاس چاہتا ہے کہ بغدادی قاعدے ہی سے اس زمانے کے دستور کے مطابق آغاز ہوا ہوگا۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ والد محترم مرحوم نے کسی گتے کے ٹکڑے پر "الف" "ب" لکھ دی ہو اور حافظ نامدار صاحب سے ابتدا کرادی ہو۔ اس وقت آپ کی عمر چھ سال کی تھی۔ بسم اللہ کا سنہ تیرہ سو گیارہ ہجری تھا۔ ماہ اور تاریخ گمنامی کے پردے میں ہیں۔

⁂

دار العلوم میں داخلہ

آپ قاعدہ وغیرہ سے فارغ ہوئے، تو شوال یا اور کسی ماہ ۱۳۱۲ھ میں دار العلوم دیوبند میں داخل ہوئے۔ اور قرآن کریم حافظ نامدار خان صاحب سے بھی پڑھا۔ چنانچہ دار العلوم کی سالانہ رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ۱۳۱۲ھ میں سورۃ الحمد سے سورۃ والنازعات تک امتحان دیا۔ ۱۳۱۱ھ کی روئداد میں آپ کا نام موجود نہیں ہے۔ ۱۳۱۳ھ اور ۱۳۱۴ھ کی سالانہ روئدادوں میں بھی طلبہ کی فہرست میں آپ کا نام نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں سالوں میں آپ والد مرحوم کے دوران ملازمت میں ان کے ساتھ ہوں گے، اور وہیں رہ کر قرآن کریم اور بعض اردو کی کتابیں پڑھی ہوں گی۔

۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء میں آپ کا نام پھر طلبہ کی فہرست میں موجود ہے۔ اور پھر مسلسل ۱۳۲۵ھ مطابق ۸-۱۹۰۷ء تک چلا گیا ہے۔

قرآن کریم اور اردو کی کتابوں کی تعلیم سے فارغ ہو کر آپ نے فارسی کی ابتداء دار العلوم کے فارسی استاد منشی منظور احمد صاحب سے کی۔ اور بعد ازاں استاذ محترم مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی مدظلہ العالی مفتیٔ پاکستان کے والد مرحوم مولانا محمد یٰسین صاحب صدر مدرس شعبۂ فارسی دار العلوم سے فارسی کی اعلیٰ کتابیں پڑھیں۔ ان تمام تاریخی تعلیمی حالات کا صحیح علم دار العلوم دیوبند کی سالانہ رپورٹوں سے بڑھ کر اور بہتر کہیں سے حاصل نہیں ہو سکتا اس لئے ہم آپ کو دار العلوم کی سالانہ رپورٹوں سے علامہ عثمانی کی سال بسال تحصیل علوم کی کیفیت پیش کرتے ہیں۔ اور یہ بھی کہ آپ نے ان کتابوں میں کتنے نمبر لیکر کامیابی حاصل کرتے رہے۔ یہاں یہ حقیقت واضح کر دینی بھی ضروری ہے کہ دار العلوم میں کامیابی کا معیار پچاس نمبروں میں چالیس نمبر

ہوتا ہے۔ چالیس سے کم نمبر حاصل کرنے والا طالب علم فیل شمار کیا جاتا ہے۔ کامیابی کے بھی اعلیٰ، اول، دوم اور سوم مدارج ہوتے ہیں۔ جو طلبہ چالیس سے پینتالیس تک نمبر حاصل کرتے ہیں وہ تھرڈ ڈویژن میں سمجھے جاتے ہیں پینتالیس سے اوپر انچاس تک سیکنڈ ڈویژن ہوتی ہے۔ لیکن پچاس نمبر حاصل کرنے والا فرسٹ ڈویژن لیتا ہے۔ مگر ایک اس سے بھی اونچی ڈویژن ہوتی ہے جس کو اعلیٰ کہا جاتا ہے۔ اس میں پچاس سے اوپر نمبر حاصل کرنے والے طلبہ ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پچاس میں چالیس نمبر حاصل کرنا سخت معیاری مقام ہے حالانکہ یونیورسٹیوں میں تینتیس فیصدی نمبر حاصل کرنے والے طلبہ پاس سمجھے جاتے ہیں۔

نقشہ تعلیم سال بسال علامہ عثمانیؒ مطابق روئداد ہائے دارالعلوم دیوبند

۱۳۱۲ھ، ۱۸۹۴ء: از سورۃ الحمد تا سورۃ والنازعات امتحان دیا۔ نمبر درج نہیں ہیں۔

۱۳۱۵ھ، ۱۸۹۷ء:

۱۔	صفوۃ المصادر	۵۰
۲۔	حکایات لطیف	۵۰
۳۔	راہ نجات	۵۰
۴۔	پہاڑا سولہ تک، جمع۔ تفریق بسیط	۵۰
۵۔	مفید نامہ	۴۶ ۲/۳
۶۔	املا	۴۰

۱۳۱۶ھ، ۱۸۹۸ء:

۱۔	بوستان	۴۰ ۱/۳
۲۔	انشائے بہار عجم	۴۰
۳۔	حساب کسور عام یا اربعہ متناسبہ	۴۵ ۱/۳
۴۔	املا فارسی	۴۵
۵۔	مالا بدمنہ	۳۵ ۱/۳

۱۳۱۷ھ ۔ ۱۸۹۹ء ۔	
۱۔ رقعات امان اللہ حسینی	۴۸
۲۔ کسور اعشار و جذر المربع	۴۷½
۳۔ انوار سہیلی باب اول	۴۵½
۴۔ زلیخا	۴۲
۵ احسن القواعد باب اول	۴۰

۱۳۱۸ھ ۱۹۰۰ء	
۱۔ تحریر اقلیدس مقالہ اول	۵۰
۲۔ حساب نفع نقصان	۵۰
۳۔ احسن القواعد	۴۹
۴ سکندر نامہ	۴۹
۵۔ ابوالفضل دفتر اول	۵۰
۶۔ صرف میر	۵۰
۷۔ دستور المبتدی	۴۷

آغاز تعلیم عربی

سنہ ۱۳۱۸ھ کی روئداد سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فارسی کے ساتھ اسی سنہ میں آپ نے عربی بھی شروع کردی تھی ۔ چنانچہ صرف میر اور دستور المبتدی میں امتحان دیا ہے جو امتحان کی کتابوں کی فہرست میں موجود ہیں ۔ لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ میزان و منشعب کے بغیر صرف میر نہیں پڑھائی جاتی لہذا علم صرف عربی کی یہ ابتدائی کتاب کہاں پڑھی ۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میزان و منشعب پڑھی ہوگی لیکن امتحان نہیں نہ دیا ہوگا ۔ یا خارج از جماعت پڑھ لی ہوگی۔

۱۳۱۵ھ سے سنہ ۱۳۱۸ھ تک کے بارے میں مدرسین کے متعلق بھی یہ بتادینا ضروری ہے کہ ان سالوں میں مولانا محمد یٰسین صاحبؒ فارسی کے مدرس اول تھے اور منشی منظور احمد صاحبؒ مدرس دوم ۔ مؤخر الذکر فارسی کی ابتدائی کتابوں کے علاوہ حساب بھی پڑھاتے تھے ۔

٭

نقشہ تعلیم عربی از ۱۳۱۸ھ (۱۹۰۰ء) تا ۱۳۲۵ھ (۱۹۰۷-۸ء)

۱۳۱۸ھ ، ۱۹۰۰ء :

۱- صرف میر (علم الصرف) ۵۰

۲- دستور المبتدی (صرف) ۴۷

۱۳۱۹ھ ، ۱۹۰۱ء :

۱- میزان منطق (منطق) ۵۰

۲- قال اقول (منطق) ۵۰

۳- فصول اکبری (صرف) ۵۰

۴- ہدایۃ النحو (نحو) ۵۰

۵- مصباح الصرف (صرف) ۵۰

۶- شرح مائۃ عامل (نحو) ۵۰

۱۳۲۰ھ ، ۱۹۰۲ء :

۱- شرح تہذیب (منطق) ۵۱

۲- اصول الشاشی (اصول فقہ) ۵۱

۳- ایساغوجی (منطق) ۵۰

۴- قدوری (فقہ) ۵۰

۵- شرح جامی بحث فعل (نحو) ۵۰

۶- کنز الدقائق (فقہ) ۴۵

۱۳۲۱ھ ، ۱۹۰۳ء :

۱- رشیدیہ (علم مناظرہ) ۵۱

۲- میبذی (علم فلسفہ) ۵۰

۳- ملاحسن (منطق) ۵۰

۴- سُلّم العلوم (منطق) ۵۰

۵- میر قطبی (منطق) ۴۸

۶- مختصر المعانی (علم معانی و بیان) ۴۵

۷- شرح وقایہ (فقہ) ۲۷

۸- ہدیہ سعیدیہ (فلسفہ) ۱۷

۱۳۲۲ھ ، ۱۹۰۴ء :

۱- میر زاہد رسالہ (منطق) ۵۱

۲- نور الانوار (اصول فقہ) ۵۰

۳- مشکوٰۃ (علم حدیث) غیر حاضر

۴- ہدایہ (فقہ) غیر حاضر

۵- میر زاہد ملا جلال (منطق) بیمار

۱۳۲۳ھ ، ۱۹۰۵ء :

۱- قاضی مبارک (منطق) ۵۳

۲- حمد اللہ (منطق) ۵۳

۳- صدرا (فلسفہ) ۵۲

۴- میر زاہد امور عامہ (منطق) ۵۱

۵- مسلم الثبوت (اصول فقہ) ۵۰½

- - - - - - - - - ۶ - مقامات حریری (ادب) ۲۵

۱۳۲۴ھ ، ۱۹۰۶ء :

۱ -	مقدمہ جزری (قرأت)	۴۸
۲ -	عمل بالتجوید مع التدویر	۵۰
۳ -	جلالین (عربی تفسیر)	۵۱
۴ -	مشکوٰۃ شریف (حدیث)	۵۱
۵ -	ہدایہ اخیرین (فقہ)	۵۰
۶ -	تصریح (علم ہیئت)	۴۵
۷ -	شرح چغمینی (ہیئت)	۴۱
۸ -	سبع شداد (ہیئت)	۴۲
	״ ״ ״ ״	
	״ ״ ״ ״	

۱۳۲۵ھ ، ۸-۱۹۰۷ء :

۱ -	شمائل ترمذی (حدیث)	۵۱
۲ -	بخاری شریف (حدیث)	۱/۲ ۵۰
۳ -	ابن ماجہ (حدیث)	۵۰
۴ -	ترمذی شریف (حدیث)	۵۰
۵ -	موطا امام مالک (حدیث)	۵۰
۶ -	موطا امام محمد (حدیث)	۵۰
۷ -	بیضاوی شریف (تفسیر)	۵۰
۸ -	ابوداؤد شریف (حدیث)	۱/۲ ۴۹
۹ -	نسائی شریف (حدیث)	۴۹
۱۰ -	مسلم شریف (حدیث)	۴۸

تجزیہ علوم وفنون

مذکورہ بالا تحصیل علم کے نقشوں سے صاف اور واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے فارسی ، حساب ، علم تجوید وقراءت ، صرف ، نحو ، منطق ، فلسفہ ، علم معانی و بیان ، ادب ، فقہ ، اصول فقہ ، مناظرہ ، ہیئت ، حدیث اور علم تفسیر کے علوم وفنون دارالعلوم دیوبند میں داخل ہو کر حاصل کئے ۔ اور ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۸ء میں درجۂ فضیلت اول درجے (فرسٹ ڈویژن) میں پاس کیا جیسا کہ ۱۳۲۵ھ کی روئداد میں آپ کو تمام طلبہ میں نمبر اول ظاہر کیا گیا ہے ۔

☆

ہم سبقوں کی کلاس میں سب سے اول

نہ صرف یہ کہ آپ نے دورے میں درجۂ اول کی پوزیشن حاصل کی بلکہ اس سال دورۂ حدیث میں ۹۹ فیصد نمبر لیکر اپنے تمام شرکائے درس اور کلاس کے طلبہ سے گوئے سبقت لے گئے اور سب سے اول نکلے۔

علوم و فنون عربیہ کی کتابوں میں امتیازی نمبروں میں کامیاب ہونے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا عہد تعلیم نہایت سنہری اور زرین عہد تھا اور آپ اپنے دور کے ذہین، فطین اور قابل طلبہ میں شمار ہوتے تھے۔

امتحانات کے نمبروں پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے سب سے زیادہ نمبر منطق کی سب سے مشکل اور آخری کتابوں یعنی حمد اللہ اور قاضی خان میں اور فلسفے کی بلند پایہ کتاب صدرا میں علی الترتیب پچاس میں ترپن ترپن اور باون نمبر حاصل کئے ہیں۔ گویا علوم عقلیہ میں آپ کی ذہنی پرواز بہت بلند تھی اور عقلی قوتوں کے جوہر معقولات میں زیادہ چمکتے نظر آتے ہیں۔ دوسرے درجے پر علم تفسیر اور حدیث میں ممتاز اور نمایاں نظر آتے ہیں۔

عہد طالب علمی میں سلسلۂ درس و تدریس

یہ خبر آج تک صحت اور حقیقت کے درجے میں شہرت رکھتی ہے کہ علامہ عثمانی اپنے زمانۂ طالب علمی میں بے تکلف قابل استادوں کی طرح اپنے ہم سبقوں اور نیچے کے طلبہ کو تعلیم دیتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کی ۱۳۳۲ھ مطابق ۱۹۱۴ء کی سالانہ رپورٹ میں جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم مولانا شبیر احمد صاحب کے عہد طالب علمی میں پڑھانے کے متعلق تحریر فرماتے ہیں :-

"مولوی صاحب موصوف اس زمانے میں بھی جبکہ خود تحصیل علم میں مصروف تھے طلبہ کو درس دینے میں اپنا بہت سا وقت صرف کرتے تھے۔ منتہی طلبہ تمام

علوم کی کتابیں آپ سے بے تامل پڑھتے تھے۔" (روئداد دارالعلوم ۱۳۳۳ھ ص۲۰)

جناب مہتمم صاحب کے اس لفظ "بے تامل" نے مولانا عثمانی کے عہد تحصیل علم کی پوری تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔ مذکورہ عبارت سے یہ بھی ظاہر ہے کہ منتہی طلبہ تمام علوم کی کتابیں علامہ کی اسٹوڈنٹ لائف میں ان سے پڑھنے کا عام رجحان رکھتے تھے۔ اور ان کے علم پر اس کم عمری اور طفلی میں اعتماد کرتے تھے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ ان کی علمی قابلیت کا سکہ سب کے دل پر بیٹھ چکا ہو۔

حضرت مولانا عماد الدین صاحب انصاری شیرکوٹی جو علامہ کے تحصیل علم کے زمانے سے ان کے دوست اور مخلص رفیق ہیں وہ اپنے ایک مکتوب میں راقم الحروف کو موصوف کے حالات میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"قطبی اور میر قطبی پڑھنے کے زمانے میں طلبہ کے اندر اپنے تمام ہم جماعتوں سے نہ صرف ممتاز تھے بلکہ طلبہ کا بڑا ہجوم بعد نماز عصر چھوٹی مسجد میں صرف قطبی پڑھنے کے لئے ہو جاتا تھا۔ اور یہ مغرب تک ایسا درس دیتے جیسے ایک شخص اپنے مریدین میں ہو۔ تقریر اس قدر کرتے کہ طلبہ پر خاص اثر ہوتا۔ اس زمانے کے خاص طلبہ میں مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی تھے جو میر قطبی کے سبق میں شامل ہوتے تھے اور ان پر خاص کیفیت جذب اور وارفتگی طاری ہوتی تھی۔ انہی ایام میں الندوہ میں مولانا سید سلیمان ندوی کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں امام مالک کا تذکرہ تھا۔ سید صاحب نے مضمون میں لفظ بُغاۃ جمع باغی کر کے عام معنی مراد لئے جس پر مولانا شبیر احمد صاحب نے گرفت کی اور بمعنی طالب لکھ کر اس الزام کو رفع کیا۔ شروع شروع میں معقولات (منطق فلسفہ) میں خاص شغف تھا۔ بہار کے مولانا عبدالوہاب معقولی دیوبند آئے مولانا اس وقت غلام یحییٰ پڑھا کرتے تھے۔ بہاری طلبہ نے ان کا

بہت احترام کیا اور وہ بھی معقولات میں اپنا ثانی کسی کو نہ سمجھتے تھے۔ طلبائے دارالعلوم پران کی معقولیت کا خاص اثر ہو رہا تھا۔ دارالعلوم دیوبند کو تفسیر وحدیث کی درسگاہ خیال کیا جاتا تھا۔ اور منطق ومعقول کو یہاں کوئی مقام حاصل نہ تھا اور طلبہ بھی اس کو کچھ قابل اعتنا نہ سمجھتے تھے مگر معقولی صاحب اپنا اثر جما رہے تھے چنانچہ ہم پران کا بڑا اثر پڑا۔ مولوی شبیر احمد صاحب کو کو بھی جو اس وقت طالب علم تھے ان کے سامنے لائے۔ ان سے یہ لن ترانی برداشت نہ ہوئی اور بحث شروع ہوگئی۔ طلبہ حیران اور معقولی صاحب بھی " ہر بیشہ گماں مبر کہ خالیست " کے قائل نظر آئے۔ "بعدیت زمانی اور بعدیت ذاتی " میں ایسی بحث ہوئی کہ بہاری طلبہ دیوبند میں معقول کے قائل ہوگئے اور معقولی صاحب کو یہ کہنا پڑا کہ آپ پھر سوچیں "۔

مولانا عماد الدین صاحب انصاری کا مکتوب علامہ کے تحصیل علم کے زمانے کی پوری بصیرت افروز تاریخ ہے جس سے وہ خود اپنے رفیق عثمانی کے ساتھ رہ کر گذرے ہیں۔ اس خط سے موصوف کی ذہانت، فطانت، لیاقت، استعداد اور جوہر علم کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ علمی ذوق واستعداد کی یہ بلند مقامی خدائے کریم کی دین ہے اللہ تعالیٰ جس کو چاہے عطا کرے ورنہ انصاری صاحب اسی خط میں مولانا عثمانی کی درس سے غیر حاضری اور بے پروائی کا چند لفظوں میں اس طرح اظہار فرماتے ہیں :-

" جماعت میں غیر حاضری عام معمول تھا۔ ہم زبردستی جماعت میں حاضری کے لئے بھیجتے۔ ہفتوں سبق سے غیر حاضر رہتے مگر اس پر بھی یہ عالم تھا کہ امتحان میں سب سے اعلیٰ نمبر حاصل کرتے "۔

یہ ہے علامہ کی طالبعلمانہ زندگی کا خاکہ جس سے ایک صاحب فکر ونظر ان کے

اس دور کی پوری تصویر اپنے دماغ کے پردے پر کھینچ سکتا ہے جس کے بعد مزید اور کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

دن بیت گئے

آپ کی طالب علمی کا زمانہ ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۸ء میں ختم ہو چکا جو کبھی دوبارہ لوٹ کر آنا ناممکن تھا۔ اب تو اس عہد ماضی کی یادیں رہ رہ کر آنے کا زمانہ آچکا تھا۔ خواہ کچھ بھی ہو نہ کبھی عہد طفلی باقی رہتا ہے اور نہ عہد جوانی۔ طالب علمی کا زمانہ جو شاہی زمانہ ہوتا ہے وہ انسانی زندگی کے دور کا زریں اور سنہرا زمانہ خیال کیا جاتا ہے۔ اس زمانے میں اگر غم ہوتا ہے تو صرف یہ کہ محنت و شوق سے علم حاصل کیا جائے۔ اور باقی دنیا کے تمام افکار و حوادث پر مٹھیاں بھر بھر خاک ڈال دی جائے۔ اس زمانے سے آگے گذر کر جب پیچھے کی طرف منہ موڑ کر دیکھتے ہیں تو درسگاہوں، کتب خانوں، بورڈنگ ہاؤسوں، ہمنواؤں، ساتھیوں اور استادوں کی نوع بنوع اور رنگ برنگی یادیں، جواب خواب وخیال نظر آتی ہیں، دل بے قرار پر کچو کے لگاتی ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ پروفیسری، ڈاکٹری، مجسٹریٹی، ججی اور گورنری پر لات مار کر مکتب کے ٹاٹ، سکول کی بنچوں اور کالج کے ڈیسکوں پر جا بیٹھیں اور عالم برزخ سے اپنے مشفق، مہربان، ہمدرد، لائق اور قابل اساتذہ کو واپس لا کر ان کے سامنے پھر زانوئے تلمذ تہ کریں اور عہد متانت اور دور فکر پہ لات مار کر طالب علم بن جائیں اور لڑکپن کی یادیں تازہ کر ڈالیں۔

کجا است جہل جوانی و عہد برنائی

اے میرے زمانہ تحصیل علم کے ساتھیو! آؤ پیچھے کو لوٹ کر اس زمانے کو واپس لائیں جبکہ ہم تم دار الطلبہ میں بیٹھ کر حوادث زمانہ سے بے خبر وقت عزیز کے سہانے لمحے گذار رہے تھے۔ جبکہ ہمیں کانٹے پھول دکھائی دیتے تھے اور خزاں بہار نظر

آتی تھی ۔ آہ ! اے ماضی تو کتنا بے وفا ہے کہ ہمیں حال اور مستقبل کے مضبوط پھندوں میں پھانس کر روانہ ہو گیا ۔ آج ان مہر و وفا سے لبریز لمحوں کو یاد یں ترستی ہیں لیکن ان کا جواب ایک لمبی اور سرد آہ کے سوا کچھ نہیں ۔ اب تو صورتِ حال یہ ہے ؎

ہر اشک ہے افسانہ ہر درد کہانی ہے
لے دے کے یہی باقی حسرت کی نشانی ہے

اے میرے ہمدمو ! تم کہاں ہو ۔ کس کار و بار زندگی میں مصروف ہو ۔ تم اس مہر و وفا ، صدق و صفا اور لطف و محبت کی بستیوں کو اجاڑ کر کن ویرانوں کو زینت زندگی بنا چکے ہو ۔ میرے سینے میں دل بے تاب بے ساختہ پکار اٹھا ہے ؎

ہم نفسو ! اجڑ گئیں مہر و وفا کی بستیاں
پوچھ رہے ہیں اہل دل مہر و وفا کو کیا ہوا

اے دار العلوم دیوبند کے متوسط دور کے فرزندو ! وہ دیکھو دار الحدیث میں سرما کے دنوں میں سبز چوغہ اور سر پر سبز عمامہ باندھے ایک خضر صورت فرشتہ سیرت علوم و فنون کے بحر ناپیدا کنار بیٹھے ہیں آب حیات کے چشمے بہا رہے ہیں اور گرد و پیش دل پیاسے سکندر بیٹھے ہیں لیکن کوئی محروم نہیں یہ اپنے زمانے کے امام ہیں جنہیں مولانا سید محمد انور شاہ کہتے ہیں ۔ اور وہ دیکھو شام کا دوسرا گھنٹہ ختم ہو چکا ہے اور اسی دار الحدیث سے امام کلام و تفسیر ابر نیساں کی طرح علم و فضل کی بارش برساتا ہوا جس کی طلاقت لسانی پر لعل و گہر نثار ہوئے تھے مسلم کا درس دیکر نکلے آرہے ہیں ۔ داہنے ہاتھ میں چھڑی ہے اور بائیں ہاتھ میں رومال کس تقہ رفتار سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو رہے ہیں ۔ راستے میں طلبہ کی صفوں کی صفیں اس کے احترام میں بندھتی چلی جاتی ہیں اور یمین و یسار کھڑے ہو کر سلام عقیدت پیش کر رہے ہیں یہ اپنے دور کے محقق

علامہ شبیر احمد عثمانی ہیں ۔ اور وہ دیکھو اسی دار الحدیث میں ایک اللہ کا ولی عجب انداز اور اطوار سے جاتا ہوا دکھائی دیا ہے ۔ یہ فرشتہ سیرت اور انسان صورت میاں سید اصغر حسین صاحب ہیں جو ابو داؤد شریف کا درس سیدھے سادے الفاظ اور میٹھی اور پیاری گفتار میں دے رہے ہیں ۔ اور گذرتے گذرتے میرے سامنے مفتی عتیق الرحمٰن کی جے کہتے ہوئے اور جملے پر مسکراتے ہوئے ، ہاتھ میں ایک ڈنڈا لئے عجب انداز سے آگے بڑھ گئے ہیں ۔ دار الافتاء کی طرف بھی دیکھو یہ وہی آسمان سے آیا ہوا فرشتہ شامی ، در مختار ، رد المحتار ، غایۃ الاوطار ، فتاویٰ قاضی خاں اور فتاویٰ عالمگیری کے ڈھیر سامنے رکھے فتوے لکھ کر ھو العزیز الرحیم کے لفظوں کی کندہ مُہر لگا رہا ہے ۔ یہ وہی مقدس انسان ہے جس کا ذکر چند ورق پہلے گذر لیا ہے جنہیں مفتی عزیز الرحمٰن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ اور ذرا زینے پر چڑھ کر کوٹھی کے سامنے سے گذرو ایک نحیف الجثہ مگر علم ، سیاست ، فراست ، دانش کے مجسّمہ قالین پر بیٹھے ہوئے گردن جھکائے مصروف نظر آتے ہیں ۔ اور دار العلوم کے نظم و نسق میں محو ہمہ تن وقف ہیں انہیں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی کہتے ہیں ۔ فارغ ہو کر کہیں جاتے ہیں تو ہاتھ میں تسبیح گھوم رہی ہے اور زبان پر ذکر اللہ جاری ہے ۔ اور وہ دیکھو کوٹھی سے گذرتے ہوئے ذرا آگے بڑھ کر ایک پتلا دبلا انسان اپنے حجرے میں بیٹھا مشکوٰۃ شریف کے مطالعہ میں مصروف ہے ۔ سامنے چائے کا سماوار گرم ہو رہا ہے ۔ ابو الکلام مرحوم کے بعد چائے پینے اور پلانے کا صحیح حق انہیں حاصل ہے ۔ منہ میں پان ہے اور چہرے پر ظرافت کی پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہیں ، اردو فارسی کے ادیب ہیں ، شاعر بھی ہیں ۔ مشکوٰۃ شریف کے پڑھانے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں ۔ یہ مولانا سراج احمد صاحب ہیں ۔ مدرسے کے بڑے گیٹ سے ایک استاد علم معانی و بیان اندر داخل ہو رہے ہیں درسگاہ کی

طرف رُخ ہے اور مختصر معانی، تلخیص اور مطوّل پڑھاتے پڑھاتے طلبہ پر جادو کر رہے ہیں۔ جو کچھ پڑھاتے ہیں دل میں بٹھا دیتے ہیں۔ دس دفعہ سوال کرو تو گھبراتے نہیں۔ ایک طالب علم حد سے زیادہ شکوک پیش کرتا ہے اس کا نام ملا شکّی رکھ دیا ہے۔ ان کی تقریر سے درسگاہ گونجتی ہے اور دل کی گرہیں کھلتی چلی جاتی ہیں یہ مولانا عبدالسمیع صاحب ہیں۔ ابھی ابھی دارالعلوم کے باہر دروازے پر ٹانگہ رکا ہے۔ کتابوں سے بھرے ہوئے صندوق ساتھ ہیں، قادیانیوں، اہلحدیثوں اور بدعتیوں سے مناظرے کر کے آ رہے ہیں۔ مناظرے کے امام ہیں، چھوٹا قد، سفید داڑھی میں ان کو دادا کہا کرتا تھا۔ سفر و حضر میں جماعت سے نماز کے بے حد پابند، دلائل الخیرات کے زبردست عامل، طبیب خوش مزاج، مریض کو باتوں اور ظرافت آمیز چٹکلوں سے اچھا کر دینے والے۔ یہ ہیں مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری۔ مناظرے کی جو کتاب چھپواتے خواہ کتنی موٹی اور قیمتی کیوں نہ ہوتی میں زبردستی اٹھا کر چلا آتا۔ چلّاتے رہ جاتے لیکن میرے کان پر جوں بھی نہ رینگتی۔ آخری دفعہ غالباً ۱۹۳۶ء یا ۱۹۳۷ء میں بس جالندھر میں ملاقات ہوئی اور پھر محروم دیدار رہا۔ ابھی ذرا اور ٹھہرو دیکھو وہ نودرے کے کمرے میں دیوار سے کمر لگائے نہایت متانت سے حمد اللہ اور قاضی خاں کے نکتے حل کرنے والے ایک زبردست معقولی اور اپنے زمانے کے منطق کے امام ہیں۔ شاہانہ دماغ ہے۔ جی میں نہیں آتا تو کئی کئی وقت پڑھانے کا نام نہیں لیتے لیکن جو پڑھاتے ہیں وہ سونے پہ سہاگے کا کام دیتا ہے۔ بے حد شفیق، نہایت مدبر، مہمان نواز اور مردم شناس ہیں۔ ۱۹۵۲ء میں ایک ہفتہ میں ان کی خدمت میں ٹھہرا۔ یہ ہیں میرے استاذ محترم مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی۔ اسی درسگاہ کے ایک کمرے میں ایک فلسفے کا محقق مصروف درس ہے۔ ٹھہر ٹھہر کر تقریر کرتے ہیں، غضب کے ذہین ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ نصیر الدین محقق طوسی بول رہا ہے

کہیں کوئی اعتراض کر بیٹھو تو ان کی زبان سے بُرا بھلا سننے میں وہ مزہ آتا ہے کہ جاگیروں کے پانے میں وہ مسرت نصیب نہیں ہوتی یہ مولانا رسول خان صاحب ہیں جو آج کل جامعہ اشرفیہ لاہور میں فیض پہنچا رہے ہیں۔ اور ابھی ذرا اور ٹھہرو وہ دیکھو مسجد میں اذان ہو چکی ہے ایک بارعب ہستی اپنی درسگاہ سے متنبّی اور حماسہ کے حواشی لکھتا لکھتا نماز کے لئے جا رہا ہے۔ راستوں میں بچتے بچاتے بڑی تیزی اور پھرتی سے السلام علیکم السلام علیکم کہتا ہوا رواں دواں ہے۔ چہرے پر جلال ٹپک رہا ہے۔ جدھر سے نکلتے ہیں طلبہ سہم جاتے ہیں۔ اپنے زمانے کے ادب وفقہ کے ماہر ہیں۔ آخری بار ۱۹۵۴ء میں جمعیۃ الطلبہ کے کمرے میں قیام پذیر تھے خدمت میں حاضر ہوا بہت خوش ہوئے۔ بعض شاگرد پاؤں دبا رہے تھے میں بھی فرطِ مسرت سے دبانے لگا۔ اگرچہ میں خود پروفیسر تھا لیکن استاذ محترم کے پاؤں دباتے وقت اپنے آپ کو وہی طفلِ مکتب تصوّر کر رہا تھا۔ یہ ہیں شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔

آہ! ان ہستیوں کی یاد جب آتی ہے تو دل لوٹ جاتا ہے اور پہروں بے قرار رہتا ہے۔ ان میں سے بعض سلامت ہیں خدا انہیں سلامت رکھے اور اکثر دنیا سے گذر چکے اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمت کی بارشیں برسائے۔

برسرِ مطلب میں جذبات کے سمندر میں بہتا ہوا کہاں سے کہاں نکل گیا۔ ذکر علامہ عثمانیؒ کے عہدِ تعلیم کے دن بیت جانے کا تھا کہ طالب علمی کے زمانے کی وہ سہانی گھڑیاں لوٹ کر آنا ناممکن تھیں جو گذر گئیں، اب علامہ متعلم سے معلم بن چکے تھے۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں یہاں آپ کے اساتذہ سے تعارف کرانا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ سوانح نگاری کے فرائض میں سے ایک اہم فریضہ ہے۔

اساتذہ

آپ کے اساتذہ میں ابتداء سے آخر تک جو حضرات شامل ہیں ان کے نام حسب ذیل ہیں :

حافظ[1] محمد عظیم صاحب دیوبندی جن سے بسم اللہ ہوئی۔ حافظ[2] نامدار صاحب جن سے آپ نے قرآن کریم پڑھا۔ منشی[3] منظور احمد صاحب مدرس دوم شعبۂ فارسی وحساب جن سے حساب سیکھا اور فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ حساب میں آپ کی مہارت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مطبع قاسمی میں ایک شخص نے آپ سے کسی مرنے والے کی جائداد اور سامان کے فرائض نکلوائے تو آپ نے اسی وقت بیٹھے بیٹھے تمام حصص نکال کر تمام وارثوں کے حق میں متعین کر دئے جس سے آپ کی حسابی معرفت کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ البتہ مولانا محمد یٰسین صاحب دیوبندی نے آپ کو فارسی کی اعلیٰ کتابیں پڑھائیں۔ لیکن عربی علوم وفنون کی تعلیم کا جہاں تک تعلق ہے اس سلسلے کے اساتذہ میں وہی حضرات ہو سکتے ہیں جو ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۱ء میں دارالعلوم میں بحیثیت پروفیسر فرائض انجام دیتے تھے۔ ان حضرات کے اسمائے گرامی دارالعلوم کی ۱۳۲۰ھ کی رپورٹ کے مطابق حسب ذیل ہیں :

شیخ[1] الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی، مولانا[2] محمد یٰسین صاحب شیرکوٹی، مفتی[3] عزیز الرحمٰن صاحب دیوبندی، حکیم[4] محمد حسن صاحب برادر اصغر شیخ الہند، مولانا[5] غلام رسول صاحب (صوبۂ سرحد)، مولانا[6] مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری، مولانا[7] گل محمد خان صاحب اور مولانا[8] محمد احمد صاحب جو کارِ اہتمام مدرسہ کے علاوہ تعلیم دینے کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ علم تجوید وقراءت قاری عبدالوحید صاحب الہ آبادی مدرس دارالعلوم شعبۂ قراءت سے حاصل کیا۔

مذکورہ بالا تمام حضرات مولانا گل محمد خان صاحب کے علاوہ حضرت عثمانی کے اساتذہ تھے۔ مولانا عماد الدین صاحب انصاری شیر کوٹی نے اپنے ایک مکتوب ۲۱ نومبر ۱۹۵۹ء میں میرے اس سوال کے جواب میں کہ علامہ کے اساتذہ کون کون تھے حسب ذیل تحریر روانہ فرمائی، میں وہ تفصیل وار قارئین کے سامنے پیش کرتا ہوں اور یہ بھی کہ کن کن اساتذہ سے کون کون سی کتابیں پڑھیں۔

۱۔ مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے :۔ ترمذی[۱] شریف، بخاری[۲] شریف، بیضاوی[۳]، ہدایہ[۴] اخیرین، توضیح[۵] تلویح۔

۲۔ مولانا غلام رسول صاحبؒ سے :۔ شرح جامی[۱]، مختصر[۲] المعانی، مطول[۳]، منطق[۴]، فلسفہ[۵] الہیات، عروض کی کتابیں، بعض ادب کی کتابیں۔

۳۔ مولانا حکیم محمد حسن صاحبؒ سے :۔ جلالین[۱] شریف، مسلم[۲] شریف۔

۴۔ مولانا محمد یٰسین صاحب شیر کوٹیؒ سے :۔ کافیہ[۱]، تصریح[۲]، شرح[۳] چغمنی، سبعہ[۴] شداد۔ (آپ نے ان کی ذہانت کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ تمہیں کافیہ پڑھاؤں گا۔ خارج وقت مدرسہ میں پڑھاتے تھے)۔

۵۔ مولانا محمد سہول صاحبؒ سے :۔ کتب صرف ونحو وابتدائی کتب منطق۔

۶۔ مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحبؒ سے :۔ کنز[۱] الدقائق، شرح[۲] وقایہ۔

۷۔ مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ سے :۔ درمختار[۱]، دارمی[۲]، سنن[۳] نسائی۔

۸۔ حافظ محمد احمد صاحب مہتمم سے :۔ مشکوٰۃ[۱] شریف۔

مذکورہ بالا تفصیل میں علامہ کے واقف حال مولانا انصاری نے مولانا سہول صاحب کو بھی اساتذہ کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ لیکن مدرسہ کی رپورٹ میں مولانا عثمانی کے عہد تعلیم میں مولانا سہول صاحب کا نام کہیں درج نہیں۔ مگر یہ ضرور ہے کہ مولانا سہول صاحب کئی سال دار العلوم میں پڑھا گئے ہیں اور جو

قابل اساتذہ میں سے مانے گئے ہیں۔

حضرت مفتی عزیز الرحمنؒ سے درمختار اور دارمی کی تعلیم کا بھی مولانا عمادالدینؒ صاحب نے ذکر کیا ہے، غالباً خارج میں پڑھی ہوں گی یا ان دونوں کا امتحان نہیں دیا گیا ہوگا جس کی وجہ سے سالانہ رپورٹوں میں ان کتابوں کا اندراج نہیں ہے۔

اساتذہ کی مذکورہ تفصیل کے بعد ہم قارئین سے علامہ کے بڑے بڑے اساتذہ کا تعارف کرانا مناسب سمجھتے ہیں۔ یہ وہ علماء اور شیوخ ہیں جن میں سے ہر ایک اپنے علم و فضل میں یگانۂ روزگار تھا۔

۱۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ۱۸۵۳ء سے ۱۹۲۱ء تک

آپؒ کا اسم گرامی محمود حسن اور لقب شیخ الہند تھا جو تحریک خلافت کے زمانے میں قوم کی زبان سے نکلا اور مشہور ہوا۔ آپ کے والد محترم مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبند کی صاحب وجاہت ہستیوں میں سے ایک تھے۔ خاندان عثمانی سے تعلق رکھتے تھے۔ انگریزی حکومت میں انسپکٹر مدارس کے عہدے پر مامور رہے اور پھر پنشن لینے کے بعد دارالعلوم دیوبند کی زبردست خدمات انجام دیا کئے۔ متنبی، حماسہ، قصیدہ بُردہ، قصیدہ بانت سُعاد، سبعہ معلقہ کے بہترین شارح گذرے ہیں۔ ہم نے تذکرہ علمائے دیوبند کی پہلی جلد جو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ، حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ گنگوہی، حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ بانی دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند، مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ والد محترم مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ پر مشتمل ہے، مؤخر الذکر پر مبسوط مقالہ لکھا ہے۔ جو ان کی تمام علمی و عملی زندگی کو بقدر ضرورت حاوی ہے۔ شیخ الہندؒ انہی کے نامور فرزند تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے سب سے

پہلے طالب علم تھے۔ ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۳ء) میں پیدا ہوئے۔ دارالعلوم ہی میں تمام عربی تعلیم حاصل کی۔ مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے خاص طور پر علم کا استفادہ کیا۔ حضرت مولانا محمد یعقوبؒ صاحب سے بھی حدیث پڑھی ۱۲۹۱ھ ۱۸۷۵ء میں دارالعلوم کے مدرس بنائے گئے۔ ۱۳۰۸ھ ۱۸۹۱ء میں صدر مدرسی یا شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے۔ ۱۳۳۳ھ ۱۹۱۵ء میں سفر حجاز اختیار فرمایا۔ ان دنوں میں جنگِ طرابلس کے بعد جرمنی اور ترکی متحد ہو کر برطانیہ سے نبرد آزما تھے۔ شیخ الہندؒ نے برطانیہ حکومت کا ہندوستان سے تختہ الٹنے کے لئے ایک زبردست پروگرام بنایا تھا جن کی تفصیلات "سفر نامۂ شیخ الہند" مصنفہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ میں ملیں گی۔ جب آپ مکۂ معظمہ پہنچے اور مدینہ میں قیام کے بعد پھر مکۂ معظمہ کو واپس ہوئے تو قیام مکہ کے دوران میں شریف حسین والئ مکہ معظمہ نے آپ کو انگریزوں کے اشارے پر گرفتار کر کے ان کے حوالے کر دیا۔ تاآنکہ آپ کو مالٹا میں اسیر کر دیا گیا۔ چار سال تک وہاں نظر بند رہ کر اور پھر رہا ہو کر ۲۰ رمضان ۱۳۳۸ھ (۱۹۲۰ء) کو آپ بمبئی پہنچے۔ یہاں پہنچکر تحریک خلافت میں حصہ لیا۔ لیکن عمر نے زیادہ وفا نہ کی اور ۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ (۱۹۲۱ء) کو ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر دہلی میں وفات پائی۔ جنازہ دیوبند لایا گیا اور وہاں آپ کو سپرد خاک کیا گیا۔

حکیم محمد حسن صاحبؒ

حضرت شیخ الہندؒ کے چھوٹے بھائی تھے۔ میں نے نہ صرف ان کو دیکھا ہے بلکہ طب کی کتابوں میں موجز اور سدیدی اور فقہ میں ہدایہ اخیرین کے کچھ اسباق پڑھے ہیں طبیعت میں غصہ بہت تھا۔ گھوڑے کی سواری اور شکار کے بہت شوقین تھے۔ ایک دفعہ گھوڑی سے گر گئے اور ٹانگ ٹوٹ گئی۔ بڑی مشکل سے ہڈی جڑی اور چلنے پھرنے

کے قابل ہوئے ۔ اپنے محلے کی مسجد میں بلالیتے اور وہیں سبق پڑھاتے ۔ روزانہ سبق کا ہونا ان کے یہاں مشکل تھا کوئی ہفتہ پورا سبق پڑھانے میں گذر جاتا تو یہ اس ہفتے کی خوش قسمتی تھی ۔ سبق پڑھاتے وقت حواشی پر نظر رہتی تھی ۔ حواشی دیکھتے جاتے اور پڑھاتے جاتے تھے ۔

چونکہ عمر میں تقریباً اساتذہ دارالعلوم سے بڑے تھے پھر شیخ الہندؒ کے چھوٹے بھائی اور مزید برآں یہ کہ مولانا ذوالفقار علی یکے از بانیانِ دارالعلوم کے صاحبزادے تھے اس لئے مہتمم صاحب سے لیکر ادنیٰ مدرس تک سب ہی ان کے سامنے لچتے تھے ۔ مدرسے کے مقررہ طبیب تھے اور مدرس بھی ۔ فن طب میں بھی مہارت رکھتے تھے ، جس کو باقاعدہ دہلی میں پڑھا تھا ۔ اس لئے تمام طلبہ عموماً انہی سے حال کہکر نسخہ لکھواتے ۔ نسخہ پر جس طالب علم کی سفارش فرماتے اس کے پیسے مدرسہ ادا کرتا تھا ۔ مہتمم صاحب بھی بے چون وچرا منظوری دیدیتے ۔ اگر کبھی کوئی طالب علم مایوس ہوتا تو آپ اس کا پارٹ لیتے تھے ۔ طلبہ سے بہت ہمدردی فرماتے ۔ ٹانگ ٹوٹنے سے پہلے مدرسے بھی آتے اور وہاں بھی پڑھادیتے تھے ۔ غالباً ۱۹۲۷ء کے لگ بھگ انتقال فرمایا ۔ صحیح سنہ یاد نہیں رہا ۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھے

مولانا محمد یٰسین صاحب شیرکوٹیؒ

راقم الحروف کے ہموطن شیرکوٹ ضلع بجنور کے رہنے والے تھے ۔ دارالعلوم کے جید علماء میں سے تھے خصوصاً علم ہیئت میں کمال رکھتے تھے ۔ نہ صرف ظاہری علوم کے عالم تھے بلکہ باطنی علوم سے بھی بہرہ ور تھے ۔ تصوّف سے ذوق وشوق رکھتے اور بزرگ سیرت انسان تھے ۔ زہد وعبادت میں زندگی گذارتے ۔ آپ کے والد محترم حضرت مولانا محمد ہادی صاحب شیرکوٹ کے اولیاء میں سے تھے ۔

مولانا محمد یٰسین صاحب دیوبند کے ہی فارغ التحصیل تھے۔ بعض مدارس مثلاً رڑکی وغیرہ میں مدرس رہے، اور پھر آپ کو دارالعلوم میں بلالیا گیا۔ یوں تو تمام علوم میں قابل تھے لیکن ہیئت اور ریاضی میں بہت مہارت رکھتے تھے۔ سنہ ۱۳۲۴ھ مطابق سنہ ۱۹۰۷ء میں حج کے لئے تشریف لے گئے واپسی میں جدے میں طاعونی بخار ہوا اور اسی میں ماہِ صفر سنہ ۱۳۲۵ھ میں انتقال فرمایا۔ آپ کی تاریخ وفات یغفر لہٗ سے نکلتی ہے۔

مولانا غلام رسول صاحبؒ

آپ صوبہ سرحد کے رہنے والے تھے۔ علوم عقلیہ منطق و فلسفہ میں کمال رکھتے تھے۔ ۹ر شوال سنہ ۱۳۱۵ھ کو مجلس شوریٰ دارالعلوم نے بحیثیت مدرس فلسفہ بیس روپیہ ماہوار پر تقرر کیا۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۱ر شوال سنہ ۱۳۱۵ھ کو دارالعلوم دیوبند کے دفتر سے رات کے گیارہ بجے ایک خط مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی کو لکھا تھا جو ان دنوں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کی خانقاہ میں مقیم تھے۔ یہ مکتوب علامہ عثمانی مرحوم کے یہاں کراچی میں میری نظر سے گذرا جس کی میں نے لعینہٖ نقل حاصل کرلی۔ یہ لفافہ ملکہ وکٹوریہ کے زمانے کا چھوٹا سائز کا ہے جو ۵ر مارچ سنہ ۱۸۹۸ء کو دیوبند کے ڈاکخانے سے روانہ ہوا۔ اس میں شیخ الہندؒ لکھتے ہیں:

> "پرسوں اہلِ شوریٰ نے فلسفہ کی مَد میں مولوی غلام رسول کو بمشاہرہ بیس روپیہ ماہوار مقرر کیا ہے اللہ انجام بخیر کرے اور مدرسین بد دل ہو رہے ہیں۔"

علامہ عثمانی اکثر مجلسوں میں ان کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔ جامع مسجد کے حجرے میں رہا کرتے تھے۔ اکثر علامہ عثمانی کو مدرسے سے جاتے جاتے اپنے ساتھ لے جایا

کرتے اور وہاں جاکر خود بھی چائے پیتے اور آپ کو بھی چائے پلاتے، اور خارج اوقات میں بھی پڑھاتے۔

علمائے دیوبند میں مولانا عثمانی اور ان کے معاصرین تقریباً سب ہی اُن کے شاگرد تھے۔ بہت شفیق، نرم دل، سنّت کے متبع، قناعت پسند تھے۔ بائیس سال تک دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت مدرس قیام فرمایا اور آپ کی ذات سے علوم کے وہ چشمے پھوٹے جن سے تشنگانِ علوم نے اپنی پیاس بجھائی۔ ۱۸ر محرم الحرام ۱۳۳۷ھ کو آپ نے دنیائے فانی سے کوچ کیا۔

آپ کی وفات نے علمائے دیوبند کو سخت متاثر کیا۔ علماء اور طلبہ نے آپ کے غم میں بہت سے مرثیئے لکھے۔ خصوصاً مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ کا عربی مرثیہ جو مولانا مرحوم کے اخلاق و خصائل اور فضائل پر مشتمل ہے۔ نیز مولانا اعزاز علی صاحبؒ کے دو مرثیے ایک عربی میں اور دوسرا اردو میں، اور ایک مفتی محمد شفیع صاحب کا عربی میں قابلِ ذکر ہیں۔ آپ کی وفات کا تذکرہ اور مرثیئے القاسم ماہ صفر ۱۳۳۷ھ اور القاسم ماہ ربیع الاول میں شائع ہوئے ہیں۔

استاذ محترم مولانا اعزاز علی صاحب القاسم ماہ صفر ۱۳۳۷ھ میں تحریر فرماتے ہیں:-

”اب تک وبائی مرض کا نام و نشان بھی دیوبند میں نہ تھا کہ خدا جانے مولانا (غلام رسول صاحب) کو یہ خیال کس طرح پیدا ہوگیا کہ ہمارا وقت قریب آگیا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی آپ نے اپنے تمام شاگردوں سے ان کے حجروں، گھروں پر جاجاکر وعدے لئے کہ ہم مرجائیں گے تو کتنے قرآن پڑھ کر ہم کو ثواب پہنچاؤ گے۔ چنانچہ سب نے اپنی اپنی حیثیت کے موافق وعدے کئے۔ ان مواعید و مواثیق پر زیادہ زمانہ گذرنے نہ پایا تھا

کہ آپ مرض وبائی میں مبتلا ہوئے۔ جب تک آپ اس قابل رہے کہ طلبہ آپ کی بغلوں میں ہاتھ دیکر آپ کو جائے قیام سے لے جاتے اور صف نماز میں شریک کردیتے تھے تب تک آپ نے کوئی نماز بغیر جماعت کے ادا نہ کی۔ وفات سے دو روز قبل بلغم کی زیادتی سے آپ کی بات سمجھ میں آنا دشوار ہوگئی ...... حضرات مدرسین و طلبۂ دارالعلوم نے جس سرگرمی سے تیمارداری کی وہ ان کے دلوں کی محبت کا حال بتاتی تھی۔ آخرکار انسانی ضعیف کوششوں پر تقدیر غالب آئی اور ۱۸ محرم ۱۳۳۷ھ کو آپ نے قبل از طلوع صبح صادق داعی اجل کو لبیک کہا۔"

(القاسم ماہ صفر ۱۳۳۷ھ ص ۱)

مولانا سیّد مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری

چھوٹا قد، منحنی جسم، سفید ریش، سر پر محمودیہ ٹوپی، سادہ لباس، بہت زیادہ ظریف الطبع، جاڑوں کے دنوں میں چمڑے کے موزے اور صافہ، صحت پر بہت محتاط، چاندپوری ضلع بجنور کے رہنے والے تھے۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں سے دیوبند کے فاضل تھے۔ دیوبند میں پڑھاتے رہے۔ بعد ازاں مراد آباد کے شاہی مسجد کے مدرسہ اور دربھنگہ میں پڑھاتے رہے۔ ۱۹۲۰ء (۱۳۳۹ھ) میں پھر دارالعلوم میں ناظم تعلیمات اور مناظر کی حیثیت سے تشریف لائے۔ میں نے ان سے سُنن نسائی کے چند اسباق پڑھے ہیں۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب ان کی بہت قدر کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد دارالعلوم کی فضاء ان کے لئے سازگار نہ رہی اس لئے علیحدہ ہوگئے۔ پاکستان بننے کے بعد غالباً ۱۹۵۰ء میں چاندپور ہی میں انتقال فرمایا۔

☆

مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ

آپ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ بانی دار العلوم کے صاحبزادہ تھے۔

سنہ ۱۲۷۹ھ (۱۸۶۳ء) میں نانوتہ ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گلاؤٹھی ضلع بلند شہر میں مولانا عبداللہ انبیٹھوی سے حاصل کی۔ بعدازاں مدرسہ شاہی مراد آباد میں مولانا قاسم العلومؒ کے شاگرد رشید مولانا احمد حسن صاحبؒ سے پڑھا کئے۔ پھر دیوبند آئے اور حضرت شیخ الہند سے منطق اور ادب کی کتابیں پڑھیں۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب محدث دار العلوم دیوبند سے ترمذی کے کچھ اسباق پڑھے اور بعدازاں مرکز علماء و طلباء میں پہنچکر مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ سے حدیث کی کتابیں پڑھیں۔ سنہ ۱۳۰۳ھ (۱۸۸۶ء) میں دیوبند میں مدرس ہوئے۔ سنہ ۱۳۱۳ھ (۱۸۹۶ء) میں مولانا گنگوہی نے جو سرپرست مدرسہ تھے آپ کو مدرسہ کا اہتمام سپرد کیا۔ آپ کے دور اہتمام میں مدرسہ کو چار چاند لگ گئے۔ اور ہر شعبہ میں کافی ترقی ہوئی۔ آپ کا دبدبہ مدرسہ اور شہر میں مشہور تھا۔ سب طلبہ اور مدرسین آپ سے مرعوب تھے۔ سنہ ۱۹۲۳ء (۱۳۴۱ھ) میں مفتی اعظم کے عہدے پر حیدرآباد دکن میں مامور رہے۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں وہاں سے پھر دار العلوم میں تشریف لے آئے۔ سنہ ۱۹۲۹ء (۱۳۴۶ھ) میں شہرت گرم ہوئی کہ نظام حیدرآباد دہلی تشریف لا رہے ہیں اس لئے آپ ان کو دیوبند آنے کے لئے دعوت دینے کی خاطر حیدرآباد تشریف لے گئے۔ وہاں بیمار ہو گئے۔ بیماری ہی میں دیوبند واپس ہونے کی رائے ہوئی لیکن ابھی نظام آباد کے اسٹیشن پر گاڑی پہنچی تھی کہ حدود دکن میں ۳ رجمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۴۶ھ (۱۹۲۸ء) کو انتقال فرمایا۔ نظام صاحب کو خبر دی گئی۔ انہوں نے جنازہ حیدرآباد لانے کا حکم دیا اگلے روز عصر سے کچھ پہلے "خطہ صالحین" کے قبرستان میں سپرد خاک کر دئے

گئے ۔ آپ نے بینتالیس سال تک دارالعلوم کی خدمات انجام دیں۔ پہلے دس سال بسلسلۂ تعلیم و تدریس اور بقیہ پینتیس سال بحیثیت مہتمم ۔

حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کا ذکر خیر آغاز کتاب میں آچکا ہے اس لئے یہاں دوبارہ لکھنے کی ضرورت نہیں وہاں ملاحظہ سے گذر چکا ہے ۔

تعارف دارالعلوم

اساتذہ سے فارغ ہو کر اب ہم قارئین کرام کو علامہ شبیر احمد عثمانی کے مرکز تعلیم اور مادر علمی کے حالات سے بھی روشناس کرانا نہایت ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر آپ کے سوانح زندگی و علمی نامکمل رہ جائیں گے اس لئے نہایت ہی مختصر سے تعارف کے لئے دارالعلوم کا تذکرہ چھیڑتے ہیں جس کی تفصیلات ہمارے "تذکرہ علمائے دیوبند" میں پڑھیئے ۔ یہ وہی دارالعلوم ہے جس میں راقم الحروف نے شوال ۱۳۳۹ھ سے شعبان ۱۳۴۶ھ (۱۹۲۸ء) تک سات سال دارالعلوم میں زندگی کے بہترین لمحے طلب علم میں گذارے ۔ ہم اپنی اور حضرت عثمانی کی اس مایۂ صد افتخار درسگاہ اور اسلامی یونیورسٹی کے تعارف کے لئے اپنے قلم کی باگ "تاریخ دیوبند" کی طرف موڑتے ہیں ۔

☆

علامہ کی مادر علمی

دارُالعلوم دیوبند

۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء یوم پنجشنبہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا وہ مبارک و مسعود دن تھا جس میں انتہائی بے سروسامانی کے ساتھ صرف ایک طالب علم "شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ" اور ایک استاذ "حضرت مُلّا محمود صاحبؒ" سے چھتہ کی تاریخی مسجد کے کھلے صحن میں قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کی قیادت و رہنمائی اور حضرت حاجی عابد حسین، حضرت مولانا ذوالفقار علیؒ، اور حضرت مولانا فضل الرحمٰن رحمہم اللہ جیسی برگزیدہ شخصیتوں کے تعاون اور مشورہ سے اس درس گاہ کا آغاز کر دیا گیا زیادہ عرصہ نہ گذرنے پایا تھا کہ یہ معمولی درسگاہ دنیائے اسلام کا مقبول ترین دارالعلوم سمجھا جانے لگا! اور ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے گذر کر مختلف ممالک اسلامیہ کے طالبان علم بھی جوق در جوق اسلامی علوم و فنون کی طلب و تحصیل کے لئے اس میں جمع ہو گئے اور مختلف رنگ و بُو کے پھولوں سے دارالعلوم کا صحن معمور نظر آنے لگا۔

پہلے سال کے اختتام پر طلباء کی تعداد ۷۸ تک پہنچ گئی! جن میں دیوبند اور اس کے قرب وجوار کے علاوہ متعدد دور دراز مقامات مثلاً بنارس، پنجاب، اور افغانستان کے ۵۸ طلباء شریک تھے طلباء کے اضافہ کے ساتھ مدرسین کا اضافہ بھی ناگزیر تھا! چنانچہ آخر سال میں ۴ مدرس اور بڑھائے گئے حضرت

مولانا محمد یعقوب نانوتوی قدس سرہٗ کو صدارت تدریس تفویض کی گئی!

دارالعلوم کی روز افزوں ترقی

دارالعلوم کا تعلیمی اٹھان شروع ہی سے بہت بلند اور نتیجہ خیز رہا ہے۔ ابھی اس نے اپنی عمر کی دوسری ہی منزل طے کی تھی کہ اس میں ایسے طلبار تیار ہو گئے! جو تدریسی خدمات سرانجام دے سکتے تھے! چنانچہ دارالعلوم کے ایک فاضل طالب علم سہارنپور کے مدرسہ مظاہر علوم میں مدرس مقرر کئے گئے! طلبار کی تعداد پہلے ہی سال میں حیرت انگیز طور پر ۷۸ ہو گئی تھی! جس میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا۔ اور چند ہی سال میں چھتہ کی مسجد جس میں دارالعلوم کا آغاز ہوا تھا! ناکافی ثابت ہونے لگی اس لئے اوّلاً جامع مسجد میں جو اسی زمانے میں تعمیر ہو رہی تھی قدیم مدارس کے طرز کے مطابق دالان اور حجرے بنائے گئے جس میں ۱۲۹۰ھ ۱۸۷۴ء میں دارالعلوم منتقل کر دیا گیا۔ مگر بہت جلد ہی یہ جگہ بھی ناکافی ثابت ہوئی، تو قاسم العلوم حضرت مولانا نانوتوی نے دارالعلوم کے لئے آبادی سے باہر ایک کشادہ اور وسیع عمارت کی تجویز پیش کی یہ تجویز عام طور پر پسند کی گئی اور اس کے لئے چندہ ہونا شروع ہو گیا۔

کئی دن کے گشت و انتخاب کے بعد زمین کا ایک قطعہ جو دیوبند کے شمال و مغرب میں چھتہ کی مسجد کے قریب تھا خرید لیا گیا۔ یہ جگہ آبادی سے ملحق ہونے کے باوجود ایسی تھی جس میں دارالعلوم کے بڑھنے کے لئے کافی گنجائش تھی۔

سنگ بنیاد

۲ر ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۶ء) کو جمعہ کے دن جلسہ تقسیم انعام کے بعد دارالعلوم کی موجودہ عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ پہلی اینٹ حضرت مولانا احمد علی صاحب محدّث سہارنپوریؒ نے نصب فرمائی پھر ایک ایک اینٹ حضرت نانوتوی، حضرت گنگوہی، حضرت حاجی عابد حسین اور مولانا محمد مظہر

صاحب کاندھلوی نے رکھی اور اس وقت دیوبند کے جوانب واطراف کا بہت بڑا مجمع موجود تھا۔ سب لوگوں نے نہایت خضوع وخشوع اور الحاح وزاری کے ساتھ دارالعلوم کی بقاء کے لئے دعاء کی حضرت نانوتوی نے فرمایا کہ :

"عالم مثال میں اس مدرسہ کی شکل ایک معلق ہانڈی کے مانند ہے جب تک اس کا مدار توکل علی اللہ پر رہے گا یہ مدرسہ ترقی کرتا رہے گا"

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے تاریخِ تعمیر کا مادہ "اشرف عمارات" سے نکالا۔ "اشرف عمارات" کے اعداد بحساب ابجد ۱۲۹۳ آتے ہیں۔ سنگِ بنیاد ۲/ ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۶ء) کو رکھا گیا تھا۔ مگر چونکہ تعمیر کا کام سال آئندہ میں شروع ہوا اس لئے ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۷ء) کو آغاز تعمیر قرار دیا گیا ہے۔ پانچ سال کی مدت میں یہ عمارت "نودرہ" کے نام سے بن کر تیار ہوئی : اس کے دو درجے ہیں اور ہر ایک درجہ میں نو نو دروازے ہیں، دارالعلوم کی یہ سب سے پہلی عمارت ہے اس کی تعمیر نہایت سادہ مگر پرکار اور شاندار ہے۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ جن کے زمانۂ اہتمام میں نودرہ تعمیر ہوا، تحریر فرماتے ہیں کہ اس میں سادگی اور استواری کو مقدم رکھا گیا ہے۔ اس کا نقشہ من جانب اللہ قلوب میں الہام ہوا تھا !

خود حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ نے نودرہ کی تعمیر شروع ہونے سے قبل خواب دیکھا کہ :

"اس مقام پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف رکھتے ہیں۔ اور فرما رہے ہیں کہ "یہ احاطہ تو بہت مختصر ہے" یہ فرما کر خود عصائے مبارک سے ایک طویل وعریض نقشہ کھینچ کر بتلایا کہ ان نشانات پر تعمیر کی جائے، چنانچہ ان ہی نشانات پر بنیاد کھدوا کر تعمیر شروع کرائی گئی"

اس احاطہ میں وہ کنواں ہے جو نودرہ کے ساتھ بنایا گیا تھا۔ یہ کنواں دارالعلوم اور دیوبند میں بڑا بابرکت سمجھا جاتا ہے۔ اس کا پانی نہایت ٹھنڈا اور شیریں ہے۔ مولانا رفیع الدین صاحب نے ہی ایک خواب میں یہ بھی دیکھا کہ:

"کنواں دودھ سے بھرا ہوا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیالہ سے دودھ تقسیم فرمارہے ہیں۔ بعض لوگوں کے چھوٹے برتن ہیں اور بعض کے پاس بڑے، ہر شخص اپنا اپنا برتن دودھ سے بھروا کر لے جارہا ہے"

مولانا نے برتنوں کے چھوٹے اور بڑے ہونے کی یہ تعبیر فرمائی کہ اس سے ہر شخص کا "ظرفِ علم" مراد ہے۔ جس کا جتنا ظرف ہے اسی قدر علم اس کے نصیب و حصہ میں آئے گا!

مسجد دارالعلوم

۱۳۲۸ھ (۱۹۱۰ء) میں دارالعلوم کے مقدس اکابر نے مسجد کی بنیاد کی دیواریں خود اپنے مبارک ہاتھوں سے تعمیر کیں روداد میں سنگ بنیاد کی تقریب کی نسبت تحریر ہے۔

طلباء کے عام مجمع میں بزرگانِ دین نے مسجد کی بنیاد رکھی اور پھر ہر ایک طالب علم نے اپنے اپنے ہاتھ سے اینٹیں رکھیں اور نہ صرف اینٹیں رکھیں بلکہ اس دیوار کی کل بنیاد جو بہت گہری تھی طلباء نے خود اپنے ہاتھوں سے بھری۔ طلباء کے ساتھ کل مدرسین اور اراکینِ مدرسہ نہایت ذوق وشوق سے خود اینٹیں اپنے سروں اور ہاتھوں پر لاتے تھے اور بجائے معماروں کے تعمیر کرتے تھے!

سبحان اللہ طلباء کا جوش، مسرت کے ساتھ سنّتِ خلیل اللّٰہی میں مشغول ہونا اور ساتھ میں رجزیہ اشعار اور تعمیر بیت اللہ کے وقت کی حضرت خلیل اللہ کی دعائیں پڑھنا عجیب مؤثر اور پرجوش سماں تھا۔

مسجد کی تعمیر سیٹھ غلام محمد اعظم صاحب کی تنہا فیاضی کی یادگار ہے۔ مسجد

کی روکار اور مینار سنگِ سُرخ کے ہیں۔ جن پر نہایت حسین و دلآویز نقش و نگار کندہ ہیں۔ صحنِ مسجد میں "مرمر" کا سنگین حوض ہے جو ہر وقت شفاف پانی سے لبریز رہتا ہے اس میں پانی برقی موٹر کے ذریعہ بھرا جاتا ہے۔ یہاں پنجگانہ اوقات نمازیوں کی کثرت اور ہجوم کو دیکھ کر جمعہ و عیدین کا سماں نظر آتا ہے۔ مسجد کی روکار میں سنگ مرمر کا کتبہ نصب ہے جس میں مندرجہ ذیل اشعار کندہ ہیں:

در مدرسہ مسجدے بنا شد	ایں مژدہ ز دوستان شنیدم
بر لوح جبینش اسم اعظم	خواندم چو بصحنِ او رسیدم
در سجدۂ شکر چوں فتادم	در گوش ایں شنیدم
مقرون شدہ عبادت و علم	در مدرسہ خانقاہ دیدم
۱۳۲۸ھ	۱۳۲۸ھ

یہ مسجد دو منزلہ ہے بالائی منزل ۱۳۴۹ھ (۱۹۳۱ء) کی تعمیر ہے!

دار العلوم کی پُر شکوہ اور خوش منظر عمارت کے اس گوشہ میں جو ریلوے اسٹیشن کو شہر سے ملانے والی سڑک کے آخری سرے پر واقع ہے اور جس سے آنے والے کو دار العلوم کے مشرقی دروازہ میں داخل ہونے پر سب سے پہلے جو عمارت ملتی ہے! وہ دار العلوم کی یہی دو منزلہ خوشنما مسجد ہے۔ مسجد کی مشرقی جانب بالائی منزل پر دار الافتاء کی عمارت واقع ہے! جو تین وسیع کمروں اور ایک کشادہ دالان پر مشتمل ہے۔

دار الحدیث جس طرح دار العلوم دیوبند کو یہ شرف و امتیاز حاصل ہے کہ ہندوستان بھر میں یہ پہلی درسگاہ ہے جو عین اسلامی علوم کے زوال کے وقت جمہور مسلمانوں کے عام چندے سے قائم ہوئی اسی طرح اس کو یہ تقدم و فضیلت بھی حاصل ہے۔ کہ دار العلوم کا دار الحدیث

ہندوستان بھر میں پہلی عمارت ہے جو اس نام سے عالمِ وجود میں آئی! اس میں شک نہیں کہ اسلامی عہد کے ہندوستان میں چپہ چپہ پر مدارس کا جال بچھا ہوا تھا! اور ایک ایک ذرہ علم کی روشنی سے منور تھا! لیکن مدارس کی اس اکثریت و بہتات کے باوجود ہندوستان میں کوئی عمارت دارالحدیث کے نام سے اس سے پہلے نہیں بنی!

اسلام کی تاریخ میں دارالحدیث کے نام سے اس سے پہلے پہل عمارت بنانے کا شرف شام کے فرمانروا ملک عادل نور الدین زنگی متوفی ۵۶۹ھ/۱۱۷۴ء کو حاصل ہے۔ سلطان ممدوح نے یہ دارالحدیث دمشق میں تعمیر کرایا تھا! دوسرا دارالحدیث قاہرہ (مصر) میں سلطان صلاح الدین فاتح بیت المقدس کے بھتیجے ملک کامل نے قائم کیا۔ اور پھر یہ سلسلہ اس قدر پھیلا کہ صرف ایک شہرِ دمشق میں بیک وقت ۱۸ دارالحدیث موجود تھے جن میں ہر ایک بجائے خود زبردست عظمت و شان کا مالک تھا!

دارالعلوم میں دارالحدیث کا سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب میں ۲۰ ربیع الآخر ۱۳۳۰ھ (۱۹۱۲ء) کو ایک جلسہ عام منعقد کیا گیا جس میں ملک کے مختلف مقامات کے لوگوں نے کثرت سے شرکت کی، طلباء نے باصرار مزدوروں کی بجائے نہایت ذوق و شوق کے ساتھ والہانہ انداز میں خود بنیاد رکھی، حضرت تھانوی رح نے مجمع سے فرمایا:

"سب صاحب ایک ایک دو، دو اینٹ اپنے ہاتھ سے رکھ دیں نہ معلوم حق تعالیٰ کے ہاں کس کا خلوص مقبول ہو جائے"!

چنانچہ تمام شرکاء جلسہ نے دو دو اینٹیں رکھیں!

دارالحدیث کی یہ پُرشکوہ عمارت بہمہ وجوہ ۱۳۴۹ھ (۱۹۳۱ء) میں مکمل ہوئی۔

یہ طویل و عریض اور سر بفلک عمارت نودرہ کی پشت پر واقع ہے اور دارالحدیث دو حصوں پر منقسم ہے۔ نودرہ کی پشت پر جو عمارت ہے قدیم دارالحدیث یہی ہے مگر آجکل اس میں درس حدیث کی بجائے دوسری مختلف جماعتیں پڑھتی ہیں۔ دارالحدیث کے گردوپیش ۱۳ کمرے ہیں! جو درس کے کام آتے ہیں۔ دارالحدیث کا طول ۶۸ فٹ اور عرض ۳۵ فٹ ہے جو نودرہ کے اوپر واقع ہے اس کی روکار مغرب کی جانب ہے اب حدیث کا درس اس عمارت میں ہوتا ہے اور دارالحدیث "فوقانی" کے نام سے موسوم ہے یہ عمارت ۱۳۵۲ھ (۱۹۳۴ء) کی تعمیر ہے۔

دارالتفسیر قدیم دارالحدیث کے اوپر دارالتفسیر کی مربع عمارت ہے، یہ طول و عرض میں ۳۰ × ۳۰ فٹ ہے۔ اس کے اوپر نہایت خوش نما گنبد بنا ہوا ہے جو اپنی رفعت و عظمت اور حسنِ تعمیر کے لحاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا دارالعلوم کے سر پر تاج رکھا ہوا ہے۔ دارالتفسیر ۱۳۵۸ھ (۱۹۳۹ء) کی تعمیر ہے۔ دارالحدیث اور دارالتفسیر کی یہ سر بفلک عمارت بہ ہیئت مجموعی اس قدر عظیم الشان اور پر شوکت ہے کہ دیکھنے والا غرقِ حیرت ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا! اس کا آسمان سے باتیں کرنے والا گنبد میلوں سے نظر آتا ہے۔

دار جدید دارالحدیث کے سامنے جدید دارالاقامہ ہے جو بڑے بڑے ۱۱۴ کمروں پر مشتمل ہے۔ دار جدید کے کمروں کا سلسلہ دارالحدیث کی شمالی جانب سے شروع ہو کر مستطیل شکل میں مغرب سے گذرتا ہوا جنوبی سمت چلا چلا گیا ہے۔ کمرے وسیع اور کشادہ ہیں۔ اور سب کے سامنے برآمدے ہیں۔ اس احاطہ کے شمال و جنوب اور مغرب میں تین دروازے ہیں۔ مغربی دروازہ جو عین دارالحدیث کے مقابل ہے "باب الظاہر" کے نام سے

موسوم ہے۔ دار جدید کا یہ احاطہ دار العلوم کا سب سے زیادہ پُر فضا مقام ہے۔ کئی ایکڑ زمین کا نہایت وسیع صحن ہے جس کی تین سمتوں میں دار الاقامے اور مشرقی جانب دار الحدیث ہے۔ دار جدید میں دو کشادہ سڑکیں ہیں۔ ایک دار الحدیث سے شروع ہو کر باب الظاہر پر ختم ہوتی ہے۔ اور دوسری سڑک شمالی دروازہ سے نکل کر جنوبی دروازہ میں گم ہو جاتی ہے۔ ان سڑکوں نے دار جدید کے احاطہ کو چار قطعوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ان قطعوں میں رنگ برنگ کے پُر بہار اور جاذب نظر پھولوں اور قسم قسم کے چھوٹے بڑے درختوں کی چمن بندی کی گئی ہے جس نے منظر میں ایک ایسی دلکشی پیدا کر دی ہے۔ جو بے ساختہ دیکھنے والے کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ہری بھری گھاس سے پورا احاطہ خوش منظر اور شاداب نظر آتا ہے۔

بابُ الظاھِر

باب الظاھر دار جدید کا صدر دروازہ ہے۔ یہ دروازہ دار العلوم کی ایک نہایت خوش نما اور عالیشان عمارت ہے۔ ۱۳۵۹ھ (۱۹۴۰ء) میں اس کی تعمیر ہوئی۔ باب الظاھر موجودہ تاجدارِ افغانستان اعلیٰ حضرت المتوکل علی اللہ محمد ظاہر شاہ کے گراں قدر شاہانہ عطیہ اور دار العلوم سے وابستگی کی ایک ایسی یادگار ہے جو تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ محفوظ رہے گی۔

دار القرآن

دار جدید کے جنوبی گوشہ میں دار القرآن کی عمارت ہے جو کولوٹولو کلکتہ کے مشہور تاجر الحاج فیروز الدین صاحب کی فیاضی اور خدمت قرآنی کی یادگار ہے۔ یہ عمارت پانچ کمروں پر مشتمل ہے۔ اس میں ہر سال کم و بیش دو سو بچے قرآن مجید پڑھتے اور حفظ کرتے ہیں ۱۳۶۸ھ ۱۹۴۹ء میں اس کی تعمیر ہوئی!

علامہ عثمانی کی شادی خانہ آبادی

چونکہ عہد طالب علمی، ذکر اساتذہ کرام اور دار العلوم دیوبند کی تاریخی حیثیت کے ترتیب وار سلسلے نے علامہ کے کسی اور واقعہ کی طرف اشارہ کرنے سے مجبور رکھا اس لئے ہم ذرا ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء کی طرف پھر لوٹتے ہیں اور معلومات میں یہ اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ جب علامہ ابھی مصروف تحصیل علم تھے تو فراغت سے دو سال پہلے ۱۱ر ذیقعدہ ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء کو آپ کی سنت نکاح جس کو عام طور پر ہماری زبان میں شادی کہتے ہیں منعقد ہوئی۔ جیساکہ آپ کی بیگم صاحبہ کی زبانی صحیح تاریخ اور سن معلوم ہوا۔

اُس نیک دل خاتون کا جو علامہ کی بیگم بنیں مختصر شجرۂ نسب یہ ہے:۔

مسماۃ[1] ام ہانی بنت بلند[2] بخت بن شرف[3] الدین بن شمس[4] الدین بن سید عش[5] بن مولوی سید[6] غلام حسین صاحب بجٹوی رحمۃ اللہ علیہ بن سید جعفر[7] علی۔

یہ مختصر سلسلۂ نسب، جو مجھے موصوف کے چھوٹے بھائی مولوی سعید احمد عثمانی سے حاصل ہوا، ظاہر کرتا ہے کہ آپ کی اہلیہ محترمہ سیدوں کے خاندان کی بیٹی ہیں اور جو بفضلہ تعالیٰ ابھی بقید حیات ہیں اور کراچی میں اپنی بھتیجی مُنیبہ خاتون کے پاس مقیم ہیں جس کو انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی بابو فضل حق سے لیکر پرورش کیا تھا۔

لہ علامہ عثمانی کی اہلیہ کا مارچ ۱۹۷۲ء کے پہلے ہفتے میں بعمر ۸۵ سال بمرض فالج انتقال ہوا۔ مصنف

بے اولادی

شادی کی خبر کے بعد انسانی حیثیت سے یہ لکھتے ہوئے ہمیں ایک گونہ افسوس ہو رہا ہے کہ ہم قارئین کو یہ بتائیں کہ علاّمہ دنیا سے بغیر اولاد رخصت ہوئے اور آپ نے اپنی زندگی میں یہ بہار نہ دیکھی۔ قدرت نے انسانوں میں جو تقسیم کی ہے ہم اس کے اسرار و رموز اور حکمتوں تک رسائی نہیں رکھتے بس صرف یہی سمجھتے ہیں کہ وہ جو کچھ کرتے ہیں درست کرتے ہیں اور ہم کچھ نہیں جانتے۔ ورنہ قادر مطلق کی غیر محدود قدرت کے جلوے آپ کے سامنے ہیں۔

انہوں نے چاہا تو آدم علیہ ماں باپ کے بغیر پیدا کر دیا، عیسیٰ علیہ السلام کو صرف ماں سے باپ کے بغیر پیدا کر کے ایک خاص آیت کا مظاہرہ کیا۔ ابراہیم علیہ السّلام کے یہاں اسماعیل اور اسحٰق علیہما السلام کو اس وقت پیدا کیا جبکہ وہ اور ان کی بیوی دونوں سلسلۂ اولاد کی منزل سے گذر چکے تھے اور بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ زکریا علیہ السلام کے گھر میں یحیٰی علیہ السلام کے نور سے اس وقت اجالا ہوا جب وہ خود شیخوخت کو پہنچ چکے تھے اور ان کی بیوی بانجھ تھی۔ غرض قدرت جبار یہ سب کچھ کر سکتی ہے تو وہ بے اولادوں کو بھی اولاد دے سکتی ہے، لیکن اگر نہیں دیتی تو جائے شکایت نہیں بلکہ اس میں بھی جائے شکر ہے۔ بقول شاعر ؎

قسمت کیا ہر شخص کو قسام ازل نے   جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا

دنیا میں اولاد، ماں باپ کے مال و دولت، مکان اور جائداد کی وارث ہوتی ہے اور اس سے کسی انسان کا سلسلۂ نسب چل کر نام و نشان کا باعث بنتا ہے لیکن علاّمہ کو قدرت نے ایسی معنوی اولاد عطا کی کہ اس کے سامنے نسل و نسب کی کوئی حقیقت نہیں اور وہ ان کی تصانیف اور ان کے علمی کارنامے ہیں جو قیامت تک صفحۂ روزگار پر ان کا نام و نشان باقی رکھیں گے جبکہ صرف اولاد والوں کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا۔

خواہ کچھ بھی ہو لیکن انسان کا دل اولاد کی تمنا میں بقدر ظرف بیقرار اور بےچین ضرور ہوتا ہے۔ اس لئے فطرت انسانی کے تقاضوں سے مجبور ہو کر آپ بھی مغموم دیکھے جاتے رہے ہیں۔ اس لئے اس غم کا ردعمل دوسری صورت میں ظاہر ہوا کہ آپ نے اپنے بھائی کی اولاد کو لیکر۔ اپنے بچوں کی طرح ان کی تربیت کی۔ اس سلسلے میں آپ کے چھوٹے بھائی بابو فضل حق عثمانی نے جو مجھے اسٹیٹمنٹ دی اور قلمی بیان میرے حوالے کیا، اس کا خلاصہ اپنے لفظوں میں پیش کرتا ہوں۔ لکھتے ہیں:

"حضرت مرحوم کے کوئی اولاد نہ تھی اس لئے بچوں اور بالخصوص بھائیوں کے بچوں سے بہت محبّت کرتے تھے۔ جب حج سے واپس آئے تو میرے پاس صرف اپنا بچہ تھا اس کو اپنا متبنّٰی بنا لیا۔ اس کا نام بھی آپ ہی نے نعمان رکھا اور مجھے اللہ تعالیٰ نے ایک لڑکی عنایت فرمائی تھی جس کا نام مُنیبہ خاتون ہے۔ میں تو مع اہل و عیال باہر ملازمت پر تھا اور نعمان حضرت علامہ کے پاس رہتا لیکن قدرت خداوندی سے چار سال کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کی وفات پر علّامہ اور ان کی اہلیہ کو جو صدمہ ہوا وہ بیان سے باہر ہے۔ روزانہ اس کی قبر پر جاتے۔ اور کبھی کبھی قبر کی مٹی لے آتے اور اپنی اہلیہ محترمہ کو دیتے کہ یہ ہمارے نعمان کی قبر کی مٹی ہے۔ جب ہمیں اس کی وفات کی خبر ہوئی تو ہم اپنی ملازمت سے رخصت لیکر آئے اور ان کے غم میں شریک ہوئے۔ لیکن ان کے اس غم کو دیکھکر ہم نے اپنی لڑکی منیبہ کو پیش کر دیا کہ آپ اس کی پرورش کر لیجئے لیکن آپ نے فرمایا کہ بھائی جب میری قسمت میں ہی بچے نہیں تو پھر میں کسی کے بچے کو رکھکر یہ صدمہ دیکھنا نہیں چاہتا۔ بالآخر باصرار تمام آپ نے منیبہ کو اپنے زیر سایہ پرورش کرنے کے لئے قبول فرما لیا اور جان سے

زیادہ سمجھ کر پالا ۔ اس کے لئے مکان بنوا کر دیا ۔تعمیر مکان کے بعد جب اس کے نام کر دیا تو اس کو اپنے قیام کی وجہ سے دس روپیہ ماہوار کرایہ دیتے رہے ۔خود اپنے اخراجات سے مولانا محمد یحییٰ صاحب تھانوی کے ساتھ اس لڑکی کی شادی کی ۔ الحمدللہ کہ منیبہ خاتون کے کئی کئی بچے ہیں ۔ علامہ تو دنیا سے رخصت ہو گئے لیکن لڑکی کو ان کی جدائی کا بہت احساس ہے ۔"

مولانا محمد یحییٰ صاحب

مولانا محمد یحییٰ صاحب تھانوی جن سے علامہ نے اپنی بھتیجی منیبہ کی شادی کی دیوبند کے فاضل اور قابل شخصیت کے مالک ہیں ۔ علامہ کی عہد طلب علم سے خدمت کرتے رہے ۔

تعمیر مکان جدید

مذکورہ بالا بیان میں ایک خاص چیز نے مجھے حیرت میں ڈال دیا کہ علامہ نے اپنے زر کثیر سے تقریباً بیس ہزار روپیہ لگا کر یہ مکان محلہ گوریواڑہ میں بنوایا اور اس کو اپنی بھتیجی کے نام کر کے پھر دس روپیہ ماہوار کرایہ باصرار اس کو دیتے رہے ۔ میرے نزدیک صلہ رحمی کی یہ اعلیٰ مثال کہی جا سکتی ہے ۔ راقم الحروف نے یہ مکان دیکھا ہے اور اس میں چند گھنٹے بھی گذارے ہیں جبکہ ۱۹۴۵ء کی دسمبر کی تعطیل میں کپورتھلہ سے شیر کوٹ جاتے ہوئے دیوبند میں قیام کیا تھا ۔ دوسری مرتبہ پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد جب اگست ۱۹۵۴ء میں میرا دیوبند جانا ہوا اور ایک ہفتہ استاذ محترم مولانا محمد ابراہیم صاحب صدر مدرس دارالعلوم دیوبند کے پاس ٹھہرا تو اس اثنا میں ایک دفعہ علامہ کے مکان کے پاس سے گذر ہوا تو اس میں کسی عورت کے رونے کی آواز آئی معلوم ہوا کہ کوئی شرنارتھی سکھ اس میں براجمان ہے[1]

---

[1] ۱۷-۱۸ سال پہلے حاجی جمیل احمد امین نمبردار مرحوم نے کسٹوڈین سے نیلام میں یہ مکان خرید لیا تھا اور اس وقت بھی ان کے اہل و عیال اس میں رہ رہے ہیں ۔ اشفاق احمد

بہر حال ۱۱ر ذیقعدہ ۱۳۲۳ھ کو علامہ کی شادی ہوئی لیکن تاحیات کوئی بچہ نہوا۔ لیکن اس خواہش کی چنگاری دل میں سُلگتی ضرور رہی۔

سِلسلۂ درس وتدریس

سلسلۂ تدریس شوال ۱۳۲۶ھ میں دارالعُلوم دیوبند میں!

جب علامہ ۱۳۲۵ھ میں فارغ التحصیل ہوئے اور طالب علمی کے زمانے میں آپ کی علمی قابلیت کا سکہ سارے دارالعلوم پر بیٹھ گیا تو اس حقیقت میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا تھا، کہ آپ دارالعلوم میں درس دینے کے لئے نہایت موزوں ثابت ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ ۱۳۲۶ھ کے شوال سے آپ کو دارالعلوم دیوبند میں منصب تدریس پر مقرر کردیا گیا اور پڑھانے کے لئے درسیات کی اعلیٰ کتابیں دے دی گئیں دارالعلوم دیوبند کا یہ پہلا زبردست فارغ التحصیل عالم ہے جو فارغ ہوتے ہی نوعمری میں سینئر پروفیسروں کی صف میں جگہ لیتا ہے۔

مولانا محمد ابراہیم بلیاوی استاذ معقول ومنقول کی آمد

اسی سال جناب مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث پڑھنے کے لئے تشریف لائے۔ علامہ عثمانی مرحوم کے یہاں اس زمانے میں بلیا کے کوئی صاحب جو دارالعلوم میں پڑھتے تھے، مقیم تھے۔ انہی کی وجہ سے مولانا بلیاوی بھی علامہ کے مکان پر ٹھہرے۔ موصوف نے دورۂ حدیث کی درخواست دی لیکن کتابوں میں ترتیب نہونے کے باعث حدیث کے اسباق نہ مل سکے اور ایک سال

پیچھے ہٹا دیئے گئے۔ یہی چند ماہ ہیں کہ ان میں مولانا بلیاوی نے علامہ عثمانی کی باقاعدہ دارالعلوم کی کلاس میں شاگردی کی۔

مدرسہ فتحپوری دہلی کی صدارت ۱۳۲۶ھ

جب آپ دارالعلوم میں ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۹ء میں تعلیم دے رہے تھے تو مدرسہ فتحپوری دہلی کی صدر مدرسی کے لئے، مولوی عبدالاحد صاحب مالک مطبع مجتبائی دہلی نے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب، سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند سے کسی قابل مدرس کے لئے درخواست کی۔ مہتمم صاحب جو علامہ کے برادر بزرگ بھی تھے، انہوں نے وہاں کی صدارت کے شایان شان علماء پر نظر ڈالی اور علامہ کو اس عہدے کے لئے فٹ اور موزوں تصور کرتے ہوئے آپ کو دہلی بھیجدیا۔ چنانچہ موصوف نے ابھی دارالعلوم میں کچھ ماہ تعلیم دی تھی کہ وہاں تشریف لے گئے۔ یہ مدرسہ اپنی نوعیت کا دہلی میں سب سے بڑا مدرسہ تصور کیا جاتا تھا۔ اور اب بھی اس کو بڑی وقعت سے دیکھا جاتا ہے۔ وہاں آپ نے شعبان ۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۱ء تک دورۂ حدیث اور دوسری اعلیٰ درجہ کی کتابیں پڑھائیں۔

دہلی کو ہندوستان کی مرکزی حیثیت سے یوں بھی بڑا مقام حاصل رہا کیا ہے اس لئے مرکز میں علامہ کی تقریروں اور صدارت تدریس کی وجہ سے آپ کو خوب شہرت حاصل ہوئی۔ دہلی کے قیام نے مولانا عثمانی کی زبان اور بیان پر سونے پر سہاگے کا کام دیا۔ اول تو تقریر سے عہد طفلی ہی سے خداداد دلچسپی تھی لیکن دہلی کی زبان نے آپ کی اردو کو اور بھی شستہ بنادیا۔ وہاں کے لب ولہجہ، وہاں کے انداز تکلم، محاوروں اور روزمروں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

اُدھر تعلیم سے فراغت پاکر مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی بھی بحیثیت مدرس فتحپوری کے مدرسہ میں تشریف لے گئے اور پھر دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ رہنے

اور قریب ہونے کا موقع ملا جس کی وجہ سے قلبی لگاؤ پیدا ہو گیا۔ اور دونوں میں دوستی کے رشتے مستحکم ہو گئے۔ ابھی علامہ کو فتحپوری میں دو سال ہی ہوئے تھے کہ آپ کو دارالعلوم دیوبند بلا لیا گیا۔

علامہ پھر دارالعلوم دیوبند میں ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۹۱۱ء

دہلی سے دیوبند واپس بلائے جانے کے متعلق جناب مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی کا حسب ذیل بیان بہترین دستاویز ہے۔ موصوف ۱۳۳۳ھ کی روئداد میں لکھتے ہیں:۔

"۱۳۲۶ھ میں آپ مدرسہ فتحپوری دہلی کے مدرس اول مقرر ہو کر گئے۔ ۱۳۲۸ھ تک وہاں رہے۔ ممبران مدرسہ کو یہ امر پسند نہ تھا کہ ایسے لائق اور کارآمد شخص کو دارالعلوم سے جدا رکھا جائے۔ اس لئے شوال ۱۳۲۸ھ میں دیوبند بلالئے گئے۔" (روئداد دارالعلوم دیوبند ۱۳۳۳ھ صفحہ ۲۰)

مہتمم صاحب کے اس جملے سے کہ "مولانا شبیر احمد صاحب کو شوال ۱۳۲۸ھ میں واپس بلا لیا گیا" یہ مترشح ہوتا ہے کہ علامہ رمضان شریف کی بڑی تعطیل کے بعد شوال کے ابتدائی تعلیمی سال کے لئے دہلی ابھی گئے ہی ہوں گے کہ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے ان کا وہاں رہنا پسند نہ کیا اور ان کو وہاں سے بلا لیا۔

دارالعلوم کی فضا

جب علامہ دہلی سے بلائے گئے ہیں یہ وہ وقت تھا کہ دارالعلوم میں تعلیمی اور تبلیغی نیز سیاسی حالات نے ایک نئی کروٹ بدلی تھی۔ دارالعلوم میں نصاب تعلیم میں تبدیلیوں کے ساتھ ایک خاص درجہ تعلیم کھولا گیا تھا جس میں فارغ التحصیل طلبہ کو تبلیغ کے لئے تیار کیا جاتا تھا اور اس درجہ خصوصی میں حضرت شاہ رفیع الدین صاحب، حضرت شاہ محمد اسمٰعیل صاحب، شاہ ولی اللہ صاحب اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب

رحمہم اللہ کی تصنیفات کا درس دیا جانا بھی شامل تھا۔ علامہ عثمانی ان حضرات کی تصانیف اور بالخصوص حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے مضامین عالیہ میں غیر معمولی بصیرت رکھتے تھے۔ ادھر جمعیۃ الانصار کے جلسے مؤتمر الانصار کے نام سے ہونے والے تھے۔ علامہ نے بھی اپنا مضمون "الاسلام" پڑھ کر علماء پر دھاک بٹھا دی تھی۔ یہی سنہ ۱۹۱۱ء مطابق سنہ ۱۳۲۸ھ کا سال ہے کہ دارالعلوم دیوبند سے شعبان کے ماہ میں القاسم کا پہلا پرچہ نکلا ہے۔ اور اسی سال میں دارالعلوم کی تاریخ کا زبردست کارنامہ جلسۂ دستار بندی ہوا۔ اندریں حالات علامہ کو دارالعلوم میں بلانے کے سوا اور کیا چارہ تھا۔ علاوہ ازیں ایک اور وجہ بھی دہلی ترک کرنے پر مجبور کر رہی تھی وہ تھی آپ کی خود دارانہ طبیعت کہ مولوی عبدالاحد صاحب مالک مطبع مجتبائی دہلی کے سامنے، جو ان دنوں مدرسہ فتحپوری کے کل کلاں تھے، علامہ جھک نہ سکے۔ لیکن مولوی عبدالاحد صاحب نے جو شکایتی خط مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کو لکھا اس میں انہوں نے تحریر کیا تھا کہ آپ نے ان کو وقت سے پہلے بڑا بنا دیا ہے۔ جیسا کہ مولانا بلیاوی کی زبانی معلوم ہوا۔ دراصل صاحب مجتبائی نے ان کی خودداری کو "بڑا بنا دیا ہے" سے تعبیر کیا ہے۔ ممکن ہے یہ وجہ بھی ہو لیکن علامہ تو مرکزی کیبنٹ کی وزارت کے قابل تھے اس لئے ان کے شایان شان دارالعلوم دیوبند ہی تھا جس کی طرف واپس بلائے گئے۔

واپسی پر

واپسی پر آپ کو اکابر مدرسین میں جگہ دی گئی اور اعلیٰ درجے کی کتابیں پڑھانے کی پیشکش کی گئی۔ اس سلسلے میں حضرت حافظ محمد احمد صاحب مہتمم اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سابق نائب مہتمم کی حسب ذیل تحریری دستاویز پیش نظر رکھئے جس سے علامہ کی ابتدائی تاریخی پوزیشن کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔ لکھتے ہیں:-

"مولانا (شیخ الہند) نے (حج کو) تشریف لے جانے سے ایک روز قبل ترمذی کا سبق خود پڑھایا اور آپ کے تشریف لے جانے کے بعد دورۂ حدیث کے اسباق اس طرح تقسیم کردئے گئے کہ حضرت مولانا کی جگہ مولانا محمد انور شاہ صاحب کو ترمذی شریف کا سبق دیا گیا اور قائم مقام صدر مدرس آپ ہی بنائے گئے۔ مسلم شریف کا سبق مولوی شبیر احمد صاحب کو دیا گیا۔ مولانا انور شاہ صاحب اور مولانا شبیر احمد صاحب بموجودگی حضرت مولانا (شیخ الہند) عرصہ آٹھ سات سال سے دورۂ حدیث کی ایک ایک دو دو کتاب ہر سال پڑھاتے تھے ترتیب اسباق حدیث اس طرح ہوتی تھی کہ شروع سال پر ترمذی حضرت مولانا (شیخ الہند) کے یہاں، مسلم شریف اور ابوداؤد میں سے ایک کتاب مولانا انور شاہ صاحب کے یہاں، اور ایک مولانا شبیر احمد کے یہاں۔" (روئداد دارالعلوم ۱۳۳۳ھ صفحہ ۳۰)

مذکورہ بالا عبارت سے کئی تاریخی واقعات مل گئے جن سے علامہ کی دیوبند واپسی پر ان کی تعلیمی سرگرمی اور اکابر اساتذہ میں شمولیت کا حال معلوم ہوا۔ یعنی شیخ الہندؒ کی موجودگی میں وہ ہستیاں جن کو بخاری شریف اور ترمذی کے علاوہ مسلم اور ابوداؤد شریف جیسی حدیث کی جلیل القدر کتابیں پڑھانے کے فرائض سپرد کئے گئے وہ استاذی مولانا سید انور شاہ صاحب اور مولانا عثمانی تھے۔ گویا شیخ الہندؒ کے بعد یہی دو ہستیاں تھیں جن کو بلند مقامی حاصل تھی۔ اس عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فتحپوری سے واپسی پر موصوف آغاز ملازمت ہی سے ابوداؤد شریف اور مسلم شریف پڑھاتے رہے ہیں۔ رپورٹ بتلاتی ہے کہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ۱۳۳۳ھ میں حج کے لئے تشریف لے گئے اور علامہ ان کی موجودگی ہی میں سات آٹھ سال پہلے سے دورۂ حدیث کی مذکورہ بالا دو کتابوں میں سے کبھی ایک اور کبھی دوسری پڑھایا کئے۔

اس تاریخی تحریر کے علاوہ موصوف کے شاگردوں سے جن جن کتب کے پڑھانے کا سراغ لگا ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے چھوٹی بڑی ہر فن کی کتابیں پڑھائی ہیں۔ مثلاً مولانا احسان اللہ خان تاجور نجیب آبادی نے مجھ سے کہا کہ میں نے علامہ سے اصول الشاشی، تلخیص المفتاح، مُلا حسن، بیضاوی، مشکوٰۃ، ابوداؤد، مسلم شریف، حمد اللہ، صدرا وغیرہ کتابیں پڑھی ہیں۔ تاجور صاحب کا دورِ تعلیم ۱۳۲۶ھ سے ۱۳۳۶ھ تک رہا ہے۔ مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی حال وارد کراچی نے فرمایا کہ میں نے علامہ سے قاضی، حمد اللہ وغیرہ کتابیں پڑھیں غرض یہ ہے کہ موصوف نے تقریباً ہر فن کی کتب کا دارالعلوم میں درس دیا۔ ان کتب کے علاوہ بخاری شریف اور ترمذی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کی وفات کے بعد پڑھایا کئے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی اپنے طویل مضمون "دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن" کے عنوان کے ماتحت جو رسالہ دارالعلوم میں شائع ہوا، لکھتے ہیں:-

"یوں استاذ ہونے کی حیثیت سے دارالعلوم کے سارے اساتذہ کے ساتھ تلمذ کی نسبت اس فقیر کو حاصل ہے لیکن سچی بات یہی ہے کہ حضرت کشمیری، مولانا شیخ الہند، مولانا شبیر احمد نور اللہ قبورہم سے تمتع کے جو مواقع میسّر آئے، دوسرے اساتذہ کے متعلق دعویٰ نہیں کرسکتا۔ جیسا کہ عرض کرچکا ہوں کہ مولانا شبیر احمد صاحب مرحوم اس سال جو ہمارے دورے کا سال تھا مدرسہ کی تدریسی خدمت سے دستکش ہوکر گھر بیٹھ گئے چند دنوں تک ان کے گھر پہنچ کر فقیر اور مولانا نورالہدیٰ دربھنگوی ابوداؤد پڑھتے رہے لیکن مولانا پر جو حال طاری تھا اس نے زیادہ دنوں تک اس سلسلے کو بھی باقی نہ رکھا۔ مدرسہ کی طرف سے ان کی کتاب سنن ابی داؤد کا سبق حضرت

میاں سید اصغر حسین صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے سپرد کر دیا گیا تھا۔"

(رسالہ دار العلوم ماہ رمضان ۱۳۷۲ھ جون ۱۹۵۳ء صفحہ ۴۵ کالم ۲)

مذکورہ عبارت سے یہ معلوم ہوا کہ حضرت میاں صاحب سے پہلے حضرت عثمانی ہی ابوداؤد پڑھایا کرتے تھے اور جب وہ اس سال جو کہ گیلانی صاحب کے دورے کا سال تھا دستکش ہو گئے تو یہ کتاب حضرت میاں صاحب کے پاس پہنچ گئی اور پھر تا زندگی میاں صاحب ہی اسے پڑھاتے رہے۔

خطیب ملت استاذی مولانا محمد طیب صاحب موجودہ مہتمم دار العلوم اپنے مضمون "حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی" میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"ابتدا میں معقولات کی کتابیں، حمد اللہ وغیرہ زیادہ پڑھاتے تھے مگر آخر میں یہ تمام مشاغل ترک ہو گئے تھے۔ اور صرف کتاب و سنت اور فنون دینیہ کا شغل باقی رہ گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ بالآخر مولانا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی خدمت کی طرف متوجہ ہو گئے۔"

(رسالہ دار العلوم ماہ مئی ۱۹۵۶ء جلد ۱۱ شمارہ ۲ صفحہ ۶)

اس ڈاکومینٹ سے معلوم ہوا کہ موصوف آغاز ملازمت سے ہی بڑی بڑی کتابیں حمد اللہ جیسی پڑھاتے تھے اور نہ صرف یہ کتابیں بلکہ معقولات یعنی منطق، فلسفہ اور علم کلام سے شروع شروع میں آپ کو زیادہ دلچسپی تھی لیکن پھر کتاب اللہ، سنت رسول اللہ یعنی تفسیر و حدیث اور فقہ کی طرف توجہ فرمائی اور ان فنون کو بھی معقولات سے زیادہ کمال پر پہنچا کر چھوڑا جس کا زندہ ثبوت ان کی تفسیر اور مسلم کی شرح فتح الملہم ہے۔

جامع علوم وفنون

دنیا میں کوئی شخص ہر فن مولا ہو جائے مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن کے قریب قریب ہے لیکن علامہ شبیر احمد صاحب اپنے ماحول میں علوم معقول و منقول، فن تحریر و تقریر میں جامع تھے،

اور دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بعد یہی وہ ہستی تھی کہ جن کو جامع العلوم والفنون کہا جا سکتا ہے۔ حضرت شاہ صاحب بلاشبہ ہر علم و فن میں سب سے بلند مقام رکھتے تھے لیکن وہاں تحریر و تقریر کا معاملہ ٹھنڈا تھا۔

ہم یہاں تک مذکورہ بالا تحقیقی بیانات کی مدد سے اس مقام پر پہنچ چکے کہ یقین کے ساتھ یہ کہہ سکیں کہ علامہ نے اپنے عہد معلمی میں ہر علم و فن کی چھوٹی بڑی کتابیں پڑھا کر ایک خاص تاریخی مقام حاصل کیا اور فن تعلیم میں وہ اپنے دور کے ایکسپرٹ پروفیسر اور ماہر تعلیم تھے۔ اور علوم عقلیہ و نقلیہ دونوں میں یکساں مہارت کے مالک تھے۔ کسی اہل علم کو میرے نزدیک اس وقت عالم کہا جانا چاہئے جبکہ اس کو اپنے معلومات اور علمی تحقیقات پر اتنا وثوق اور اعتماد ہو جائے کہ وہ ہر سوسائٹی اور مجلس میں اپنے ٹھوس علم اور بصیرت کے باعث تفوق اور بالادستی حاصل کر سکے اور علماء و فضلاء اس کے سامنے سر جھکا لیں، یہ مقام ان کو اپنی آغاز زندگی سے حاصل ہو چکا تھا اور میں ان کے حق میں اسی تفوق و بالادستی کو قدرت کا زبردست انعام تصور کرتا ہوں۔ اور ستم بالائے ستم اور حیرت اندر حیرت یہ ہے کہ نوعمری اور نوجوانی میں اس مقام پر پہنچ گئے جہاں عمر کھپا کر انسان پہنچتے ہیں۔ سنہ ۱۳۳۲ھ کی دارالعلوم کی رپورٹ کے حسب ذیل جملے ملاحظہ فرمائیے جو اس وقت کے مہتمم صاحبان مولانا محمد احمد صاحبؒ اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ کی طرف سے ہیں :-

> " مولوی شبیر احمد صاحب .... مؤخر طبقے کے اصحاب میں سے ہیں اور ماشاء اللہ نوجوان اہل علم میں سے ہیں جن کو علوم اکابر کا حامل قرار دیا جائے۔ تمام علوم معقول و منقول میں کامل استعداد رکھتے ہیں۔ تقریر و تحریر میں بے مثل ہیں۔ خصوصاً علم حدیث میں ایسا ملکہ ہے جو معمر اور تجربہ کار مشائخ حدیث کو ہوتا ہے ۔" (روئداد دارالعلوم سنہ ۱۳۳۲ھ صفحہ ۲۰)

جمعیۃ الانصار اور علامہ شبیر احمد عثمانی

شہرت عام اور بقائے دوام

سعادت مند پیشانیاں کسی بلند شخصیت کے مستقبل کی جھلک لوگوں کی آنکھوں کو اس طرح دکھادیتی ہیں کہ اہل بصیرت کے لئے سب کچھ اس میں نظر آجاتا ہے۔ حضرت عثمانی عہد طالب علمی میں ہی طلبہ میں شہرت حاصل کرتے جارہے تھے۔ اور ان کے ذریعہ باہر کے معاصرین میں آپ کے چرچے ہو چلے تھے۔ چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی تک ان کی قابلیت اور لیاقت کی شہرت پہنچی اور یہ زمانہ ان کی بھی طالب علمی کا زمانہ تھا۔ دونوں میں باہمی نامہ وپیام، خط وکتابت اور تبادلۂ سلام ہونے لگا۔ جب عہد طالب علمی سے نکل کر دہلی پہنچے تو مرکز میں تقریروں کے سلسلے نے آپ کے ذکر کو باہر کے علمی اور عوامی حلقوں تک پہنچایا ابھی آپ دہلی ہی تھے کہ دارالعلوم میں حضرت شیخ الہند نے مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کو بلایا اور یہاں اب فضاؤں میں انقلابی حرکت اور تعلیمی پروگرام میں ایک خاص تبدیلی رونما ہونے کے آثار ہوتے۔ شیخ الہند کے اشاروں پر الانصار کے نام سے ایک انجمن کی تشکیل ہوئی۔ مولانا عثمانی اس کے سرگرم رکن رہے۔

جمعیۃ الانصار، ۲۷ رمضان ۱۳۲۷ھ

اس انجمن کی تشکیل کا پس منظر اور تاریخی خاکہ مولانا عبیداللہ صاحب سندھی مؤتمر الانصار مراد آباد کے جلسے منعقدہ ۱۵-۱۶-۱۷ اپریل ۱۹۱۱ء کی رپورٹ میں اس طرح پیش کرتے ہیں:۔

”مدت سے اس قسم کے خیالات میرے اور دیگر تعلیم یافتگان مدرسہ میں سے ایک بڑی جماعت کے ذہن میں خطور کر رہے تھے مگر ان کے اظہار کی نوبت بتاریخ ۲۶ ماہ رمضان المبارک ۱۳۲۷ھ بعد عشاء آئی جب استاذ العلماء

حضرت مولانا محمود حسن صاحب مدظلہ العالی نے مدرسہ کی روز افزوں ضروریات تعلیمی و مالی حالت کی طرف تعلیم یافتگان مدرسہ کو متوجہ کرنے کی ضرورت بیان فرمائی۔

رمضان کی ستائیسویں شب مقدس کو حضرت مولانا مدظلہ العالی اور سرپرستاران جمعیۃ نے اس مجلس کے انعقاد کی اجازت دی اور بروز چہارشنبہ ۲۷ رمضان بوقت ۹ بجے بصدارت جناب مولانا محمود حسن صاحب سلمہ افتتاحی جلسہ ہوا جس میں قدیم طلبہ مدرسہ کی ایک معقول تعداد شامل ہوئی۔ اول قاری حافظ محمد طیب سلمہ ابن مولانا حافظ احمد صاحب نے سورۂ صف کی خوش الحانی سے تلاوت کی اس کے بعد بندہ نے اپنے مربی علمی مدرسہ عالیہ دیوبند کے حقوق اور انعقاد مجلس کی ضرورت پر مختصر تقریر کی .... بندہ اپنی تقریر ختم کر چکا تو استاذ العلماء حضرت مولانا مدظلہم نے اس کی تائید میں ایک مفصل تقریر فرماتے ہوئے مجلس کی ضرورت ظاہر فرمائی اور یہ بھی فرمایا کہ اب ضرورتیں ایسی پیش آرہی ہیں جن کی وجہ سے ایسا کرنا ناگزیر ہوگیا ہے۔ اس درمیان میں جناب مولانا حافظ احمد صاحب مہتمم مدرسہ (ابن حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ) اور مولانا مولوی حبیب الرحمٰن صاحب مددگار مہتمم نے بھی تقریریں فرمائی اور معمولی بحث کے بعد مجلس کے انعقاد کی ضرورت باتفاق رائے تسلیم کی گئی اور مجلس کا نام "الانصار" تجویز ہوا۔"

(رپورٹ ص ۵۴ و ۵۵)

شوال سنہ ۱۳۳۰ھ کے القاسم میں مولانا سندھی جمعیۃ الانصار کے آغاز کے متعلق لکھتے ہیں:-

"دار العلوم (دیوبند) میں ایک ایسی حرکت پیدا ہوئی جس سے منتشر پروانے شمع کے گرد جمع ہونے شروع ہوتے اور یہ جمعیۃ الانصار کی ابتدا ہے جو ۲۷ رمضان ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۳ اکتوبر ۱۹۱۰ء کو مدرسہ عالیہ میں منعقد ہوئی۔" (القاسم ص۱۰۱)

ان تحریروں سے تشکیل انجمن کی پوری روئداد سامنے آگئی جس میں بتایا گیا ہے کہ اس قسم کی انجمن کو جنم دینے کے لئے عرصہ سے دماغ میں خیالات کی کھچڑی پک رہی تھی۔ اور بالآخر وہ وجود میں آگئی۔ انجمن کے اغراض و مقاصد مرتب ہوئے جو مذکورہ رپورٹ میں تفصیل سے درج ہیں۔ قواعد و ضوابط اور قوانین ترتیب دئے گئے۔ اور اسی "الانصار" کے ماتحت چھ شعبے قائم کئے گئے۔ یہ رپورٹ اس وقت میرے سامنے ہے اور میں نے اس کے تمام اطراف و جوانب پر غور کیا ہے اور راقم الحروف اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ اس انجمن کو پھر زندہ کر کے اس کی سکیم کو از سر نو چلایا جائے۔ جو چھ شعبے اس جمعیت میں قائم کئے گئے ان کے متعلق دفعہ ۱۶ کے ماتحت مولانا عبید اللہ سندھی لکھتے ہیں:۔

"جمعیۃ (الانصار) اپنے فرائض (یعنی مدرسہ کی تعلیمی، انتظامی، مالی ترقی) کی تعیین و تشخیص کے لئے پانچ شعبے قرار دیتی ہے (الف) تکمیل التعلیم (ب) نظام التعلیم (ج) الارشاد (د) التالیف والاشاعت (ہ) جلسہ علمیہ۔ (روئداد مؤتمر الانصار مراد آباد ص۱)

یہ پانچ شعبے اپنے اندر انقلاب کی ہمہ گیر قوت کے حامل ہیں۔ اسی کے قواعد و ضوابط کے ضمیمے میں آگے چل کر قاعدہ و دفعہ ۶۷ میں رپورٹر لکھتے ہیں:۔

"جمعیۃ الانصار کا وہ جلسہ علمیہ جس میں (الف) قرآن شریف و حدیث شریف کے اسرار و لطائف بیان ہوں (ب) اصلاح عقائد و اخلاق

اعمال کے متعلق علمی مضامین پڑھے جائیں (ج) مسلمانوں کی مذہبی علوم و معارف کی حفاظت و اشاعت کے وسائل پر عموماً اور مدارس و مساجد کی اصلاح و عمارت پر خصوصاً بحث و مشورہ ہو (د) ان تجاویز پر عمل کرنے کا تہیہ کیا جائے موتمر الانصار کے نام سے موسوم ہوگا۔"

(رپورٹ موتمر الانصار ص ۱۲)

غرض یہ کہ دار العلوم میں ایک خاص حرکت پیدا ہوئی اور ۱۳۲۷ھ میں جب کہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ مدرسہ فتحپوری دہلی میں ملازم تھے دار العلوم میں انقلابی ہوائیں چلنا شروع ہو گئی تھیں۔ اس اثناء میں علامہ دہلی سے جمعیۃ الانصار میں شرکت کرنے کے لئے دیوبند تشریف لاتے۔ یہاں سے حضرت عثمانی کی شہرت میں مزید اضافہ شروع ہوا۔ کیونکہ آپ بھی "الانصار" کے ایک ممتاز ممبر بنائے گئے۔ مولانا عبید اللہ صاحب نے رپورٹ میں اس حقیقت کا نشان اس طرح دیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

" اور ایک مجلس خاص جو نصاب اور نظام مدرسہ اور طرز تعلیم کے بارے میں غور و فکر کرے جمعیت الانصار کے ارکان ذیل سے مرکب کی گئی:

مولانا مولوی ناظر حسن صاحب، مولانا مولوی مرتضیٰ حسن صاحب۔

مولانا شاہ وارث حسن صاحب بنارسی، مولانا مولوی محمد انور شاہ صاحب کشمیری۔

مولانا مولوی حسین احمد صاحب مدنی، مولانا مولوی کفایت اللہ صاحب شاہجہانپوری

مولانا اصغر حسین صاحب دیوبندی، مولانا مولوی شبیر احمد صاحب دیوبندی

عبید اللہ ناظم جمعیۃ الانصار" (رپورٹ ص ۵۵)

مذکورہ فہرست سے مولانا عثمانی کا انجمن انصار نیز اصلاح تعلیم کی کمیٹی میں ہونا صاف ظاہر ہے۔

٭

جمعیۃ الانصار میں حضرت عثمانی کی شاندار خدمات :

ابھی آپ دہلی کے مدرسے سے وابستہ تھے کہ اصلاح تعلیم کی کمیٹی کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے آپ نے ۱۱ - ۱۲ محرم ۱۳۲۸ھ کی میٹنگ میں شرکت فرمائی ۔ اس میٹنگ میں جو بغرض اصلاح نصاب و طریقۂ تعلیم و تعلّم منعقد کی گئی تھی نہ صرف کمیٹی کے مذکورہ بالا افراد شامل ہوتے بلکہ دیگر حضرات کو بھی مشورہ کے لئے دعوت دی گئی ۔ رپورٹ کے صفحہ چھپن (۵۶) پر اس کا ذکر کرتے ہوئے آخر میں حسب ذیل حضرات کے دستخط ہیں جنہوں نے اس میں شرکت کی :

" محمد ناظر حسن العبد ، صدیق احمد عفا اللہ عنہ بقلم خود ، محمد اشرف علی عفی عنہ ، احمد حسن امروہی غفرلہ ، خلیل احمد غفرلہ ، محمود حسن عفی عنہ ، عبید اللہ ابو محمد احمد عفی عنہ ، عبدالمومن محمد کفایت اللہ ، خاکسار سراج احمد عفی عنہ ، بندہ محمد امین عفی عنہ ، محمد سہول عفی عنہ ، وارث حسن عفی عنہ ، عبدالصمد عفی عنہ ، احقر الزمان گل محمد خان عفی عنہ ، بندہ محمد مرتضیٰ حسن عفی عنہ ، کفایت اللہ گنگوہی ، احقر الطلبہ حسین احمد غفرلہ ، عبدالوحید عفی عنہ ، محمد قدرت اللہ غفرلہ ، عبدالرحمٰن کان اللہ لہٗ ولوالدیہ ولجمیع المؤمنین ، احقر محمد انور عفا اللہ عنہ ، بندہ محمد ضرغام الدین عفی عنہ ، عاشق الٰہی عفی عنہ میرٹھی ، بندہ عزیز الرحمٰن عفی عنہ دیوبندی ، شبیر احمد عفی عنہ ، حبیب الرحمٰن عفی عنہ ، احمد مہتمم مدرسہ دیوبند ۔ "

ان اسمائے گرامی کی فہرست میں جو اس میٹنگ میں شریک ہوئے مولانا عثمانی کے بھی دستخط موجود ہیں ۔ ۱۱ - ۱۲ محرم سے گذر کر یہ جلسہ ۱۳ محرم تک گذر گیا اور بقیہ کاروائی عمل میں لائی گئی ۔ ۸ ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ کو پھر جلسہ ہوا جس میں

ابنائے قدیم اور نواب محی الدین صاحب قاضی ریاست بھوپال، حاجی سعید صاحب اتالیق نواب مالیر کوٹلہ مع سرپرست حضرات اور دستار بندی ہونے والے طلبہ شامل ہوئے۔ اور اس روز مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی جن کو رپورٹ میں مجلس کا سرپرست لکھا گیا ہے، تقریر فرمائی اور یہی وہ مجلس ہے جس میں حضرت عثمانی کو حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب نے خاص نوازش سے شرف بخشا۔ مولانا عبید اللہ صاحب لکھتے ہیں :۔

"حضرت مولانا اشرف علی صاحب نے حضرت مولانا (محمد قاسم صاحب) مرحوم کی تصانیف کی طرف توجہ دلاتے ہوئے مولانا مولوی سید مرتضیٰ حسن صاحب سے فرمایا کہ مولوی شبیر احمد صاحب مدرس اول مدرسہ فتحپوری دہلی کو چونکہ مولانا مرحوم کی کتابوں سے ایک خاص مناسبت ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اپنا عمامہ ان کو دوں۔ آپ اس امر کا اعلان فرمادیں۔ مولوی مرتضیٰ حسن صاحب نے حضرت مولانا کی اس قدر افزائی کا اعلان فرمایا اس کے بعد حضرت سلطان العلماء (مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہند) مدظلہم سے اجازت لیکر مولانا اشرف علی صاحب عم فیضہم نے اپنا عمامہ مولوی شبیر احمد صاحب نے سر پر رکھا۔" (ارپورٹ صفحہ ۵۹، ۶۰)

دیوبند میں آمد یہ عزت افزائی کا واقعہ ہندوستان کے چیدہ علماء کے سامنے ہوا جس نے علامہ عثمانی کی شہرت اور عظمت کو چار چاند لگا دئیے۔ اس کے بعد ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ کو ایک اور میٹنگ ہوئی جس میں جمعیۃ الانصار کے تیس ارکان کے علاوہ حضرت شیخ الہند، مولانا مسعود صاحب گنگوہی صاحبزادہ حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ، مولانا عبدالرحیم صاحب رائے پوری وغیرہم شریک ہوئے۔ اس میں بھی علامہ عثمانی شریک تھے۔ یہ سب

مجالس اس زمانے میں ہوئیں جبکہ آپ کا تعلق ابھی دہلی سے تھا۔ لیکن اس کے بعد موصوف شوال ۱۳۲۸ھ میں دارالعلوم دیوبند میں تشریف لے آئے کیونکہ ان حالات میں کسی نے بھی آپ کا دہلی رہنا پسند نہ فرمایا وجہ یہ تھی کہ ان جیسے اہم کاموں کو انجام دینے کے لئے ایک قادرالکلام مقرر اور انشاء پرداز کی ضرورت تھی اور وہ ان دونوں باتوں میں پوری مہارت رکھتے تھے۔

شعبۂ تکمیل التعلیم کا افتتاح

بعدازاں ۱۵ر ذیقعدہ ۱۳۲۸ھ کو درجۂ تکمیل کا افتتاح ہوا۔ اب حضرت عثمانی دارالعلوم کے پروفیسر کی حیثیت سے دیوبند میں موجود ہیں۔ اس میں بھی آپ نے شرکت کی بلکہ اس کی رپورٹ خود مرتب کی۔ مولانا عبیداللہ صاحب رپورٹ میں لکھتے ہیں:

" ۱۵ر ذیقعدہ ۱۳۲۸ھ کو عام جلسے میں درجۂ تکمیل کا افتتاح ہوا، جس کی روداد مولانا شبیراحمد صاحب عثمانی معتمد جمعیۃ الانصار کی لکھی ہوئی درج کی جاتی ہے۔" (رپورٹ ص۶۲)

یہ پوری کی پوری درجۂ تکمیل کی رپورٹ حضرت عثمانی کی تحریر کی ہوئی مؤتمر الانصار مرادآباد کی روئداد میں درج ہے۔ جس میں اس کلاس کا نصاب درج ہے اور یہ بھی کہ اس درجہ کے طلبہ کے لئے ادب، تاریخ، تفسیر و کلام وغیرہ علوم کی مستند کتابوں کا مطالعہ، اردو عربی لٹریچر کی مہارت اور مناظرہ یا تدریس وغیرہ کی مشق کرنا واجبات میں سے قرار دیا گیا ہے اس میٹنگ کے بعد ۲۸ر ذیقعدہ ۱۳۲۸ھ میں ایک مختصر سا اجلاس ہوا تھا جس میں مختلف قواعد منظور کئے گئے تھے۔

مؤتمر الانصار مرادآباد

۱۵-۱۶-۱۷ر اپریل ۱۹۱۱ء مطابق ۱۳۲۹ھ

مولانا عثمانی دارالعلوم میں فرائض تدریس کے ساتھ کہ جس میں آپ کئی کئی گھنٹے مختلف کلاسوں کے پڑھاتے تھے جمعیۃ الانصار

کے کاموں میں بھی سرگرمی سے حصہ لے رہے تھے۔ گویا علمی، مذہبی، قومی وملی اور وطنی تمام ہی خدمات انجام دے رہے تھے۔ تاآنکہ الانصار کے ماتحت ہر سال میں کسی خاص شہر میں جلسوں کا کیا جانا بھی مقاصد میں آتا تھا اس لئے شوال ۱۳۲۸ھ میں مراد آباد کے چند ذی وجاحت حضرات کی کمیٹی کی تحریک سے ۱۵-۱۶-۱۷ اپریل کی تاریخیں مؤتمر الانصار کے لئے مقرر کی گئیں اور مراد آباد میں ہی پہلا جلسہ ہونا طے پایا۔ اس جلسے میں علامہ عثمانی نے اپنا معرکہ آرا مضمون "اسلام" کے عنوان سے پڑھا۔ ناظم جمعیۃ الانصار مؤتمر کے رپورٹر روداد میں لکھتے ہیں:۔

"آٹھ بجے مولانا مولوی شبیر احمد صاحب عثمانی دیوبندی کھڑے ہوئے اور اسلام کے عنوان پر اپنی تقریر شروع کی۔ یہ وہ زبردست تقریر ہے کہ جس کی کوئی بات دلائل عقلیہ سے خالی نہیں۔ فلسفہ وحکمت اور علم کلام کے ذریعہ سے جو آجکل تعلیمیافتہ گروہ کا تختۂ مشق ہیں ان تمام اعتراضات کو اٹھایا گیا جس کی نسبت مولوی حالی نے عربی تعلیم یافتہ گروہ کو بیکار سمجھ کر اپنے مسدس میں کہا تھا کہ وہ دلائل سے حقیقت اسلام اور ضرورت نبوت ورسالت کو بھی ثابت نہیں کرسکتے اور نہ ان کے پاس اس کا ذخیرہ ہے۔" (روداد ص ۸۴)

علامہ کا یہ مضمون ۱۵ر اپریل کے تیسرے اجلاس میں صبح کے وقت آٹھ بجے پڑھا گیا اور دس بجے ختم ہوا۔ اس جلسے میں علیگڈھ، ندوہ، دیوبند کے اکابر اور اعاظم رجال جمع ہوئے تھے، علامہ شبلی بھی موجود تھے۔ حضرت عثمانی کے اس مقالے کا سب پر اتنا زبردست اثر ہوا کہ ہندوستان کے عوام اور خواص طبقے میں ان کی عظمت وشہرت نے اس مقالے سے ہی ملک میں شہرت حاصل کی۔ آپ کی تقریر کے اثر کا نقشہ مولانا عبیداللہ صاحب رپورٹ میں اس طرح پیش کرتے ہیں:۔

"اکابر علماء نے اس تقریر کو جس ذوق وشوق سے سُنا اس کا اندازہ

اس امر سے ہو سکتا ہے کہ جس وقت مولانا محمد اشرف صاحب نے اپنا وعظ شروع کیا تمہیداً یہ بات فرمائی کہ جو دلائل عقلیہ وجود صانع حقیقی اور ضرورت نبوت و رسالت پر مولوی شبیر احمد صاحب نے بیان فرماتے ہیں میں اب ان سے زیادہ کیا کہہ سکتا ہوں۔ مولانا اشرف صاحب کا یہ فرمانا اگرچہ انکسار پر مبنی تھا لیکن اس میں شک نہیں کہ مولوی شبیر احمد صاحب نے جس خوبی اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ یہ تقریر فرمائی وہ تمام اہل علم حضرات کے دل پر نقش کالحجر ہو گئی ...... دس بجے یہ تقریر ختم ہوئی اور تمام حاضرین جلسہ نے مولوی شبیر احمد صاحب کی درازئ عمر کے واسطے دعا کی۔" (صحیفہ ۱)

مؤتمر الانصار کا یہ اجلاس مولانا عثمانی کی زندگی کو چمکانے کا سبب بن گیا۔ ملک کے زبردست اور جید علماء، لیڈر، رؤسا اور عوام سے تعارف کا موقع ملا اور ہندوستان میں شہرت کا ذریعہ بنا۔ اس وقت آپ کی عمر صرف چوبیس سال کی تھی۔ چوتھے اجلاس کے بعد عصر کی نماز پڑھ کر ایک خصوصی اجلاس اہل علم کا ہوا جس میں علامہ عثمانی نے تقریر فرمائی۔ رپورٹر لکھتے ہیں :۔

"بعد نماز عصر مولوی شبیر احمد صاحب کا وعظ وجود واجب الوجود اور بحث خلق افعال وغیرہ سے متعلق بالکل فلسفیانہ رنگ میں ہوا جو مخصوص اہل علم کے لئے تھا۔ اور انہوں نے نہایت دلچسپی کے ساتھ اس کو سنا۔" (رپورٹ صفحہ ۱۳۲)

اس تقریر سے اندازہ لگائیے کہ اتنے بڑے بڑے علماء میں ایک چوبیس سالہ نوجوان عالم ایک خالص علمی اور فلسفیانہ تقریر کر کے اکابر سے داد لیا قت لے رہا ہے۔

کراچی میں علامہ عثمانی کا آریوں سے مناظرہ

رمضان المبارک ۱۳۲۹ھ اکتوبر ۱۹۱۱ء

مؤتمر الانصار مراد آباد کے بعد علامہ آریوں سے مناظرہ کے لئے تشریف لے گئے۔ القاسم شوال

سنہ ۱۳۲۹ھ مطابق اکتوبر سنہ ۱۹۱۱ء میں اس مناظرے کی کارروائی کا حسب ذیل عبارت میں اظہار کیا گیا ہے۔ مدیر القاسم لکھتے ہیں :-

"کراچی میں آریہ جماعت کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا اور اس میں اہل اسلام سے مناظرہ کی قرارداد ہو گئی۔ تب انجمن ضیاء الاسلام کراچی کی جانب سے مولوی شبیر احمد صاحب دیوبندی عثمانی مدرس مدرسہ عالیہ دیوبند کی طلب میں تار آیا۔ چنانچہ مولوی صاحب موصوف ۲۲ ر رمضان کو کراچی روانہ ہوئے۔ اور وہاں بحمد اللہ مولوی صاحب کے نہایت مؤثر بیانات ہوئے جو بہت ہی دلچسپی سے سُنے گئے۔ اور اہل کراچی پر ان بیانات کا گہرا اثر پڑا اور مولوی صاحب ہی کی موجودگی میں جمعیۃ الانصار کی شاخ قاسم المعارف کا باضابطہ انعقاد و افتتاح ہوا۔ ۲۸ ر رمضان سنہ ۱۳۲۹ھ کو عین تراویح کے وقت سیکرٹری صاحب انجمن ضیاء الاسلام کا تار بدیں مضمون موصول ہوا کہ مولوی شبیر احمد صاحب نے نہایت کامیابی حاصل کی اور آج کی میل سے روانہ دیوبند ہو گئے۔ ۳۰ ر رمضان کو دس بجے دن کے مولوی صاحب موصوف بخیریت تمام دیوبند پہنچے۔ والحمد للہ علیٰ ذالک"

(القاسم شوال سنہ ۱۳۲۹ھ ص ۵)

آپ کی شہرت کے نتیجے میں اہل کراچی نے آپ ہی کو مناظرے کے لئے منتخب کیا۔ حالانکہ رمضان مبارک کا مہینہ تھا لیکن اس مشقت کو برداشت کیا اور نور وز برابر سفر میں رہے۔ اسی عبارت سے ظاہر ہے کہ آپ کی وجہ سے وہاں جمعیۃ الانصار کی شاخ قاسم المعارف قائم ہوئی۔

مؤتمر الانصار میرٹھ ۱۸ ربیع الثانی سنہ ۱۳۳۰ھ ۷ اپریل سنہ ۱۹۱۲ء

مراد آباد کے جلسے سے ٹھیک ایک سال بعد جمعیۃ الانصار کا ایک جلسہ

میرٹھ صدر میں ۱۷-۱۸-۱۹ ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ مطابق ۶-۷-۸ اپریل ۱۹۱۲ء کو منعقد ہوا۔ اس جلسے کی کارروائی مولانا سراج احمد صاحب نائب ناظم جمعیۃ الانصار و نائب مدیر رسالہ القاسم جمادی الاولیٰ ۱۳۳۰ھ میں شائع کی ہے۔ یہ جلسہ تین دن رہا اور کل پانچ نشستوں میں ختم ہوا۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی جلسہ کے صدر تھے لیکن مولانا احمد حسن صاحب کا اس سے پہلے ہی ۱۳۳۰ھ میں انتقال ہو چکا تھا جنہوں نے مراد آباد کے مؤتمر الانصار کی صدارت بھی فرمائی تھی اور تقریر بھی کی۔ آپ کے علاوہ مولانا محمد ابراہیم صاحب دہلوی، مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوری کی دوسرے اجلاس میں تقریریں ہوئیں۔ ۸ ربیع الثانی بروز اتوار تیسرے اجلاس میں مولانا عثمانی کی تقریر ہوئی۔ مولانا سراج احمد صاحب لکھتے ہیں:-

"مولوی قاری محمد شفیع بڈھانوی کی تلاوت کلام مجید سے آغاز جلسہ ہوا۔ آپ نے قرأت سبعہ میں قرآن شریف۔ پھر مولوی قاری احمد موسیٰ صاحب امام جامع مسجد کلکتہ نے عربی لہجہ میں اور پھر چند طلبائے دارالعلوم دیوبند نے مختلف قراءتوں میں کلام مجید پڑھا جس سے اہل جلسہ پر ایک خاص اثر اور وارفتگی کا عالم تھا۔ اس کے بعد مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی دیوبندی مدرس دارالعلوم دیوبند نے اپنی وہ تقریر شروع کی جس کا عنوان "الدار الآخرۃ" ہے۔ عنوان بتلا رہا ہے کہ مضمون کیسا کچھ دقیق ہوگا۔ ادھر مولانا کا طرز تقریر و تحریر فلسفیانہ۔ مشکل تھا کہ عوام اس مضمون سے متمتع ہوتے۔ مگر جہاں مولانا کی تقریر فلسفیانہ ہے وہاں خدائے تعالیٰ کے فضل سے طرز ادا بھی ایسی عام فہم ہے کہ اس کی نظیر دوسری جگہ مشکل سے مل سکتی ہے۔ آپ نے دار آخرت کے ثبوت اور ضرورت پر تسکین بخش بحث فرمائی۔ اور درمیان میں بضرورت

اثبات مدعا ابطال تناسخ پر متعدد دلائل قائم کئے۔ آپ کی تقریر سے مؤتمر الانصار اور دار العلوم دیوبند کی ایک خاص شان ہویدا تھی اور سامعین محو حیرت تھے۔ اس کے بعد حضرت طبیب امت مولانا مولوی اشرف علی صاحب مدظلہم العالی کا وعظ شروع ہوا ...... وعظ شروع کرنے سے پہلے مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کو اپنے برابر کھڑا کیا اور فرمایا "میں اپنے چھوٹوں کو بھی بڑا سمجھتا ہوں۔ اگر میرا کوئی معتقد نہ مانے تو وہ جانے۔ میں تو یہی خیال کرتا ہوں۔ یہ مولوی شبیر احمد صاحب جن کی تقریر آپ نے سُنی ہے میرے چھوٹے ہیں مگر میں ان کو بڑا سمجھتا ہوں۔ ان کی ذات سے ہمیں امید ہے کہ یہ سب کچھ کرلیں گے۔ اب ہم کو موت کا ڈر نہیں رہا، کیونکہ ہماری جماعت میں کام کے آدمی پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ بعدہٗ مولانا نے دعا کی۔ بعدہٗ خطبہ ماثورہ پڑھ کر وعظ شروع کیا کہ میرا یہ بیان گویا مولوی شبیر احمد کی تقریر کا تتمہ ہے۔"

(القاسم دیوبند جمادی الاولی ۱۳۳۰ھ ص ۳۸ و ۳۹)

جمعیۃ الانصار کے سالانہ اجلاس میرٹھ صدر میں بھی علامہ موجود ہیں اور ان کے مقالے کا جو اثر علماء و خواص و عوام اور بالخصوص حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب پر ہوا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ حضرت عثمانی کی یہ بڑی سعادت ہے کہ وہ ہر جلسے میں مولانا تھانوی سے داد اور دعا وصول کر رہے ہیں اور خواص و عوام میں مقبول ہو رہے ہیں۔ آپ کا یہ مقالہ رسالہ القاسم جمادی الاولی ۱۳۳۰ھ اور القاسم ماہ رجب ۱۳۳۰ھ کے صفحات پر دو قسطوں میں شائع ہوا ہے، اور جس کے بعض اقتباسات ہم نے تجلیات عثمانی میں پیش کئے ہیں۔

ان جلسوں میں بعض اکابر کو چھوڑ کر جتنا مولانا عثمانی کو سراہا گیا ہے اتنا روئداد

مؤتمر میں اور القاسم میں کسی اور کو نہیں سراہا گیا۔ ہر جلسے میں انہی کا طوطی بولتا نظر آتا ہے۔ آپ کے بڑے بھائی مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مدیر القاسم نے آپ کے اس مقالے کے اول میں ناظرین القاسم سے مقالے کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے:

"مضمون ذیل عزیز مولوی شبیر احمد سلمہ نے اجلاس مؤتمر الانصار میرٹھ میں پڑھا تھا۔ چونکہ یہ ایک مفید اور کار آمد مضمون ہے اور بعض بہی خواہانِ قوم کا تقاضا بھی ہے اس لئے القاسم میں اس کا درج کرنا قرین مصلحت معلوم ہوا۔" (مدیر) (القاسم جمادی الاولیٰ ۱۳۳۰ھ ص ۹)

علامہ نے یہ مقالہ جلسے سے تین روز پہلے لکھا تھا۔ چنانچہ اس کی تمہید میں لکھتے ہیں:

"ہمارے محترم بزرگ مولانا عبید اللہ ناظم جمعیۃ الانصار جنہوں نے کسی نامعلوم مصلحت اور حسن ظن کی بنا پر یہ عنوان میرے سپرد کیا ہے اس کے گواہ ہیں کہ میں نے اس مضمون کے لکھنے سے کس وقت تک اور کس حد تک پہلوتہی کی ہے لیکن آخر مولائے موصوف کے تقاضے میرے تکاسل اور تقاعد پر غالب آئے اور جلسے سے تین روز پہلے بنام خدا یہ تحریر لکھنا شروع کی۔"

بہر حال ایک سوانح نگار کی حیثیت سے ان تاریخی جواہر پاروں کو میں ترتیب کے ساتھ جڑ رہا ہوں کہ قارئین کو موصوف کے کارناموں اور مذہبی، علمی، دینی اور قومی خدمات کا اندازہ ہو سکے۔

جمعیۃ الانصار کا علمی جلسہ شملے میں ۱۳۳۱ھ ۱۹۱۳ء

جس طرح مراد آباد اور میرٹھ کے حضرات کی خواہشات اور کوششوں سے ان دونوں مقامات پر جمعیۃ الانصار کے جلسے منعقد ہوئے

اسی طرح اہل شملہ کی خواہشات پر جمعیۃ الانصار کا علمی جلسہ ۹ - ۱۰ - ۱۱ / اگست ۱۹۱۳ء مطابق شعبان ۱۳۳۱ھ میں منعقد ہوا۔ مولانا مظہر الدین شیرکوٹی شہید سفیر جمعیۃ الانصار کی شملے میں تقریریں ہوئیں۔ اور انہی کی مساعی سے علمائے دیوبند وہاں پہنچے۔ ۸ / اگست کو شملہ کے اسٹیشن پر وفد علمائے دیوبند کا اتنا زبردست استقبال ہوا کہ اس سے پہلے ایسا شاندار استقبال کسی کا نہ ہوا تھا۔ شملہ اسٹیشن بھرا ہوا تھا کہ دو بجکر دو منٹ پر کلکتہ میل اسٹیشن پر پہنچی۔ یہ وفد اتر کر میر نادر حسین صاحب رئیس شملہ کے یہاں ٹھہرا۔ سالار وفد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی تھے۔ آپ کی گاڑی کو آدمیوں نے کھینچنا چاہا لیکن آپ نے منع فرمادیا۔ اس جلسے کے چھ اجلاس ہوئے۔ پہلا اجلاس بعد نماز جمعہ ۹ / اگست کو ۲ بجے سے پانچ بجے تک ہوا۔ پہلے خان بہادر کرنل عبد المجید خان نے دار العلوم دیوبند کے برکات اور خدمات پر تقریر فرمائی۔ اس جلسے میں اتفاق سے شیخ الاسلام افغانستان بھی موجود تھے جو دیوبند کے فاضل تھے بعد ازاں حکیم الامت نے تقریر فرمائی جس نے لوگوں پر جادو کا کام کیا۔ دوسرے اجلاس میں مولانا سید محمد انور شاہ صاحب نے قرآن شریف کے اعجاز اور عربی زبان کی ضرورت پر تقریر فرمائی۔ تیسرے اجلاس میں مولانا مرتضیٰ حسن صاحب نے اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وعظ فرمایا اور ان کے بعد مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے معجزات کی بحث پر ایک زبردست مدلل تقریر فرمائی۔ چوتھے اجلاس میں مولانا محمد سہول صاحب نے علم کے فضائل اور مولانا مرتضیٰ حسن صاحب نے تعلیم نسواں پر تقریر فرمائی۔ پانچویں اجلاس میں مولانا عبید اللہ صاحب سندھی نے "مسلمانوں کو مذہبی تعلیم کی ضرورت" پر تقریر فرمائی۔ بعدہٗ مولانا تھانوی نے "تکمیل فلاح دارین کے وسائل" پر وعظ فرمایا۔

عبد القادر صاحب جن کی مذکورہ بالا رپورٹ القاسم رمضان ۱۳۳۱ھ میں چھپی ہے وہ اپنی اسی رپورٹ میں آگے چل کر لکھتے ہیں :۔

"یہ (پانچواں) اجلاس آخری تھا اور اس کے بعد کوئی وقت پروگرام میں نہیں دیا گیا تھا لیکن سامعین کے بے حد اصرار پر مولانا مظہر الدین صاحب نے ساڑھے نو بجے شب کے جلسے کا اعلان کیا جس میں مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ پر نہایت پُر مغز اور موثر تقریر فرمائی۔ آپ نے یہ ثابت کر دکھایا کہ عقلاً و نقلاً اگر کوئی مذہب حق ہو سکتا ہے تو وہ اسلام ہے۔" (القاسم رمضان ۱۳۳۱ھ ص ۶)

یہ جلسہ نہایت ہی عظمت اور کامیابی سے ختم ہوا اور علمائے دیوبند ۱۲ اگست کو شملے سے دیوبند واپس ہوئے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان اجلاسوں میں بعض حضرات کی اگرچہ دو دو تقریریں ہوئیں لیکن پانچویں اجلاس پر پروگرام ختم ہو جانے کے باوجود اہلِ شملہ نے جس فاضل کی تقریر کے لئے دوبارہ پوری تمنا اور خواہش سے اصرار کیا وہ علامہ عثمانی تھے۔ یہاں مجھے پھر اطلاع دینی ہے کہ علامہ اس جلسے میں بھی برابر شریک ہیں اور لسانی جہاد میں مصروف ہیں اور وہ کسی جلسے سے بھی پیچھے نہیں رہے۔ جس سے ان کی سرگرمیاں اور محنت پسندیاں مترشح ہوتی ہیں۔

شملہ میں جمعیۃ الانصار کا ایک اور جلسہ شعبان ۱۳۳۲ھ اگست ۱۹۱۴ء

جمعیۃ الانصار کا یہ جلسہ ۲۷-۲۸-۲۹ شعبان ۱۳۳۲ھ مطابق ۱-۲-۳ اگست ۱۹۱۴ء کو پھر دوبارہ اہلِ شملہ کی خواہش پر شملہ میں منعقد ہوا۔ اس وفد میں مولانا مرتضیٰ حسن صاحب، مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، مولانا سراج احمد صاحب، مولانا عبد السمیع صاحب اور مولانا مظہر الدین صاحب تھے۔ پہلا اجلاس یکم اگست کو بعد نماز جمعہ ہوا۔ دوسرا اجلاس رات کو جس میں مولانا سراج احمد صاحب اور مولانا عبد السمیع صاحب نے تقریریں کیں۔ تیسرا اجلاس ہفتہ کو ۲ بجے ہوا اس میں علامہ عثمانی کی تقریر ہوئی۔ اس جلسے کے رپورٹر عبد القادر

صاحب تائب مینیجر آرمی پریس شملہ تحریر فرماتے ہیں :۔

"فصیح البیان مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کا "برکات رمضان شریف" پر وعظ شروع ہوا ۔ آپ کی تقریر نہایت دلفریب تھی اور ہر ہر جملے سے فصاحت ٹپکتی تھی ۔ علمی نکات کا ذہن نشین کرنا آپ کا حصہ تھا ۔ ۳/ اگست کے جلسے میں پہلے مولانا عبدالسمیع صاحب نے وعظ فرمایا اور بعد کو مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے "حدوث عالم" پر اپنی مدلل تقریر شروع کی ۔ اگرچہ مضمون فلسفی اور نہایت خشک تھا مگر آپ کی صاف بیانی نے مجمع پر وہ جادو کیا کہ سب محو حیرت تھے ۔ زور کلام سے سامعین نقش تصویر کی طرح خاموش تھے ۔ کہیں کہیں آپ کی تمثیلیں اس غضب کی تھیں کہ لوگ پھڑک اٹھتے تھے ۔ الحمد للہ کہ یہ جلسہ بخیر و خوبی ختم ہوگیا ۔ لیکن سامعین کا شوق پورا نہ ہوا ۔ چنانچہ نو تعلیم یافتہ گروہ کی طرف سے یہ درخواست کی گئی کہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی ایک تقریر ہمارے تنزل و ترقی کے اسباب پر آج بعد مغرب فرمائیں ۔ مولانا نے اس کو منظور بھی فرمالیا لیکن بعد میں خیال آیا کہ آج ۲۹ شعبان ہے اور چاند ہونے کا احتمال ہے اس لئے یہ آرزو پوری نہ ہوسکی ۔ اور اگلے روز مسلمانان شملہ کو حضرات دیوبند سراپا حسرت وارمان بنا کر رخصت ہوگئے ۔"

عبدالقادر تائب

مینیجر آرمی پریس شملہ

تائب صاحب کی رپورٹ آپ کے سامنے ہے ۔ اس سال کے جلسۃ الانصار میں بھی علامہ اپنی پوری شان امتیازی سے شریک تھے ۔ آپ کی دو تقریریں ہو چکنے کے باوجود اہل شملہ نے آپ سے ایک اور تقریر کرنے کی خواہش کی ہے ۔ یہ بار بار کی

فرماتشیں آپ کے علم، تقریر کی بلند پروازی اور دلربائی کے نشانات بتلا رہی ہیں۔
لیکن اس وفد میں مولانا عبید اللہ صاحب سندھی نظر نہیں آرہے ہیں۔ خدا خیر کرے کہیں جمعیۃ الانصار نظرِ بد کا شکار ہوتی تو نظر نہیں آتی۔ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ تاہم انشاء اللہ ابھی ظہور میں آیا جاتا ہے۔ اس راز سے پردہ اٹھانے سے پہلے مجھے یہ کہنا ہے کہ علامہ کے حالات کے سلسلے میں ترتیب وار بعض ذاتی سوانح اور بھی بیان کرنے تھے کہ مؤتمر الانصار کے سن وار حالات کا سلسلہ توڑنا پسند نہ آیا اور بعض وہ حالات رہ گئے جن کو سنہ ۱۳۲۸ھ کے ماتحت پیش کیا جانا تھا۔ کیونکہ جمعیۃ الانصار کے ساتھ علامہ عثمانی کی بقیہ کوششوں کو آخری تک بیان کرنے کی ضرورت پیش نظر ہے۔ اس لئے اسے ختم کرلیں تو آگے بڑھیں۔ ہاں تو شملہ کے اس آخری جلسہ میں ناظم جمعیۃ الانصار، برات کے دولہا، مولانا عبید اللہ غائب ہیں۔ اور پھر پورا سال ہوچکا کوئی میٹنگ، کوئی مؤتمر الانصار اور کوئی اس کی کارروائی القاسم میں اور نہ روئداد میں نظر آئی۔
اتنی شوراشوری اور یہ بے نمکی پر شبہات کا ہونا اور وسوسوں کا گذرنا لازمی امر ہے۔ آخر برات کا دولہا کہاں غائب ہوا۔ بالآخر ان کا پتہ چلا کہ دہلی میں موجود ہیں

جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

مولانا سندھی کی کہانی خود ان کی اپنی زبانی

دیوبند سے مولانا سندھی دہلی چلے گئے۔ آپ کا ایک بیان اخبار الجمعیۃ دہلی میں شائع ہوا تھا۔ اور پھر رسالہ قائد مراد آباد کے ربیع الاول کے پرچے میں

نکلا ۔ یہ بیان آپ نے ہندوستان کی طویل جلاوطنی سے واپسی کے بعد دیا تھا جو حسب ذیل ہے :۔

"۱۳۲۷ھ میں حضرت شیخ الہند نے مجھے دیوبند طلب فرمایا اور مفصل حالات سُن کر دیوبند رہ کر کام کرنے کے لئے حکم دیا ۔ چار سال تک جمعیۃ الانصار میں کام کرتا رہا ۔ اس تحریک کی تاسیس میں مولانا محمد صادق سندھی اور مولانا ابومحمد صاحب لاہوری اور عزیزی مولوی احمد علی میرے ساتھ شریک تھے ۔ پھر حضرت شیخ الہندؒ کے ارشاد سے میرا کام دیوبند سے دہلی منتقل ہوا ۔ ۱۳۳۱ھ ۱۹۱۳ء میں نظارۃ المعارف قائم ہوئی ۔ شیخ الہند کے ساتھ حکیم اجمل خاں اور نواب وقار الملک ایک ہی طرح شریک تھے ۔

حضرت شیخ الہند نے اس طرح چار سال دیوبند میں رکھ کر میرا تعارف اپنی جماعت سے کرایا تھا ۔ اسی طرح دہلی بھیج کر مجھے نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے اس غرض کی تکمیل کے لئے دہلی تشریف لائے اور ڈاکٹر انصاری صاحب سے میرا تعارف کرایا ۔ ڈاکٹر انصاری نے مجھے مولانا ابوالکلام آزاد مولانا محمد علی مرحوم سے ملایا ۔ اس طرح تخمیناً دو سال مسلمانان ہند کی اعلیٰ سیاست سے واقف رہا ۔ ۱۳۳۳ھ ۱۹۱۵ء میں شیخ الہند کے حکم سے کابل گیا ۔ مجھے کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا گیا ۔ اس لئے میری طبیعت اس ہجرت کو پسند نہیں کرتی تھی لیکن تعمیل حکم کے لئے جانا ضروری تھا ۔ خدا نے اپنے فضل سے نکلنے کا راستہ صاف کر دیا اور میں افغانستان میں پہنچ گیا ۔ دہلی کی سیاسی جماعت کو میں نے بتایا کہ میرا کابل جانا طے ہو چکا ہے انہوں نے بھی اپنا نمائندہ بنا دیا

مگر کوئی معقول پروگرام وہ بھی نہ بتا سکے۔ کابل جاکر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ جس جماعت کے نمائندے تھے اس کی پچاس سال کی محنتوں کا حاصل میرے سامنے غیر منظم شکل میں تعمیل حکم کے لئے تیار ہے۔ اس میں میرے جیسے ایک خادم شیخ الہند کی اشد ضرورت تھی۔ اب مجھے اس ہجرت اور شیخ الہند کے اس انتخاب پر فخر محسوس ہونے لگا۔"

مذکورہ بالا بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الہند کے حکم پر مولانا عبیداللہ دہلی چلے گئے۔ وہاں ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں اور مولانا محمد علی وغیرہم سے ملاقاتیں ہوئیں اور انقلاب و سیاست کا دھارا دوسری طرف کو بہنے لگا۔ جمعیۃ الانصار کی بجائے اب " نظارۃ المعارف " کی بنیاد ڈالی گئی مگر یہ انجمن سازیاں، یہ جمعیۃ الانصار کے جلسے، یہ ملک میں مذہبی بیداری کی رُوح نہیں بلکہ صُور کیوں پھونکا جارہا ہے۔ اس کی کیفیت حکومت برطانیہ کی رولٹ ایکٹ کمیٹی کی رپورٹ سے سُنئے۔ کمیٹی لکھتی ہے :-

ریشمی خطوط کی سازش یا تحریک :

" اگست ۱۹۱۶ء میں اس سازش کا انکشاف ہوا جو گورنمنٹ کے کاغذات میں ریشمی خطوط کی سازش کہلاتی ہے۔ یہ ایک تجویز تھی جو ہندوستان میں تیار کی گئی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ شمالی مغربی سرحد سے ایک حملہ ہو۔ ادھر ہندوستان کے مسلمان اٹھ کھڑے ہوں اور سلطنت برطانیہ کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔ اس تجویز پر عمل کرنے اور اس کو تقویت دینے کے لئے ایک شخص مولوی عبیداللہ نے اپنے تین رفقاء فتح محمد اور محمد علی وغیرہ کو ساتھ

لیکر اگست ۱۹۱۵ء میں شمالی مغربی سرحد کو عبور کیا۔ عبید اللہ سکھ سے مسلمان ہوا ہے اور صوبہ جات متحدہ کے ضلع سہارنپور میں مسلمانوں کے مذہبی مدرسہ دیوبند میں اس نے مولوی کی تعلیم پائی تھی وہاں اس نے اپنے جنگی اور خلاف برطانیہ خیالات سے عملۂ مدرسہ کے خاص لوگوں اور کچھ طلبہ کو متأثر کیا اور سب سے بڑا شخص جس نے اس پر اثر ڈالا وہ مولانا محمود الحسن تھا جو سکول میں بہت دیر تک ہیڈ مولوی رہ چکا ہے۔ عبید اللہ چاہتا تھا کہ دیوبند کے مشہور مدرسہ کے تعلیم یافتہ مولویوں کی رفاقت سے تمام ہندوستان بھر میں ایک عام اسلامی جوش اور مسلمانوں میں برطانیہ کے خلاف تحریک پھیلا دے لیکن اس کی تجاویز کے راستے میں مدرسے کے مہتمم اور انجمن کے لوگ سد راہ ہوتے۔ انہوں نے اسے اور اس کے چند ساتھیوں کو مدرسہ کی ملازمت سے برخاست کر دیا۔"

رولٹ ایکٹ کا تجزیہ

رولٹ ایکٹ کمیٹی کی مذکورہ بالا رپورٹ میں یہ بتایا گیا ہے کہ مولانا عبید اللہ اس انقلاب کے بانی تھے' یہ غلط ہے بلکہ خود مولانا عبید اللہ صاحب کا بیان کہ شیخ الہند نے مجھے ۱۳۲۷ھ میں کام کرنے کے لئے بلایا تھا رولٹ ایکٹ کمیٹی کی رپورٹ کی تغلیط کرتا ہے۔ کمیٹی کا یہ خیال بھی غلط ہے کہ مولانا عبید اللہ کو برخاست کیا گیا بلکہ وہ مدرسہ کے ملازم ہی نہ تھے۔ ہاں دیوبند کے فاضل اور شیخ الہند کے جاں نثار اور معتمد ہونے کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اور محرک خود شیخ الہند تھے۔ چنانچہ مولانا سندھی کو جب کابل بھیجا گیا تو انہیں اپنے پروگرام کا خود پتہ نہ تھا لیکن جب وہ وہاں پہنچ گئے تو پھر ان کے سامنے وہ تمام سکیم آ گئی جو شیخ الہند چلانا چاہتے تھے۔

شیخ الہند کی سکیم

رولٹ ایکٹ کمیٹی کا یہ بیان درست ہے کہ شیخ الہند ہندوستان سے حکومت برطانیہ کا بستر گول کرانا چاہتے تھے۔ اور اس کے لئے قبائلی علاقے کے پٹھانوں، کابل، ایران اور ترکی حکومت میں اتحاد پیدا کرکے ان کے تعاون سے انگریزوں کا تختہ الٹنا چاہتے تھے۔ اسی سلسلے میں شیخ الہندؒ ۱۹۱۶ء / ۱۳۳۴ھ میں حج کے ارادے سے حجاز تشریف لے گئے۔ وہاں مکہ معظمہ کے ترکی گورنر غالب پاشا سے ملے اور تمام سکیم سے ان کو آگاہ کیا۔ اور ان کی وساطت سے انور پاشا اور جمال پاشا سے مدینہ منورہ میں جبکہ وہ بعض جنگی ضروریات کے باعث اتفاقاً وہاں آئے تھے ملاقات ہوئی تھی اور انہوں نے بھی شیخ کی تجویزوں سے اتفاق کیا تھا۔ ان حضرات کی رائے یہ تھی کہ شیخ الہند خود ترکستان ایران اور کابل کے راستے قبائلی علاقے میں پہنچیں لیکن ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ کرنل لارنس نے شریف حسین والی مکہ کو ہموار کرلیا۔ حجاز میں اس وقت ترکی اقتدار تھا لیکن شریف حسین نے ترکوں سے غداری کی اور اس طرح انگریزی اقتدار نے حجاز میں پاؤں جما لئے اور ترکوں کی حکومت حجاز سے ختم ہوگئی۔ حضرت شیخ الہند حجاز سے باہر نکلنے کی کوشش میں ناکام رہے اور بالآخر حکومت برطانیہ کے اشارے پر شریف مکہ نے ان کو گرفتار کرکے انگریزوں کے حوالے کردیا۔ تفصیلات کے لئے حضرت مولانا حسین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا سفر نامہ "اسیر مالٹا" اور "مسلمانوں کا روشن مستقبل" اور حضرت میاں سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حیات شیخ الہند ملاحظہ فرمائیے۔ بالآخر شیخ الہند کو انگریزوں نے مالٹا میں اسیر کردیا اور آپ پانچ سال تک نظر بند رہ کر پھر دیوبند تشریف لائے۔ اس تحریک کے ضمن میں یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ آزادی کے پہلے علمبردار شیخ الہند جن کے بنیادی تصورات پر مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں اور

مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ نے آزادیٔ ہند کی تعمیر بلند کی۔

جمعیۃ الانصار کا انجام

جمعیۃ الانصار نے علمائے دیوبند کے ذریعہ ہندوستان کے علماء، لیڈروں، عظما اور مقتدر طبقے میں ایک اسلامی جوش برپا کر دیا۔ یہی وہ زینہ تھا جس کے ذریعہ شیخ الہند بام آزادی پر چڑھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جمعیۃ الانصار کے چند جلسوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔

ان جلسوں کے ضمن میں مختلف ریزولیوشنوں کے ذریعہ گورنمنٹ برطانیہ کی وفاداری کا اظہار اور اس کے زیر سایہ مذہبی آزادی کے شکریے کے تار بھیجے گئے جیسا کہ روئداد مؤتمر الانصار اور روئداد جلسہ ہائے شملہ کی تجویزوں میں یہ چیزیں موجود ہیں لیکن گورنمنٹ برطانیہ ان جلسوں سے چوکنی ضرور تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس مدرسے کے بانی مولانا محمد قاسم صاحب انگریزی حکومت کے سخت مخالفین میں سے تھے جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شاملی میں اپنے رفقاء کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف جہاد کیا تھا اور انہیں کے نقش قدم پر شیخ الہند چل رہے تھے۔ چنانچہ مکہ معظمہ سے گرفتار کر کے جب آپ کو قاہرہ لے جایا گیا اور وہاں شیخ الہند سے سوال و جواب کیے گئے تو ان میں سے ایک سوال یہ بھی تھا:۔

سوال انگریز آفیسر : مولوی عبید اللہ نے دیوبند میں جمعیۃ الانصار کیوں قائم کی تھی۔

جواب شیخ الہند : مدرسہ کے مفاد کے لئے۔

سوال : پھر کیوں علیحدہ کیا گیا۔

جواب : آپس کے اختلاف کی وجہ سے۔

سوال: کیا اس کا مقصد اس جمعیۃ سے کوئی سیاسی تھا۔

جواب: نہیں۔

بہر حال جمعیۃ الانصار سے حکومت کے دل میں بے اطمینانی تھی۔ یہ معاملات آگے بڑھ رہے تھے کہ مہتمم صاحبان نے بڑھتی ہوئی سیاسی کارروائیوں کی مخالفت تو نہیں کی لیکن مدرسہ کے بچاؤ کے لئے یہ ضرور چاہا کہ مدرسہ مسلمانوں کی متاع عزیز ہے اگر یہ بند ہو گیا تو پھر مسلمانوں میں دینی تعلیم پھیلانے کا سرچشمہ بند ہو جائے گا اس لئے مدرسے کے اندر اس راہ سے آزادی کی سرد جنگ کو آگے بڑھنے سے روکنے کی ضرورت تھی۔ شیخ الہند بھی غلط راہ پر نہ تھے، وہ خیال کرتے تھے کہ استاذ محترم مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد دیوبند کے مدرسے سے جہاں تعلیم دین کی اشاعت تھا وہاں حضرت مولانا سید احمد صاحب شہید بریلوی اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحب دہلوی جیسے لوگوں کے جذبۂ جہاد اور روحِ حریت کو برقرار رکھنا بھی تھا اس لئے مہتمم صاحبان کے نزدیک مدرسہ کی حفاظت اور شیخ الہند کے نزدیک دین کے ساتھ جذبۂ جہاد و آزادی کی روحانیت کے برقرار رکھنے میں ایک گونہ نظریاتی اختلاف پیدا ہونا لازمی بات تھی۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات کو پسند نہ فرمایا اور مولانا عبید اللہ صاحب کو دیوبند سے دہلی بھیجدیا اور جمعیۃ الانصار کو نظارہ المعارف میں تبدیل کر دیا۔ اس صورت کو رولٹ ایکٹ کمیٹی کے ارکان نے مولانا عبید اللہ اور ان کے ساتھیوں کو دیوبند کی ملازمت سے برخاست کر دینے کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔

مسلمانوں کا جمعیۃ الانصار سے تعلق جمعیۃ الانصار کے جلسوں سے مسلمانوں میں عام بیداری اور اسلامی جوش پیدا ہو چکا تھا۔ مولانا عبید اللہ دیوبند سے جا چکے تھے۔ جلسے بھی رفتہ رفتہ بند

ہو گئے تھے۔ شملہ کے بعد جمعیۃ الانصار کا کوئی جلسہ نہ ہوا۔ یہ آخری جلسہ ۱۳۳۱ھ ۱۹۱۳ء میں ہوا تھا اس لئے مسلمانوں کی ایک تعداد نے دیوبند خطوط بھیجے اور دریافت کیا کہ جمعیۃ الانصار کے جلسے کیوں نہیں ہوتے۔ مسلمانان ہندوستان کی طرف سے یہ استفسار یقیناً درست تھا۔ لیکن ذمہ داران دارالعلوم نے اس کا کیا جواب دیا اس کی حقیقت کا پتہ چلانا ہمارے لئے ضروری ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے لئے دارالعلوم دیوبند کے رسالے "القاسم" کے پرچوں سے زیادہ اور کوئی چیز رہبری نہیں کر سکتی چنانچہ تجسس اور ریسرچ سے ہمیں استاذ محترم مولانا سراج احمد صاحب مرحوم کا مضمون مل گیا جو اس وقت جمعیۃ الانصار کے نائب ناظم اور القاسم کے نائب مدیر اور دیوبند کے اعلیٰ مدرسین میں سے تھے۔ لکھتے ہیں :-

" مدت سے القاسم کے صفحات جمعیۃ الانصار کے تذکروں سے خالی ہیں۔ عرصہ سے اس کا کوئی کارنامہ مسلمانوں کے روبرو پیش نہیں ہوا سال گذشتہ میں مؤتمر الانصار کا اجلاس کہیں منعقد نہ ہونے سے بہت سے دردمندوں کو اس کے وجود سے وساوس پیدا ہونے لگے۔ اس پر جناب مولوی عبیداللہ صاحب کی جمعیت سے علیحدگی ان وساوس کی پیدائش کا کہا جاتا ہے اچھا خاصا ذریعہ بن گئی۔ یہاں سے علیحدگی کے بعد مولوی عبیداللہ صاحب کے دہلی میں اپنی نئی انجمن قائم کرنے سے اور دو غلط فہمیوں کا فتح باب ہوا۔ کسی کو کہیں سے یہ خبر ملی کہ جمعیۃ الانصار کا خاتمہ ہو لیا۔ اس کی بجائے دہلی میں "نظارۃ المعارف" قائم ہو گئی۔ کسی کو یہ اطلاع پہنچی کہ نظارۃ جمعیت کا ایک شعبہ ہے جو بعض مصالح کی بنا پر دہلی میں قائم کیا گیا ہے۔ بعض احباب نے بزرگان دارالعلوم سے مل کر زبانی طمانیت حاصل کر لی اور بعض دوستوں نے مراسلات کے ذریعہ سے [illegible] کی اصلیت معلوم کی مگر عام مسلمانوں کو رفع غلط فہمی کا کوئی

موقع نہیں ملا ادھر استفسارات بھی زائد ہیں مصلحت ہے کہ مختصراً اس کے متعلق کچھ عرض کیا جائے۔

جمعیۃ الانصار خدا کے فضل سے زندہ ہے۔ سال گذشتہ میں چونکہ جنگ بلقان کی وجہ سے ترک مظلوموں کی امداد کی طرف عامۂ مسلمین متوجہ تھے۔ ہر شہر، قصبہ اور اکثر دیہات میں ہلال احمر کی انجمنیں قائم تھیں، وفود جا بجا پھرتے تھے اور خود دارالعلوم دیوبند اور اس کی جماعت کے اجزاء اس کارِ خیر کے لئے وقف تھے اس لئے قرین مصلحت نہ تھا کہ عامۂ مسلمین کو دوسرے کسی خیال کی طرف متوجہ کردیا جائے اور درحقیقت جو حضرات مؤتمر الانصار کے کارکن ہوتے ان کو اتنی فرصت کہاں تھی اور مظلوم ترکوں کی مرثیہ خوانی کے سوا کوئی دوسرا خیال کب ان کے دلوں میں خطور کرسکتا تھا چنانچہ چند اخباروں میں مؤتمر الانصار کے جلسہ نہ ہونے کا موجبہ اعلان کردیا گیا تھا۔ کیا ان کو یہ معلوم نہیں کہ دارالعلوم دیوبند کی آمدنی ایک مدت تک بند رہی اور جمعیت کے سفرا کے روزنامچوں اور بہیوں میں بجائے رقوم اور ہندسوں کے صفر رہ گیا۔ بدقسمتی سے اسی پُر آشوب زمانے میں جناب مولوی عبیداللہ صاحب جمعیت کی نظامت سے علیحدہ ہوئے اور نہ صرف نظامت سے علیحدہ بلکہ اپنی جماعت سے مفارقت گوارا فرما کر اور ایسے نازک وقت میں جمعیت کو زیر بار چھوڑ کر دہلی میں نظارۃ المعارف قائم کرلی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ؂

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

جمعیت کے اراکین مجلس انتظامیہ نے اپنا جلسہ منعقد کیا اور بہت گفت د

شنید کے بعد یہ طے کیا کہ جمعیت دارالعلوم کی فرع (شاخ) ہے اور اصل کی بقا سے فرع باقی رہ سکتی ہے۔ نیز دارالعلوم کی مالی امداد کرنا جمعیت کا اولین فرض ہے اس لئے مناسب یہ ہے کہ طمطراق اور ناظم صاحب کی اولوالعزمیوں سے قطع نظر کر کے ان تجاویز پر عمل پیرا ہونا چاہیے جن سے دارالعلوم اپنی امتیازی شان کے ساتھ اپنے مالی نقصانات کی جبر و مکافات کر سکے اور جمعیت کا وجود باقی رہے چنانچہ اراکین انتظامیہ اور قائم مقام ناظم نے حضرات سرپرستانِ جمعیت کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کی کہ ہم خدام دارالعلوم چاہتے ہیں کہ ہم کو برائے چندے تعلیمی خدمات سے سبکدوش فرمایا جائے کہ ہم اپنا وفد لیکر چند مقامات کا سفر کریں اور دارالعلوم کے نقصانات کی کچھ مکافات کر سکیں۔ چونکہ زمانۂ امتحان سالانہ قریب تھا اس لئے سب کو تو اجازت نہ مل سکی مگر جناب مولانا مولوی شبیر احمد صاحب، مولانا مولوی سید مرتضی الحسن صاحب، مولانا مولوی عبدالسمیع صاحب، مولانا مولوی مظہرالدین صاحب اور قائم مقام ناظم (یعنی راقم الحروف مولانا سراج احمد صاحب) اس خدمت پر مامور ہوئے۔

ہم نے اس زمانے میں مؤتمر کا جلسہ منعقد نہیں کیا۔ کسی گریجوایٹ کو وظیفہ نہیں دیا کوئی دھوم دھام کا کام ہم سے نہ ہو سکا مگر ہم سے جو کچھ ہو سکا اس کو ہم جمعیت کی تاریخ میں آبِ زر سے لکھنے کے قابل سمجھتے ہیں اور ہم خدام کی یہ سعی کسی درجے میں بارگاہِ حضرت رب العزت میں قبول ہو گئی تو پھر سب کچھ پالیا۔

علمی مجالس کا انعقاد جمعیت کی مفید اور نمایاں مقاصد سے ہے ہم نے

تا بمقدور اس کو ترک نہیں کیا۔ سیتولی اور شملہ و خورجہ وغیرہ میں متعدد جلسے نہایت مفید ثابت ہوئے۔ کسی اہلکار کی علیحدگی یا عزل سے کیا کوئی محکمہ کوئی سر رشتہ کوئی مدرسہ کوئی انجمن معدوم ہو جاتی ہے۔ بڑے بڑے کالجوں میں بڑے بڑے پروفیسر، پرنسپل، ناظم، سیکرٹیری علیحدہ ہو جاتے ہیں اور معزول کر دئے جاتے ہیں اور معاً ایک دوسرا ان کا جانشین ہو جاتا ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ جمعیت الانصار سے جناب مولوی عبیداللہ صاحب کی علیحدگی پر یہ خطور دلوں میں کیوں پیدا ہوا ؎

برائے کارِ خدا رہبرے ہمی آید
یکے ہمی رود و دیگر ہمی آید

بلاشک جناب مولوی عبیداللہ صاحب کی مفارقت کا صدمہ ہے اور بہت بڑا صدمہ ہے مگر ان کی علیحدگی سے جمعیت کی موت آجائے خدا نہ کرے۔

کل کی بات ہے کہ حضرت شبلی نظامتِ ندوہ سے علیحدہ ہوئے کیا خدانخواستہ ندوہ کا خاتمہ ہو گیا۔ علیگڈھ کالج سے بھی کبھی کبھی بعض جلیل القدر عہدہ دار جدا ہوئے ہیں۔ کیا کالج بند ہو گیا۔ ہم نہیں سمجھتے کہ جمعیت کے متعلق ان بے معنیٰ وساوس کی پیدائش کا مادہ کیوں ہیجان میں ہے۔ یہ بالکل غلط ہے کہ جمعیت الانصار بند ہو گئی اور یہ بھی بالکل غلط ہے کہ جناب مولوی عبیداللہ صاحب کی دہلی کی انجمن جمعیۃ الانصار کا شعبہ ہے یا دار العلوم کی ساختہ اور ماتحت ہے اور یہ بھی بالکل غلط ہے کہ دار العلوم کی جمعیۃ الانصار نے انگریزی داں طلبہ کی دینی تعلیم و تربیت سے انکار کر دیا۔ مولوی عبیداللہ صاحب دار العلوم

میں تعلیمی اور تدریسی جماعت کے جزو اور رکن نہیں تھے کہ ان کے چلے جانے سے یہ دقت پیش آئی ہو۔ بعض انگریزی داں طلبہ اس وقت بھی دارالعلوم میں تعلیم پا رہے ہیں اور دارالعلوم ہر وقت نہایت مسرت اور خندہ پیشانی کے ساتھ گریجویٹ حضرات کی دینی تربیت کی کفالت کے لئے مستعد ہے۔ مگر جیسے کہ عربی خواں طلبہ اپنے خورد و نوش کی خود کفالت کرتے ہیں یا دارالعلوم کی معمولی کفالت پر قناعت کرتے ہیں ایسے ہی اگر گریجویٹوں کا طریق عمل ہو تو پھر کوئی دقت نہیں۔ سچ یہ ہے کہ جمعیۃ الانصار کے پاس اب نہ مالی رُوح باقی ہے اور نہ وظائف میں ایسا امتیاز مناسب ہے اور مشاہدہ کے بعد اب کسی میں یہ جرأت بھی باقی نہیں ہے۔

جناب مولوی عبید اللہ صاحب کی علیحدگی کا مسئلہ گو پیچیدہ نہیں ہے مگر تفصیل طلب ضرور ہے اور القاسم کے بقیہ صفحات اس کے لئے یقیناً کافی نہیں ہیں اور ہمارے موضوع سخن کے اتمام میں سہیم و شریک بھی نہیں اس لئے اگر ضرورت ہوئی تو پھر کبھی اس کی بحث معرض بیان میں آجائے گی۔

جمعیۃ الانصار کا شعبہ الارشاد بحمدہٖ تعالیٰ اعتدال کے ساتھ مناظرہ اور تقریر و تحریر میں تدریجی ترقی کر رہا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ القاسم و الرشید کے صفحات میں آپ کو جمعیت الارشاد کی ترقیاں برابر نظر آیا کریں گی۔ جمعیت کا قانون نظر ثانی ہونے کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ شائع کیا جائے گا اور اس کے مفید شعبوں کی ترقی میں سرمو کوتاہی نہ ہوگی۔ اراکینِ جمعیت الانصار القاسم اور الرشید کے ذریعے تالیف و اشاعت کا موقت الشیوع سلسلہ جاری رکھیں گے اور مسلمانوں کی آگاہی کے لئے مفید مضامین کے

ذخائر جمع کرتے رہیں گے۔ اراکین جمعیۃ الانصار کی خدمت میں بطور یاددہانی عرض کیا جاتا ہے کہ جن حضرات کے ذمے چندہ دوامی جمعیت کا باقی ہے وہ مہربانی سے جلد مرحمت فرمائیں اور جمعیت کے لئے مالی ذرائع پیدا کرنے میں نمایاں حصہ لیں اور نیک مشوروں سے دریغ نہ فرمائیں۔ والسلام

خاکسار سراج احمد رشیدی قائم مقام ناظم جمعیۃ الانصار

دار العلوم دیوبند (القاسم ذی الحجہ سنہ ۱۳۳۱ھ ص ۳۱ و ۳۲ و ۳۳)

تجزیۂ بیان
از مؤلف، انوار الحسن

جناب مولانا سراج احمد صاحب کا بیان آپ کے سامنے ہے۔ ہمیں ان کی اس طویل تحریر میں جو کچھ نظر آیا وہ یہ ہے کہ مولانا عبید اللہ صاحب جمعیۃ الانصار کو خود چھوڑ کر دہلی چلے گئے۔ انہوں نے جمعیت سے بے وفائی کی اور انجمن کو زیر بار کر کے سدھار گئے۔ نیز جمعیت الانصار کے جلسے نہ ہونے کی وجہ جنگ بلقان میں علما کی غیر معمولی مصروفیت اور جنگ کے لئے چندے کی شدید طلب، ترکوں کے ساتھ تعاون، دیوبند کے خزانے کا خالی ہو جانا، الانصار کی طرف توجہ دینے کی بجائے اصل اور بنیاد کو قوت پہنچانا وغیرہ وغیرہ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سنہ ۱۹۱۲ء میں بلقان کی ریاستوں کے ترکوں کے خلاف اعلان جنگ نے نہ صرف ترکوں کو بلکہ مسلمانان ہند کو بھی مجروح کر دیا تھا۔ اس کا اثر دار العلوم دیوبند پر بھی پڑنا لازمی تھا۔ چنانچہ نہ صرف مسلمانان ہند کی توجہ ترکوں کی اعانت پر تھی بلکہ علمائے دیوبند بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ تاآنکہ دار العلوم کو کچھ عرصہ کے لئے بند کر کے مدرسین اور طلبہ تک چندے کے حصول میں دیوبند سے باہر جا کر مصروف رہے۔

چنانچہ القاسم ماہ ذی الحجہ سنہ ۱۳۳۰ھ میں "چندہ ہلال احمر اور دار العلوم دیوبند"

کے عنوان کے ماتحت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی، جو ابھی دارالعلوم میں تھے، لکھتے ہیں :۔

"دارالعلوم کا فتویٰ (جو گذشتہ نمبر میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں) اب تک مختلف طور پر ایک لاکھ سے زیادہ چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ دارالعلوم اور اس کے متعلق مدارس کے مدرسین اور طلبہ کے وفود قصبات اور دیہات ہند کے تمام اطراف میں دورہ کر کے رؤساء و علماء اور مشائخ اور عوام کو متوجہ کرتے رہے ہیں۔ محض ان لوگوں کے مواعظ اور اس جماعت کے مساعی جمیلہ سے ایک بڑی مقدار جس کا تخمینہ تین لاکھ روپیہ سے کم نہیں کیا جاتا مقامی انجمنوں اور اخبارات کے ذریعے سے بھیجا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اراکین دارالعلوم کی معرفت بھی پچھتر ہزار سے زیادہ جمع ہو چکا ہے اور یہ روپیہ عموماً نیشنل بینک کے توسط سے پریزیڈنٹ ہلال احمر قسطنطنیہ کے نام سے پہنچایا گیا ہے۔ وفود دارالعلوم کے دورے اور خاص دیوبند میں جو روپیہ جمع ہو کر براہِ راست قسطنطنیہ بھیجا گیا یا اراکین دارالعلوم کی کوششوں سے جمع ہو کر بھیجا گیا ہے اس کی تفصیل انشاء اللہ تعالیٰ کسی دوسری اشاعت میں درج کریں گے۔ مگر اس قدر ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا کہ ضلع سہارنپور میں مولانا خلیل احمد صاحب (مدرس اول مدرسہ مظاہر العلوم) صدر انجمن ہلال احمر سہارنپور و مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری و مولانا اشرف علی صاحب تھانوی و مولانا حکیم مسعود احمد گنگوہی و حکیم محمد یوسف گنگوہی و مولانا حکیم محمد احمد رام پوری کے مساعی جمیلہ سے جس قدر روپیہ جمع ہوا، غربا اور متوسط الحال لوگوں سے اتنی رقوم جمع کر لینا آسان نہیں۔ مولانا خلیل احمد صاحب خالص سہارنپور سے زائد از بیس ہزار روپیہ اب

تک بھیج چکے ہیں" (القاسم ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ صفحہ ۱۹ و ۲۰)

حضرت مولانا حسین احمد صاحب "سفرنامہ شیخ الہند" میں لکھتے ہیں :-

"بلقان کے خونخوار اور طرابلس کے سنگین واقعہ نے مولانا (محمود حسن صاحب) کے دل و دماغ پر نہایت عجیب مگر بے چین کن اثر ڈالا ......

مولانا نے پوری جان توڑ کوشش امداد اسلام میں فرمائی، فتوے چھپوائے، مدرسہ کو بند کر دیا، طلبہ کے وفود بھجوائے، خود بھی ایک وفد کے ساتھ نکلے، چندے کئے اور ہر طرح سے مدد کی"

ان بیانات کی روشنی میں مولانا سراج احمد صاحب کا یہ بیان درست ہے کہ جنگ بلقان کے باعث جمعیۃ الانصار کے رکن حضرات مصروف رہے۔ یہ بھی درست کہ مدرسے کا خزانہ خالی ہو گیا تھا، یہ بھی صحیح کہ جمعیۃ الانصار کا چندہ صفر پر پہنچ گیا تھا لیکن ان وجوہات کے علاوہ منتظمین مدرسہ اور مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کے خیالات اور آئندہ کے سیاسی نقشوں اور طریق کار نیز بعض مذہبی مسائل میں کشمکش پیدا ہو گئی تھی۔ جمعیۃ الانصار سے بھی گورنمنٹ چوکنی ہو چکی تھی۔ ادھر جنگ بلقان ۱۹۱۲ء تا ۱۹۱۴ء سے گذر کر جنگ عظیم تک نوبت پہنچ چکی تھی، جرمن اور ترک دونوں برطانیہ سے برسر پیکار تھے۔ ترکوں کی مدد انگریز کی دشمنی کے مترادف تھی۔ علمائے دیوبند نے لاکھوں روپیہ سے ترکوں مدد کی تھی۔ انہی حالات میں شیخ الہند حجاز روانہ ہوئے تھے ادھر ۱۹۱۵ء میں مولانا سندھی کابل پہنچ چکے تھے۔ وہاں سے انہوں نے ایک ریشمی کرتے پر وہاں کے حالات لکھکر مولوی عبدالرحیم صاحب سندھی کے ذریعہ حج کے بہانے شیخ الہند کو بھیجے تھے۔ اس تحریک کا انکشاف اگرچہ پورے طور پر ۱۹۱۶ء میں ہوا تھا لیکن مدرسہ دیوبند گورنمنٹ برطانیہ کی نظروں میں کھٹک رہا تھا اس لئے ارکان و ذمہ داران مدرسہ کے لئے اس صورت

حال سے عہدہ برآ ہونے کی ضرورت تھی اس لئے سردست جمعیۃ الانصار سے مولانا عبیداللہ کا علیحدہ ہو جانا ہی مناسب تھا۔ اگرچہ ان کی چلائی ہوئی سکیم مسلمانوں میں آزادی کی رُوح پھونک چکی تھی۔ شیخ الہند کے حج کو روانہ ہونے کے بعد مذکورہ حالات میں لنڈن کی پارلیمنٹ میں دارالعلوم کو بند کرنے کی تجویز بھی پیش ہو چکی تھی۔ جب یہ مسئلہ لنڈن کے دارالعوام میں لیفٹیننٹ کرنل جیمس نے اٹھایا تو ہندوستان کے مسلم اخبار اور رسالے چیخ اٹھے۔ اخبار الخلیل بجنور نے حسب ذیل اداریہ سپرد قلم کیا جو القاسم شعبان ۱۳۳۸ھ میں بھی شائع ہوا۔ الخلیل نے لکھا :۔

"دارالعلوم دیوبند کا ذکر پارلیمنٹ میں

بجواب ایک سوال کے جو لفٹیننٹ کرنل جیمس نے کیا دارالعوام میں مسٹر مانٹیگو وزیر ہند نے فرمایا "جب سے کہ حجاز گورنمنٹ نے دارالعلوم دیوبند کے علامہ کو گرفتار کیا تھا جو مالٹا میں نظر بند کئے گئے تھے اس وقت سے اور جب تک کہ وہ مالٹا سے روانہ ہوئے مدرسہ عربی دیوبند کی باغیانہ تبلیغ کی شکایت جہاں تک انہیں علم ہے نہیں ہوئی اور اس لئے اس تجویز پر عمل کرنے کی کہ مدرسہ موصوف بند کر دیا جائے کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی" اس سوال کے ساتھ بالشویک تحریک کے متعلق بھی ایک سوال تھا جس کا جواب دیا گیا کہ گورنمنٹ ہند اس کے متعلق سرگرم کار ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان کے آنریبل ممبران ہندوستان میں کسی بڑے پیمانے پر انقلاب عظیم کا خواب دیکھ رہے ہیں حالانکہ یہاں روز بروز سکون ہو چلا تھا۔ مگر خود انگلستان کی عیسائی آبادی نے

صلیبی جنگ کا سوال چھیڑ کر اور مسٹر لارڈ جارج نے اپنے صریح اعلان کے خلاف اور نہایت بے انصافی کے ساتھ ٹرکی پر الزامات قائم کر کے اس کو مٹانا چاہا ہے جس سے ہندوستان کی مسلم آبادی قدرتی طور پر بھڑک اٹھی ہے۔ اور یہ ناممکن ہے کہ مدرسۃ العلوم دیوبند مسلمان بھی رہتا اور اس سے متاثر بھی ہوتا۔ پھر بھی کارکنانِ مدرسہ دیوبند نے اس میں حصہ لیا ہے اس سے وہ بمشکل اپنی اسلامی پوزیشن کو قائم رکھ سکے ہیں۔ لیکن یہ ناممکن تھا کہ وہ یا اور کوئی مسلمان ہونے کا مدعی ایسے موقع پر ہو اور وہ اسلامی معاملات سے جدا رہے۔ مگر آنریبل لفٹیننٹ کرنل جیمس نے مدرسہ (دیوبند) بند کر دینے کی جو بنا قرار دی ہے یعنی مولانا محمود حسن صاحب کی ذات گرامی صفات، وہ عرصہ ہوا کہ اس سے قطع تعلق کر چکے تھے اور گورنمنٹ کا یہ تحقیقاتی ریکارڈ ابھی موجود ہوگا جس سے مدرسہ کی بے تعلقی ثابت ہو چکی ہے۔ نیز مولانا کی نظربندی کسی باضابطہ اس وقت کی انگریزی عدالتی تحقیقات سے ہرگز عمل میں نہیں آئی بلکہ وہ کھلی ہوئی یکطرفہ کارروائی تھی۔ اگر وہ انگریزی درخواست پر بیت الحرام سے گرفتار کرائے گئے تھے اور اگر شاہ حجاز نے انہیں ازخود گرفتار کر کے برطانیہ کے سپرد کیا ہے تاکہ وہ نظربند رکھے جائیں تو اس کی وجہ صرف ایک ہی تھی کہ مولانا نے اس فتوے پر دستخط کرنے سے اپنی معذوری ظاہر کی تھی جس میں بغیر کسی مؤثر قطعی شرعی وجہ کے تمام ترکوں کے کفر کا فتویٰ ان سے چاہا تھا اور انہوں نے جائز طور پر خاموشی کو ترجیح دی۔

پارلیمنٹ میں مسٹر مانٹیگو کے معلومات اس سوال و جواب کے زمانے تک ممکن ہے کہ مدرسۃ العلوم کے متعلق ناقص ہوں کیونکہ بعض کارکنان مدرسۃ العلوم نے خلافت کے متعلق جو حصہ لیا وہ اس کے بعد کا ہے۔ لیکن اگر یہ

اس سے قبل کا بھی ہو تو یہاں اس سے زیادہ بڑھے ہوئے خیالات دوسرے مسلمانوں کے ہیں اور جس قدر عربی مدارس ہندوستان میں ہیں سب ایک رشتۂ مذہبی میں منسلک ہیں تو مدرسۃ العلوم دیوبندہی کی کیا خصوصیت ہے۔ مدرسۃ العلوم دیوبند کسی اخذ زر کے لئے قائم نہیں ہے وہ ایک اسلامی مدرسہ ہے اگر گورنمنٹ اسے بند بھی کر دے گی تو بحیثیت ایک مسلمان کے وہ چارو ناچار اسے برداشت کریں گے لیکن کیا یہ تدبر ہوگا ؟ نہیں بلکہ ہزار ہا مسلمان طلبہ اور استادوں کو جو خاموشی کے ساتھ ایک بے ضرر مذہبی شغل میں لگے ہوئے ہیں اس لئے منتشر کر دینا ہوگا کہ وہ سلطنت کے خلاف تمام ملک میں پروپیگنڈا پھیلاتے پھریں۔ ایسے ہی وزیروں نے موجودہ تکلیف دہ حالت پیدا کی ہے اور ایسے ہی ناعاقبت اندیش آئندہ اس کو مزید ترقی دینا چاہتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اس تذکرے سے دیوبند میں کوئی حرکت محسوس نہ ہوگی اور وہ جہاں ہے بے خوف وہیں کھڑا رہے گا جو اس امر کی علامت ہوگی کہ " آنراکہ حساب پاک است از محتسب چہ باک " اور یہ کہ اسلامی سچی تعلیم صرف ایک خدائے قادر مطلق سے ہی ڈرنا سکھلاتی ہے اور اسی پر بھروسہ رکھتی ہے "۔ ایڈیٹر الخلیل

(القاسم شعبان ۱۳۳۸ھ صفحہ ۶)

الخلیل اخبار بجنور کے ایڈیٹر نے یہ ایڈوٹوریل (مقالۂ اداریہ) ۳۰ رجب ۱۳۳۸ھ مطابق ۲۰ اپریل ۱۹۲۰ء کو شائع کیا۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے اِس کونے سے اُس کونے تک بجلی کی طرح یہ خبر دوڑ گئی۔ دارالعلوم نے اگرچہ اس کی چنداں پروانہ کی جیساکہ مذکورہ ماہ کے القاسم میں دارالعلوم کی طرف سے حضرت مولانا اعزاز علی صاحب مرحوم نے صرف ایک صفحہ کا نوٹ لکھا ہے جس میں

وہ لکھتے ہیں :-

"ہم اس سے نہیں گھبراتے ہیں کہ ممبران پارلیمنٹ نے اس مدرسہ کو کس نظر سے دیکھنا شروع کر دیا ہے وہ جس نظر سے چاہیں اس کو دیکھیں مگر ہم تو اس پر بھی یہی کہیں گے ؎

وان ساءنی ان تلقنی بمساء
لقد سرنی انی خطرت ببالک"

جس کا ترجمہ بقول غالب یہ ہے :

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے باایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے جو اس محفل میں ہے

یہ تھے وہ حالات جن کی پیش نظری و بیش بینی مہتمم صاحبان کو مولانا عبید اللہ صاحب کے متعلق فیصلہ کن نتیجہ کے لئے مجبور کر رہی تھی ۔ یہ تیور جب شیخ الہند اور ان کے جان نثار سندھی شاگرد نے دیکھے تو خود بھی انہوں نے کارکنان مدرسہ کے ساتھ اشتراک عمل کو مناسب نہ سمجھا چنانچہ دہلی کو اپنا مرکز بنایا اور دوسرے قسم کے جاں بازوں یعنی مولانا محمد علی جوہر ، ڈاکٹر انصاری ، حکیم اجمل خان اور مولانا ابو الکلام آزاد کو اپنی تجویز حریت میں شامل کر لیا ۔ کہتے ہیں کہ شیخ الہند کی زبان پر یہ شعر اکثر آجاتا تھا ؎

کامل اس فرقۂ زہاد سے نکلا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

اختلاف نظریات میرے خیال میں دونوں جانب اپنے اپنے مقام پر مستقیم تھے ۔ لیکن ایک چیز اور بھی تھی جو مولانا سندھی کے متعلق حلقۂ دیوبند میں اختلاف کی خلیج وسیع کر رہی تھی وہ تھی مولانا سندھی کی آزاد خیالی اور مجتہدانہ رنگ ۔ یہ بھی افواہیں تھیں کہ وہ نماز کی پابندی میں ڈھیلے اور غیر محتاط ہیں ۔

یہ افواہیں ایسے لوگ اڑاتے تھے جو غالباً گورنمنٹ برطانیہ کے بازار میں ہوتیں اور شدہ شدہ مدرسے تک پہنچتیں۔ مگر یہ صرف پراپیگنڈا تھا اور بس۔

نظریاتی اختلاف کے متعلق ہم آپ کو مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کے ایک مضمون کی طرف لئے چلتے ہیں جو رسالہ دار العلوم میں " احاطۂ دار العلوم میں بیتے ہوئے دن" کے عنوان سے دس بارہ قسطوں میں نکلا گیا۔ موصوف لکھتے ہیں:۔

" خاکسار جس زمانے میں پڑھنے کے لئے دار العلوم میں داخل ہوا یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا سندھی اور دار العلوم کے ارباب حل وعقد کے درمیان تلخیاں بڑھتی ہوئی اس حد تک پہنچ چکی تھیں کہ دیوبند سے کنارہ کش ہو کر دتی کو مولانا سندھی نے اپنا مستقر بنا لیا تھا اور " نظارۃ المعارف القرآنیہ" کے نام سے ایک خاص نوعیت کا تعلیمی ادارہ قائم کر کے چند مخصوص طلبہ کو قرآن کا درس اپنے مخصوص نقطۂ نظر دیتے تھے۔ ان طلبہ میں دار العلوم کے سند یافتہ بھی تھے اور غالباً کچھ انگریزی تعلیم یافتہ حضرات بھی شریک تھے۔ اس عرصے میں کبھی کبھی مولانا سندھی مرحوم دیوبند بھی تشریف لایا کرتے تھے۔ غرض اصلی تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہوتی تھی اور موقع ملتا تو ایک چکر دار العلوم کا بھی کر لیتے .... میں مولانا عبید اللہ کے نام ہی سے نہیں بلکہ ایک حد تک ان کے کام سے بھی ایک گونہ واقف تھا۔ دل میں ان کی عظمت بھی تھی ان کے علم کی تعریفیں بھی سن چکا تھا اس لئے جب وہ دار العلوم کے احاطے میں نظر آتے تو بے ساختہ ان سے ملنے کا تقاضہ دل میں پیدا ہوتا لیکن پھر یہ سوچ کر کہ کہیں مدرسے کے ارباب بست وکشاد تک خبر نہ پہنچ جائے دل کا ولولہ دل ہی میں بجھ کر رہ گیا۔ بمشکل ایک دن جب مولانا سندھی مسجد والے احاطے کے آخری مشرقی کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے اس زمانے ہمارے

ہمارے مرحوم شہید دوست مولوی مظہرالدین شیرکوٹی مدیر (الامان) کی قیام گاہ بھی وہ حجرہ تھا مدرسہ میں کچھ تدریسی خدمت انجام دیتے تھے اسی احاطہ میں عرض کرچکا ہوں کہ فقیر کا حجرہ قبریہ بھی تھا مولانا سندھی کو وہاں پاکر دبے پاؤں فقیر ان کی خدمت میں حاضر ہوا .... چند منٹ میں میری ملاقات مولانا سے ختم ہوگئی ۔ اس دفعہ تو وہ دلّی واپس ہوگئے اور زیادہ وقفہ بھی نہیں گذرا تھا کہ پھر دیوبند پہنچے ۔ ہم تو طلبہ کے جھمیلے میں تھے افواہاً اِدھر اُدھر سے خبریں ملتی رہیں کہ آج کل دار المشورہ میں مولوی عبیداللہ کا مقدمہ پیش ہے ۔ دارالعلوم کے اساتذہ ان سے ایک خاص مسئلہ میں بحث ومباحثہ کر رہے ہیں لیکن اختلافی مسئلہ کیا ہے صحیح تعبیر پہنچانے والے مجھ تک نہیں پہنچا سکے ۔ تبلیغ کے مسئلے میں اختلاف ہے بس اس سے زیادہ اور کچھ پتہ نہ چل سکا کہ اچانک دارالعلوم کی مسجد میں دیکھا مدرسے کے بست وکشاد جمع ہو رہے ہیں اساتذہ میں جہاں تک خیال آتا ہے بجز شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے سب ہی موجود تھے. طلبہ کی بھی کافی تعداد اِدھر اُدھر سے بطور تماشبینوں کے جمع ہوگئی ۔

علامہ عثمانی اور مولانا سندھی

اب ترتیب تو صحیح طور پر یاد نہ رہی لیکن یکے بعد دیگرے کھڑے ہونے والوں میں ایک تو مولانا شبیر احمد عثمانی اور خود مولانا سندھی تھے ۔ اور تیسرے مقرر غالباً مولوی غلام رسول مرحوم (استاذ فلسفہ ومنطق) بھی تھے ۔

(مولانا عبیداللہ کا نظریہ بسلسلہ تبلیغ)

مولوی عبیداللہ صاحب نے کھڑے ہوکر جہانتک

خیال آتا ہے یہ فرمایا کہ "قرآنی آیت لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْ بَلَغَ (تاکہ میں ڈراؤں تم کو گوں کو اور ان لوگوں کو جن تک بات پہنچی) اسی سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ بنی آدم میں جن لوگوں تک قرآن کا پیغام نہیں پہنچا ہے ان سے مؤاخذہ اسلام کے نہ قبول کرنے پر نہ ہوگا"۔ اب آگے پورے طور پر یاد نہیں رہا کہ انہوں نے کیا کہا۔ کچھ ایسا خیال آتا ہے کہ اپنے اس خیال کے متعلق یہ کہتے ہوئے کہ عام علما کی رائے یہ نہیں ہے بلکہ ان کے نزدیک تبلیغ عام ہر فرد تک پہنچ چکی ہے۔ اس لئے عدم تبلیغ کا عذر کسی قوم یا فرد کے لئے باقی نہیں رہا ہے۔ اب واللہ اعلم انہوں نے اپنے خیال سے رجوع کا اعلان کیا یا نہیں کیا۔ لیکن دیکھا کہ مولانا شبیر احمد صاحب مرحوم غصے میں ان کے خیال کی تنقید فرما رہے ہیں۔ ان کی تقریر تو یاد نہ رہی لیکن ان کے بعد مولوی غلام رسول صاحب مرحوم نے تقریر کی تھی ان کی تقریر کا یہ فقرہ بھولا نہیں جا سکتا، کہا تھا:-

"کہ یہ مولوی عبیداللہ سندھی اگرچہ ہماری جماعت کے ایک فرد ہیں لیکن جب کوئی عضو سڑ جاتا ہے تو کاٹ دیا جاتا ہے، اسی طرح ہماری جماعت سے یہ الگ کر دئیے گئے ہیں"۔

قریب قریب کچھ اسی نوعیت کے الفاظ تھے۔ میرا دل بھی اس وقت بھر آیا تھا اور یاد پڑتا ہے کہ مولوی عبیداللہ صاحب جس وقت تقریر فرما رہے تھے تو کچھ آبدیدہ سے تھے۔

مجلس برخاست ہوگئی اس مجلس میں جو کیفیت گذری تھی میرا دل اس سے بے حد متاثر تھا۔ غالباً دوسرے دن یا ایک دو دن بعد جب

بحوالہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ کہ مولانا سندھی کی تقریر کو مکمل سمجھ رہے تھے۔

ترمذی شریف کا درس حضرت شیخ الہند کے حلقہ میں ہو رہا تھا ہمت کرکے اس فقیر نے اس مسئلہ کو اٹھایا کہ مسئلہ تبلیغ میں جو اختلاف اس وقت رونما ہوا ہے حضرت والا کا خیال اس باب میں کیا ہے .... بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کے جلسے کی تقریروں کی خبریں حضرت تک بھی پہنچی تھیں جن سے متاثر تھے اور خلاف دستور دیکھا کہ ذرا سنبھل کر متوجہ ہو گئے اور ایک ایسی شُستہ و رُفتہ تقریر اس مسئلہ پر فرمائی جو خاکسار کے نزدیک حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اپنی کتاب "الدین القیم" میں اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے اور عام خیالات کے سوا حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے خاص نظریہ کو درج کرکے آخری فیصلہ حضرت والا کی اسی درسی تقریر کو اپنی کتاب میں قرار دیا ہے ...... اس وقت جو تقریر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی تھی اس کا خلاصہ یہ تھا کہ

خلاصہ تقریر شیخ الہند

تبلیغ اور مؤاخذہ ان دونوں کی حیثیت کلی مسلک جیسی ہے۔ مثلاً ارشاد ہوا تھا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تبلیغ جس رنگ میں ہوئی تھی ظاہر ہے کہ وہی رنگ اس تبلیغ کا نہیں ہو سکتا جو ہمارا اور آپ کا ہے۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ براہ راست نبوت کبریٰ کے محرم اسرار تھے۔ جو قُرب ان کو حاصل تھا یقیناً آج کل کے ایک عامی مسلمان کو وہ میسر نہیں۔

اسی طرح حق تعالیٰ کے مؤاخذہ و گرفت کی نوعیت بھی ایک جیسی نہیں آخر ابو جہل پر حجت جس طرح پوری ہوئی تھی اور اسی بنیاد پر مؤاخذہ کا وہ مستحق ہوا۔ یہی نوعیت ان لوگوں کے مؤاخذہ کی کیسے ہو سکتی ہے جنہیں

ابوجہل کی آسانیاں میسر نہیں ہیں۔

اس تمہیدی مقدمہ کو سمجھانے کے بعد فرمایا گیا تھا کہ بس اجمالی عقیدہ یہ رکھنا چاہیئے کہ ہر شخص کا مؤاخذہ اس کی تبلیغ کی نوعیت کے ساتھ وابستہ ہے۔ جیسے جس حد تک تبلیغ ہوئی ہے اسی حد تک اس سے مؤاخذہ بھی ہوگا۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک شخص ہندوستان یا عرب میں ہی رہتا ہو لیکن اپنے خاص حالات کی وجہ سے "دین حق" کا پیغام اس شخص تک نہ پہنچے جس رنگ میں امریکہ یا یورپ کے کسی ایسے شخص تک پہنچا ہو جس نے باضابطہ اسلام اور اسلامی تعلیمات، اسلامی کتابوں کا مطالعہ کیا ہو۔ الغرض انفرادی طور پر یہ بات کہ تبلیغ کسے کس درجے کی ہوئی ہے حق سبحانہٗ تعالیٰ ہی اسے جانتے ہیں اور مؤاخذہ بھی وہی اپنے علم کے مطابق کریں گے تفصیلی علم تو اس کا خدا ہی کو ہے۔ ہمارے لئے اتنی اجمالی بات کافی ہے کہ جسے جس حد تک تبلیغ ہوئی ہو اسی حد تک اس سے مؤاخذہ بھی ہوگا۔ اشخاص کو متعین کر کر کے یہ بتانا انسان کے لئے ناممکن ہے کہ کسے کس درجہ کی تبلیغ ہوئی ہے۔ اور جب تبلیغ کے مدارج کا تفصیلی علم نہیں ہو سکتا تو مؤاخذہ کی تفصیل بھی ہم کیسے کر سکتے ہیں"۔

درس اس دن کافی پُر جوش اور گرم تھا۔ پہنچانے والوں نے یہ خبر دار المشورہ (مہتمم صاحبان اور ان کے حامیوں) تک پہنچائی کہ فلاں طالب علم نے آج شیخ الہند کے حلقۂ درس میں فلاں مسئلہ کو چھیڑا جس کا جواب یہ دیا گیا ہے۔ کافی شور و غوغا ہوا۔ نو درہ میں ایک جلسہ بھی طلب کیا گیا اور اس غلط فہمی کے پھیلنے کا جو اندیشہ پیدا ہوا تھا کہ آج کل اس اختلافی مسئلہ میں حضرت شیخ الہند نے ایسی تقریر فرمائی ہے جس سے

مولوی عبید اللہ سندھی کے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ اس اندیشے کا ازالہ کیا گیا درانحالیکہ دونوں خیالوں میں فرق تھا کیونکہ جہاں تک خیال آتا ہے، مولوی عبید اللہ صاحب یورپ و امریکہ کے باشندوں کو متعین کر کے دعویٰ کرتے تھے کہ ان کو دینِ حق کی صحیح تبلیغ ہی نہیں ہوئی ہے اور حضرت شیخ الہند کی تقریر اصولی تھی۔ شاید اس جلسے سے اسی فرق کو ظاہر کرنا منظور تھا۔ بہر حال یہ تو علمی بات تھی جو اپنی طالب علمی کے دنوں میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے میرے کانوں میں پہنچی۔

دوسری بات جسے اس سلسلے کی ایک کڑی سمجھنا چاہیئے یعنی مولوی عبید اللہ سندھی اور ارباب مدرسہ کی کشیدگی پھر بھی باقی ہی رہی اور یہ مسئلہ بھی واضح ہوتا چلا گیا کہ حضرت شیخ الہند اور مولوی عبید اللہ دونوں کا زاویۂ خیال مدرسہ کے اربابِ بست وکشاد سے جُدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ تبلیغ والا مسئلہ تو خیر ایک علمی مسئلہ تھا درحقیقت ان دونوں صفوں میں حقیقی اختلاف "سیاسی طریقہ عمل" کے متعلق تھا۔ اب پوری بات تو یاد نہیں رہی لیکن ایک دن کچھ ایسا ہوا کہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی (نائب مہتمم) نے فقیر کو یاد فرمایا اور کہا کہ تم حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے مِلکر دریافت کرو کہ واقعی "سیاسیات" میں حضرت والا کا صحیح مسلک کیا ہے...... شاید ظہر کی نماز کے بعد کا واقعہ ہے مسجد کے احاطے میں ایک کمرہ تھا جسے اس زمانے میں "دار التصنیف" کا نام دیا گیا تھا۔ اس کمرے میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اپنی زندگی کے آخری

مشغلے یعنی ترجمہ قرآن مجید کا کام کچھ دیر کیا کرتے تھے۔ فقیر تو اسی احاطے کا باشندہ ہی تھا۔ نماز کے بعد حضرت اپنی تصنیف و ترجمہ کے اسی کمرے میں تشریف لے گئے۔ تنہا تھے موقع پاکر فقیر بھی پیچھے سے حاضر ہو کر عرض رسا ہوا کہ کچھ عرض کرنا ہے۔ جیسا کہ قاعدہ تھا خندہ جبین سے فرمایا گیا کہ آؤ کیا کہنا چاہتے ہو؟ بیٹھ گیا اور جو پیغام میرے سپرد کیا گیا تھا اُسے پہنچا دیا گیا۔ سُنتے رہے اپنی بات جب ختم کر چکا تو دیکھا کہ حضرت پر ایک خاص حال طاری ہے اور اپنے استاذ حضرت مولانا محمد قاسم بانی دارالعلوم جن کو وہ حضرت الاستاذ کے لفظ سے یاد کرتے تھے ان ہی کا نام لیکر فرمایا:

"حضرت الاستاذ نے اس مدرسہ کو کیا درس و تدریس کے لئے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی ناکامی کے بعد یہ ارادہ کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔ تعلیم و تعلّم، درس و تدریس جن کا مقصد اور نصب العین ہے میں ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہوں لیکن خود اپنے لئے تو اسی راہ کا انتخاب میں نے کیا ہے جس کے لئے دارالعلوم کا یہ نظام میرے نزدیک حضرۃ الاستاذ نے قائم کیا تھا..... فرائض الٰہیہ جس حد تک بن پڑا ادا کرتا رہا اب آخری کام بھی رہ گیا ہے جسے اپنی حد تک تو میں کر گذروں گا۔"

مولانا مناظر احسن کی مذکورہ تحریر آپ کے سامنے ہے۔ میں نے اس طویل

بیان کو مجبوراً نقل کیا ہے کہ اس سے حضرت شیخ الہند، مولانا عبید اللہ سندھی اور کارکنان و ذمہ دارانِ دارالعلوم کے تعلقات اور سیاسی نظریات کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے آگیا ہے۔ حقیقت واقعہ بھی یہی ہے کہ مولانا عبید اللہ صاحب سندھی اور حضرت شیخ الہند سے منتظمین مدرسہ کا اختلاف "نظارۃ المعارف" دہلی کے وجود میں آنے اور "جمعیۃ الانصار" کا ہمیشہ کی نیند سوجانے کا باعث ہوا۔

محاکمہ

دنیا کی پوری تاریخ پر نظر دوڑا جائیے آپ کو اقتدار، انتظام اور انقلاب و اصلاح میں دست وگریباں ہوتے ہوئے دیکھنا قدم قدم پر پیش آئے گا۔

جہاں انقلاب پسندوں کو انقلاب لانے اور اصلاح کرنے کا ولولہ ہوتا ہے وہاں اقتدار پسندوں اور ذمہ داروں کو زمانے کی نزاکتوں اور ماحول کی ناسازگاریوں کا دغدغہ رہتا ہے۔ غرض کہ اسی کشمکش سے دنیا کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ اور پھر یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اس کشمکش کی گتھی کا سلجھاؤ ع

بردار تواں گفت و بہ منبر نہ تواں گفت

جمعیۃ الانصار کے ثمرات

مولانا عبید اللہ صاحب کچھ ہوں اور منتظمین کا نظریہ کچھ ہو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جمعیۃ الانصار نے علماء اور قوم کو ایک راستے پر لگایا، اس نے ملک میں عام اصلاحی بیداری پیدا کی اور دارالعلوم کے لئے ایک تعلیمی، تبلیغی، اصلاحی اور انقلابی پروگرام دیا، اس نے ان قوتوں کو جگایا اور جھنجوڑا تھا جو مردہ، نیم مردہ یا خفتہ تھیں اور جن میں برف کی طرح کا جمود اور یخ کی طرح کی نمود تھی۔ جمعیۃ الانصار نے ان منجمد مادوں کو پگھلایا اور ٹھٹھری ہوئی قوتوں کو گرمایا جو ناامیدی و کسالت کا شکار ہو چکی تھیں۔ وہ خون جو رگوں میں رک رک کر چلتا تھا اس کو صاف کر کے

بہایا، جو چراغ ٹمٹما رہے تھے ان کو بھڑکایا اور جو شمعیں جھلملا رہی تھیں ان کو ابھارا، زندہ دلانِ اسلام کے نقشہائے کہن کو جو مٹے جا رہے تھے چمکایا اور مجاہدین علمائے ربانی کے کارناموں کو اجاگر کرنے کا بیڑا اٹھایا، قاسمی اور سیدی افکار میں تازہ روح پھونکنے کا پیغام دیا اور قوم سے تحسین و آفرین کا سلام لیا۔ لیکن افسوس کہ ؎

پھول تو دو دن بہار جاں فزا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

آمدم برسر مطلب علامہ شبیر احمد عثمانی نے جمعیۃ الانصار کے پورے کے پورے پروگرام میں ایک جامع منصوبے کے ساتھ بھرپور کوشش سے کام لیا۔ وہ اس جمعیت کے نصاب میں ترمیم و تنسیخ اور اس کی تجدید میں سرگرم نظر آتے ہیں، جمعیۃ الانصار کے شعبۂ قاسم المعارف میں مصروف عمل دکھائی دیتے ہیں، مؤتمر الانصار میں مقالے پڑھتے اور اپنی تقریروں سے مسلمانوں کے دلوں کو مراد آباد، میرٹھ، شملہ وغیرہ میں گرماتے نظر آتے ہیں۔ کراچی میں آریہ سماج سے سرگرم مناظرہ ہو کر کامیاب و کامران لوٹتے ہیں لیکن جمعیت کی مغفرت ہو جانے کے بعد وہ اس طرف سے ہٹ چکے ہیں۔ لیکن کام کرنے والے کے سامنے دنیا وسیع ہوتی ہے۔ جوہر قابل تھا اس لئے اس کی ہر جگہ مانگ تھی۔ اب جہاں جمعیۃ الانصار نے دم توڑا ہے ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۵ء کا زمانہ ہے۔ اس سنہ تک حضرت عثمانی آسمان شہرت پر پہنچ چکے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میں جمعیۃ الانصار کے وہ ممنون ہیں۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی سابق مہتمم ۱۳۳۳ھ کی روئداد دارالعلوم میں لکھتے ہیں:

"مولوی (شبیر احمد) صاحب اور ان کے بیانات اور تقریروں کا ملک

میں عام اثر ہے۔ اسی بنا پر اکثر مشہور جلسوں میں آپ کو باصرار بلاتے ہیں مگر بوجہ نقصان تعلیم سوائے مخصوص مقامات کے اکثر جگہ عذر لکھ دیا جاتا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ خداوند عالم اس نوجوان کے علم اور عمر میں برکت عطا فرمائے۔ آمین" (روئداد صفحہ ۲۰)

دارالعلوم کی خدمات جلیلہ

دیوبند کی اس دینی یونیورسٹی پر غور کی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ عثمانی مادر علمی کے اس تمام دور کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہیں جس میں انہوں نے عہد طفلی و طالب علمی کے وقت سے ہوش سنبھالا تھا۔ بلکہ قاسمی دور کی بھی وہ یادگار ہیں کہ انہوں نے اس عہد کی نشأت کو پورے طور پر اپنی تحریروں اور تقریروں میں اچھالا تھا۔

اب ہم ذرا اپنی عنانِ قلم کو پیچھے موڑ کر ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۱۱ء کی طرف لئے چلتے ہیں۔ کیونکہ جمعیۃ الانصار کے ترتیبی واقعات کے باعث ہم ان کے ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۵ء تک پہنچنے کی وجہ سے بعض دیگر حالات بیان کرنے سے قاصر رہ گئے تھے۔

ہمارا خیال ہے کہ جس طرح حضرت عمرؓ کی شہرت وعظمت اسلام کی ممنون ہے اور اسلام حضرت عمرؓ کا ممنون ہے اسی طرح حضرت عثمانی بھی جس طرح دارالعلوم دیوبند کے ممنون ہیں اُسی طرح دارالعلوم بھی ان کا بے حد ممنون ہے۔ ان کی خدمات جلیلہ میں دارالحدیث کی بھی نمایاں خدمت ہے۔

دارالحدیث دارالعلوم دیوبند ۱۳۳۰ھ ۱۹۱۲ء

دارالعلوم کی تعمیر میں دارالحدیث اور دارالتفسیر کو وہی مقام حاصل ہے جس طرح اعضائے انسانی میں دل کو۔ کسی اسلامی یونیورسٹی میں علم حدیث اور تفسیر کے لئے عظیم الشان عمارت اس کی عظمت شان کا نشان ہوتا ہے۔ دارالعلوم

بھی ایسی عمارت کے بغیر عظیم الشان نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ کارکنان مدرسہ کی طرف سے دارالحدیث کی تحریک القاسم کے ذریعہ کی گئی اور سنہ ۱۳۲۹ھ میں جناب مہتمم صاحبان کی طرف سے اس کا اعلان ہوا چنانچہ ملک نے اس آواز پر دلی خلوص اور عقیدت سے لبیک کہا۔ اور ملک کے اطراف و جوانب سے دارالعلوم میں روپیہ آنا شروع ہوا۔ سنہ ۱۳۲۹ھ کے بعد کے القاسم رسالوں میں باقاعدہ چندہ دہندگان کے اسمائے گرامی اور رقمیں شائع ہوتی رہی ہیں جو راقم الحروف کی نظر سے بھی گذری ہیں۔

دارالحدیث دیوبند پر حضور پُر نور کی توجہ

جس طرح دارالعلوم دیوبند کی مشہور درسگاہ نودرہ کے متعلق حضرت مولانا رفیع الدین صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند نے خواب دیکھا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے خطوط کھینچکر بتلائے کہ ان نشانات پر نودرے کی تعمیر کی جائے اسی طرح سرونج ریاست ٹونک میں مولوی سید مبارک علی کی دارالحدیث کی طرف توجہ دلانے سے سید یوسف علی صاحب وکیل کی زبان سے یہ فقرہ نکلا کہ اس مبارک کام کے لئے گداگری کریں گے چنانچہ انہوں نے اور ان کے چچازاد بھائی منشی محمد زکریا صاحب نے خاص سرونج سے چندہ شروع کیا۔

ابھی باسٹھ روپیہ ہوئے تھے کہ یوسف علی صاحب نے خواب دیکھا جو یہ ہے:

"نصف شب گذشتہ کے بعد میں نے بعالم خواب دیکھا کہ میں بسواری ریل ٹونک جا رہا ہوں۔ ایک خاص مقام پر جو کف دست میدان ریگستانی ہے یکایک ریل ٹھہر گئی اسی وقت ایک شخص میرے پاس آئے۔ کہا آج حضور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہاں تشریف فرما ہیں۔ میں بکمال شوق ان کے ہمراہ گیا، ایک جگہ چند مکان سرکی کے اور دو تین خیمے کپڑے کے، خلاف خیمہ یہاں کے، مکانیت کے طور پر قائم ہیں۔ اولاً میں مکان سرکی والے میں گیا جہاں

چند صاحب تشریف فرما تھے۔ ایک کسی قدر فربہ اندام کچھ سیاہ فام پیشانی پر سجدے کا نشان۔ کُرتے کی گھنڈی کھلی جن کے پاس چند کتابیں مجلد بچرم رکھی ہیں۔ باقی کا حلیہ قوت متخیلہ نے فراموش کیا۔ فرمایا کہ اول حضور نبی کریم کے حضور جاؤ۔ میں نے عرض کیا، کیا حضور مجھ کو اندر خیمے میں بلالیں گے فرمایا ہاں۔ میں سلام علیک کرکے رخصت ہوا۔ خیمہ مبارک پر پہنچا۔ دروازہ خیمہ پر نہ معلوم پردہ تھا یا کیا چنانچہ وہ علیحدہ ہوگیا۔ مجھ کو باریابی نصیب ہوئی۔ حضور نے مسکرا کے میری جانب ہر دو دست مبارک بڑھائے۔ میں نے دونوں ہاتھوں میں لیکر بوسہ دیا اور روتا رہا۔ حکم بیٹھنے کا صادر ہوا۔ میں بیٹھ گیا۔ ہنس کر فرمایا کہ کس قدر چندہ تو نے وصول کیا۔ عرض کیا باسٹھ روپیہ عہ ارشاد ہوا اسر و نج کا اہتمام زکریا کے ذمے ہے۔ میں عرض کیا وہ میرا بھائی ہے۔ ارشاد ہوا کہ اس کا اہتمام کا بار زکریا کو لینا چاہیئے۔ پھر ارشاد ہوا کچھ پڑھ میں نے سورۃ فاتحہ شریف سنائی۔ ارشاد ہوا قرآن شریف صحیح پڑھا کر۔ حضور کے قریب دو صاحب اور تھے۔ ایک پورے قد کے قد آور جوان۔ ڈاڑھی سینے تک۔ بال سیاہ و سفید۔ سرخ و سپید رنگ، خوبصورت چہرہ۔ دوسرے صاحب لانبے لاغر جسم، ان کا پورا حلیہ یاد نہ رہا"

(القاسم ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ ص ۲)

بہر حال اس خواب سے دار الحدیث کی مقبولیت کا پتہ ضرور چلتا ہے۔ ریاست خیر پور سندھ کے وزیر اعظم آنریبل خان بہادر شیخ صادق علی صاحب منتظمین مدرسہ کی استدعا پر ۱۱ نومبر ۱۹۱۱ء مطابق ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ کو دہلی سے دار العلوم دیوبند تشریف لائے، مدرسہ عالیہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور دار الحدیث کے لئے ایک ہزار روپیہ کا نوٹ عطا فرمایا اور پچاس روپیہ طلبہ کی مٹھائی کے لئے عنایت فرمائے۔ مدرسے کی امداد کا

بھی وعدہ فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ القاسم میں دارالحدیث کا ذکر دیکھکر میرا خیال ہوا تھا کہ اس قدر رقم بھیجوں جواب تک دارالحدیث میں نہیں آئی۔

چندہ دہندگان کی فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسف صاحب وکیل کے خواب کو القاسم میں پڑھ کر بہت سے لوگوں نے آنحضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اور اہلبیت کی طرف سے بھی چندہ دیا۔ چنانچہ ماہ شوال ۱۳۲۹ھ کے چندے کی فہرست جو القاسم ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ میں شائع ہوئی ہے اس میں بعض چندہ دہندگان کی کیفیت چندہ حسب ذیل ہے:

۱۔ یکے از خدام مولانا اشرف علی صاحب تھانوی
منجانب حضور اقدس سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم — مبلغ ۳۰ روپیہ

۲۔ منشی بشیر احمد از جانب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم — " ۵ روپیہ

۳۔ زوجہ منشی فرید محمد خانصاحب زمیندار کھونگام ضلع مین پوری بہ تفصیل ذیل:۔

(۱) منجانب حضور فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم — مبلغ ۳ روپیہ

(۲) منجانب حضرت ابوبکر وحضرت عمر، حضرت عثمان وحضرت علی رضوان اللہ علیہم اجمعین — مبلغ ۴ روپیہ

(۳) منجانب حضرت امام حسن وحسین رضی اللہ عنہما — مبلغ ۲ روپیہ

(۴) منجانب حاجی امداداللہ صاحب ومولانا رشید احمد صاحب گنگوہی — مبلغ ۵ روپیہ

مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند نے دارالحدیث کے چندے کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ اس کی تعمیر کی مد میں لوگوں نے آنحضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی طرف سے اس کثرت سے چندہ دیا ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں سنا۔

بنیاد دارالحدیث دارالعلوم دیوبند

۲۰ ربیع الاول ۱۳۳۰ھ ۱۹۱۲ء بدست

مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

دراصل اس کی مقبولیت کا راز یہ ہے کہ اس کی بنیاد جن بزرگ ہاتھوں سے رکھی گئی ہے وہ خود خدا کے مقبول بندے تھے۔

چنانچہ دارالعلوم میں دارالحدیث کی بنیاد رکھنے کی تقریب میں ۲۰ ربیع الاول ۱۳۳۰ھ ۱۹۱۲ء کو ایک جلسہ عام منعقد ہوا جس میں بیرون دیوبند سے بھی ممتاز ہستیاں شریک ہوئیں۔ طلبا نے خود بنیادیں کھودیں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب نے اس کی بنیاد رکھی اور پھر فرمایا کہ سب صاحبان دو دو اینٹیں رکھیں نہ معلوم کس کی اینٹیں شرف قبولیت حاصل کریں۔ بہر حال دیوبند کے تمام علما اور طلبہ نے بنیاد میں حصہ لیا۔ پھر بھی عمارت مقبول نہ ہوتی تو اور کونسی ہوتی۔

ہم نے دارالحدیث کے تاریخی پس منظر کو چھیڑ کر تحریر کو طویل تو ضرور بنا دیا لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے سوانح زندگی میں دارالعلوم کی تاریخ بھی لپٹی ہوئی ہے اس لئے بات میں بات چھڑ گئی اور اس طرح دارالحدیث کی عمارت کا ایک خاکہ سامنے آگیا۔

دارالحدیث کے لئے علامہ عثمانی کا سفر خورجہ ضلع بلند شہر

علامہ مرحوم کے مختلف سفروں کے اسباب میں بڈھانہ ضلع مظفر نگر اور خورجہ ضلع بلند شہر کے اسفار کا سبب آپ کے مخلص اور قلبی دوست مولانا الحاج محمد عماد الدین صاحب انصاری شیر کوٹی کا ان دونوں مواضع میں بسلسلۂ مدرسی قیام بھی ہے۔ مولانا شیر کوٹی دارالعلوم سے فارغ ہو کر شیخ الہند رح کے حکم کے مطابق ۱۳۲۳ھ کے لگ بھگ بڈھانہ ضلع مظفر نگر کے اسلامی مدرسے میں مدرس مقرر ہوئے تو حضرت عثمانی دیوبند سے اکثر مظفر نگر جاتے اور وہاں سے بیل گاڑی میں بڈھانے مولانا شیر کوٹی سے ملنے جاتے۔ آپ کے یہاں

کئی کئی روز قیام فرماتے اور اکثر بلکہ روزانہ تربوز اور خربوزوں کا لطف اٹھاتے۔

مولانا انصاری مدظلہ نے مجھ سے فرمایا کہ ہم دونوں اکثر فالیزوں پر چلے جاتے اور وہیں بیٹھ کر کھیتوں پر تربوز خربوزے کھاتے اور فالیزوں کے مالک اسے اپنی عزت افزائی اور فخر سمجھتے اور دعوتیں کرتے۔ مظفر نگر اور بڈھانے کے درمیان ایک ندی تھی علامہ اسے پیدل عبور کرتے اور کبھی پیدل چل کر بھی پہنچتے۔ تھوڑے عرصے کے بعد جب مولانا انصاری مدرسہ خازن العلوم خورجہ ضلع بلند شہر کے صدر مدرس بن کر تشریف لے گئے تو علامہ عثمانی اکثر وہاں تشریف لے جاتے اور پندرہ پندرہ روز قیام فرماتے۔ مولانا انصاری کا بیان ہے کہ وہاں آپ کی تقریریں ہوتیں اور لوگ محبت کے پھول آپ پر قربان کرتے۔ دعوتیں اتنی کثرت سے ہوتی تھیں کہ پروگرام بنانے پڑتے تھے۔ وہاں کی آمد و رفت نے حضرت عثمانی کو اہل خورجہ کی آنکھوں کا تارا بنادیا۔

جب دار الحدیث کی تحریک ہندوستان میں جاری ہوئی اور لوگوں میں اس کی طرف قلبی شوق کی فراوانی ہوئی تو مولانا انصاری نے خود بھی دار الحدیث کے لئے بہت سا چندہ فراہم کیا اور مولانا عثمانی کو مہتمم صاحب دار العلوم کی معرفت خورجہ تشریف لانے کی دعوت دی۔ مہتمم صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"خورجہ میں القاسم کے ذریعہ بنائے دار الحدیث کی خبر پہنچ چکی تھی اور بعض مخیر و نیک دل اصحاب معقول مقدار میں امداد فرما بھی چکے تھے مگر شروع شوال (۱۳۲۹ھ) میں وہاں کے بعض مخلصین کے اصرار سے مولوی شبیر احمد صاحب کے خورجہ پہنچنے پر ایک عام جوش پھیل گیا۔ نہایت تقاضا اور اصرار سے وعظ کہلائے گئے اور مولوی صاحب کی بہت سی باثر اور موقر تقریریں ہوئیں۔ ان تقریروں کا عوام اور تعلیم یافتہ لوگوں پر ایسا گہرا

رنگ چڑھا کہ لوگوں میں چندہ کی ایک عام تحریک پیدا ہوگئی۔ اور ہر ایک قوم نے دارالحدیث میں حسب حیثیت شرکت کی۔ اور وہاں کے معزز حضرات نے نہایت مستعدی اور فراخ دلی سے چندہ بھی دیا۔ اور اپنا عزیز وقت صرف کر کے جگہ جگہ سے چندہ وصول کرایا۔ اور تین چار یوم میں (با وجودیکہ عنقریب وہاں کے مسلمان کئی چندوں میں اپنی جیبیں خالی کر چکے تھے) ساڑھے پانسو روپیہ نقد جمع ہوگیا اور توقع کی جاتی ہے کہ بہت جلد مقدار چندہ ایک ہزار روپیہ تک پہنچ جائے گی جو اس سے پہلے کبھی کسی مدرسہ کے لئے نہیں ہوسکی ۔" (القاسم شوال ۱۳۲۹ھ صفہ ۳۳)

اس عبارت سے مولانا کی ان خدمات کا پتہ چلتا ہے جو دارالعلوم کی تعمیر سے متعلق ہیں۔ جس زمانے کی یہ بات ہے اس وقت ایک ہزار کا چندہ خاص وقعت رکھتا تھا درانحالیکہ بعض چندوں کی وجہ سے وہاں کے لوگوں نے اپنی جیبیں خالی کردی تھیں۔ اس عبارت سے ان کی تقریروں کے اثر اور جوش کا بھی پتہ چلتا ہے۔

تعمیر دارالطلبہ

کئی سال تک دارالحدیث کی بنیادیں بھری پڑی رہیں، اور چندے آتے رہے لیکن مدرسہ کے قریب گندے نالے کو پیچھے ہٹانے کی کوشش بھی ہو رہی تھی جس کے بغیر اس عمارت کی تکمیل نہ ہوسکتی تھی۔ جناب مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مرحوم اس کی برابر کوشش میں تھے تاآنکہ مسٹر میسٹن گورنر یو۔ پی کو دارالعلوم آنے کی دعوت دی اور مہتمم صاحب کامیاب ہوئے تب کہیں جا کر بدقت بسیار نالہ دور ہٹا کر لے جایا گیا اور عمارت کو بلند کیا جانے لگا لیکن روپیہ پھر بھی ناکافی تھا اُدھر تاخیر کے سبب قوم میں بدگمانی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ مولانا عثمانی کا قوم پر اثر تھا اس لئے مہتمم صاحب نے دارالحدیث کے چندے کے لئے علامہ سے ایک نہایت ہی ادبی اور مؤثر مضمون لکھایا جو واقعی اثر

میں ڈوبا ہوا اور ادب پارہ ہے۔ ذیل میں ہم یہ مضمون بعینہ درج کرتے ہیں کہ ان کے زور قلم کی یادگار ہے اور جو رسالہ القاسم ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ میں شائع ہوا ہے۔ رسالے کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ماہ کا رسالہ مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی مرحوم نے مرتب کیا تھا:۔

مضمون حضرۃ الاستاذ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مدرس دار العلوم دیوبند

عشق و محبت کی بحث میں تم نے مجنون و لیلیٰ کے تذکرے پڑھے۔ قیس و فرہاد کی داستانیں سنیں اور یہ تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ رات کے وقت جب شمع روشن ہوتی ہے تو ہزاروں پروانے اپنی چھوٹی چھوٹی ہستیوں کو کس اشتیاق اور بے تابی کے ساتھ شمع کی لَو پر نثار کرتے اور تن من کو جلا ڈالتے ہیں۔ لیکن تم کو غالباً کبھی ایسے پروانوں کو دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا ہوگا جنہوں نے شمع کی آگ میں اپنے کو اس لئے جلایا ہو کہ وہ جلنے سے بچ جائیں اور اس لئے فنا کیا ہو کہ وہ پھر کبھی فنا نہ ہوں۔ چمن میں خاموش پھولوں کے اردگرد سینکڑوں دفعہ بلبلوں کے چہچہے سنے ہوں گے پر ایسا ایک دفعہ بھی نہ سنا ہوگا کہ شاہد گل تو خود چہچہا رہا ہو اور شور مچانے والی بلبلیں ساکت و صامت رہ کر اس کے ایک ایک لفظ کو چن رہی ہوں۔

پس آؤ کہ تم کو حجاز کی سرزمین میں کے نور سے روشن کی ہوئی وہ شمع محمدی دکھلائیں جس پر لاکھوں پروانوں نے اپنی ہستیوں کو محض اس لئے جلا ڈالا کہ وہ خدا کی سب سے بڑی دہکتی ہوئی آگ کی لپٹ سے محفوظ ہو جائیں اور اپنی چند روزہ حیات کو اس کے قدموں پر اس لئے قربان کر دیا کہ ان کو دائمی زندگی حاصل ہو۔

عرب کے خشک ریگستانوں اور بے آب و گیاہ پہاڑوں میں خدا کی قدرت دیکھو

ایک غنچے میں چٹک پیدا ہوئی اور ایک ایسا پھول کھلا جس کی مست کر دینے والی مہک کے سامنے مشک و گلاب کی بھی حقیقت نہ رہ گئی۔ اور جب بلبلوں کے دماغوں میں اس کی مدہوش کر دینے والی خوشبو پہنچی تو انہوں نے جمع ہو کر خوب شور مچانا شروع کیا۔ اس پر چمنستان نبوت کا وہ گل سر سبد گویا ہوا اور اپنے نغمۂ طرب افزا سے سب کی زبانیں خاموش کر دیں۔ پھر کیا تھا بلبلیں اس کا لحن داؤدی سننے کے لئے گردنیں جھکا جھکا کر ادب سے سمیٹ سمیٹ کر بیٹھ گئیں۔ اور جو لفظ بھی اس کی زبان سے نکلا اس کو اٹھا لیا اور جو کلمہ بھی سنا اس کو فوراً دل کی تختی پر لکھ لیا۔

میرے اس بیان کو تم محض شاعریت مت سمجھو بلکہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پڑھو اور آپ کے ساتھ ان کے شغف اور تعلق کا اندازہ لگاؤ تو تم کو صاف معلوم ہو جائے گا کہ وہ آپ کے اصحاب بھی تھے اور شاگرد بھی۔ عاشق جاں نثار بھی تھے اور درم ناخریدہ غلام بھی۔ مؤدب بھی تھے اور بے تکلف بھی۔ آپ کو اپنا محبوب بھی سمجھتے تھے اور بادشاہ بھی۔ نبی بھی مانتے تھے پدر بزرگوار بھی۔ پھر ایسی حالت میں یہ کیونکر ہو سکتا تھا کہ وہ آپ کے آثار اور روایت میں سے کسی ایک کو بھی ضائع کر دیتے۔ یا ان کے نشر و اشاعت میں ادنیٰ بے اعتنائی کو کام میں لاتے۔ صرف ابوہریرہ، عبداللہ بن عمرو بن العاص، عبادلہ ثلاثہ اور عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی روایات کا تتبع ہی ہم کو یہ جتلانے کے لئے کافی ہے کہ آپؐ نے شاید تئیس برس کے عرصے میں کوئی سانس نہیں لی اور ایک قدم نہیں اٹھایا اور کبھی لبوں کو حرکت نہیں دی مگر آپ کے اصحاب نے اس کو پورے اہتمام کے ساتھ قلم بند کر لیا اور یا کاغذ کے اوراق سے بھی زیادہ پائیدار یادداشت میں محفوظ رکھا۔ اور یہ اس لئے کہ انہوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں آپؐ ہی کی ذات با برکات کو اسوۂ حسنہ ٹھہرا لیا تھا۔ اور دین و دنیا کے ہر ایک کام میں وہ آپ ہی کے اقوال و احوال کو (جن پر ان ہو

اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحیٰ کی مُہر ہو چکی تھی) دلیلِ راہ مان چکے تھے۔

بعدہٗ انہوں نے تمام دنیا کو اسی ایک مقصد (عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ) کی طرف دعوت دی جس کے لبیک کہنے کے لئے مشارق و مغارب سے لوگ امنڈ پڑے اور کسی صحابی سے ایک حدیث سُن لینے کو انہوں نے کل دنیا اور ما فیہا سے زیادہ قیمتی سمجھا۔ اور پھر ان لوگوں کی راہ طلب میں نہ تو سمندر کی موجیں حائل ہو سکیں اور نہ پہاڑوں کی بھاری بھاری چٹانیں۔ جنگل و بیابان قطع کرتے ہوئے اور پہاڑوں کو پھلانگتے ہوئے وہاں پہنچے جہاں کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار مبارک سے آنکھیں روشن کرنے والے موجود تھے۔ مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑھنے پڑھانے والوں سے بھر گیا اور کل دشت و جبل نعرۂ حدیث سے گونج اٹھے۔ اسی طرح یہ سلسلہ خلفاً عن سلفٍ چلا اور بیسیوں علوم خاص فن حدیث کے لئے مدوّن ہو گئے۔ یہاں تک کہ ثریا تک پرواز کرنے والوں عجمیوں کی ایک جماعت نے روایات اور الفاظ حدیث کا ایک چھانا اور تایا ہوا صحیح و صاف ذخیرہ جس میں وضّاعین اور کذّابین کے بطالت انگیز مکائد کی ذرّہ برابر بھی آمیزش نہ تھی، ہمارے ہاتھوں میں قیامت تک کے لئے چھوڑ دیا اور ایک دوسرے گروہ نے (جو لعلمہ الَّذِیْنَ یَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ میں شامل تھا) ان احادیث کے اسرار و معارف اور اصول و فروع منضبط کر کے سینکڑوں علوم اسلامیہ کی بنیاد ڈالی۔ انہوں نے یہ بخوبی ثابت کر دکھایا کہ نہ تو دنیا کا کوئی فلسفہ ان تعلیمات کا مقابلہ کر سکتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیروؤں کو دی ہیں اور نہ مصریوں کا ابلہ فریب تمدّن اور نہ حکمتِ یونان کی عظام رمیم (گلی سڑی ہڈیاں)۔

فریب رائے عزیزاں چرا خورم کہ مرا
حدیثِ سیّدِ کونین بر زبان باقیست

اس زمانے کے ملوک و سلاطین کی توجہ اور حوصلہ افزائی بھی داد دینے کے قابل ہے کہ انہوں نے علمائے حدیث کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ خود محدث بنے اوروں کو اس طرف توغبت دلائی حتی کہ دمشق اور قاھرہ وغیرہ میں خاص دار الحدیث کے نام سے عمارتیں بنوا کر آئندہ نسلوں کے لئے نیک مثالیں قائم کیں۔ گویا اس طرح وہ امانت جو قلم نے بطون اوراق میں جمع کی تھی مدارس کے کمروں کے سپرد کی گئی۔

تاریخ کی ضخیم جلدیں اس چھوٹے سے اشتہار میں نہیں سما سکتیں جن سے تم کو یہ معلوم ہوتا کہ اب سے چند صدی پہلے کس طرح مسلمانوں کی غفلت اور کم ہمتی یا سہل انگاری سے بالخصوص ہندوستان میں علم حدیث (اور صحیح معنوں میں علم حدیث) قریبًا ناپید رہا۔ اور پھر کس طرح دہلی کے ایک حکیم امت نے مدینہ منورہ سے ایک نہر کاٹ کر نئی روانی اور حیرت انگیز آب و تاب کے ساتھ ہندوستان کی بنجر زمین میں جاری کی اور پھر کس صورت سے اس کے حقیقی وارثوں نے اس کو خشک ہونے سے بچایا۔

میرے نزدیک آپ کو تاریخ کے سارے دفتر کو الٹ پلٹ کرنے کی ضرورت نہیں دیوبند میں آجاؤ اور قاسمی رشیدی بلکہ ولی اللّٰہی دار العلوم کو دیکھ لو وہ خود فن حدیث وفقہ کی ایک مجسم تاریخ ہے۔ کیونکہ اسی نے آج اس کساد بازاری کے زمانے میں اس متاع گرانمایہ کو رواج دیا جس کو مسلمان اپنی بدقسمتی سے کھو بیٹھے تھے۔ یہاں پہنچکر تم دیکھو گے کہ حدیث کی تعلیم کس طرح ہوا کرتی ہے۔ اور کس طرح ہونی چاہیئے۔ اور کس طرح آج بھی اعناق، مطایا کو قطع کرکے طالبین حدیث کے جوق در جوق مختلف اقطار و اکناف سے چلے آرہے ہیں۔ اور کس طرح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے ہم وطن آج دیوبند کے دار العلوم سے ان کے قدیم ترکہ کو بخارا پہنچانے میں سرگرم ہیں۔ اور کس طرح اس نہر کے چند قطرے مدینہ طیبہ پہنچ کر اپنے اصلی سرچشمہ میں جا ملے ہیں۔

مشتاقان حدیث اور عاشقانِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ہجوم کو دیکھ کر

منتظمین دارالعلوم بھی تنگی مکانی سے گھبرا اٹھے اور تقریباً چھ سال ہوئے کہ انہوں نے تاسیس دارالحدیث کے متعلق آواز بلند کی۔ مسلمانوں کے ہر طبقے نے اس کو سنا اور ایسے قبول عام کے ساتھ سنا کہ جس کی نظیر کم از کم میری نگاہ سے تاریخ میں نہیں گذری میں نے کسی دارالحدیث بلکہ کسی درسگاہ کی نسبت نہیں پڑھا کہ اس میں جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام، ائمہ مجتہدین اور مشائخ عظام رضی اللہ عنہم کی طرف سے ہزاروں آدمیوں نے چندے بھیجے ہوں اور ایسی مبشرات بیان کی ہوں جو دارالحدیث دیوبند کی نسبت بیان کی گئیں۔ زیادہ تفصیل کا یہ موقع نہیں لیکن میں اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جو دارالحدیث عہد ماضی میں بنائے گئے ان کے بانی سلاطین اور فرمانروا تھے اور اس کے محرک و ساعی عموماً فقراء اور متوسط الحال لوگوں کی ایک جماعت ہے۔

بہرحال چھ سال ہوئے یہ غلغلہ اٹھا اور ایک نہایت معقول رقم جس کی تفصیل کسی دوسری اشاعت میں معلوم ہو سکے گی چند یوم میں بغیر کسی معتد بہ مادی کشش کے اس مد میں پہنچ گئی۔ اس کے بعد یکایک وہ پھر خاموشی سے بدل گیا جس کی بہت سی وجوہ عوام نے طبعاً اختراع کر لیں لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ ایک سرکاری گندے نالے کے حائل ہونے کی وجہ سے بڑے عرصے تک یہ مقدس کام رکا رہا۔ بیہم مساعی کے بعد خداوند تعالیٰ نے گورنمنٹ عالیہ کو اس طرف متوجہ کیا اور موجودہ ہز آنر نواب لفٹیننٹ گورنر بہادر کی قابل شکریہ عنایات خاصہ سے دارالعلوم کے ارباب حل و عقد اس مشکل پر غالب آئے۔ یہاں تک کہ پاکی نے ناپاکی کو دور کر دیا اور آفتاب قدس کی شعاعوں کو نجاست کے چھینٹے گندہ نہ بنا سکے اور أَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ کی مثل پوری صادق ہوئی۔ والحمد للہ علی ذالک۔

اب جماعت اسلام اور اخوان صدق و صفا کی اطلاع کے لئے یہ اعلان

شائع کیا جاتا ہے کہ بحمداللہ دارالحدیث کی عالیشان بنیادیں جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں بھری گئیں اور عمارت کا نقشہ زمین پر قائم ہو گیا اور نہایت سرعت کے ساتھ کام جاری ہے۔ لیکن یہ سرعت جب ہی قائم رہ سکتی ہے جبکہ ہماری قوم زائد از زائد توجہ سے کام لے۔ کیونکہ یہ لاکھ سوا لاکھ روپیہ کا تخمینہ اولاً خدا کے فضل و رحمت اور ثانیاً مسلمانوں کی اعلیٰ درجہ کی توجہ سے انجام پا سکتا ہے، مسلمانانِ ہندوستان کی ہمت و سعی نے یہ کام کر دکھایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کے اولیاء و علماء کی یہ رفیع المنزلت یادگار سرزمین ہند پر قائم ہو گئی تو انشاء اللہ العزیز یہ ایک ایسی یادگار ہو گی جو دنیا میں تا ابد مسلمانوں کی عظمت و وقعت کو زندہ رکھے گی اور آخرت میں ذخائر حسنات ان کے ساتھ ہوں گے۔

خداوند رب العزت کے فضل و کرم سے جس کی مہربانی ہمیشہ اپنے تمام بندوں پر مبذول رہتی ہے، یقین ہے کہ اگر ہم سب اس کے سامنے گردن جھکا کر اور خالص اس کے افضال پر بھروسہ کر کے اور اپنی غفلت شعاریوں کو چھوڑ کر کوشش کریں گے تو وہ ضرور اپنی رحمت کی بارش ہم پر کرے گا جس سے امیدوں کی تمام کھیتیاں لہلہا اٹھیں گی اور کوئی مشکل ایسی نہ رہے گی جو آسانی سے نہ بدل جائیگی ؎

فضل حق کا کس حال میں شامل نہ رہا   ایک دم بھی وہ کبھی لطف سے غافل نہ رہا
حال اپنا ہی کسی کام کے قابل نہ رہا   ورنہ یہ سخت غلط ہے کہ وہ مائل نہ رہا

اے کہ خواہی بجہاں اشرف و ممتاز آئی
می نشاند کہ زیندار بہ پرواز آئی

پس اے خدائے قدیر ؎

ہو بہو عقدۂ دشوار ہیں آساں کر دے
سر بسر درد کی تصویر ہیں درماں کر دے
خوگر گریۂ اندوہ کو خنداں کر دے

تجھ میں قدرت ہے کہ کانٹے کو گلستاں کر دے

شد فراموش جہاں قصہ پارینۂ ما
باز نقدے بر واج آر ز گنجینۂ ما

(القاسم ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ صفحہ ۵ سے ۹ تک)

رقمزدہ
شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ
مدرس دار العلوم دیوبند
مورخہ ۲۴ محرم الحرام ۱۳۳۵ھ

دار الحدیث سے متعلق علامہ کا یہ مضمون، حدیث کی عظمت، دار الحدیث کی تاریخی شوکت اور زبان کی طلاقت کا پتہ دیتا ہے۔ آپ کے اس مضمون کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ القاسم کے اوراق سے اس کے رد عمل اور تعاون کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے بعد علامہ نے اس سلسلے میں اور کوئی قدم اٹھایا یا نہیں نظر سے نہیں گذرا۔ البتہ تعمیر کا سلسلہ جاری رہا حتیٰ کہ پورے طور پر اس کی تکمیل ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۹۳۱ء میں ہوئی۔ جس کا طول اڑسٹھ ۶۸ فٹ اور عرض پینتیس ۳۵ فٹ ہے۔ اور جس کا نقشہ سید عاشق حسین صاحب ریاست انجینئر بہاولپور نے بنایا۔ مجھے تو اس سلسلے میں یہ کہنا تھا کہ القاسم کے اوراق میں دار العلوم کی علمی اور عملی خدمات میں علامہ عثمانی کے حالات جا بجا ملتے ہیں، اور اسی سلسلے کی ایک کڑی دار الحدیث کے لئے علمی اقدام مضمون کی صورت میں اور عملی قدم خورجہ پہنچنے اور اس کے لئے مالی امداد کے لئے اٹھایا۔

تعمیر دار الطلبہ جدیدہ: دار الحدیث کے علاوہ علامہ نے دار العلوم کے جدید بورڈنگ ہاؤس کی تعمیر کے لئے بھی قدم اٹھایا تھا۔ آپ نے اس سلسلے میں ضلع بجنور کا دورہ کیا۔ مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری ناظم

تعلیمات دار العلوم، مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی بھی ہمراہ تھے۔ دہلی سے مولانا احمد سعید صاحب بھی پہنچ گئے تھے۔ اس سفر میں راقم الحروف خادم سفر کے طور پر ساتھ تھا۔ سب سے پہلے یہ وفد نہٹور ضلع بجنور گیا۔ وہاں علامہ کی تقریر ہوئی، بعد ازاں دھام پور ضلع بجنور میں تقریر فرمائی۔ دھام پور سے تین میل کے فاصلے پر میں اپنے وطن شیر کوٹ چلا گیا اور یہ حضرات یاد پڑتا ہے کہ بجنور اور نگینہ تشریف لے گئے اور علامہ نے وہاں بھی تقریریں کیں۔ یہ سفر خالص دار العلوم کے لئے تھا۔

وکیل دار العلوم دیوبند

حضرت عثمانی چونکہ اپنی تحریر و تقریر کے باعث ہندوستان میں بلند پایہ شہرت کے مالک ہو چکے تھے اور لوگوں میں آپ کا اثر تھا اس لئے دار العلوم کی وکالت بھی آپ ہی کے سپرد تھی۔ ہر وہ حملہ جو دار العلوم دیوبند یا مجلس انتظامیہ یا تعلیمی و انتظامی امور پر کسی کا ہوتا آپ کو ہی اس کے جواب میں وکیل اور نمائندہ بنایا جاتا۔ گویا آپ مادر علمی کے لئے سپر کا کام دیتے تھے۔

دار الحدیث کے مضمون میں یہ اشارہ آپ کی نظر سے ابھی گذرا ہے کہ سرکاری گندہ نالے کی وجہ سے دار الحدیث کی بنیادوں کا کام رکا پڑا تھا۔ تا آنکہ یہ رکاوٹ دور ہوئی اور برطانیہ کی حکومت نے اس کو اس جگہ سے دور ہٹانے کا حکم دیدیا۔ جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب جن کو راقم الحروف تدبر و سیاست میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا عکس (پرتو) سمجھتا ہے، انہوں نے اس زمانے کے صوبہ آگرہ و اودھ کے گورنر سر جیمس میسٹن کو اس سلسلے میں نواب عبدالصمد خان صاحب رئیس طالب نگر اور نواب حافظ احمد سعید خان صاحب چھتاری کے ذریعہ دعوت دی۔ چنانچہ گورنر صاحب مذکور نے دعوت کو قبول کرلیا لیکن تاریخ کا تعین نہ ہوسکا۔ جناب مولانا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم سابق مہتمم دار العلوم کسی مدرسے کی ضرورت سے

۲۶ر جنوری ۱۹۱۵ء کو دہلی تشریف لے گئے اور گورنر صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے تاریخ آمد کے متعلق کہا کہ ہم نواب عبدالصمد صاحب سے ملاقات کے بعد مقرر کریں گے۔ ۲ر فروری ۱۹۱۵ء کو ہر دو نواب صاحبان مشورے کے لئے دیوبند پہنچے۔ رائے طے پائی کہ نصف فروری تک آگرہ میں دربار ہوگا اس وقت تاریخ کے تعین پر گفتگو کرلی جائے گی۔ ۲۴ر فروری کو اطلاع ملی کہ گورنر صاحب یکم مارچ ۱۹۱۵ء کو دیوبند پہنچیں گے۔ چنانچہ خاص گاڑی (اسپیشل ٹرین) ۸ بجے صبح کے بعد دیوبند پہنچی۔ سٹیشن پر دونوں نواب صاحبان نے استقبال کیا اور دس بجے کے بعد گورنر صاحب دارالعلوم میں پہنچے۔ صدر دروازے پر مہتمم صاحبان اور اراکین مدرسہ نے استقبال کیا۔ دو گھنٹے تک گورنر صاحب نے دارالعلوم کی تمام عمارتوں کا معائنہ کیا۔ مہتمم صاحب مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم القاسم میں لکھتے ہیں :۔

"دو گھنٹے قیام فرما کر دارالعلوم کے احاطوں کو اندر باہر سے ملاحظہ فرمایا اور گندہ نالہ سرکاری و تالاب عقب مدرسہ پر تشریف لے جا کر دیر تک نالے کے ہٹلائے جانے کے بابت جس کے ہٹا دینے کی بابت ہز آنر سے خواہش کی گئی تھی گفتگو فرماتے رہے۔" (القاسم جمادی الاولیٰ ۱۳۳۳ھ ص ۴)

یہ وہ ۔۔۔۔ تھا جس کے لئے حضرت مہتمم صاحب نے تار کر گورنر صاحب کو بلایا تھا۔ بہرحال ایڈریس پڑھے گئے، کتب خانہ دیکھا گیا، جلسہ ہوا۔ ایڈریس کا جواب گورنر صاحب نے دیا جس کی تمام اجمالی اور تفصیلی کیفیت مذکورہ بالا رسالہ القاسم اور روئداد میں موجود ہے۔

ظاہر ہے کہ صوبے کی سب سے بڑی حاکمانہ شخصیت کی آمد پر دارالعلوم کو سجانا ناگزیر تھا۔ ان کی آمد اور استقبال پر اہتمام کیا گیا۔ جھنڈیاں بھی لگائی گئیں۔ کچھ فرش فروش بھی ہوا۔ اور اس جلسے جلوس کے بعد جناب مولانا حافظ محمد احمد صاحب

کو گورنمنٹ برطانیہ کی طرف سے ایک ماہ کے بعد شمس العلماء کا خطاب بھی مل گیا۔ جلسے میں شہری اور معزز حکام، ہندو مسلمان سب ہی تھے۔ گورنر صاحب کے ایڈریس پر ان بیرون مدرسہ کے لوگوں نے خوشی اور احترام میں حسب دستور زمانہ تالیاں بجائیں۔ علمائے دیوبند کے لئے یہ صورت معذوری کی سی تھی۔ یہ حالات باہر بھی پہنچے۔ بات کا بتنگڑ بن گیا۔ کارکنان مدرسہ کی پوزیشن اور دارالعلوم کی بہبودی کو نظر انداز کرتے ہوئے کسی صاحب نے مدرسے کے خلاف زمیندار میں معترضانہ مضمون شائع کرایا۔ یہ مضمون مولانا ابوالکلام آزاد کی طرف سے تھا لیکن مضمون نگار کا نام نہ تھا۔ تاہم پتہ چلانے والوں نے پتہ چلا لیا۔ اس مقام پر یہ بھی واضح کردوں کہ مولانا عبیداللہ صاحب دیوبند سے الانصار کے بعد چلے گئے تھے۔ اور دہلی کی دوسری جماعت یعنی ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خان، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام سے جا ملے تھے۔ یہ سارے دور ابھی ابھی ختم ہو چکے تھے اور پانی سر سے گذر گیا تھا۔ گورنمنٹ میں دیوبند کی انصارانہ سیاسی سرگرمیوں سے بدگمانی سی ہوگئی تھی۔ کارکنان مدرسہ اپنی پوزیشن کو بھی صاف کرنا چاہتے تھے اور اپنا کام بھی نکالنا چاہتے تھے۔ گورنر کی آمد پر شیخ الہند مدرسہ میں موجود تھے۔ مولانا عبیداللہ اپنی دہلی کی انجمن نظارۃ المعارف میں کام کر رہے تھے۔ اور جو اسی سال اگست ۱۹۱۵ء میں کابل چلے گئے تھے اور شیخ الہند بھی گورنر صاحب کی آمد سے کئی ماہ بعد شوال ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۵ء میں حجاز کو روانہ ہونے والے تھے اور ہوئے تھے۔ جنگ یورپ چھڑی ہوئی تھی اسی دور میں ملسٹن دیوبند آئے تھے۔

ان حالات میں مدرسۂ عالیہ اور اس کے کارکنوں پر اعتراضات کا ہونا بالکل قرین قیاس تھا در انحالیکہ گورنر کی آمد کے بعد جناب مہتمم صاحب کو شمس العلماء خطاب بھی مل چکا تھا۔ حالانکہ یہ زمانہ انگریزوں سے نفرت کا زمانہ تھا۔ ان اعتراضات اور حملوں سے بچانے کے لئے علامہ شبیر احمد صاحب کو وزیر دفاع بنایا گیا

اور انہوں نے اپنے ایک زبردست جوابی مضمون میں جو زمیندار ۱۳ر جولائی ۱۹۱۵ء میں بھی چھپا اور علیحدہ پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع ہوا اور القاسم رمضان المبارک ۱۳۳۳ھ مطابق اگست ۱۹۱۵ء میں "تشریح واقعۂ دیوبند" اور "عطائے اعزاز کی حقیقت" کے عنوانات کے ماتحت چھپا۔ اس مضمون میں آپ نے جہاں دارالعلوم کی حمایت میں قلم اٹھایا وہاں مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی پوزیشن کو بھی صاف کیا۔ بہرحال مولانا آزاد نے جو اعتراضات کئے ہیں وہ اور علامہ عثمانی کے جوابات ہدیۂ ناظرین ہیں :۔

معترض مولانا ابوالکلام آزاد:۔ جس طرح سرآمد خدام ہند، شیخ الاحرار، قبلۂ فداکاران و سرفروشان عصر مسٹر گاندھی کو بایں ہمہ ملت پرستی و حریت کاری خطاب کا ملنا تعجب انگیز ہے، ایسا ہی یہ واقعہ بھی تعجب انگیز ہے کہ مولانا محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کو شمس العلما کا خطاب ملا۔

(۲) عام طور پر آج تک جو طرز عمل عطائے خطابات و مناصب میں رہا ہے یعنی بالعموم ان لوگوں کو خطاب دینا جو مقاصد عالیہ کے لئے سِرًّا یا علناً خدمات انجام دے چکے ہوں یا ان سے اس طرح کے خدمات متوقع ہوں، اس کے لحاظ سے مولانا موصوف کو شمس العلما بنانا تعجب انگیز یا اقلاً خلاف توقع ہے۔

(۳) اس لئے کہ مولانا کی آزاد شخصیت اور بے باکانہ صداقت جلسۂ سہارنپور میں ظاہر ہو چکی ہے۔

(۴) مولانا کی اعلیٰ شخصیت کو نہ کبھی پہلے خطاب کی ضرورت تھی اور نہ (خدانخواستہ) کبھی ہو۔ ع

"باآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را"

مجیب علامہ شبیر احمد عثمانی :۔ امور مذکورہ بالا میں، سے امر اول پر نظر ڈالتے ہوئے حقیقت نگار موصوف کا پیمانۂ جوش چھلک پڑا اور انہوں نے سخت نعل در آتش ہو کر ایڈیٹر ہمدرد سے یہ مؤاخذہ کیا ہے کہ "مشہور وطن پرست گاندھی اور مدرسۂ دیوبند کے تنخواہ دار مہتمم مولانا محمد احمد صاحب دونوں کو ایک صف میں کھڑا کرنے کا آپ کو کیا استحقاق تھا جبکہ موخر الذکر کو کسی قسم کے ایثار قومی اور فداکاری کے دکھلانے کا موقعہ نہیں ملا۔ اور برخلاف اس کے مسٹر گاندھی نے جو کچھ کیا وہ تاریخ صداقت و وطن پرستی میں محفوظ ہے۔

بلاشبہ حقیقت نگار موصوف کی طرح ہمارے لئے بھی اس امر کا احساس سخت تکلیف دہ ہے کہ شیر بیشۂ مذہب اور ایک آزاد پولٹیکل پہلوان کو ایک نگل میں اتار دیا جائے یا کسی سادہ اور روشن ضمیر خدا پرست کو کسی معروف و مصطلح وطن پرست کی صف سیاست میں لا کر کھڑا کر دیا جائے۔ کیونکہ ؎

صلاح کار کجا و من خراب کجا — ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا
چہ نسبت است برندی صلاح و تقویٰ را — سماع وعظ کجا، نغمۂ رباب کجا

لیکن ہم جانتے ہیں کہ فی الحقیقت معزز ایڈیٹر ہمدرد پر کسی ایسی صف آرائی کا الزام رکھنا محض بے بنیاد ہے جس میں مسٹر گاندھی اور مولانا محمد احمد صاحب کو دوش بدوش کھڑا کیا گیا ہو۔

ہمدرد کے ان الفاظ سے کہ "دیوبند کے ایک سیدھے سادے غیر شہرت پسند بزرگ مہتمم دارالعلوم الاسلامیہ کو بے مانگے شمس العلما کا خطاب ملنا

ایسا ہی خلاف توقع اور غیر مترقب ہے جیسا کہ مسٹر گاندھی کی جنوبی افریقہ کی خدمات کا صلہ ہندوستان میں بصورت خطاب دیا جانا؟ میں نہیں سمجھتا کہ کس منطق کی بنا پر دونوں کے کارناموں کی مساوات اور ان کی پوزیشنوں کے عدم امتیاز کا نتیجہ نکال لیا گیا۔ ہمدرد خود دونوں کی خدمات کی طرف اشارہ کر کے ہر ایک کی نوعیت کو اپنے مختصر جملوں میں واضح کر رہا ہے لیکن آپ ہیں کہ نہیں دیکھتے اور نہیں سنتے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے تھا کہ دارالعلوم دیوبند (جس کے اہتمام کی ذمہ داری مولانا محمد احمد صاحب کو لوگوں میں ممتاز بناتی ہے) کوئی معمولی مکتب یا انجمن نہیں ہے وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی سب سے بڑی یادگار ہے جس کے بانی جس کے فیض یافتہ طلبہ، جس کے مدرسین، جس کا نصاب تعلیم اور جس کا سارا اسٹاف خالص مذہب کی روح اپنے اندر رکھتا ہے اس نے ہمیشہ اپنی خاموش، پُرامن، بے ضرر مگر پائدار ناممکن التبدیل اور نہایت ہی غیر متزلزل رفتار میں مذہب کی تعلیم کو عام کیا اور سچے اسلامی جذبات کو عوام و خواص اور مشرق و مغرب تک پہنچایا۔

وہ اپنی آواز پر کان دھرنے والوں کو، اس وقت بھی جبکہ "ہندوستان میں مسلمانوں کے بڑے بھاری لیڈر کانگریس کے مقاصد میں شرکت کرنے کو حماقت اور گمراہی سمجھتے تھے" اور جبکہ "قرآن کریم میں سے بہت ساری گرم جوش آیات کو لفظاً یا معناً نکال ڈالنے کا مسودہ پیش ہو رہا تھا" اسی قرآن اور اسی دفتر احادیث کے تمام ابواب کی بے کم و کاست اور آزادانہ تعلیم دے رہا تھا جس کی آج اس زمانے میں دے رہا ہے جبکہ مسلم لیگ اور کانگریس کو مدغم کیئے جانے کی کوشش جاری ہے۔ اور جبکہ پُرجوش جذبات کی نمائش کرنے والے ان ہی مولویوں کو جن کو وہ دس بیس سال پہلے مذہبی مجنون

دیوانہ، نا عاقبت اندیش کہا کرتے تھے، اب نہایت کمزور، بزدل اور مصلحت ساز خوشامدی بتلاتے ہیں۔

انقلاب لیل و نہار کو دیکھو اور بغور دیکھو کہ ایک وہ حالت تھی جبکہ دارالعلوم کی تعلیم کو مغویانہ اور برہم زن امن و اماں اور مفسد ملک و ملت سمجھا جاتا تھا یہاں تک کہ ایک مطبوعہ اشتہار میں "قابل غور گورنمنٹ" کے عنوان سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ "سرحد، کابل اور دوسری جگہ کے مسلمان، جہاں کہیں نصاریٰ سے جنگ کرتے ہیں ان سب کی سکیم دیوبند کا مدرسہ تیار کر رہا ہے" اور آج یہ کیفیت ہے کہ ان ہی سکیم تیار کرنے والوں کو (درانحالیکہ ہم ثابت کریں گے کہ وہ ابھی تک اپنے اکابر سلف کے قدم بقدم چل رہے ہیں) خوشامدی اور دین فروش یا اس کا مرادف قرار دیا جا رہا ہے۔

لیکن آپ خوب یاد رکھیں کہ جس طرح دارالعلوم کے ارکان کے قدم بحمداللہ مقدم الذکر حملوں سے نہیں ڈگمگائے اسی طرح ان دوسری قسم کے جھٹکوں سے بھی کوئی وجہ نہیں کہ وہ لڑکھڑا کر گر پڑیں ؎

عنقا شکار کس نشود دام باز چیں　　　کانجا ہمیشہ باد بدست دام را

. . . .

فضائل و مناقب کی لائنوں کو آپ نے پوری طرح سمجھا ہی نہیں ورنہ آپ ہر ایک کو اس کی صنف کمال کی لائن میں کھڑا کرنے کے خواہشمند ہوتے۔

دیکھ لو، صحابۂ کرام میں بحمداللہ ایک سے ایک اعلیٰ افراد موجود تھے لیکن زہد و فقر میں ابوذر کو، امانت میں ابو عبیدہ کو، اتباع سنّت میں ابن عمر کو، تفقہ دینی میں ابن مسعود کو، تاویل و تفسیر میں ابن عباس کو،

رحمت میں صدیق اکبر کو، صلابت و شدت فی الدین میں فاروق اعظم کو، حیا میں عثمان غنی کو اور فصل قضایا میں حضرت علی کو امام طائفہ سمجھا گیا (رضی اللہ عنہم اجمعین ورضوا عنہ)

پس اگر فرض کرلو کہ مولانا محمد احمد صاحب میں آپ کا فرضی ایثار یا جذبۂ وطن پرستی نہیں پایا جاتا تو کیا ان کے تمام مناقب سے بھی چشم پوشی کی جا سکتی ہے جن میں وہ ممتاز ہیں۔ اور جن کے چمکتے ہوئے آثار ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی کے واحد مرکز (دار العلوم دیوبند) کی پچھلی بست سالہ تاریخ میں محفوظ ہو چکے ہیں۔

دوسرے اعتراض کا جواب
از علامہ عثمانی

امر دوم کی نسبت ہم حقیقت نگار سے اس قدر دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ عطائے خطابات کے متعلق گورنمنٹ کا جو طرز عمل آج تک آپ نے تبلایا ہے .... تو کیا حضرت مولانا عبد الحی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا عبد الحق صاحب خیر آبادی مرحوم (جن کو خطاب دیئے جانے کا آپ بھی اقرار کرتے ہیں) اس عام کلیہ کے ماتحت داخل تھے یا نہیں۔ اور جن استحقاقات کی بنا پر آپ کے نزدیک یہ خلعت عظمت مستحقین محترمین (مولانا عبد الحی اور مولانا عبد الحق) کے دوش خدمت پر راست آتا ہے۔ اس کے لحاظ سے ان دونوں بزرگ[illegible]ب دیا جانا تعجب انگیز اور خلاف توقع تھا یا نہیں۔ اگر تھا تو اس پر کیا [illegible] کہ گورنمنٹ آپ کے نزدیک جو غلطی[1] دو دفعہ کر چکی ہے وہ ہی اس نے [illegible]

---

[1] یعنی جس طرح ان دونوں صاحبان نے گورنمنٹ کے خطابات کو واپس کر دیا تھا اسی طرح مولانا محمد احمد صاحب بھی خطاب واپس کر دیں۔ چنانچہ موصوف نے شمس العلماء کا خطاب واپس کر دیا تھا۔ انوار

مولانا محمد احمد صاحب کے معاملہ میں بھی کی ہو۔

آپ نے بہت زور لگا کر یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ "مولانا محمد احمد صاحب کو خطاب دیا جانا سر جیمس میسٹن کے دیوبند تشریف لانے کے ساتھ وابستہ ہے"۔ ممکن ہے کہ ایسا ہو لیکن مولانا محمد احمد صاحب کو ۱۹۰۵ء[1] میں سر جیمس لاٹوس کی تشریف آوری سے چونکہ یہ تجربہ ہو چکا تھا کہ "کسی لفٹیننٹ گورنر کا دیوبند میں آنا خطاب ملنے کے مرادف نہیں ہے" اس لئے مولانا کا اس قسم کے خیال اور نیت سے خالی الذہن رہنا ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔

۶ جنوری ۱۹۰۵ء کو آپ ہی کے الفاظ میں :۔

"دار العلمائے والمتوکلین میں (سر جیمس لاٹوس کا) نزول جلال، مولانا محمد احمد صاحب کی سرگرمی، درمیانی حضرات کی جد و جہد اور اس کے تمام کلیات و جزئیات کا مرقع، مدرسہ کے اندر عقیدت مندانہ انتظامات، دو رویہ جھنڈیوں کا تسلسل، واردین و زائرین کا شدّ الرحال اور عرض نیاز کی عقیدت کیشی یا جواب لطف کی پذیرائی" (اقتباس از مضمون مولانا ابو الکلام آزاد)

وغیرہ وغیرہ جو کچھ دیکھا گیا وہ اس سے ہرگز کم نہ تھا جو آپ کے اور آپ کے زہری اور سالم وغیرہ نے یکم مارچ ۱۹۱۵ء کو دیکھا۔ مگر حیرت ہے کہ اس وقت سے آج تک نہ تو کسی نے اس پر کوئی نکتہ چینی کی اور نہ کوئی پیشین گوئی

---

[1] ۶ جنوری ۱۹۰۵ء میں سر جیمس لاٹوس گورنر یو۔ پی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کی سرپرستی دار العلوم کے زمانے میں دیوبند آئے تھے۔ مولانا ابو الکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر نے بھی اس جلسے میں شرکت کی تھی لیکن ناراض ہو کر چلے گئے تھے۔ جس پر مولانا ابو الکلام مرحوم نے ایک ادیبانہ مضمون لکھ کر مخالفت کی تھی جس کے چند جملے علامہ عثمانی نے اپنی تحریر میں نقل کئے ہیں۔

یہاں تک ہم نے حقیقت نگار موصوف کی معلومات پر جو کچھ ریمارک کیا وہ اصولی اور کلی طور پر تھا۔ جزئی غلط بیانیوں یا مبالغہ آمیزیوں کے متعلق جو حقیقت نگار سے سرزد ہوئیں مثلاً

"سٹیشن سے مدرسہ تک دورویہ جھنڈیوں کا تسلسل، اس زور سے چیرز کی گونج کہ علیگڈھ کا اسٹریچی ہال ماند پڑ گیا، اور علمائے کرام اور فقہائے عظام پر ایسا عالم تواجد وتراقص طاری ہوا کہ بے اختیار عقدۂ تشبہ کی پنجاہ سالہ تعقید خود بخود حل ہو گئی۔"

(اقتباس مضمون مولانا آزاد)

میں اس کے سوا کیا کہہ سکتا ہوں کہ اگر واقعی آپ نے اپنے ذاتی مشاہدے کی بنا پر ایسا لکھا ہے تو ہزاروں اشخاص کے مشاہدات اس کی تکذیب کر سکتے ہیں اور اگر آپ نے خود بلا واسطہ ایسا نہیں دیکھا تو میں معاف کیا جاؤں اگر یہ کہوں کہ آپ کے وہ زہری کے ہم پایہ رواۃ جن کے ذریعہ سے آپ کو اس قسم کی روایات دستیاب ہوئی ہیں، جابر جُعفی سے بھی زیادہ کذّاب ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۰۵ء میں سر جیمس لاٹوس نے اثنائے اسپیچ میں خود بھی اور ان کے یمین ولیسار دونوں طرف کے لوگوں نے (باستثنائے مہتمم وارکان دارالعلوم) متعدد چیرز دیے اور اس دفعہ سر جیمس میسٹن کی تشریف آوری کے موقع پر خود ہز آنر نے اور ان کی داہنی طرف کے لوگوں نے جن میں عموماً علمائے کرام اور منتظمین دارالعلوم تھے اور طلبائے مدرسہ نے ایک مرتبہ بھی چیرز نہیں دیا۔ ہاں اصحابِ شمال نے جن میں بکثرت شہر کے برادرانِ ہنود تھے خاتمۂ تقریر پر چیرز دیا۔

اس اعتبار سے اگر حقیقت نگار کو ۱۹۰۵ء اور ۱۹۱۵ء کا صحیح واقعہ معلوم ہوتا تو یہ کہنا چاہیئے تھا کہ ۵ء میں عقدۂ تشبہ کی جو گرہ ذرا سی ڈھیلی ہو گئی تھی علمائے کرام ۱۵ء میں اس کو پھر کس دیا ....

تیسرے اعتراض کا جواب؛

(۳) امر سوئم یعنی جلسۂ سہارنپور کی جو اصلیت آپ نے زہری عن سالم عن ابیہ کی سند سے بیان کی ہے اس کو دیکھ کر میں یہ کہنے میں معذور ہوں کہ تنقیح روایات اور نقد رجال کا فن ایک نہایت مشکل فن ہے اور اسی لئے غالباً اس کے دقائق تک ہمارے حقیقت نگار کی دسترس نہ ہو سکی ....

حدیث میں آیا ہے کہ شیاطین وحی الٰہی کے سننے کے واسطے آسمان کی طرف چڑھتے ہیں اور جو ایک بات وہاں سے اُچک لیتے ہیں اس کے ساتھ سو جھوٹ ملا کر اپنے اتباع کے روبرو پیش کر دیتے ہیں۔ تو دیکھ لو کہ ان کی روایت کا اصل ماخذ کس قدر پاک و صاف ہے لیکن خود ان کے توسط نے خبر کو کس قدر گندہ اور بے اعتبار بنا دیا ہے۔

نفس واقعہ کی تحقیق جس کی سند پر آپ نے خواہ مخواہ اتنا زور دیا بالکل آسان تھی۔ اخبار مشرق گورکھپور میں اس واقعہ کی مختصر سی اصلیت خود جناب مہتمم صاحب کی طرف سے ظاہر کر دی گئی تھی۔ بلا شبہ ممکن ہے کہ حضرت مہتمم صاحب نے جو تقریر جلسہ سہارنپور میں ایک حاکم وقت کے سامنے کی اور ترکی کے ساتھ اپنی ہمدردی اور اخوت اسلامیہ کا پُرزور لہجے میں اظہار کیا اور ان کی تکلیف و راحت کے ساتھ اپنی تکلیف و راحت کو وابستہ بتلایا اس میں وہ ہندوستان بھر کے اندر منفرد (تنہا) نہ ہوں لیکن اس میں بھی کلام نہیں ہو سکتا کہ اس مجمع میں کہ جس میں عام طور پر گورنمنٹ کے ضرورت سے زیادہ خیر خواہ، ترکوں

سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کر کے حکام کو متاثر بنا رہے تھے جناب مہتمم صاحب ایسی صداقت کے اظہار میں ضرور متفرد تھے۔ لیکن اس میں تو آپ کو بھی شبہ نہیں کہ مولانا نے ایک سچی بات کہی اور جب وہ سچی بات ایک مذہبی مرکز کے ذمہ دار کی زبان سے ادا ہوئی تو قدرتی طور پر اہم ہو گئی۔

امر چہارم

امر چہارم کے ضمن میں حقیقت نگار نے خطاب قبول کرنے سے اس پر استدلال کیا ہے کہ "مولانا محمد احمد صاحب کو بیشک خطاب کی ضرورت و خواہش تھی۔ حالانکہ ایک عالم دین کی سب سے بڑی عزت انقطاع (عن الخلق) میں ہے بلکہ عالم دین ہونے کے لئے سب سے بڑی شرط یہی ہے ان کو دنیا کے ظواہر سے کیا سروکار"۔ ....

یہ بالکل درست ہے کہ ایک عالم دین کی اصلی عزت دنیا سے علیحدہ رہنے ہی میں ہے اور علما کے جو حالات آپ نے احیاء العلوم میں پڑھے ہیں وہ بھی سب درست ہیں مگر مولانا محمد احمد صاحب فقط عالم دین ہی نہیں بلکہ وہ ایک دارالعلوم کے مہتمم بھی ہیں۔

اس کے علاوہ آپ کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ مولانا جامی قدس سرہٗ نے اپنے شیخ خواجہ عبید اللہ احرار کے شاہانہ ٹھاٹھ کو دیکھکر جب یہ کہا تھا کہ

نہ مرد است آنکہ دنیا دوست دارد

تو خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے جواب میں یوں فرمایا تھا

اگر دارد برائے دوست دارد ،

دارالعلوم میں ایسے لوگ بھی آئے جو "دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر" رکھنے کی رائے دیتے تھے انہوں نے گورنمنٹ کی رعایا بنکر دارالعلوم کے احاطے میں اس سے بائیکاٹ کرنے کی تحریک کی۔ اور وہاں کے ارکان کو

کانگریس وغیرہ کی شرکت کی طرف توجہ دلائی لیکن اس قسم کی ساری عیارانہ مساعی دارالعلوم کے مہتمم اور اس کے بے لوث مسلک رکھنے والے اعضاء نے بالکل باطل کردیں۔ اور شاید یہ تحریر جواب زمیندار میں شائع ہوئی ہے یہ بھی انہی سعی کرنے والوں کی آواز بازگشت ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

آخر میں مَیں اس قدر اور گذارش کر کے آپ سے رخصت ہونا چاہتا ہوں کہ آپ نے حاجی محمد عابد صاحب مرحوم کے زہد (ترک تنخواہ) اور آزادانہ رویہ (بیگم بھوپال کے سامنے سپاسنامہ پیش نہ کرنے) کو بہت سراہا ہے حالانکہ حضرت حاجی صاحب مرحوم اگر تنخواہ نہ لیتے تھے تو اپنے تعویذ گنڈے وغیرہ کے مشغلے سے وہ بہت ہی کم وقت مدرسے کے کاموں کے لئے بچا سکتے تھے۔ اور اسی لئے برخلاف مہتممین سالقین ان کو ایک نائب معقول تنخواہ کا رکھنا پڑتا تھا۔

سپاسنامہ اگر انہوں نے بیگم صاحبہ کے سامنے پیش نہیں کیا تو وہی سپاسنامہ حضرت قبلہ مولانا محمود حسن صاحب دامت برکاتہم نے ان کو سُنایا حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آسمان جاہ نواب بشیر الدولہ مرحوم سابق مدار المہام حیدر آباد دکن کو ایک ایڈریس دیا حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نواب مالیر کوٹلہ کے پاس چندے کے کوشش میں تشریف لے گئے۔ اور خود حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شاہ عبدالغنی صاحب دہلوی قدس سرہٗ کا نامہ مبارک دیکر دیوان محمد یٰسین مرحوم کو نواب کلب علی خاں بہادر مرحوم کے پاس مدرسے کے لئے بھیجا۔ پس اگر یہ سب مقدس حضرات (عیاذاً باللہ) غیر اللہ کے سامنے سر نیاز جھکاتے تھے تو تنہا حضرت حاجی صاحب کی ایک نظیر ہم کو

رؤسا کے تعلقات اور مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لکھے ہوئے اس اصول سے کہ "مہتمم اور ارکان مدرسہ کا سب سے بڑا فرض تکثیر چندہ کی کوشش ہے" کس طرح بے نیاز بنا سکتی ہے۔ درانحالیکہ آپ یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ حضرت حاجی صاحب مرحوم کے طرز عمل سے دارالعلوم نے کیا ترقیات حاصل کیں، اور ان حضرات کے نقش قدم پر چلنے سے کیا۔

الراقم

شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ

از

دارالعلوم دیوبند

۱۳ار رمضان المبارک ۱۳۳۳ھ

مذکورہ بالا مضمون علامہ عثمانی کے سترہ صفحات میں سے انہی کی اصل عبارت کا اختصار ہے کیونکہ تمام مضمون کا یہاں پر نقل کرنا طوالت سے خالی نہ تھا۔ اس مضمون کو ہم نہایت ہی تاریخی مضمون سمجھتے ہیں جس میں نہ صرف مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے اعتراضات کا جواب ہے بلکہ ایک گونہ بزرگان و اکابر دیوبند کے اجمالی حالات بھی اس میں آگئے ہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کے باعث ہم نے اپنے مضمون کی سرخی "وکیل دیوبند" رکھی ہے۔ دراصل علامہ عثمانی نے اس جیسے نازک مواقع پر ہمیشہ دارالعلوم اور اکابر دارالعلوم کی حمایت پر قلم اٹھا کر وکالت کے فرائض انجام دئے ہیں۔ حضرت مولانا محمد احمد صاحب والد محترم مولانا محمد طیب صاحب موجودہ مہتمم دارالعلوم کی جس قدر حمایت علامہ عثمانی نے کی ہے اس کی نظیر موجود نہیں ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے زبردست مضمون کا جواب جو انہوں نے ہمدرد اخبار

جاری کردہ مولانا محمد علی جوہر کے جواب میں شائع کرایا تھا، اگر کوئی دے سکتا تھا تو وہ علمائے دیوبند میں صرف حضرت عثمانی کی ہستی ہو سکتی تھی۔

محاکمہ مولانا آزاد نے جو اعتراضات دار العلوم جیسے مرکز کے مہتمم صاحب پر کئے ہو سکتا ہے کہ وہ ان کے نقطۂ نگاہ سے ٹھیک ہوں لیکن علامہ عثمانی نے ایک جملہ لکھکر ساری پوزیشن کو صاف کر دیا ہے اور وہ جملہ یہ ہے کہ "مولانا محمد احمد صاحب صرف عالم ہی نہیں بلکہ وہ مہتمم بھی ہیں" اس لئے جو آزادی دیگر حضرات کو ہو سکتی ہے وہ مہتمم جیسے ذمہ دار کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہر مہتمم کا یہ فریضہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے تدبّر سے کسی ادارے کو خطرات سے بچا کر لے جائے وہی اس دور میں جناب مہتمم صاحب نے کیا۔ دوسری جانب جنگ عظیم کے باعث ترک زبردست بحران سے دوچار تھے اس لئے مجاہدین اسلام کی جماعت دشمنان دین کے وجود کو مقدس اداروں میں آنے اور ان کے لئے عقیدتمندی سے انتظامات فراہم کرنے کو گوارا نہیں کر سکتے یہی پارٹ جو مہتمم صاحب نے ادا کیا خلافت کے عدم تعاون اور انگریزی حکومت سے بائیکاٹ کے دور میں ڈاکٹر ضیاء الدین وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ نے کیا اور میرے نزدیک درست کیا۔

رہا انگریزوں کا دار العلوم میں بلایا جانا یہ بھی علمائے دیوبند کی ہمیشہ سیاست فاضلہ رہی ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے زمانے میں اُس عہد کے لفٹیننٹ گورنر کے سیکریٹری آئے تھے۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب کے زمانے میں آرڈن صاحب کلکٹر سہارنپور مدعو کئے گئے تھے۔ اور ۱۹۰۵ء میں جناب مولانا رشید احمد صاحب کی سرپرستی کے دور میں سرجیمس لاٹوس گورنر یوپی آئے تھے اس لئے یہ امور قابل اعتراض نہیں۔ میرے نزدیک ان کا دیوبند میں آنا اور ذمہ دارانِ دار العلوم کا شاندار انتظامات کرنا مدرسے کی خاطر ایک سیاسی آنکھ مچولی تھی۔

بہرحال راقم الحروف نے اتنی طویل تحریر نقل کر کے اپنے موضوع کتاب یعنی علامہ شبیر احمد عثمانی کی گذشتہ سرگذشت پر روشنی ڈالی ہے کہ وہ ہمیشہ دیوبند کے بہترین وکیل رہے ہیں۔ ہم آخر میں تفنن طبع اور تفریح قلبی کے لئے اس موقع پر سید اکبر حسین الہ آبادی کی وہ غزل مسلسل تحریر کرتے ہیں جو انہوں نے جناب مہتمم صاحب کو میسٹن صاحب گورنر کے جوابی لیکچر کے مضمون سے متاثر ہو کر لکھ کر بھیجی تھی۔ اکبر الہ آبادی لکھتے ہیں ؎

ہز آنر حضرت میسٹن نے بیحد مہربانی کی ✽ ہماری ہی زباں میں آپ نے گوہر فشانی کی
ثنائے عالمان دیوبند اس طرح فرمائی ✽ ہوئی روح اس سے شاداں مدرسے کے نیک بانی کی
یہ فرمایا کہ خالص مذہبی تعلیم ہوتی ہے ✽ نہیں ہے فکر کچھ پولٹیکل ریشہ دوانی کی
طریق انسب یہی ہے ایسے دار العلم عالی کی ✽ ہوا تک لگ نہیں سکتی ہے اس کو بدگمانی کی
حیات چند روزہ ہی کی فکر آتی ہے سب کو ✽ بہت کم فکر رکھتے ہیں حیات جاودانی کی
فقط لذات جسمانی کا شیدا یہ زمانہ ہے ✽ خبر ان کو نہیں ہے روح کے راز نہانی کی
ضروری ہے کہ پیدا ہوں یہاں ذی علم ایسے بھی ✽ کہ جو کچھ روشنی پھیلائیں عقبیٰ کے معانی کی
دلی راحت مسلمانوں نے اس ارشاد سے پائی ✽ دوا ان کو میسر آئی دینی ناتوانی کی
ہز آنر کے ادائے شکر میں سب دل ہیں شامل ✽ زباں میں دے رہی ہیں داد ان کی حق بیانی کی
یہ گو مشکل ہے حاکم کو کہ وہ درویش بن جائے ✽ بہت دشوار پیچیدہ ہے منزل حکمرانی کی

مگر ہے صاف ظاہر حامی مذہب ہیں ہز آنر
حقیقت منکشف ان پر بھی ہے دنیائے فانی کی

(القاسم جمادی الاولیٰ ۱۳۳۲ھ ص ۱۶)

لسان العصر اکبر الہ آبادی مرحوم کو دار العلوم دیوبند سے بہت محبت تھی لیکن اس کے برعکس سرسید مرحوم سے نوک جھوک رہتی تھی۔ دیوبند کے مدرسہ عالیہ کے متعلق انہوں نے ہی یہ لکھا تھا ؎

ہے دل روشن مثال دیوبند ۔ اور ندوہ ہے زبانِ ہوشمند
اب علیگڈھ کی بھی اک تشبیہ لو ۔ اک مقدس پیٹ بس اس کو کہو

یہ تو پرانی باتیں ہیں لیکن کچھ بھی ہو تینوں اداروں نے مسلمانوں کے دین، زبان اور پیٹ کی بڑی خدمت کی۔

دارالعلوم کی مالی اعانت اور علامہ عثمانی، سفر ڈھاکہ جمادی الاخریٰ ۱۳۳۲ھ

گذشتہ اوراق میں ہم نے ابھی یہ واضح کیا تھا کہ مولانا عثمانی نے نہ صرف ایک شیخ المدرسین کی حیثیت میں دارالعلوم کی خدمات انجام دیں بلکہ وہ دارالعلوم کے تعمیری اور عمارتی امور کی ترقی اور بہبودی کے لئے بھی دارالعلوم دیوبند سے باہر نکلے ہیں۔ چنانچہ دارالحدیث اور دارالاقامہ جدیدہ (بورڈنگ ہاؤس) کے متعلق آپ نے ابھی پڑھا ہے۔ اب ہم آپ کے سامنے ڈھاکہ (بنگال) کے سفر کا حال بیان کرتے ہیں جس میں دارالعلوم کے موقر وفد کے ساتھ آپ بھی ایک ممتاز رکن کی حیثیت سے شریک ہیں۔ اس سفر کی پوری کیفیت رسالہ القاسم ماہ جمادی الاخریٰ ۱۳۳۲ھ میں تفصیل کے ساتھ درج ہے۔ جس کا مقصد دارالحدیث کی تعمیر اور دارالعلوم کے بڑھتے ہوئے اخراجات کے پیش نظر چندے کی فراوانی مقصود تھی۔ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ میں اس مرکز علم کے لئے اس جیسا وفد اپنی نظیر آپ ہے۔

دراصل نواب سر خواجہ سلیم اللہ خاں صاحب نے دارالعلوم کے ساتھ عقیدتمندی کے ماتحت مہتمم صاحبان کو بنگال کے سفر کی طرف توجہ دلائی کہ ڈھاکہ اور کلکتہ کی طرف وہاں کے علما کا کوئی خاص وفد آئے اور یہاں کے مسلمانوں کو دارالعلوم کی امداد کے لئے متوجہ کرے۔ چنانچہ نواب صاحب نے اس مقصد کے لئے اپنا خاص معتمد آدمی جناب مولانا محمد احمد صاحب اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتممان دارالعلوم کے پاس بھیجا اور یہ بھی کہلا کر بھیجا کہ مہتمم صاحب کی معیت میں چند خوش بیان علما کا ہونا بھی

ضروری ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اس سفر کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"ممبران و ارکان دار العلوم میں سے مولانا مولوی محی الدین خان صاحب قاضی ریاست بھوپال، مولانا محمد حسن صاحب استاذ صاحبزادگان سرکار عالیہ بھوپال، مولانا عبدالحق صاحب اکاؤنٹنٹ ریاست رتلام، مولانا ظہور علی صاحب ممبر کونسل واضع قوانین و وکیل سرکار بھوپال حاجی امیر شاہ خاں صاحب۔

مدرسین و عہدہ داران دار العلوم میں سے مولانا مولوی عزیز الرحمٰن صاحب مفتی و مدرس، مولانا سید محمد انور شاہ صاحب، مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب، مولانا شبیر احمد صاحب، مولانا سید حسین احمد صاحب مہاجر مدنی، مولانا قاری عبدالوحید خاں صاحب مدرس درجۂ قرأت و تجوید مع مولوی قاری خالد صاحب بصری و مولوی قاری عبدالرشید صاحب بیربھومی۔ اور دار العلوم کے قدیم فارغ التحصیل علماء میں سے مولوی فضل حق صاحب ہزاروی منتخب کئے گئے۔

چونکہ اس سفر میں یہ بھی خیال تھا کہ خاص کلکتہ کے اندر بھی دار العلوم کے لئے تحریک کی جائے گی اس لئے حاجی رشید احمد صاحب تاجر میرٹھ نے بھی تکلیف سفر گوارا فرمائی۔

مولانا مولوی اشرف علی صاحب کی شرکت وفد کے لئے جناب نواب صاحب موصوف کو بھی اصرار تھا اور آپ نے براہِ راست مولانا موصوف کی خدمت میں خط بھی بھیجا تھا۔ .... ۳۰ مارچ سے ۲ اپریل ۱۹۱۴ء تک دار العلوم میں ممبران کے سالانہ جلسے کا انعقاد تھا مولانا (اشرف علی صاحب) بھی تشریف لائے تھے۔ مہتمم صاحب کے فرمانے سے وفد میں شریک ہونے کو قبول فرمایا۔" (القاسم جمادی الاخریٰ ۱۳۳۲ھ مطابق مئی ۱۹۱۴ء ص ۲-۳)

یہ وفد اپنی تاریخ کا کتنا عظیم الشان وفد تھا جس میں علامہ شبیر احمد عثمانی بھی موجود ہیں

بہر حال القاسم کی اطلاع کے مطابق ۴ر اپریل ۱۹۱۴ء کو چھ بجے ایکسپریس میں یہ وفد کلکتہ روانہ ہوا۔ ۵ر اپریل کا ظہرانہ مولوی عبدالباقی صاحب نے الہ آباد کے سٹیشن کے وسیع مکان میں تمام وفد کو دیا۔ گاڑی کے پہنچنے پر کھانے چنے ہوئے موجود تھے۔ سب نے کھانے سے فراغت حاصل کی اور سوار ہو گئے۔ ۶ر اپریل کی صبح کو وفد کلکتہ پہنچ گیا۔ سٹیشن پر نواب صاحب اور مسلمانان کلکتہ کی طرف سے شاندار استقبال ہوا۔ ہر قسم کے طبقے کے لوگوں سے سٹیشن کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ طلبہ کے پاس استقبالیہ نظمیں تھیں۔ وفد نواب سلیم اللہ خاں صاحب کی کوٹھی چورنگھی پر ٹھہرا۔ چھ روز قیام رہا جس میں مولانا تھانوی مولانا مرتضیٰ حسن صاحب اور مولانا محمد احمد صاحب کی تقریریں ہوتیں، ممبران وفد کی تحریک پر نو سو روپیہ کی رقم اسی وقت فراہم ہو گئی۔

۱۱ر اپریل کو وفد ڈھاکہ روانہ ہوا اور ۱۲ر اپریل کو ڈھاکے پہنچا، نواب صاحب مع اعزا و خاندان و اراکین ریاست نے اسٹیشن پر استقبال کیا۔ مہتمم صاحب لکھتے ہیں:۔

"ڈھاکہ میں اس وقت تعلیمی کانفرنس، لیگ اور علما کی کانفرنس کے متعدد جلسے تھے۔ تین روز تک لیگ کے جلسے ہوا کئے اس لئے کوئی نمایاں کارروائی نہیں ہوئی۔"

بعد ازاں پندرہ اپریل کی شام کو جلسہ ہوا۔ دارالعلوم کے وفد کی طرف سے ایک تحریر ترتیب کی گئی تھی کہ اس کو سنایا جائے۔ مہتمم صاحب لکھتے ہیں:۔

"نواب صاحب نے پہلے اپنی تحریر سنائی اور اس کے بعد مولانا شبیر احمد صاحب نے دارالعلوم کی تحریر سنائی۔ اور سنانے کے بعد اس کو آپ کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ آپ نے کھڑے ہو کر نہایت بشاشت و مسرت کے ساتھ اس کو لیا اور سر پر رکھا۔ چاروں طرف سے مسلمانوں نے آپ کو مبارکباد دی اسی وقت مولوی سید عاشق حسین صاحب انجینئر نے دارالحدیث کے نقشے دکھلائے

...... اس کے بعد مولانا حسین احمد صاحب نے کھڑے ہو کر عربی میں برجستہ تقریر شکریہ کی فرمائی۔ اور ازاں بعد مولانا سید محمد انور شاہ صاحب نے نہایت فصیح و بلیغ زبان عربی زبان میں تقریر فرمائی جس میں اعجاز قرآن کو نہایت خوبی و وضاحت سے ثابت کیا تھا۔ ان تقریروں کا سامعین خصوصاً علماء پر نہایت گہرا اثر ہوا .... آنریبل مسٹر غزنوی بھی اس مجلس میں موجود تھے چونکہ آپ اسی سال سفر حجاز سے واپس آئے ہیں آپ کو ان تقریروں میں خاص لطف آیا۔ جس کا اظہار آپ نے اس مجلس میں فرمایا۔

ڈھاکے میں نواب سلیم اللہ کے یہاں علامہ شبیر احمد عثمانی کی تقریر

اس کے بعد مولوی شبیر احمد صاحب کھڑے ہوئے۔ اوّل تو آپ نے دارالعلوم کے حالات ذکر فرمائے اور پھر آیت شریفہ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ کا بیان شروع کیا۔ مولوی صاحب موصوف کو آیت مذکورہ کے ضمن میں عجیب و غریب نکات و لطائف قرآنی، تعلیم کتاب و حکمت کا فرق بیان کرنا تھا تقریباً ایک گھنٹہ تمہیدی مضمون بیان کیا تھا کہ دوران سر اور اختلاج قلب کا دورہ ہو گیا جو اس سے پہلے ایک دو موقع پر ہو چکا تھا۔ مجبوراً اپنے بیان کو درمیان ہی میں چھوڑ کر بیٹھ گئے جس کا بے حد افسوس اہل مجلس کو ہوا۔ جناب نواب صاحب نے بھی اظہار تاسف فرمایا۔

نواب صاحب نے اس مجلس میں مبلغ پانچ ہزار دو سو اسی روپیہ اور ایک طلائی ہار وزنی تقریباً بیس تولہ کا عطا فرمائے۔ اور دس ہزار کا وعدہ

اپنے اور اپنے خاندان کی طرف سے اس کے علاوہ فرمایا۔ اور تعمیر دارالحدیث کے لئے ایک کمیٹی مقرر فرمادی جس کے سکریٹری خود نواب صاحب ہیں۔ یہ کمیٹی دارالحدیث کے لئے جس قدر رقم مطلوب ہے اس کا تخمینہ اسّی ہزار سے ایک لاکھ تک کیا گیا ہے بہم پہنچائے گی"۔

(القاسم جمادی الاخریٰ ۱۳۳۲ھ صـ۴-۵-۶)

۱۶ اپریل کو یہ وفد ڈھاکے سے کلکتہ اور وہاں سے نہایت کامیابی کے ساتھ دیوبند واپس ہوا۔ اس سلسلے میں مزید تفاصیل بھی قابل ذکر ہیں لیکن تحریر کو مختصر کرنے اور سمیٹنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن اجمال سے کام لینے میں واقعات کی پوری پوزیشن آنکھوں کے سامنے نہیں آتی اس لئے پوری بات کہنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ اس وفد میں علامہ شبیر احمد، حضرت مولانا تھانوی رحمہما اللہ خصوصی طور پر ابھرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن مولانا عبیداللہ صاحب اور حضرت شیخ الہند کا ان واقعات میں کالے کوسوں دور تک کچھ پتہ نہیں ہے۔ یہ وہی زمانہ ہے جس میں اختلاف رونما ہو چکا ہے اور دلوں میں کدورت پیدا ہو چکی ہے۔

اس سفر ڈھاکہ کے بعد شملے میں جلسے ہوئے ہیں اور جمعیۃ الانصار کا جنازہ دفن ہو چکا ہے۔ سفر ڈھاکہ کے متعلق مجھے یہ بھی بتانا ہے کہ جو تحریر علمائے دیوبند کی طرف سے نواب صاحب کے سامنے پڑھی گئی وہ طرز تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبیر احمد عثمانی نے تحریر فرمائی تھی۔ یہ تحریر نہایت ہی پُرمغز بے حد متین اور ٹھوس ہے جو رجب ۱۳۳۲ھ مطابق ماہ جون ۱۹۱۴ء کے رسالے القاسم میں لفظ بلفظ موجود ہے۔

دارالعلوم کا دائرۃ المعارف

اسی ماہ کے پرچے میں ڈھاکے کے بقیہ سفر کے حالات اور واپسی پر کلکتہ سے متعلق کیفیات بھی بیان کی گئی ہیں۔ دراصل ان تمام بیانات کے لئے میرے خیال

میں ایک دار العلوم کا دائرۃ المعارف مرتب ہونے کی ضرورت ہے جس میں اس مذہبی یونیورسٹی کی پوری تاریخ لکھی جائے۔

علامہ عثمانی کی کلکتہ میں نصاب تعلیم پر تقریر

جب علماء کا یہ وفد ڈھاکے سے کلکتہ واپس ہوا تو آنریبل مولانا شمس الہدیٰ نے دو وقت وفد کو مہمان رکھا۔ اور چونکہ آپ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے زبردست ورکر تھے اس لئے آپ نے وفد سے خیال ظاہر کیا کہ آج کل مدرسہ عالیہ کلکتہ کا نصاب جدید ترتیب دیا گیا ہے اس لئے میری خواہش ہے کہ اس کے لئے ۱۸ اپریل کو ایک جلسہ منعقد کروں چنانچہ مولانا شمس الہدیٰ کی کوٹھی پر جلسہ ہوا جس میں پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ، اسسٹنٹ ڈائرکٹر تعلیم بنگال، مدرسین مدرسہ عالیہ، علمائے کلکتہ شریک ہوئے۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اس جلسے کے متعلق لکھتے ہیں :-

"مہتمم (مولانا محمد احمد) صاحب کی معیت میں مولانا عزیز الرحمٰن صاحب مفتی مدرسہ عالیہ دیوبند، مولانا محمد انور شاہ صاحب، مولوی شبیر احمد صاحب اور مولوی فضل حق صاحب تھے۔ جلسے میں اولاً جناب موصوف (مولوی شمس الہدیٰ) نے اپنی جانب سے اور نیز گورنمنٹ بنگال کی جانب سے مہتمم صاحب اور علمائے دیوبند کا شکریہ ادا فرمایا۔ مہتمم صاحب کی جانب سے مولانا شبیر احمد صاحب مدرس دار العلوم نے مبسوط تقریر فرمائی اور نصاب کے متعلق اپنی رائے کا اظہار فرمایا جس کو سن کر نواب صاحب، صدر مدرس صاحب و پرنسپل صاحب نے پسند فرمایا۔"

(القاسم رجب ۱۳۳۲ھ صفحہ ۸)

دیکھئے اس نصاب تعلیم کی کمیٹی میں بھی دار العلوم کی طرف سے علامہ شبیر احمد نے جو نمائندگی کی ہے وہ علمائے دیوبند کے لئے باعثِ فخر ہے۔ اب تک برابر اور

مسلسل دارالعلوم کی تاریخ میں عثمانی موصوف کی انتھک محنتیں، تقریریں، مناظرے، تبلیغی جلسے، دارالعلوم کے امدادی سفر اور پھر درس و تدریس، مضمون اور مقالہ نگاری سب ہی کچھ ہیں جن سے موصوف کی جانفشانی، محنت طلبی اور مستقل مزاجی کا پورا پورا ثبوت مل رہا ہے اور یہ بھی کہ وہ نہ صرف دارالعلوم کی ہر معاملے میں وکالت کر رہے ہیں بلکہ حافظ مولانا محمد احمد صاحبؒ کی بھی ہوا باندھ رہے ہیں۔

دفاعِ اسلام

ہم نے اب تک قارئین کے سامنے علامہ کے وہی حالات پیش کئے ہیں جو تحریری طور پر پورے یقین کے ساتھ ہمارے سامنے دستاویزات کے طور پر موجود ہیں۔ انہی یقینیات کے سلسلے میں وہ چشم دید واقعات بھی شامل ہیں جو عوام و خواص مسلمانوں کی اصلاح عقائد و اعمال اور باطل فرقوں سے بچانے اور ان کے جراثیم پھیلنے کو روکنے کی کوششوں سے متعلق ہیں۔ گذشتہ اوراق میں آپ نے کراچی کے اس سفر کا حال پڑھا ہے جو علامہ نے آریوں سے مناظرہ کے لئے اور اسلام کی حقانیت اور صداقت واضح کرنے کے لئے کیا تھا۔ آیئے آپ کے ایک اور طوفانی تبلیغی اور دفاعی دورے کا چشم دید منظر پیش کریں جو استاذ محترم مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہٗ نے حیات انور کے ایک مقالے میں، جس میں انہوں نے اپنے فیروزپور جانے اور قادیانیوں سے مناظرہ کرنے کے سلسلے میں حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کا ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں :۔

> " اگلے روز مقررہ وقت پر مناظرہ شروع ہو گیا۔ ابھی شروع ہوا ہی تھا کہ عین مجلس مناظرہ میں نظر پڑی کہ حضرت شاہ صاحب اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہما مع چند دیگر علماء کے تشریف لا رہے ہیں۔ مناظرے کے بعد شہر میں ایک جلسۂ عام ہوا جس میں حضرت

شاہ صاحب اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کی تقریریں فیروز پور کی تاریخ میں ایک یادگار خاص کی نوعیت رکھتی ہیں۔ بہت سے وہ لوگ جو قادیانی دجل کے شکار ہو گئے تھے۔ اس مناظرے اور تقریروں کے بعد اسلام پر لوٹ آئے "۔ (حیات انور صف ۲۶)

اس کے بعد مفتی محمد شفیع صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ فیروز پور کے مناظرے اور تقریروں کے بعد حضرت شاہ صاحب اور مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے پنجاب کے بڑے بڑے شہروں کا دورہ کیا اور قادیانیوں کے فریب و مکر کے جال کے تاروں کو بکھیر دیا۔ اس طرح بے شمار بندگان خدا کو اسلام کا صحیح راستہ نظر آیا۔

میدان تحریر میں

حضرت عثمانی کی تقریروں اور فصیح و بلیغ لیکچروں کا تحریری دستاویزوں کے ذریعے ایک تفصیلی جائزہ ہم پیش کر چکے ہیں۔ دراصل اہل علم کا فیضان دوسروں تک پہنچنے کے لئے یا تقریری طور پر ہوتا ہے جیسا کہ آپ کا فیض اہل ہند پر اس ذریعے سے بہت کچھ ہوا۔ یا تحریری طور پر جس کا تفصیلی طور پر ذکر ہم علامہ کی " خالص علمی سوانح تجلیات میں پیش کر چکے ہیں۔ تاہم بعض بعض تصنیفی و تقریری واقعات کا ذکر ترتیب سوانح کے اعتبار سے "حیات عثمانی" میں مکرر بیان کرنے پر مجبور نظر آتے ہیں۔ آپ کی تصنیفات و مقالات حسب ذیل ہیں:۔

تصنیفات اور رسالے

الاسلام[۱]، العقل والنقل[۲]، اعجاز القرآن[۳]، الشہاب[۴]، تفسیر عثمانی[۵]، فتح الملہم شرح[۶] مسلم ۳ جلد، تقریر بخاری[۷]،

مضامین اور مقالے معارف القرآن ، لطائف الحدیث ، الدار الآخرہ ہدیۂ سنّیہ ، قرآن مجید میں تکرار کیوں ہے ، تحقیق خطبۂ جمعہ ، تشریح واقعہ دیوبند (جوابی انداز میں) حجاب شرعی ، سجود الشمس ، خوارقِ عادات ، الروح فی القرآن ، سینما بینی ۔

تقریظیں اور خطبے جہاں تک تقریظوں اور خطبوں کا تعلق ہے ان میں راقم الحروف کی تحقیقات میں جو خطبے آئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں :۔

خطبۂ ترک موالات ، خطبۂ جمعیۃ علمائے کلکتہ (یا پیغام) خطبۂ مسلم لیگ کانفرنس میرٹھ ، خطبۂ جمعیۃ العلمائے لاہور ، خطبۂ صدارت ڈھاکہ ، بیان و خطبۂ مؤتمر اسلامی کراچی (بزبان عربی)

لیکن تقریظیں مختلف کتابوں پر میری نظر سے گذریں ۔ مثلاً مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کے قصیدہ لامیۃ المعجزات پر ، مولانا محمد عمادالدین صاحب شیرکوٹی کے رسائل گلدستۂ تعلیم الاسلام پر ، مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی کے مقامات حریری کے حواشی پر ، نیز بعض تصانیف پر جن پر تبصرہ القاسم کے بعض پرچوں میں موجود ہے ۔

جائزہ آپ کے تحریری ورک (کام) کا جائزہ لیا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ تحریری کام میں بھی آپ کی خدمات بہت کچھ ہیں جو زمانے کی وقتی ضروریات کے تقاضوں کے باعث معرض وجود میں آئیں ۔ لہٰذا علامہ کی حسب ذیل تصنیفات پر نظر ڈالئے :۔

تصنیفات :

۱ ۔ الاسلام :۔ ۱۳۲۸ھ مطابق اپریل ۱۹۱۱ء میں لکھا گیا جس کو آپ نے مراد آباد کے "مؤتمر الانصار" میں پڑھ کر سنایا ۔

۲۔ **العقل والنقل**:۔ یہ بھی زمانے کے ماحول نے آپ سے لکھایا تہذیب الاخلاق علیگڈھ کے پرچے ملک میں جس قسم کے عقلی اور فلسفی مضامین کے ذریعہ اسلام کے صاف اور سچے معجزات وغیرہ کے خلاف جراثیم پھیلا رہے تھے علامہ نے "العقل والنقل" لکھ کر اثباتی رنگ میں یہ ثابت کیا ہے کہ عقل صحیح اور نقل صحیح میں کبھی مخالفت نہیں ہو سکتی۔

یہ سلسلہ مضمون القاسم میں کئی مسلسل نمبروں میں چھپا ہے جس کی تفاصیل "تجلیاتِ عثمانی" میں تاریخی طور پر ہم لکھ چکے ہیں۔ تاہم یہ سلسلہ القاسم کے اجرا ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۹۱۱ء ہی سے شروع ہوا ہے۔ العقل والنقل کا مقالہ القاسم کے دس نمبروں میں شائع ہوا اور اس کی آخری قسط ربیع الثانی ۱۳۳۳ھ میں شائع ہوئی جبکہ الانصار کا آخری جلسہ شملہ میں ہوا تھا۔

اس مضمون سے علامہ کی اہل علم میں دھوم مچ گئی۔ دارالعلوم کے دفتر میں بہت سے خطوط ان مضامین کی تحسین میں آئے۔

۳۔ **اعجاز القرآن**:۔ یہ مقالہ دراصل دارالعلوم میں ان تقریروں کی تحریری شکل ہے جو موصوف نے طلبا کے سامنے کی تھیں۔ آپ طلبا کو مناظرے اور تقریروں کے لئے تیار کرنے کے لئے ایسے عنوانات پر تقریریں فرمایا کرتے تھے جو اسلام کے اہم اور نازک مسائل سمجھے جاتے ہیں۔ ان ہی مسائل میں یہ بھی مسئلہ نہایت اہم ہے کہ قرآن کریم خدا کا کلام کیونکر ہے۔ موصوف نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ قرآن کریم خدا کا ہی کلام ہے۔

۴۔ **الشہاب**:۔ نعمت اللہ قادیانی کو جب ۳۱ اگست ۱۹۲۴ء کو کابل میں شاہ امان اللہ کے حکم سے سنگسار کیا گیا تو قادیانیوں کی طرف سے بہت شور مچا کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل نہیں ہے۔ آپ نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے۔ یہ رسالہ چھپوا کر شاہ امان اللہ خاں کے پاس بھیجا گیا تھا۔ جو ۱۸ صفر ۱۳۴۳ھ

مطابق ستمبر ۱۹۲۴ء کو لکھا گیا تھا۔

۵۔ تفسیر عثمانی:۔ علامہ کے مایہ ناز تفسیری فوائد ہیں جو شیخ الہند کے اردو ترجمۂ قرآن پر لکھے گئے ہیں۔ اس تفسیر کی ہندو پاکستان اور بیرون ہند میں جس قدر قدر ہوئی اس سے زیادہ اور نہ کسی تفسیر کی ہوئی اور نہ اور کسی کے فوائد کی۔ بہت سے ایڈیشن چھپے اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئے۔ ۹ رذی الحجہ ۱۳۵۰ھ کو لکھ کر ختم ہوئے۔

۶۔ فتح الملہم:۔ صحیح مسلم کی شرح ہے جو تین جلدوں میں ہے۔ نہایت محققانہ، نہایت مبصرانہ، نہایت عالمانہ۔ دنیائے اسلام بالخصوص علماء کے لئے علم حدیث کا زبردست شاہکار ہے۔ مزید تفصیلات تجلیات عثمانی میں ملاحظہ فرمائیے۔

۷۔ شرح اردو بخاری شریف:۔ ایک اور بڑا کارنامہ آپ کا بخاری شریف پر درس کے سلسلے میں بخاری شریف کی وہ اردو کی شرح ہے جو اپنے مضامین کے اعتبار سے علوم حدیث کا سمندر ہے۔[۱]

خطبات اور دیگر مضامین کی تفصیلات بھی تجلیات میں موجود ہیں۔ اگر اس تحریری کام کا جائزہ لیا جائے تو یہ بھی بڑی خدمت ہے جو قلمی طور پر آپ نے اسلام اور مسلمانوں کی کی ہے۔ پھر قرآن کریم کے فوائد تفسیری نہ صرف ہندو پاکستان ہی میں پڑھے جاتے ہیں بلکہ کابل، ایران میں بزبان فارسی ترجمہ ہو کر عوام و خواص کو فیض پہنچا رہے ہیں۔ بعض اور زبانوں میں بھی آپ کے تفسیری فوائد کا ترجمہ ہو چکا ہے، اور مسلسل مقبولیت ہو رہی ہے۔

۸۔ لطائف الحدیث اور معارف القرآن کے نام سے جو مضامین القاسم میں چھپے انہوں نے بھی ملک سے خراج تحسین لیا۔ القاسم کی تحریروں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کی فرمائشیں اکثر و بیشتر علامہ عثمانی کے مضامین کے متعلق ہوا کرتی تھیں۔

---

[۱] یہ شرح کراچی سے "فضل الباری" کے نام سے حال ہی میں چھپی ہے۔ نجیب

راقم الحروف کے نزدیک القاسم میں اصلاحی مضامین کے اعتبار سے حضرت مولانا اشرف علی صاحب اور تاریخی و اخلاقی اعتبار سے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اور فلسفی اور علمی اعتبار سے مولانا شبیر احمد صاحب کے مضامین نہایت ہی قابل قدر ہوتے تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کا مضمون "دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا" اور "تعلیمات اسلام" کے مضامین لاجواب تھے۔

القاسم کی قلمی خدمات

علامہ نے جہاں اپنے قیمتی مضامین سے القاسم کو مالا مال کیا وہاں اس کی بعض دفاعی خدمات بھی انجام دیں۔ بعض افتتاحیہ شذرے بھی لکھے۔ لیکن باقاعدہ ذمہ داری کبھی نہیں لی۔ باقاعدہ ذمہ داری میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم مستقل طور پر رسالے کے مدیر تھے۔ لیکن آپ کے معاونین میں پہلے معتمد مدیر مولانا سراج احمد صاحبؒ، بعد ازاں میاں اصغر حسین صاحبؒ اور پھر مولانا اعزاز علی صاحبؒ رہے۔ بہرحال اگر القاسم کی خدمات کا تجزیہ کیا جائے تو مولانا عثمانی کا مقام بہت بلند ہے۔ ان حضرات کے بعد پھر مولانا مناظر احسن گیلانی نے بھی رسالے کی بہت خدمت انجام دی۔ بلکہ بعض مہینوں کے رسالے تو پورے کے پورے انہی کے مضامین سے بھرے ہوئے ہوتے تھے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ یہ رسالہ تقریباً ۱۳۴۰ھ ۱۹۲۲ء میں دم توڑ چکا۔

دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے میں القاسم کے پرچے

میں نے دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے میں جب القاسم کے پرچوں کی فائلوں کو دیکھا تو مجھے اس میں بہت سے کوہ نور اور دریائے نور چمکتے ہوئے نظر آئے۔ لیکن سب گمنامی کے پردوں میں چھپے پڑے ہیں۔ القاسم و الرشید کے پرچوں اور رودادوں سے دارالعلوم دیوبند کی پوری انسائیکلو پیڈیا یا "سوانح دارالعلوم" تیار ہو سکتی ہے اور جیسا کہ میں نے اپنی اس تمنا کا بار بار اظہار کیا ہے۔ دارالعلوم کے

کتب خانے میں بیٹھکر یہ کام بڑی خوش اسلوبی، سنجیدگی اور خموشی سے انجام دیا جاسکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ "تاریخ تعمیر دارالعلوم" اور اسی طرح دیگر شعبہ جات پر مشتمل یہ دائرۃ المعارف دارالعلوم کا نہایت شاندار کارنامہ ہوسکتا ہے جس کا اس ناچیز نے ارادہ کیا ہے لیکن اختلاف دارین نے پاکستان سے بھارت جانے کی سہولتوں میں زبردست رکاوٹیں کھڑی کردی ہیں جس سے یہ فخیم کام دشوار نظر آرہا ہے۔

الحاصل اب تک کی میری ان تفصیلات کا خلاصہ یہ ہوا کہ علامہ عثمانی نے دارالعلوم دیوبند کی مسند تدریس پر بیٹھ کر اپنی عالمانہ شان کو چمکایا دوسری طرف الانصار کے جلسوں میں اپنے عالمانہ مقالوں اور تقریروں سے ہندو پاکستان کے اہل علم وفضل لوگوں میں اپنا وقار اور مقام پیدا کیا۔ مزید برآں اپنے مضامین سے القاسم کو شرف بخش کر علماء وفضلا، عوام وخواص میں نام پیدا کیا اور بقول مولانا حبیب الرحمٰن صاحب بہت سے مقامات پہ اپنے مواعظ حسنہ سے لوگوں میں اپنی عظمت کا سکہ بٹھایا۔

مدرسہ عربیہ فتحپوری دہلی دارالعلوم دیوبند میں سب سے پہلے، مولانا نے تعلیم سے فراغت کے بعد، سنہ ۱۳۲۶ھ میں درس دیا۔ بعد ازاں دو سال فتحپوری مدرسہ دہلی میں صدر مدرس کی حیثیت سے کام کیا۔ سنہ ۱۳۲۸ھ میں یہ صاحب فضیلت عالم پھر دارالعلوم کے مرکز کی طرف لوٹا اور چھوٹی بڑی معقول اور منقول کی اکثر کتابیں پڑھاتیں۔ اسی طرح ۱۳۳۹ھ مطابق سنہ ۱۹۲۱ء تک علامہ کا یہ دور گذرتا رہا۔

تنخواہ اس مقام پر پہنچکر وہ بات جو مجھے ابتداء میں بیان کرنی چاہئے تھی، میں یہاں بیان کرنا بہتر سمجھتا ہوں۔ جب آپ سنہ ۱۳۲۸ھ میں دہلی سے دارالعلوم واپس تشریف لائے تو اس وقت آپ کا تقرر پینتیس روپیہ ماہوار پر مدرس

ششم کی جگہ ہوا تھا۔ دارالعلوم دیوبند کی ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۹۱۲ء کی روئداد میں آپ کی تنخواہ پینتیس روپیہ لکھی ہوئی ہے۔ لیکن ۱۳۳۴ھ مطابق ۱۹۱۶ء کی روئداد کے گوشوارہ کے ضمن میں مولانا شبیر احمد صاحب کی تنخواہ ساٹھ روپیہ لکھی ہے۔ ساتھ ہی روئداد میں ایک نوٹ بھی درج ہے کہ یکم محرم ۱۳۳۴ھ سے (مولانا شبیر احمد صاحب کی تنخواہ میں) پچیس روپیہ کا اضافہ ہوا۔ یعنی کل تنخواہ ساٹھ روپیہ ماہوار ہوگئی۔ ۱۳۳۴ھ کے سینئر مدرسین کے گوشوارہ تنخواہ کی تفصیل حسب تحریر مہتمم صاحب یہ ہے[1]:۔

شاہ (مولانا انور شاہ) صاحب	۷۰ روپیہ
مولانا محمد احمد صاحب مہتمم	۸۵ روپیہ
مفتی عزیز الرحمٰن صاحب	۶۵ روپیہ
حکیم محمد حسن صاحب	۶۰ روپیہ
مولانا غلام رسول صاحب	۶۰ روپیہ
مولانا حبیب الرحمٰن صاحب	۶۰ روپیہ
مولانا شبیر احمد عثمانی یکم محرم ۱۳۳۴ھ سے	۶۰ روپیہ

اس زمانے میں دارالعلوم کے احاطے میں ساٹھ روپیہ تنخواہ بڑی معقول تنخواہ سمجھی جاتی تھی حالانکہ یہ حضرات وہ آفتاب و ماہتاب علم و فضل تھے کہ ان کو ہزار ہزار روپیہ ماہوار کی تنخواہوں پر دعوتیں آئیں لیکن یہ حضرات خدمات دینی کے مقابلے میں کثرتِ زر کو نظر میں نہ لائے۔

بلا تنخواہ | بہرحال ۱۳۳۴ھ میں آپ کی تنخواہ ساٹھ روپیہ تو ہوگئی لیکن آپ پر

---

[1] (نوٹ) حضرت مولانا محمود حسن صاحب ان ایام میں مالٹا تشریف فرما ہیں۔ کیونکہ آپ شوال ۱۳۳۳ھ میں سفر حجاز پر تشریف لے گئے تھے۔

توکل کا غلبہ طاری ہوا اور احتیاط نے مجبور کر کے ۱۳۳۵ھ سے بلا تنخواہ پڑھانے پر مجبور کر دیا۔ اور ۱۳۴۴ھ تک فی سبیل اللہ نوسال کے ایک لمبے پیریڈ تک بغیر کسی معاوضے کے پڑھا کر وہ مالی قربانی پیش کی جو اس سے پہلے اور کوئی پیش نہ کر سکا۔ اگر حساب لگایا جائے تو ساٹھ روپیہ ماہوار کے حساب سے نوسال کی تنخواہ چھ ہزار چار سو اسّی روپیہ ہوتے ہیں۔ علامہ عثمانی کی یہ قربانی کوئی معمولی قربانی نہیں۔ ذرا سینے پر ہاتھ رکھکر دیکھئے کہ موصوف نے جس مادر علمی سے مفت تربیت حاصل کی تھی اس مادر مہربان و مشفق کی خدمت کا اس نے کتنا بڑا حق ادا کیا ہے۔ آپ نے بلا تنخواہ کام کرنے کا جب فیصلہ کیا تو اساتذہ اور احباب میں سے کسی نے آپ کی تائید نہیں کی البتہ حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب رائپوری نے ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا اور آپ کے خیال کو سراہا جیسا کہ خود علامہ عثمانی نے اپنی ایک مجلس میں فرمایا اور مولوی محمد شریف صاحب جالندھری نے جو علامہ کے جاں نثار خادم ہیں اس صورت حال کو مجھ سے بیان کیا ہے۔

علامہ عثمانی بلا تنخواہ بحیثیت صدر مہتمم
از ۱۹۳۵ء / ۱۳۵۴ھ تا ۴۵-۱۹۴۴ء / ۱۳۶۲ھ

یہ تو ۱۳۳۵ھ سے ۱۳۴۴ھ تک نو سال کا عرصہ تھا لیکن جب آپ صدر مہتمم کی حیثیت سے آئے تو ۱۳۵۴ھ مطابق ۱۹۳۵ء سے ۱۳۶۲ھ مطابق ۴۵-۱۹۴۴ء تک دارالعلوم کی بلا تنخواہ نوسال تک مزید خدمات انجام دیتے رہے۔ اس دور میں اگر آپ کی صدارت کی حیثیت سے ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار ہی تنخواہ تجویز کی جائے تو نوسال کی تنخواہ سولہ ہزار دو سو روپیہ ہوتی ہے۔

شرح مسلم کے مشاغل

۱۳۳۵ھ سے بلا تنخواہ پڑھانے کا سبب ایک یہ بھی تھا کہ آپ اسباق کو حسب مرضی کم کر کے مسلم کی شرح

فتح الملہم کی طرف زیادہ توجہ دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ آخری سالوں میں آپ صرف علوم اسلامیہ و شرعیہ کی طرف پورے طور پر متوجہ ہو گئے تھے اور منطق و فلسفہ وغیرہ کی طرف سے منہ موڑ لیا تھا۔ مولانا محمد طیب صاحب آپ کے متعلق ایک مضمون میں لکھتے ہیں :۔

"ابتداء میں معقولات کی کتابیں حمد اللہ وغیرہ زیادہ پڑھاتے تھے مگر آخر میں یہ تمام مشاغل ترک ہو گئے تھے اور صرف کتاب و سنّت اور فنون دینیہ کا شغل باقی رہ گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ بالآخر مولانا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی خدمت کی طرف متوجہ ہو گئے"

(رسالہ دار العلوم ماہ مئی ۱۹۵۶ء صفحہ ۶)

میرے خیال میں چونکہ علامہ مسلم کی شرح کی جانب ہمہ تن متوجہ تھے اس لئے ۱۳۳۵ھ اور ۱۳۳۹ھ کے درمیانی سالوں میں سے کسی ایک سال سے صرف شام کے دو گھنٹے میں مسلم شریف پڑھاتے تھے اور ۱۳۴۴ھ تک صرف یہی کتاب پڑھایا کئے۔

مکان وزمین دیکر حج بیت اللہ کیا

۱۳۳۷ھ ، ۱۹۱۸ء

میں جب دار العلوم دیوبند کی ایک روئداد دیکھ رہا تھا تو اس میں میری نظر سے آپ کے حج کا تاریخی نوٹ گذرا۔ اس میں لکھا تھا کہ مولانا عثمانی شعبان ۱۳۳۷ھ میں بیت اللہ تشریف لے گئے۔ لیکن علامہ کی بیگم صاحبہ نے بتلایا کہ موصوف ۱۳۲۸ھ میں زیارت حرمین شریفین کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ ان دونوں بیانات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ شوال ۱۳۲۸ھ میں تو آپ مدرسہ فتحپوری دہلی سے دیوبند بلائے گئے۔ لازم آتا ہے کہ کیا آپ اسی سال زیارت حرمین شریفین کے لئے تشریف لے گئے مگر اس دور کی کسی تحریر سے آپ کا ۱۳۲۸ھ میں جانا ثابت نہیں ہوتا۔ یا ہو سکتا ہے کہ آپ ۱۳۲۸ھ میں تشریف لے گئے ہوں اور ۱۳۳۷ھ میں بھی۔

بہرحال دونوں بیانات میں جو بھی صحیح ہو۔ ہوا یہ کہ بقول آپ کی بیگم صاحبہ اور آپ کے چھوٹے بھائی بابو فضل حق کے آپ نے نوسو روپیہ میں اپنے حصے میں پہنچی ہوئی آبائی زمین اور مکان دونوں جائدادیں اپنے بڑے بھائی مولوی مطلوب الرحمٰن صاحب کو فروخت کر دیں۔ اور اس طرح بیت اللہ اور روضۂ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کر کے دل کی پیاس بجھائی۔ زیارت حرمین کے لئے رہنے کو گھر تک نہ چھوڑنا عشق الٰہی اور محبت رسالت کی واضح دلیل نظر آتی ہے۔ لیکن جب آپ اس عبادت عظیمہ سے فارغ ہو کر دیوبند تشریف لائے تو اپنے چھوٹے بھائی بابو فضل حق صاحب کے گھر میں ہی قیام پذیر ہوئے اور انہی کے گھر میں سکونت اختیار کی تا آنکہ اپنا ذاتی مکان ۱۳۴۷ھ میں ۱۵ - ۲۰ ہزار کی لاگت سے گدّیواڑے میں تعمیر کرایا اور اپنی بھتیجی منیبہ خاتون کے نام کر دیا جس کی آپ نے پرورش فرمائی تھی۔

حج سے واپسی پر

حج سے واپسی پر آپ اپنی دارالعلوم کی ملازمت پر پھر قائم رہے اور برابر درس دیتے رہے۔ اس اثنا میں کئی دفعہ اپنے بڑے بھائی مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نائب مہتمم دارالعلوم سے مدرسہ کے امور میں اختلاف رائے کیا۔ جس کا اظہار آپ کے روٹھ کر گھر بیٹھنے کی صورت میں نمودار

مولانا محمد طیب صاحب اپنے مضمون میں آپ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

ظاہر و باطن کی یکسانیت اور اخلاق حمیدہ

"اخلاقی طور پر مولانا (شبیر احمد صاحب) میں ایک خاص وصف یہ تھا جو بہت ہی اونچا تھا کہ ظاہر و باطن میں یکسانیت تھی۔ وہ اپنے قلبی جذبات کے چھپانے یا ان کے برخلاف اظہار پر قدرت نہ رکھتے تھے۔ اگر کسی سے خوش ہیں تو ظاہر و باطن میں خوش اور ناخوش ہیں تو علانیہ اس کا اظہار ان کے چہرے بشرے سے ہو جاتا تھا۔ اور کہہ بھی دیتے تھے دارالعلوم کے معاملات میں اگر ذمہ داروں سے انہیں کوئی گرانی پیش آتی اور حضرت

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم سے جو ان کے بڑے بھائی بھی تھے رنجش ہو جاتی تو اکثر روٹھ کر بیٹھ جاتے یا سفر میں چلے جاتے انہیں منانے اور راضی کر کے لانے کے لئے اکثر میں مامور ہوتا تھا۔ کیونکہ مجھ پر شفقت زیادہ فرماتے تھے۔ ایک دفعہ خفا ہو کر تھانہ بھون تشریف لے گئے تو یہ احقر وہاں گیا اور راضی کر کے لے آیا۔

ایک دفعہ ناخوش ہو کر گھر بیٹھ رہے اور مدرسہ میں آنا جانا ترک کر دیا۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے طے فرمایا کہ تو ہی جا کر لا سکتا ہے۔ میں حاضر ہوا اور عرض معروض کی تو راضی ہو گئے۔ اور دارالعلوم میں چلے آئے۔ طبیعت اس قدر صاف تھی کہ جس وقت بھی بات ان کے ذہن میں آجاتی تھی تو اسی لمحے گرانی رفع ہو کر حقیقتاً بشاشت چہرے پر نمودار ہو جاتی۔ اور ایسے خوش اور منفرح ہو جاتے کہ گویا گرانی ہی نہیں۔ ایک عالم دین کے لئے یہ وصف ایک عظیم مقام ہے کہ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہو اور نہ تکلف نہیں بلکہ بلا تصنع و بناوٹ اس کی قلبی رفتار یہی ہو۔

بزرگوں کا ادب حق تعالیٰ نے علم و فضل کا ایک وافر حصہ عطا فرمایا تھا لیکن ساتھ ہی میں نے یہ بھی بارہا دیکھا کہ ان کے بڑوں نے اگر بھری مجلس میں بھی انہیں تہدید آمیز لہجے سے کوئی بات کہی تو کبھی اُف نہیں کرتے تھے۔ اگر بات ان کے نزدیک قابل تسلیم بھی نہ ہوتی تب بھی اپنے اکابر کے حقوق کی رعایت روا فرماتے تھے۔

اظہار جذبات قلبی جذبات کو بالکل صفائی سے کہہ ڈالتے تھے خواہ وہ اپنی ہی کمزوری ہو۔ ایک بار ناخوش ہو کر گھر بیٹھ گئے۔ میں حسب معمول منانے کے لئے گیا۔ تو غصے کے لہجے میں فرمایا " بھائی حبیب نے مجھے مردہ سمجھ

لیا ہے جو اس طرح سے مجھ سے قطع نظر کر لی تو سُن لو کہ اس قطع نظر کرنے پر میرے دل میں دو طرح کے جذبات پیدا ہوئے۔ ایک جذبہ نفسانیت سے اور ایک للّٰہیت سے۔ نفسانیت سے تو یہ کہ اگر انہوں نے مجھے مردہ سمجھ لیا ہے تو انہیں مَیں اپنی زندگی باور کراؤں اور اس کا یہ ادب یہ طریقہ ہوتا جو انہیں میری زندگی سمجھوا دیتا۔ دوسرا جذبہ للّٰہیت سے پیدا ہوا اور وہ یہ کہ میں دیوبند سے کہیں باہر جا کر صحیح مسلم کی شرح لکھنے میں لگ جاؤں۔ میری طرف سے کچھ بھی ہوتا رہے نہ میں یہاں رہوں گا نہ یہ روز روز کی کوفت اٹھانا پڑے گی۔ میں نے کہا کہ حضرت ان دونوں جذبوں میں سے کون سے کو آپ نے ترجیح دی ہے فرمایا للّٰہیت والے جذبے کو۔ میں نے کہا الحمد للہ۔ مگر میں نے (پھر) کہا کہ حضرت آپ کے لئے تو اس میں بلاشبہ اجر ہے اور یہ نیت یقیناً پاک ہے مگر اس پر تو دھیان فرمائیے کہ کیا اس قسم کی چھوٹی چھوٹی طبعی ناگواریوں سے جماعتی کام کا ترک کر دیا جانا مناسب ہوگا جبکہ کاموں کا دارومدار آپ ہی جیسے حضرات کے اوپر ہے۔ اگر اسی طرح کل کو جماعت کے دوسرے بزرگ بھی ایسی ہی وقتی اور ہنگامی ناگواریوں کے سبب جو کبھی نہ کبھی آپ کی طرف سے اس میں پیش آجاتی ہیں یہی فیصلے کر لیں کہ ہمیں کام چھوڑ دینا چاہئے تو فرمائیے کہ یہ کام آخر کس طرح چلے گا۔ اور اسے کون سنبھالے گا۔ میرے نزدیک تو آپ نے یہ اپنے آپ کو یکسو کرنے کا فیصلہ نہیں فرمایا بلکہ اس جماعتی کام کو ختم کر دینے کا فیصلہ فرمایا ہے۔ کیا یہ مناسب ہے؟ بس اتنا سُن کر اک دم چہرے پر بشاشت آگئی۔ اور فرمایا "ہاں یہ تو نے صحیح کہا۔ بس اب میں نے دوسرا جذبہ بھی دل سے نکال دیا۔ اور کل سے دارالعلوم پہنچ کر کام کروں گا"۔ چنانچہ علی الصباح حسب وعدہ

تشریف لے آئے ، اور ایسے انداز سے آئے کہ گویا کوئی بات پیش ہی نہیں آئی تھی ۔ یہ درحقیقت وہی ظاہر و باطن کی یکسانیت، قلب کی صفائی اور حق پسندی کا اثر تھا کہ دل میں کبھی کچھ نہیں رکھتے تھے ۔

قلبی استغنا اور کیفیت ناز بہر حال علم کے ساتھ حق تعالےٰ نے یہ خاص وصف عطا فرمایا تھا جس نے ان کی بڑائی دلوں میں بٹھا دی تھی ۔ قلبی طور پر استغنا ، اور ناز کی کیفیت کا غلبہ زیادہ تھا ۔ کام کے سلسلے میں جب تک دوسروں کی طرف سے طلب اور کافی طلب ظاہر نہ ہوتی تھی متوجہ نہیں ہوتے تھے ۔" (رسالہ دار العلوم مئی ۱۹۵۶ء ص ۶-۷-۸)

استاذ محترم کا بیان تحقیقی طور پر علامہ کے ان ہی ایام سے وابستہ ہے جو ۱۳۳۲ھ اور ۱۳۳۹ھ کے درمیان گذرے ہیں ۔ راقم الحروف کو جناب مولانا محمد طیب صاحب کے بیان سے علامہ کے مختلف قسم کے امور زندگی کا سراغ مل گیا جو حسب ذیل ہیں :۔

۱ ۔ اول تو یہ کہ وہ ظاہر و باطن کے یکساں تھے ان کی زندگی منافقت سے قطعاً صاف تھی ۔ وہ سیاست غیر فاضلہ سے کوسوں دور تھے کہ سیاسی آنکھ مچولی بھی ہوتی رہے اور دوستانہ انداز میں ملتے بھی رہیں ۔

۲ ۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ وہ اپنی شخصیت کو مقام خودی میں رکھتے ہوئے اپنے آپ کو کسی مقام پر گرانے کے لئے قطعاً تیار نہ تھے ۔

۳ ۔ تیسری بات یہ واضح ہوئی کہ وہ مدرسہ کے معاملات میں منتظمین مدرسہ اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم مرحوم سے بھی جو ان کے بڑے بھائی ہوتے تھے اختلاف کر بیٹھتے تھے ۔ ان کو ان کے روٹھ کر بیٹھ جانے پر مولانا محمد طیب صاحب سے منوایا جاتا تھا ۔ یہ منوانا بتاتا ہے کہ مولانا عثمانی کے اختلاف رائے میں قوت ہوتی تھی ۔

۴ ۔ چوتھی بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ ان کا معاملہ ان کی ذاتی قابلیت اور شخصی علم و

فضل کے باعث ناز کا ساتھا۔ جب تک کسی کی طرف سے پوری خواہش اور طلب نہ ہوتی اپنے آپ کو ارزاں نہ بناتے اور اس کام کی طرف متوجہ نہ ہوتے۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ قدرت جبار کی طرف سے اسپیشل عالم بنا کر بھیجے گئے تھے کہ ان کو انہی خصوصی معاملات کے باعث حرکت میں لایا جاتا تھا جن کے لئے قدرت نے انہیں خصوصیت کے ساتھ بھیجا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب، مولانا عبید اللہ صاحب سندھی، مولانا مجید حسن بجنوری اور حضرت شیخ الہندؒ نے ان سے کام لیا لیکن میرے خیال میں ان کو مُدرسی سے ہٹا کر صرف تصنیف و تالیف اور ملک میں خصوصی مجالس کے لئے خاص کر دینا چاہیئے تھا تاکہ وہ اپنی قوت علمی، قوت لسانی، قوت ادبی کے جواہر سے اسلام اور مسلمانوں کے لئے علم و فضل کے بہترین ذخائر چھوڑ جاتے۔ اور اس کام کے لئے ان کے مزاج کے مطابق ان کو مسخر کر لیا جانا چاہیئے تھا۔

۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۱ء سے ۱۳۴۷ھ مطابق ۱۹۲۸ء تک

چشم دید حالات

ہم ان کی زندگی کے واقعات تحریر کرنے میں ۱۳۳۹ھ ۱۹۲۱ء تک تا ہنوز جا پہنچے ہیں اور اب تک ہم نے تحریری دستاویزات (DOCUMENTS) کے ذریعہ ان کے حالات زندگی کو آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ اب راقم الحروف ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۸ء تک کے چشم دید حالات بیان کرے گا جو پہلے حالات کی طرح یقینی ہوں گے۔ کیونکہ شوال ۱۳۳۹ھ میں یہ راقم الحروف بھی دارالعلوم میں پڑھنے کے لئے داخل ہوا اور بہت قریب سے قریب تر ہو کر مجھے ان کے دیکھنے کا موقع ملا۔

علامہ کے دوست مولانا عماد الدین انصاری

میرے ہم وطن بزرگ جناب مولانا عماد الدین صاحب انصاری شیرکوٹی ان دنوں مطبع قاسمی مملوکہ جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی کے ناظم تھے۔ ہم وطنیت کی تقریب کے باعث میرے بڑے بھائی مبارک حسن صاحب نے مجھے انہی کے پاس قیام کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ میں مطبع قاسمی میں ٹھہرا۔ یوں تو اور بھی میرے ہم وطن مثلاً مولوی انیس احمد شیرکوٹی، مولوی محمد شعیب صاحب، مولوی عنایت اللہ صاحبان وغیرہم وہاں پڑھتے تھے لیکن میرے لئے جناب انصاری صاحب کے پاس قیام کرنا ہی آسانیوں کا باعث تھا۔ بہرحال میں مطبع قاسمی میں مقیم ہوا۔

حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی اور مولانا عبدالسمیع صاحب

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی ظاہر کیا ہے کہ مولانا انصاری، علامہ عثمانی کے طالب علمی کے زمانے سے ہی دوست تھے اس لئے علامہ اور آپ کے ساتھ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی مدرس دارالعلوم اور مولانا عبدالسمیع صاحب دیوبندی مدرس دارالعلوم یہ تینوں صاحب بعد نماز عصر روزانہ مطبع قاسمی تشریف لاتے اور پھر مع مولانا انصاری چاروں دوست جو (اصحاب اربعہ) کے نام سے مشہور ہو گئے تھے سیر کے لئے باہر تشریف لے جاتے اور عموماً حضرت شیخ الہند کے مزار تک جاتے اور واپس آجاتے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ مغرب کی نماز مطبع قاسمی کے سامنے کی مسجد میں جو محل کی کہلاتی تھی پڑھتے اور بعد مغرب سب یہیں کھانا کھاتے اور کبھی مغرب کی نماز سے پہلے واپس ہو جاتے اور اپنے اپنے محلوں کی مسجدوں میں نماز پڑھتے۔ مغرب کے بعد پھر سب مولانا عثمانی کی بیٹھک پر ہوتے اور اپنے اپنے گھروں سے سب کھانا منگا لیتے اور مل کر کھا لیتے۔ اکثر و بیشتر مغرب سے عشا کی اذان تک مجلس لگتی۔ طلبہ بھی ہوتے۔ اس زمانے میں مولانا بلیاوی، علامہ عثمانی ہی کی بیٹھک

میں رہتے تھے ۔ یہ ایک چھوٹی سی بیٹھک تھی جس میں دو کوٹھڑیاں تھیں ۔ ایک میں مولانا بلیاوی رہتے اور دوسری میں عام نشست وبرخاست تھی ۔ یہ بیٹھک گدّیواڑے میں میں قاضی مسجد کے عقب سے گذرنے والی اور شیخ الہند کے مکان کی طرف جانے والی سڑک پر قریب ہی واقع تھی ۔ مجھے یہاں اکثر بیٹھنے اور علامہ کی مجلسوں سے شرفیاب ہونے کا موقع ملا ہے ۔

ان مجالس میں میرے عہد طالب میں اکثر وبیشتر مولانا بلیاوی ، مولانا انصاری ، مولانا عبدالسمیع صاحب ، مولوی معظم علی نجیب آبادی مبلغ دارالعلوم ، مولوی سید محمد مبلغ دارالعلوم ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ، مفتی عتیق الرحمٰن صاحب ، مولانا سعید احمد اکبر آبادی ، گاہے گاہے مولانا محمد طاہر مرحوم ، مولانا سراج احمد صاحب ، کبھی کبھی مولانا مرتضیٰ حسن صاحب ، مولوی بشیر احمد صاحب بھٹہ ، ماسٹر طفیل احمد صاحب ، دارالعلوم کے طلبہ ۔ اور یہ راقم الحروف ہوا کرتے تھے ۔ علمی تذکرے ہوتے ، ظرافت کی باتیں ہوتیں ، بزرگان دین اور اکابرین دارالعلوم کے چرچے ہوتے ۔

علامہ عثمانی کا سراپا

مطبع قاسمی میں جب میں شروع شروع میں ٹھہرا تو میرے جانے کے پہلے ہی روز شام کو غالباً ۶ شوال ۱۳۳۹ھ کو میں نے پہلی مرتبہ علامہ عثمانی کو دیکھا ۔ وجیہ گندم گوں چہرہ ، خط بھرا ہوا ۔ سیاہ متشرع ریش مبارک ، دہرا جسم بھرا ہوا ، نہ زیادہ موٹا اور نہ پتلا ، متوسط قد ، رفتار دلبرانہ مگر عالمانہ ، ہاتھ میں چھڑی ، سر پر مجھوئیہ مڑھی ہوئی ٹوپی ، سر کے بال کترے ہوئے اور کبھی سر منڈا ہوا ۔ سلائی دار ڈورئیے کا نیچا کرتا ، مغلئی پاجامہ ، پاؤں میں کلکتہ کا سیاہ سلیپر اور سفر میں بعض اوقات دلّی کا بنا ہوا ایک پھول کا جوتا کبھی اچکن یا شیروانی پہنے نہیں دیکھا ۔ کچھ ایام کے بعد خالص گاڑھے کے کپڑے رہ گئے جو آخری عمر تک رہے ۔ غذا مختصر مگر لطیف ، چائے کے شوقین ، وسیع القلب ،

طلبہ کے ہمدرد ، نازک مزاج اور نازک طبع ، عبادت میں خشوع و خضوع ، رفتار میں میانہ روی ، نگاہیں نیچی کر کے چلتے ۔ دوستوں اور احباب کے ساتھ تواضع ۔

جیسا کہ میں نے کہا یہ حضرات روزانہ شام کو مطبع میں آتے اور چاروں مل کر سیر کو جاتے ۔ لیکن گرمیوں میں دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد بھی علامہ عثمانی روزانہ آتے اور دوپہر کو مطبع میں ہی مولانا عماد الدین صاحب کے ہوادار کمرے میں سوتے ۔ اس کمرے کی ایک کھڑکی باہر کی طرف کھلتی تھی ۔ اس آرام کی خاطر آپ وہیں قیلولہ فرماتے ۔

اتفاق سے شوال کے بعد ہی برسات کا موسم آچکا تھا اس لئے اکثر مطبع میں آم کھائے جاتے اور اس کے بعد برف پڑا ہوا دودھ نوش کیا جاتا ۔ خوب یاد ہے کہ ایک دو دفعہ میں نے بھی اچھے آم خرید کر دعوت کی جس میں علامہ عثمانیؒ ، مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ ، مولانا عبد السمیع صاحبؒ اور مولانا انصاری شامل تھے ۔ اسی طرح کئی دفعہ میری طرف سے مٹھائی کی دعوتیں ہوئیں ۔ اگرچہ علامہ فرماتے کہ بھائی طالب علموں سے کھانا نہیں چاہیئے لیکن مولانا عبد السمیع صاحب جو بعض اوقات خود دعوت اور مٹھائی کی فرمائش کر دیتے تھے فرماتے بھائی انوار تو مالدار طالب علم ہے ۔ علامہ فرماتے کہ مالدار بھی ہو تو پھر بھی استاد کا طلبہ سے کھانا مناسب نہیں ۔ لیکن میرا معاملہ ان سب حضرات سے خصوصی ہو گیا تھا ۔ سب مجھے بھائی انوار کہتے ۔ مولانا عبد السمیع صاحب کو استاد کے لقب سے پکارا کرتے ۔

عوض دکاندار کی فیرنی

اکثر شام کو مطبع میں یا اپنی بیٹھک پر کھانے کے ساتھ گرمیوں میں عوض دکاندار کے یہاں کی فیرنی ہوتی ۔

عوض دکاندار کی فیرنی دیوبند میں بہت مشہور تھی اور سچ تو یہ ہے کہ بہت ہی خوش ذائقہ اور مزیدار ہوتی تھی ۔ ان حضرات کے ساتھ مطبع میں کھانے میں میری بھی

شرکت ہوتی تھی ۔ میں دارالعلوم کے مطبخ سے اس زمانے میں اپنے بیسوں سے درمیانہ درجے کا کھانا کھاتا تھا ۔ مدرسہ کے مطبخ میں جس سے کئی سو لڑکے مفت کھانا کھاتے تھے اور صاحب استطاعت اپنے پیسے دیکر کھاتے، تین قسم کے کھانے پکتے تھے درجۂ اول جس میں بکری کا گوشت ہوتا تھا، اس کے تقریباً چھ روپیہ ہوتے تھے. درمیانہ درجے کا کھانا بھی بہت اچھا اور رئیسانہ سمجھا جاتا تھا اس کے ماہوار چار روپیہ ہوتے تھے اور تیسرے درجے کے کھانے میں صبح کو دال اور شام کو شوربا ہوتا تھا اور اس کے دو ڈھائی روپیہ ماہوار لئے جاتے تھے ۔ اللہ اللہ اس تیسرے درجے کا کھانا کھا کر شاہ محمد انور شاہ صاحب جیسے عالم پیدا ہوئے ۔ کئی دفعہ لڑکے آپس میں پوچھتے "هَلْ يَجُوزُ الْوُضُوءُ بِمَرَقِ الْمَطْبَخِ" کیا مطبخ کے شوربے سے وضو کرنا جائز ہے ۔ کیونکہ یہ شوربا اتنا پتلا ہوتا تھا کہ طلبہ کھاتے اور شوربے کی بے لطفی سے لطف لیتے ۔ تیسرے درجے کی دال میں آدھا پانی ہوتا اور آدھے دال کے دلنے. لیکن اسی کھانے سے تربیت پانے والوں میں مولانا عبیداللہ سندھی، مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی، مولانا حسین احمد صاحب مدنی، مولانا عبدالحق مفسر تفسیر حقانی، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی جیسے شہیر و نامور نکلے ۔

ہاں تو علامہ عثمانی روزانہ مطبخ میں تشریف لاتے تھے ۔ تا آنکہ اسی سال کے جاڑے آگئے ۔ چائے کا دور یوں تو گرمیوں میں بھی چلتا لیکن جاڑوں میں خصوصیت کے ساتھ بزم چائے منعقد ہوتی ۔ چائے پکانے کے فرائض میرے سپرد تھے. جاڑوں میں اکثر سبز چائے بنتی تھی ۔ مجھے پکاتے پکاتے اس کے پکانے کا سلیقہ آگیا تھا ۔ علامہ اور آپ کے رفقاء پیتے اور چائے کے پکنے کی تعریف کرتے اور فرماتے "بھائی انوار تو خوب چائے پکاتے ہیں"۔ بہر حال چائے پکانے کی میری ڈیوٹی تھی اور چائے بنا کر دینا بھی میرے فرائض میں سے تھا ۔ اسی طرح دو سال تک ان حضرات کی

آمد و رفت رہی اور یوں علامہ سے مجھے قریب ترین رہنے اور ان کو بہت ہی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ دو سال کے بعد مولانا عماد الدین صاحب انصاری مطبع قاسمی سے مستعفی ہو کر جالندھر کے اسلامیہ ہائی سکول میں ناظم دینیات بنکر چلے گئے اور میں دار العلوم کے بورڈنگ ہاؤس میں مولسری کے احاطے میں مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کی درسگاہ کے برابر والے حجرے میں جو جنوب مغرب کے گوشے میں تھا رہنے لگا اور اس طرح وہ روزانہ کی مجلسیں ختم ہو گئیں۔ لیکن اب میں علامہ کی نشستگاہ پر روزانہ

حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ

کی مجلسوں میں ۱۳۴۶ھ تک تقریباً ۱۹۲۸ء تک برابر جاتا رہا۔ میری آمد و رفت جن حضرات کے یہاں زیادہ ہوتی ان میں سے ایک تو علامہ مرحوم تھے دوسرے حضرت میاں سید اصغر حسین صاحب کے یہاں ہر ہفتے جایا کرتا تھا۔ مجھے ان سے بھی بہت انس تھا۔ وہ بھی مجھے "بھائی انوار" کہکر پکارتے۔ جب جاتا کچھ نہ کچھ ضرور کھلاتے۔ ان کی مجلس ایک صاحب دل درویش کی مجلس تھی۔ مسکراتے جاتے اور ظرافت آمیز جملوں میں چٹکلے چھوڑتے جاتے۔ اکثر حسبنا اللہ ونعم الوکیل پڑھتے اور ہائے ہائے بہت کرتے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ خشیۃ الٰہی اور خوف عاقبت میں ڈوبے ہوئے ہیں اس لئے "آوہ" اور ہائے ہائے، زبان پر بہت تھی۔ لوگوں نے تو غور نہیں کیا اردو کے بہت اچھے ادیب اور خوش گو شاعر تھے۔ میاں صاحب کے یہاں بھی طلبہ اور دیگر عقیدتمندوں کا شام کے وقت ہجوم ہوتا تھا۔

مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری

مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب کے گھر بھی چلا جاتا۔ ان کو میں دادا کہا کرتا تھا۔ فرمانے لگے اس شسرے نے مجھے دادا بنا کر اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اور میں

اسے پوتا ہی سمجھنے لگا ہوں۔ "سسرے" کا لفظ تکیہ کلام تھا۔ کئی دفعہ سفر سے تھکے ہوئے آئے اور میں نیز ان کے صاحبزادوں میں سے مولوی محمد انور یا محمد احسن یا مولوی خلیل احمد مراد آبادی میرے کلاس فیلو پاؤں دباتے بیٹھ جاتے۔ کبھی مناظروں کی اور کبھی اپنے سفروں کی باتیں سناتے۔ حد سے زیادہ ظریف الطبع تھے۔ طبابت میں بھی بہت ملکہ تھا۔ علامہ شبیر احمد عثمانی اکثر اپنا علاج ان ہی سے کراتے اور فرماتے علاج سے زیادہ ان کی خوش طبع باتوں اور ظرافتوں سے میری بیماری آدھی ہو جاتی ہے اس لئے میں انہی سے علاج کراتا ہوں۔

ایک دفعہ مجھے سفر میں، غالباً ۱۹۲۶ء میں، علیگڈھ اپنے ہمراہ لے گئے۔ مدرسہ کا کوئی کام تھا۔ علیگڈھ کے اسٹیشن سے اتر کر سیدھے حبیب گنج مولانا حبیب الرحمن صاحب شیروانی کی کوٹھی پر تشریف لے گئے وہ اتفاق سے نہ ملے اس لئے پھر علیگڈھ یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے ناظم مولانا عبداللہ صاحب فاضل دیوبند کے یہاں ٹھہرے۔ اسی سفر میں مجھے مسلم یونیورسٹی اور اس کے متعلقات دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے دیکھا کہ مولانا مرتضیٰ حسن صاحب سفر میں بھی جماعت سے نماز پڑھنے کے بہت عادی تھے۔ مجھے سفر میں اپنا مقتدی بنا لیتے اور جماعت کر لیتے۔ دلائل الخیرات اور تلاوت کلام پاک کے بھی سخت پابند تھے۔ بہر حال مولانا کے یہاں بھی میرا آنا جانا تھا اور ان سے بہت بے تکلفی تھی۔ پہلے لکھ آیا ہوں کہ مناظرے کی جو کتاب چھوڑتے میں اٹھا کر چلا آتا تھا۔ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ چلاتے رہ جاتے لیکن میں تھا کہ یہ جا وہ جا۔ مولانا میرے استاذ تھے اور میں نے دورے میں ان سے نسائی کے دو تین سبق پڑھے تھے۔

ان کے علاوہ جب مولانا بلیاوی علامہ عثمانی کی بیٹھک کی بجائے قاضی مسجد کے سامنے کے مکان میں اپنی فیملی کے ساتھ رہنے لگے تو وہاں بھی آنا جانا رہا۔

میں جب دیوبند گیا تھا تو اس وقت کم عمر تھا نحو میر اور کبریٰ سے تعلیم شروع کی تھی۔ امتحان شرح مائۃ عامل اور علم الصیغہ میں دیا تھا جو مولانا عبدالقیوم صاحب شیرکوٹی سے پڑھتا ہوا آیا تھا۔ مولانا اعزاز علی صاحب نے داخلے کا امتحان لیا تھا اور نحو میر، کبریٰ اور علم الصیغہ ہی پڑھنے کی انہوں نے تجویز دی تھی۔ مولوی محمد علی صاحب حیدرآبادی جو عرصے کے بعد حیدرآباد میں انتقال فرما گئے ان سے یہ کتابیں شروع کیں۔ بعد ازاں کبریٰ مولوی یعقوب الرحمٰن صاحب عثمانی کے پاس چلی گئی افسوس کہ ان کا بھی انتقال ہو چکا ہے لیکن خارج میں مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی سے بھی کبریٰ پڑھتا تھا۔

مولانا عبدالسمیع صاحب سے باقاعدہ میں نے تلخیص، مختصر المعانی، نورالانوار کتابیں پڑھیں۔ لیکن خارج میں مطول پڑھی جو پنجاب یونیورسٹی کے مولوی فاضل کے کورس میں بھی تھی۔ اس لئے گھر پر بعد مغرب جاکر پڑھتا تھا۔

علامہ عثمانی اور سیاسیات

دورِ اوّل

آپ کی سیاسیات ملکی کے سلسلے میں ہم نے تجلیات عثمانی میں تفصیل سے بحث کی ہے لیکن واقعات کی ترتیب میں مجھے یہاں ان کے سیاسیات کے اثرات اور مشاغل ظاہر ہوتے ہیں اس لئے ان کا اظہار یہاں سوانح زندگی کی ترتیب کے مناسب ہوگا۔

علامہ کی ابتدائی سیاسی سرگرمی ترکوں کی حکومت اور خلافت سے شروع ہوئی جبکہ ۱۹۱۲ء مطابق ۱۳۳۰ھ میں جنگ بلقان کا آغاز ہوا۔ یہی وہ زمانہ تھا جس میں جمعیۃ الانصار ہندوستان میں چمک رہی تھی اور شباب پر تھی۔ علامہ پبلک کے سامنے آچکے تھے اور آپ کی تحریریں اور تقریریں ملک سے خراج تحسین حاصل کر رہی تھیں۔

ہندوستان کے مسلمانوں کو ترکوں سے ہمیشہ ہمدردی رہی ہے اس لئے جنگِ بلقان سے بھی مسلمانانِ ہند سخت متاثر ہوئے۔ علمائے دیوبند اس تاثر میں آگے آگے تھے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ تو سب سے زیادہ متاثر تھے۔ اس لئے ترکوں کی امداد کی خاطر ایک وہ وقت آیا جب کہ مدرسہ کو بھی ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ نومبر ۱۹۱۲ء میں بند کر دیا گیا اور تمام علمائے دیوبند اور طلبہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں چندے کے لئے پھیل گئے۔ پہلے لکھ آیا ہوں کہ حضرت شیخ الہند، علمائے دیوبند، طلبہ اور اساتذہ کی طرف سے اس

سلسلے میں بڑی خدمات عمل میں آئیں۔

ہلال احمر اور عثمانی

علامہ عثمانی بھی بہرحال اسی دارالعلوم کے ہونہار اور قابل فرزند تھے وہ کیسے خاموش رہ سکتے تھے چنانچہ آپ نے بھی اس سلسلے میں کوششیں کی ہیں اور آپ نے جس نے علاقے میں دورہ کیا وہ کاندھلہ اور مظفر نگر کے دوسرے حصے معلوم ہوتے ہیں محرم ۱۳۳۱ھ کے ضمیمہ القاسم میں ہلال احمر کے نام سے چندے کی فہرستیں شائع ہوئی ہیں۔ ہلال احمر ترکوں کی ایک سوسائٹی تھی جس کا کام مریضوں اور جنگ کے زخمیوں کی امداد تھا بعینہٖ جس طرح یورپ میں ریڈ کراس سوسائٹی ہے۔ اسی القاسم کے ضمیمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کی معرفت کاندھلے سے ایک رقم تین سو پندرہ روپیہ کی موصول ہوئی ہے۔ جو ۷ ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۸ نومبر ۱۹۱۲ء کو آپ کے نام سے اس فنڈ میں داخل ہوئی۔ دوسری رقم ۱۷ ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ مطابق ۲۹ نومبر ۱۹۱۲ء کو مبلغ دوسو آٹھ روپیہ کی آپ کے نام سے درج ہے۔ تیسری رقم ۱۸ ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ مطابق ۲۹ نومبر ۱۹۱۲ء کو درج ہے جو آپ کی معرفت جمع ہوئی جو دوسو کی رقم ہے۔

ہلال احمر کے چندے کی ایک اور فہرست جمادی الاولیٰ ۱۳۳۱ھ مطابق مئی ۱۹۱۳ء کے القاسم میں شائع ہوئی ہے۔ جس میں مولانا عثمانی نے خورجہ ضلع بلند شہر کا بھی دورہ کیا ہے جہاں اس وقت آپ کے دوست مولانا عماد الدین صاحب انصاری تھے وہاں سے سترہ سو پچاس روپیہ وصول کر کے لائے ہیں۔ جو ۱۲ ربیع الاول ۱۳۳۱ھ کی تاریخ میں آپ نے ہلال احمر کی مد میں دارالعلوم میں داخل کیا۔ گویا ان فہرستوں میں آپ کے ذریعہ دو ہزار چار سو تہتر روپیہ داخل ہوئے۔ ان رقومات کے علاوہ ۲۸ ربیع الاول ۱۳۳۱ھ کو ایک اور رقم مبلغ

ایک سو پچیس روپیہ خورجہ سے وصول شدہ آپ نے دار العلوم میں داخل کی گویا کل رقم دو ہزار پانسو اٹھانوے روپیہ کی علامہ عثمانی کے ذریعہ داخل ہوئی۔ اس کے علاوہ خود دار العلوم میں جو جلسہ ہوا اس میں جو رقم آپ کے ذریعہ داخل ہوئی وہ اس کے علاوہ ہے۔

شیخ الہند کی مالٹا سے واپسی اور علامہ عثمانی کا انکی معیت میں سیاسی دورہ

ہم یہ پہلے لکھ چکے ہیں کہ ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان وطرابلس کا آغاز ہوا ۱۹۱۵ء میں مولانا عبید اللہ سندھی کابل پہنچ چکے۔ اور حضرت شیخ الہند مکہ معظمہ روانہ ہوئے لیکن وہاں گرفتاری کے بعد مالٹا میں اسیر کر دیے گئے۔ ۲۲ر جمادی الاخریٰ ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۲ر مارچ ۱۹۲۰ء کو حضرت شیخ الہند مالٹا سے رہا ہوئے اور ہندوستان کو روانہ کئے گئے۔ ۲۰ر رمضان ۱۳۳۸ھ مطابق جون ۱۹۲۰ء کو بمبئی پہنچے۔ ۲۶ر رمضان ۱۳۳۸ھ کو دیوبند میں قدم رنجہ فرمایا۔

تحریک خلافت اور فتویٰ ترک موالات

جس وقت شیخ الہند تشریف لائے ہندوستان میں تحریک خلافت اور ترک موالات شباب پر تھی۔ انگریزوں کے خلاف سخت نفرت پھیلی ہوئی تھی۔ ہندو مسلم اتحاد زوروں پر تھا۔ ان حالات میں شیخ الہند کب خاموش رہ سکتے تھے۔ ترک موالات کا فتویٰ اس زمانے میں آپ کی طرف سے شائع ہوا۔ آپ سے جب ترک موالات کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے اس کے جواب کے لئے اپنے تین شاگردوں کو جمع کیا۔ استاذ محترم مولانا محمد طیب صاحب لکھتے ہیں:-

شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں علامہ عثمانی کے فتوے کی پسندیدگی؛

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے واپسئ مالٹا کے بعد ترک موالات کا استفتا

کیا گیا (جو کسی علیگڑھ کے صاحب نے کیا تھا۔ انوار) حضرت نے اپنے تین ارشد تلامذہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت مولانا محمد کفایت اللہ صاحب اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہم کے سپرد کیا کہ فتویٰ یہ حضرات مرتب کریں .... چنانچہ تینوں حضرات نے قلمبند فرمایا اور حضرت نے تینوں کے جوابات ملاحظہ فرما کر حضرت مولانا شبیر احمد صاحب کے جواب کے بارے میں فرمایا جواب تو ماشاء اللہ سب ہی بہتر اور جامع ہیں لیکن بھائی میں اگر لکھتا تو وہ اس کے قریب ہوتا جو شبیر نے لکھا ہے۔"

(رسالہ دارالعلوم ص ماہ مئی ۱۹۵۶ء)

اس عبارت سے واضح ہے کہ ترک موالات پر شیخ الہند کی طرف سے جو فتویٰ شائع ہوا اور جس پر مسلمانانِ ہند مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کو بھی توڑنے لگے تھے، وہ علامہ شبیر احمد عثمانی کا لکھا ہوا تھا۔ یہی وہ معرکہ آرا فتویٰ ہے جو "ترک موالات" کے عنوان سے موصوف نے جمعیۃ العلماء کے اجلاس منعقدہ دہلی ۱۹، ۲۰، ۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء مطابق ۷، ۸، ۹ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ کو بصدارت شیخ الہند پڑھا تھا۔ اور جس کا حوالہ آپ نے قرآن کریم کے فوائد کے ضمن میں دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ہم نے موالات بالکفار (کافروں سے دوستی) کے متعلق حضرت شیخ الہند کی فرمائش پر مستقل رسالہ ترک موالات پر لکھا ہے۔

دورہ ہند اگرچہ شیخ الہند کی عمر نے مالٹا سے واپسی پر وفا نہ کی لیکن پھر بھی چند ماہ میں آپ نے اپنی قوت سے زیادہ کام کیا اور علامہ عثمانی کو اپنی زبان بنا کر ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ ان تمام جلسوں میں حضرت عثمانی کو یہ فخر حاصل رہا ہے کہ وہ اپنے استاد و شیخ کے ترجمان بنے اور تقریریں کیں۔ پروفیسر سعید احمد صاحب اکبر آبادی ایم۔ اے ایڈیٹر

برہان ریڈر سنی تھیالوجی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ جنوری ۱۹۵۰ء کے برہان کے نظرات میں لکھتے ہیں :۔

"حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے مالٹا سے آنے کے بعد آپ (مولانا عثمانی) نے ۱۹۱۹ء کے آخر اور ۱۹۲۰ء کے شروع میں سہارنپور، غازی پور، لکھنؤ، بنارس، کانپور، علیگڈھ اور دہلی کے بڑے بڑے اجتماعات میں حضرت شیخ الہند کے ترجمان کی حیثیت سے جو بلند پایہ تقریریں کیں انہوں نے ملک کے گوشے گوشے میں مولانا عثمانی کی عظمت و برتری کا سکہ بٹھا دیا۔" (برہان جنوری ۱۹۵۰ء)

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ نے شیخ الہند کی زبان بن کر سیاسیات میں خاصہ حصہ لیا۔ اور اس طوفانی دورے میں جمعیۃ الانصار کی طرح ملک بھر میں تقریروں کا ہنگامہ برپا کر دیا۔

علیگڈھ کا سفر اور جامعہ ملیہ کا افتتاح
۱۶ صفر ۱۳۳۹ھ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء

ہندوستان میں ترک موالات کے زور شور اور خلافت کی تحریک کے اس دور میں مسلم قوم کسی ایسے ادارے کو دیکھنا گوارا نہ کرتی تھی جس میں گورنمنٹ دخیل ہو یا اس کی طرف سے گورنمنٹ کی وفاداری کا اظہار ہلکے رنگ میں بھی ہو اس لئے مولانا محمد علی جوہر وغیرہ کی رائے یہ تھی کہ ایک ایسی آزاد یونیورسٹی قائم کی جائے جو اسلامی آزادی کی رُوح باقی رکھتے ہوئے مذہبی اور سیاسی تعلیم دے اور انگریزوں سے آزاد ہو۔ اس سلسلے میں جوہر موصوف نے علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کو بھی مشتعل کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے یونیورسٹی کا بائیکاٹ کیا۔ لیکن ڈاکٹر ضیاء الدین، خدا انہیں جزائے خیر دے، اپنی جگہ ڈٹے رہے۔ جزائے خیر کی وجہ یہ کہ جب ہندو بنارس یونیورسٹی کے بائیکاٹ کا سوال پیدا

ہوا تو پنڈت مدن موہن مالویہ جو اس کے کرتا دھرتا تھے انہوں نے نان کو آپریشن والوں کو آنکھیں دکھائیں اور یونیورسٹی کمپاؤنڈ میں ایسے عنصر کو گھسنے بھی نہ دیا۔ اگر مسلم یونیورسٹی اس وقت ٹوٹ جاتی تو غیر مسلموں میں گھی کے چراغ جلتے اور ان کی یونیورسٹی باقی تھی ہی۔ بہرحال جامعہ ملیہ کی علیگڈھ میں بنیاد رکھنے کے لئے شیخ الہند کو دعوت دی گئی۔ آپ اس وقت سخت بیمار اور کمزور تھے لیکن آپ نے اسے قبول فرمالیا۔ آپ کو پالکی میں بٹھا کر سٹیشن لے جایا گیا اور وہاں سے علیگڈھ۔ مسلم یونیورسٹی کی مسجد میں شیخ الہند کی چارپائی بڑے محرابی دروازے میں بچھادی گئی اور مولانا عثمانی نے جامعہ ملیہ کے افتتاح کے لئے شیخ الہند کی طرف سے افتتاحی خطبہ پڑھا۔ یہ خطبہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو حضرت عثمانی نے ہی تحریر فرمایا تھا کیونکہ عبارت میں وہی ادیبانہ رنگ اور شان و شکوہ ہے جو ان کی اردو میں ہوتا ہے۔ جناب مولانا محمد میاں صاحب مصنف علمائے حق تحریر فرماتے ہیں :۔

"یہ اجلاس ۱۶ ر صفر ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۹ راکتوبر ۱۹۲۰ء کو علیگڈھ میں ہوا۔ حضرت شیخ الہند کا خطبہ صدارت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے پڑھ کر سنایا۔" (علمائے حق جلد اول صفحہ ۲۱۳)

اس زمانے میں عام طور پر یہی مشہور تھا کہ یہ علیگڈھ والی تحریر حضرت عثمانی ہی کی لکھی ہوئی تھی جیسا کہ آئندہ صفحات میں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ شیخ الہند جب اس قدر علیل ہوں تو آپ کیا لکھ سکتے تھے۔ طرز تحریر سے اندازہ لگائیے کہ یہ خطبہ حضرت عثمانی کا لکھا ہوا نہیں تو اور کس کا ہے۔ لکھتے ہیں :۔

"ہماری قوم کے سربرآوردہ لیڈروں نے سچ تو یہ ہے کہ امت اسلامیہ کی ایک بڑی اہم ضرورت کا احساس کیا۔ بلاشبہ مسلمانوں کی درسگاہوں میں جہاں علوم عصریہ کی اعلیٰ تعلیم دیجاتی ہو اگر طلبہ اپنے مذہب کے اصول و

فروع سے بے خبر ہوں اور اپنے قومی محسوسات اور اسلامی فرائض فراموش کر دیں اور ان میں اپنی ملت اور اپنی قوموں کی حمیت نہایت ادنیٰ درجہ پر رہ جائے تو یوں سمجھو کہ وہ درسگاہ مسلمانوں کی قوت کو ضعیف بنانے کا ایک آلہ ہے۔ اس لئے اعلان کیا گیا ہے کہ ایسی آزاد یونیورسٹی کا افتتاح کیا جائے گا جو گورنمنٹ کی اعانت اور اس کے اثر سے بالکل علیحدہ ہو اور جس کا تمام تر نظام عمل اسلامی خصائل اور قومی محسوسات پر مبنی ہو۔" (خطبہ علیگڈھ)

یہ عبارت صاف غمازی کر رہی ہے کہ میں جناب عثمانی کے قلم کی چکیدہ اور مرہون ہوں۔ الفاظ کی چستی، تراکیب کی برجستگی، عبارت کا شکوہ اور مضمون کی ذہنی ساخت سب کچھ اسی صاحب قلم کی صنعت بیان کا ثمرہ ہیں۔ یہ تو ہم نے درایت و عقل سے لکھا ہے لیکن حضرت مولانا حسین احمد صاحب بھی نقش حیات میں تحریر فرماتے ہیں کہ علیگڈھ کا خطبہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے تحریر کیا تھا۔

جامعہ ملیہ کا افتتاح اگرچہ علیگڈھ میں ہوا لیکن بعض مصلحتوں کی وجہ سے اس کو دہلی منتقل کر دیا گیا جہاں ۱۹۴۷ء تک ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی پرنسپل شپ میں چلتا رہا اور ابھی جاری ہے۔

جمعیۃ العلمائے ہند ۱۹۱۹ء

جنگ بلقان وطرابلس ۱۹۱۲ء و ۱۹۱۳ء کے بعد ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم کا آغاز ہوا۔ اس جنگ میں جرمنی اور ترکی ایک دوسرے کے حلیف تھے اور برطانیہ سے نبرد آزما تھے۔ ہم نے تجلیات عثمانی میں اس کا پس منظر پوری تفصیل سے بیان کیا ہے۔ بہر حال ترکوں سے جنگ کی بنا پر اور ان کی شکست کے باعث امت مسلمہ کے لئے خلافت کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں جب جرمن اور ترکوں کو شکست ہوئی تو خلافت کے پرزے پرزے ہو گئے۔ ۱۹۱۸ء کے

بعد تحریک خلافت نے زور پکڑا اور خلافت کمیٹی عمل میں آئی۔ سرزمین ہندوستان کا چپہ چپہ اس تحریک سے متاثر ہوا۔ ہندو بھی اُٹھ کھڑے ہوئے اور مسلمانوں کے ساتھ آزادیٔ وطن کی تحریک میں شامل ہو گئے اُدھر علماء اگرچہ خلافت کے جلسوں میں شریک ہوتے لیکن ان کے لئے خصوصی پلیٹ فارم کی ضرورت تھی جہاں سے خالص مذہبی آواز بلند ہوتی اس لئے خلافت اور کانگریس، نیز مسلم لیگ کے علاوہ ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ العلماء وجود میں آئی جس کا پہلا اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں ہوا۔ جون ۱۹۲۰ء میں شیخ الہند مالٹا سے تشریف لائے تو جمعیت کا دوسرا سالانہ اجلاس ۱۹، ۲۰، ۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء کی تاریخوں میں شیخ موصوف کی زیر صدارت نہایت شان وشوکت کے ساتھ ہوا۔ اسی میں حضرت شیخ الہند نے ترک موالات پر اپنے خطبہ میں زور دیا تھا اور اسی میں حضرت عثمانی نے ترکِ موالات پر تقریر پڑھی تھی۔

اس اجلاس کے صرف ایک ہفتہ بعد حضرت شیخ الہند تو ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء مطابق ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ کو دنیا سے رخصت ہو گئے اور جناب عثمانی نے اپنے شیخ کی تحریک اور خیالات کو آئندہ بھی جاری رکھا۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے شاگردوں کی علمی قوتوں میں سب سے زیادہ علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی پر اعتماد تھا اور ان کی تحریری شگفتگی کے بھی دل سے قائل تھے۔

شیخ الہندؒ کا علامہ عثمانی پر علمی اور تحریری و تقریری اعتماد

یہی وجہ ہے کہ جہاں پڑھانے یا لکھنے کا مہتم بالشان کام ہوتا وہاں علامہ شبیر احمد صاحب پر ان کی نظر انتخاب پڑتی تھی۔

حضرت مولانا حسین احمد صاحب اپنی خود نوشتہ سوانح زندگی ”نقش حیات“ میں لکھتے ہیں:۔

"مدرسہ عالیہ کلکتے کے طلبہ نے ترک موالات کے سلسلے میں مدرسے کو چھوڑ دیا۔ طے ہوا کہ اس کے متوازی مدرسہ قائم کیا جائے چنانچہ مسجد ناخدا میں آزاد مدرسہ قائم کیا گیا اور مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ناظم بنائے گئے۔ فرنگی محل اور امروہہ سے مدرسین منگائے گئے۔ لیکن حدیث کے لئے کسی مشہور اور فاضل مدرس کی ضرورت تھی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ چاہتے تھے کہ مولانا شبیر احمد صاحب یا مولانا مرتضیٰ حسن صاحب وہاں چلے جائیں۔ حضرت نے دونوں صاحبوں سے تذکرہ کیا دونوں نے علیحدہ علیحدہ اپنی ماؤں سے اجازت طلبی کا عذر کیا۔"

مجھے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ ان دونوں صاحبوں میں مولانا شبیر احمد صاحب کا درجہ اول تھا۔ اور جیسا کہ لکھا جا چکا ہے اور مولانا مدنی رح نے بھی لکھا ہے کہ جامعہ ملیہ کے افتتاح کے موقع پر حضرت شیخ الہند نے خطبۂ صدارت کا مضمون مولانا شبیر احمد صاحب کو بتا کر تحریر کا حکم دیا اور جب مولانا شبیر احمد صاحب مسودہ لکھ کر لائے تو اس کو سن کر حسب منشا ترمیم فرما کر چھپنے کا حکم دیا گیا۔ (نقش حیات جلد دوم ص۲۵۶)

یہ ہے حضرت شیخ الہند کا تحریری اعتماد اور پہلا تھا علمی اعتماد۔

افتتاح جامعہ ملیہ

۱۶ صفر ۱۳۳۹ھ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء

مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:۔

"۱۶ صفر ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء اجلاس (افتتاح) کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حضرت (شیخ الہند) رحمۃ اللہ علیہ نے شرکت اور صدارت فرمائی۔ ضعف اور بیماری کی وجہ سے خود چل نہیں سکتے تھے۔ دو شخصوں کے کندھوں پر ٹیک لگا کر چلنا ہوتا تھا۔ خطبہ جناب مولانا شبیر احمد صاحب نے پڑھا جو کہ مطبوع ہے۔" (نقش حیات جلد دوم ص۲۵۹)

مشاہدات راقم الحروف

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے چھ ماہ بعد ۶ر شوال ۱۳۳۹ھ مطابق مئی ۱۹۲۱ء کو راقم الحروف دیوبند پہنچ گیا جس کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے۔ ان ایام میں دیوبند اور بیرون دیوبند میں بے حد جوش وخروش تھا۔ میں نے مولانا عثمانی کی دیوبند ہی میں خلافت اور آزادی ہند کے سلسلے میں اول اول تقریریں سنیں۔ اس سے پہلے مجھے جن صاحب کی تقریر اپنے اہل وطن میں من کو بھائی تھی وہ مولانا مظہر الدین صاحب شیر کوٹی شہید تھے۔ لیکن حضرت عثمانی کی تقریر نے دل پر جو اثرات چھوڑے وہ کچھ اور ہی تھے۔

تب مجھے موصوف کی شعلہ مقالی اور جادو بیانی کا پتہ چلا۔ خوب یاد ہے کہ آپ کی ایک تقریر تو آپ کی مسجد کے سامنے کے چوک ہی میں محلہ گدیواڑہ میں ہوئی۔ تحصیل کے پاس قلعہ کی مسجد کے پیچھے ڈاکخانے کے سامنے بھی جو عام جلسہ گاہ تھی مولانا کی کئی تقریریں ہوئیں، اس سلسلے میں باہر بھی تشریف لے جاتے دیکھا اور دیکھنے والوں کی زبانی تقریروں کے تاثرات معلوم ہوا کئے۔ حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو پہلی مرتبہ ۱۹۲۱ء میں دیوبند میں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ وہ اکثر باہر جاتے اور دیوبند میں حضرت شیخ الہند کے دولت خانہ پر ٹھہرتے۔ چوغہ اور سر پر پگڑی، کھدر کی شیروانی کھدر کا کرتا اور کھدر کا مغلئی پاجامہ پہنتے۔ صورت وسیرت میں عالمانہ رنگ ظاہر ہوتا تھا۔ ان دنوں آپ کی گرفتاری کا وارنٹ نکلا۔ دو بار پہنچی۔ یہ مغرب کے بعد کا وقت تھا۔ مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ شیخ الہند رحمۃ اللہ کے مکان پر فروکش تھے لیکن مسلمانوں کو جب معلوم ہوا تو ٹھٹ کے ٹھٹ جمع ہو گئے۔ فساد کا قوی اندیشہ ہو گیا تھا۔ مسلمانوں نے کہا کہ ہم ہرگز مولانا کو گرفتار ہونے نہیں دیں گے۔ پولیس افسر نے دور اندیشی سے کام لیا اور واپس چلے گئے لیکن آدھی رات کے بعد پھر آئے اور گرفتار کر کے لے گئے۔ اس وقت کسی شاعر نے مولانا مدنی کے متعلق اشعار بھی

لکھے تھے۔ غالباً نور سہارنپوری تھے۔ کہا تھا ؎

اے حسین احمد حق کے فدائی
آبرو دین و دنیا میں پائی
کی بروں سے بھی تم نے بھلائی
آبرو دین و دنیا میں پائی

مولانا حسین احمد صاحب کی گرفتاری کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی نائب مہتمم دار العلوم، مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری ناظم تعلیمات اور علامہ عثمانی کی بھی شہرت گرم تھی کہ یہ بھی اب گرفتار ہوئے اور اب گرفتار ہوئے۔ چنانچہ اس روز موخر الذکر مولانا عثمانی اپنی گرفتاری کے انتظار میں مطبع قاسمی میں مولانا عماد الدین صاحب ناظم مطبع قاسمی کی جائے قیام میں مقیم رہے۔ لیکن جب تمام دن گذر گیا اور کوئی نہ آیا تو شام کے وقت مغرب کے قریب گھر تشریف لے گئے۔ گھر سے گرفتار ہوتے تو والدہ کو بہت دکھ ہوتا اس لئے ان کی خاطر مطبع قاسمی میں گرفتار ہونا پسند فرماتے تھے۔ خود فرماتے تھے کہ والدہ صاحبہ کو گرفتاری کی افواہ سے بہت احساس ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ موصوف قید و بند، اور جیل اور چکی کے مرد نہ تھے۔ بہر حال

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

ان تینوں حضرات میں سے کوئی گرفتار نہ ہوا۔

مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی گرفتاری پر ردعمل مولانا مدنی کی گرفتاری نے شہر میں جوش پیدا کر دیا تھا تقریباً روز جلسے ہوتے۔ اکثر و بیشتر مولانا عثمانی کی تقریریں ہوتیں۔ باہر بھی سہارنپور، دہلی، میرٹھ اور دیگر مقامات پر تقریر میں جاتے۔

جمعیۃ العلمائے ہند دہلی کی مجلس عاملہ کے رکن علامہ عثمانی

پہلے لکھ چکا ہوں کہ کانگریس اور مسلم لیگ سے علیحدہ صرف علما کے لئے متحدہ پلیٹ فارم کی ضرورت کے باعث علمائے ہند دہلی کا وجود ۱۹۱۹ء میں عمل میں آیا۔ علامہ عثمانی اس کی مجلس عاملہ کے ممتاز رکن تھے۔ آپ اکثر جمعیۃ العلما کے سالانہ جلسوں میں شریک ہوتے۔ مجلس عاملہ کی تجویزوں پر بحث کرتے، اختلاف رائے پیش کرتے۔ جمعیت کے خاص ارکان میں مولانا ابوالکلام آزادؒ، مفتی کفایت اللہ صاحبؒ، مولانا حسین احمد صاحبؒ مدنی، مولانا احمد سعید صاحب دہلویؒ، مولانا سید محمد انور شاہ صاحبؒ، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ، مولانا مرتضیٰ حسن صاحبؒ وغیرہم تھے۔ ان میں بھی آگے چل کر جمعیۃ العلما مفتی کفایت اللہ صاحبؒ اور مولانا مدنی صاحبؒ کے دم سے چل رہی تھی۔

پہلے تو اس میں ہندوستان کے مختلف العقائد علما شامل تھے۔ لیکن مولانا احمد سعید صاحب ابتدائے دورِ خلافت میں گرفتار ہوئے تو ان کی جگہ سیکریٹری مولانا مظہر الدین صاحب شیر کوٹی ایڈیٹر الامان دہلی بنائے گئے۔ جب مولانا احمد سعید صاحب رہا ہوئے تو پھر سیکریٹری وہی بنائے گئے۔ مولانا مظہر الدین صاحب شہید اس جماعت سے اختلاف کے باعث علما کی دوسری جماعت سے جا ملے جو مولانا عبدالماجد بدایونی اور دیگر علمائے بریلی پر مشتمل تھی۔

۱۹۱۹ء سے ۱۹۴۵ء تک

بہرحال جمعیۃ العلما میں علامہ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۴۵ء تک شریک رہے اور اس عرصے میں آپ نے خلافت کمیٹیوں اور جمعیۃ العلما اور ہندو مسلم اتحاد کے پلیٹ فارموں پر زبردست تقریریں فرمائیں۔

۱۹۲۲ء میں جب گیا میں جمعیۃ العلماء کا سالانہ جلسہ ہوا تو مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند صدر بنائے گئے اور آپ کا خطبۂ صدارت علامہ نے ہی پڑھا جس سے محفل کا رنگ بدل گیا۔ اس جلسے میں موصوف نے ایک پُر جوش تقریر بھی کی تھی جو اس تجویز کے رد میں تھی کہ آئندہ کو بائیکاٹ کی بجائے ہندوستانیوں کو اسمبلیوں میں شریک ہو کر اپنے حقوق کے حصول میں جدوجہد کرنی چاہیئے۔

ہم نے علامہ کی سیاسی سرگرمیوں کا پورا تفصیلی جائزہ تجلیات عثمانی میں لیا ہے۔ یہاں اس کو دہرانا تطویل سے خالی نہیں۔ اس لئے یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ آپ خلافت، جمعیت، ہندو مسلم اتحاد اور مسلم لیگ کے معاملات میں صرف ایک سیاست پیش نظر رکھتے تھے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کے حقوق کی نگہداشت اور شریعت اسلامی کے احکام اور اسلام کا اقتدار باقی رکھا جائے۔ اور اس کے لئے ہمیشہ کوشش کرتے رہے۔

خلافت کے دور میں مسلم ہندو اتحاد میں جو مذہبی بے اعتدالیاں مسلمانوں اور ان کے لیڈروں کی طرف سے ہوا کیں مثلاً مسلمانوں کا تلک لگانا، گائے کی قربانی سے دست بردار ہونا، ارتھیوں کے ساتھ رام رام کہتے ہوئے چلنا وغیرہ وغیرہ آپ نے ہمیشہ اس کی مخالفت کی۔

جمعیۃ العلمائے ہند سے بھی آپ کا اس سلسلہ میں ہمیشہ اختلاف رہا کہ وہ جمعیت کی پالیسی کو علماء کی حیثیت سے کسی کا تابع مہمل بنانا گوارا نہیں فرماتے تھے۔

تحریک خلافت کا ہند میں ۱۹۲۸ء میں خاتمہ

خلافت کے پلیٹ فارموں سے علامہ نے کسی نہ کسی شکل میں اس وقت تک روگردانی نہیں کی جب تک کہ خود خلافت ترکوں کے ہاتھوں ٹکڑے ٹکڑے نہ کر دی گئی اور ادھر ہندوستان کے اولوالعزم لیڈر یعنی علی برادران مولانا محمد علی اور

شوکت علی بھی جو خلافت کمیٹی کے بانی مبانی تھے خلافت سے دست بردار نہ ہو گئے یعنی ۲۱ نومبر ۱۹۲۲ء کو ترکوں کی قومی اسمبلی نے خلافت کو سلطنت سے جُدا کرنے اور سلطان وحید الدین کو معزول کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے بعد ۱۹۲۳ء میں ترکی میں خلافت کی جگہ جمہوریت نے لے لی۔

۲۵ دسمبر ۱۹۲۸ء کو ایک اجلاس خلافت کمیٹی کا زیر صدارت مولانا محمد علی جوہر مرحوم کلکتہ میں ہوا اور پھر نہرو رپورٹ کے سلسلے میں خود خلافت کمیٹی کے مسلم لیڈروں میں اختلاف ہو گیا۔ لیکن خلافت کمیٹی اس کے بعد سسکتی سی رہی کیونکہ پھر اس کے باقاعدہ جلسے نہ ہوتے البتہ ۳۰ مئی ۱۹۳۱ء کو بمبئی میں، ۲۷ دسمبر ۱۹۳۲ء کو اجمیر میں، اور ۱۵ دسمبر ۱۹۳۸ء کو بمبئی میں جلسے ہوتے اور پھر ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سو گئی۔ ۱۹۱۹ء میں اس کا آغاز ہوا اور ۱۹۳۸ء میں ۱۹ سال کی عمر میں غُفِرَ لہا ہو گئی۔ علامہ عثمانی بھی یہیں تک چل سکتے تھے لیکن خلافت کے آخری سالوں میں ان کی جولانگاہ زیادہ تر جمعیۃ العلمائے ہند کا میدان تھا۔

ہندو مسلم اتحاد کا شدھی کے باعث خاتمہ

ہندو مسلم اتحاد کا بھانڈا ابھی شدھی کے چوراہے میں پھوٹا جبکہ پنڈت شردھانند نے انگریزی حکومت سے رشوت لیکر دونوں قوموں میں پھوٹ ڈالنے کے لئے آگرے کے ارد گرد ملکانوں میں شدھی کی تحریک شروع کر دی۔ علماء اور دیندار مسلمان ہندو مسلم اتحاد سے مستعفی ہو گئے۔ اور یہی انگریز چاہتا تھا۔ شدھی کی تحریک دراصل لارڈ ریڈنگ یہودی وائسرائے ہند کی سیاسی عیاری کا کرشمہ تھا جو بہت کامیاب ثابت ہوا۔

خلافت کے جلسوں کے خاتمے کے ساتھ ساتھ ہندو مسلم اتحاد میں بھی زبردست شگاف پڑ گیا اور اس کا سبب کچھ تو نہرو رپورٹ (جس میں ہندو حقوق کا زیادہ

خیال رکھا گیا تھا) بنی اور زیادہ تر شدھی۔ بہر حال اس طرح حضرت عثمانی کے لئے اب یہ مقام بھی نہ رہا۔ اب لے دے کر جمعیۃ العلماء اور تبلیغی یا مناظروں کے میدان تھے۔ جن میں علامہ کی ہر جگہ مانگ تھی۔

جمعیۃ العلماء میں علامہ عثمانی کی خدمات

۱۹۱۹ء سے ۱۹۴۵ء تک

علامہ نے جمعیۃ العلمائے ہند میں رہ کر ۱۹۱۹ء سے ۱۹۴۵ء تک خاصی خدمات انجام دی ہیں جن کا اظہار انہوں نے مکالمۃ الصدرین میں پوری شدت سے کیا ہے۔ لیکن ہم سردست ان کی خدمات کے متعلق جمعیۃ العلماء کے جلیل القدر ممبر اور عہدہ دار مولانا محمد میاں صاحب دیوبندی کی زبانی پیش کرتے ہیں۔ ان کی رپورٹ "جمعیۃ العلماء کیا ہے" کی دو جلدیں اس وقت میرے پیش نظر ہیں جن میں انہوں نے جمعیۃ العلماء کے کارناموں کی رپورٹ پیش کی ہے۔ لکھتے ہیں :-

عدم تعاون کا فتویٰ

"۱۹۱۴ء کے جنگ کے سلسلے میں جبکہ یورپ کی فرنگی طاقتوں نے ترکی حکومت کو ختم کر دینے اور خلافت اسلامیہ کو تباہ کر دینے کا فیصلہ کر لیا اور حجاز مقدس پر قبضہ جمانے کا ارادہ کر لیا اس وقت جمعیۃ العلماء ہند کے رہنماؤں نے اپنی بصیرت سے ترک موالات اور عدم تعاون کے قدیم اسلامی حربے کے استعمال کا فیصلہ کیا اور تمام مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے عدم تعاون کے پروگرام کے متعلق ایک متفقہ فتویٰ تیار کیا جس کو لیکر خلافت کمیٹی اور کانگریس کے رہنما اور کارکن حکومت کے مقابلے میں صف آرا ہوئے۔" (جمعیۃ العلماء کیا ہے ص ۱۲ و ۱۳ / ۱۲)

اس موقع پر میں اتنا لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ علامہ شبیر احمد نے ایک زبردست خطبہ پڑھا تھا جس کا عنوان ہی "ترک موالات" تھا اور جس کو فقیہ ہند مفتی کفایت اللہ صاحب اور تمام علماء نے بہت سراہا تھا۔ چنانچہ مولانا محمد میاں صاحب دوسری جلد میں لکھتے ہیں :۔

"سالانہ اجلاس جمعیۃ العلمائے ہند، ترک موالات پر زبردست تقریر از مولانا شبیر احمد عثمانی براہ راست دفتر سے شائع کی۔"

(جمعیۃ العلماء کیا ہے جلد ۲ صفحہ ۲۹)

خود شیخ الہند کے خطبۂ صدارت اجلاس دہلی میں جس کو مفتی کفایت اللہ صاحب نے تحریر فرمایا تھا، شیخ الہند کی ترجمانی کے ضمن میں علامہ عثمانی کے خطبۂ ترکِ موالات کے لکھا ہے :۔

"جو کچھ مجھے کہنا تھا خطبۂ صدارت میں کہہ چکا ہوں اور جو مبسوط مضمون مولوی شبیر احمد صاحب عثمانی نے آپ کو آج ہی کے اجلاس میں سنایا ہے اس کے ضمن میں بھی میرے مقاصد اور محسوسات نہایت خوبی سے ادا ہو گئے ہیں۔"

مولانا محمد میاں صاحب آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں :۔

حجاز میں مؤتمر اسلامی حجاز پر شریف مکہ کی بجائے ابن سعود کا قبضہ ہو گیا تو جمعیۃ العلمائے ہند نے ان کو ایک مؤتمر اسلامی منعقد کرنے کا مشورہ دیا تاکہ وہاں صحیح طریقے پر نظام حکومت قائم ہو۔ چنانچہ سلطان ابن سعود نے اس مشورے کو قبول کیا اور ایک مؤتمر اسلامی منعقد کی جس میں جمعیۃ العلمائے ہند کا ایک نمائندہ وفد شریک ہوا۔" (صفحہ ۱۳ جلد ۱)

اس وفد میں علامہ شبیر احمد عثمانی نے مختلف مجلسوں میں اور شاہ ابن سعود کے سامنے عربی میں زبردست تقریریں کیں۔ یہ موتمر دراصل نظام حکومت کے سلسلے میں مشورے کے لئے نہیں بلکہ ابن سعود نے صحابہؓ کی قبروں پر بنے ہوئے قبوں اور دیگر مآثر کو منہدم کرادیا تھا جس سے ہندوستان کے مسلمانوں میں ہیجان پیدا ہوگیا تھا اس لئے ابن سعود نے تمام دنیائے اسلام کے جید علماء کو دعوت دی تھی۔ ہندوستان سے حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب، حضرت علامہ شبیر احمد صاحب، مولانا عبدالحلیم، مولانا محمد عرفان اور مولانا احمد سعید صاحب جمعیۃ کی طرف سے نمائندہ بنکر گئے تھے جس کا تفصیلی تذکرہ ہم نے "تجلیاتِ عثمانی" میں پیش کیا ہے اور آئندہ بھی آرہا ہے۔

علامہ عثمانی جمعیت کے اجلاس سوم میں اور سب کمیٹی کے رکن کی حیثیت میں

جمعیۃ علمائے ہند کے تیسرے اجلاس میں جو مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں ۱۸ - ۱۹ - ۲۰ نومبر ۱۹۲۱ء مطابق ۱۷ - ۱۸ - ۱۹ ربیع الاول ۱۳۴۰ھ کو لاہور میں منعقد ہوا اس میں جو تجویزیں پیش کی گئیں ان میں تیسری تجویز کے جز (ب) یعنی مسلمانوں کو کسی غیر مسلم کے ساتھ ہوکر مسلمانوں سے جنگ کرنا جس سے کفر کی شوکت بڑھتی ہے اور اسلام کی قوت کو صدمہ پہنچتا ہے قطعاً حرام ہے۔ اس تجویز کی تحریک مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نے فرمائی اور تائید میں پہلا نام علامہ شبیر احمد عثمانی کا ہے اور بعدازاں مولانا محمد فاخر، مولانا محمد اسحٰق مرادآبادی، مولوی محمد نعیم لدھیانوی، مولانا مرتضیٰ حسن وغیرہم کے ہیں۔ یہی وہ جلسہ ہے جس میں علامہ عثمانی کی معرکہ آرا تقریر ہوئی جو تمام علما کی تقریروں سے بڑھ کر تھی جس کو مولانا نصراللہ عزیز نے اپنے ایک مضمون میں ذکر کیا ہے۔

اسی لاہور کے اجلاس میں تجویز نمبر ۸ میں امیر الہند کی تجویز اور اس کا انتخاب بھی ہے۔ جس میں طے پایا کہ امیر الہند کا انتخاب کر لیا جائے اور ایک سب کمیٹی بنائی جائے جو امیر شریعت کے فرائض اور اختیارات کا تعین کرے چنانچہ ایک ایک کمیٹی بنائی گئی جو اپنی رپورٹ بدایوں کے دسمبر میں منعقد ہونے والے اجلاس میں پیش کرے۔

مولانا خلیل[۱] احمد صاحب ، مولانا حبیب[۲] الرحمٰن صاحب ، مولانا شبیر[۳] احمد صاحب ، مولانا [۴] ، مولانا محمد سجاد[۵] صاحب ، مولانا سید[۶] انور شاہ صاحب ، مولانا کفایت[۷] اللہ صاحب ، مولانا عبد[۸] الباری صاحب ، مولانا مرتضیٰ[۹] حسن صاحب ، مولانا ثناء[۱۰] اللہ صاحب ، مولانا محمد فاخر[۱۱] صاحب الہ آبادی ، مولانا عبد[۱۲] الماجد صاحب ، مولانا سبحان[۱۳] اللہ ، مولانا محمد داؤد[۱۴] صاحب۔

اس سب کمیٹی میں جن علماء کو رکھا گیا ہے وہ ہند کے چیدہ علماء ہیں اور ان ہی میں علامہ شبیر احمد صاحب کا نام نامی بھی ہے۔ بدایوں میں ہونے والے سالانہ اجلاس کو بعض وجوہ سے ملتوی کرنا پڑا لیکن صوبائی اجلاس ہوا۔ اس میں علماء کی تقریریں ہوئیں نیز سب کمیٹی نے اختیارات و فرائض امیر شریعت کا مسودہ تیار کر لیا۔ (بحوالہ اخبار مسلم ۱۰ رجمادی الاخریٰ ۱۳۴۰ھ مطابق ۵ فروری ۱۹۲۲ء بدھ و جمعیۃ العلماء کیا ہے صفحہ ۴۷ جلد دوم)

مذکورہ سب کمیٹی کا امیر شریعت کے فرائض سے متعلق مسودہ اجمیر کے سالانہ اجلاس میں پیش کئے جانے کی تجویز مولانا عبد الحلیم صدیقی نے پیش کی لیکن پھر آئندہ اجلاس کے لئے ملتوی کر دی گئی۔ (صفحہ ۵۲ ج ۲)

اور آخر کار سب کمیٹی کی یہ رپورٹ نہایت تفصیل سے مجلس منتظمہ کے اجلاس ۸ / ۹ ر صفر ۴۲ھ ۲۰ / ۲۱ ر ستمبر ۱۹۲۳ء بمقام دہلی پیش ہوئی اور مولانا عبد الحلیم

---

[۴] اصل مسودہ میں نام درج نہیں، خالی جگہ چھوڑی ہوئی ہے ۱۲ اشفاق احمد گیاوی

صاحب نے سنہ ھ میں حمیدیہ پریس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا۔

حضرت عثمانی جمعیۃ کے چوتھے سالانہ اجلاس گیا میں

جمعیت کا چوتھا سالانہ جلسہ جو گیا میں ۲۴ دسمبر ۱۹۲۲ء سے شروع ہوا اس میں علامہ عثمانی نے کونسلوں اور اسمبلیوں کے مسلسل بائیکاٹ پر تقریر کی اور فرمایا کہ گورنمنٹ برطانیہ کا مقاطعہ جاری رہنا چاہیئے۔ دوسری طرف علماء کا ایک گروہ تھا جو یہ رائے رکھتا تھا کہ کونسلوں اور اسمبلیوں پر قبضہ کرنا چاہیئے۔ چنانچہ سید سلیمان ندوی مرحوم کا یہی خیال تھا مگر علامہ عثمانی کثرت رائے سے فتحیاب ہوئے۔ اس اجلاس میں مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کا خطبۂ صدارت علامہ عثمانی نے پڑھ کر سنایا تھا جنہوں نے خطبے میں حیات تازہ پھونک کر سامعین کو محو حیرت بنا دیا تھا۔

علامہ عثمانی مجلس منتظمہ کے اجلاس منعقدہ دہلی، بتاریخ ۸، ۹ صفر ۱۳۴۲ھ، ۲۰، ۲۱ ستمبر ۱۹۲۳ء

علمائے ہند دہلی کی مجلس منتظمہ کا اجلاس تھا جس میں علامہ کی شرکت نیز مجلس منتظمہ کا ممبر ہونا ثابت ہوتا ہے۔ افسوس کہ رپورٹ تمام تفصیلات سے خاموش ہے البتہ مجلس منتظمہ کے اس اجلاس میں خصوصی تجویز جزیرۃ العرب سے غیر مسلم کا اقتدار اور اثر دور کرنے کے لئے طے کی گئی۔ اور التوائے حج کے مسئلے پر غور کرنا بھی طے کیا گیا۔ اور یہ بھی طے پایا کہ حسب ذیل کمیٹی ایک فتویٰ مرتب کر کے جمعیت منتظمہ کے سامنے پیش کرے۔ کمیٹی کے ارکان یہ ہیں:-

مولانا کفایت اللہ صاحب، مولانا محمد انور شاہ صاحب، مولانا ثناء اللہ صاحب، مولانا محمد سجاد صاحب، مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب، مولانا عبد الباری صاحب، مولانا مظہر الدین صاحب (شیر کوٹی راقم الحروف کے ہم وطن شہید) مولانا حسین احمد صاحب

مدنی ، مولانا عبدالماجد صاحب ۔ (جمعیۃ العلماء کیا ہے ص۶۵ جلد دوم)

علامہ شبیر احمد جمعیۃ العلماء کے پانچویں سالانہ اجلاس بمقام کوکناڈا میں

علامہ جمعیۃ کے پانچویں سالانہ جلسے میں بھی تشریف لے گئے یہ جلسہ ۲۲، ۲۳، ۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۲ھ مطابق ۳۱ دسمبر ۱۹۲۳ء و یکم، دوم جنوری ۱۹۲۴ء کو کوکناڈا میں منعقد ہوا ۔ جو مختلف تجویزیں اس جلسے میں پاس ہوئیں ان میں ہندوستان کی آزادی کے لئے ہندو مسلم لیڈروں نے دہلی کے اسپیشل کانگریس اجلاس اور بنگالی صوبائی کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں قومی معاہدہ یا میثاق ملی مرتب کیا ۔ جمعیۃ العلماء نے تجویز کیا کہ دونوں مسودوں پر غور کرنے کے لئے ایک سب کمیٹی مرتب کی جائے جو انصاف، مذہبی آزادی اور حفاظت حقوق کے مضبوط اصول کو پیش نظر رکھ کر اپنی تجویز جمعیۃ العلماء کو پیش کرے ۔ اس سب کمیٹی کے لئے جو حضرات منتخب ہوئے ان کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں :

۱۔ مولانا حسین احمد مدنی ۲۔ مولانا شبیر احمد عثمانی ۳۔ مولانا سید سلیمان ندوی
۴۔ مولانا عبدالحلیم صدیقی ۵۔ مولانا ثناء اللہ ۶۔ مولانا عبدالقدیر
۷۔ صدر جمعیۃ ۸۔ ناظم جمعیۃ ۹۔ حکیم اجمل خاں ۔ (جمعیۃ کیا ہے ص۱۷/۲۶)

ایک اور مجلس منتظمہ کے اجلاس دہلی میں

یہ مجلس منتظمہ کا اجلاس ۲۵، ۲۶، ۲۷ محرم ۱۳۴۳ھ مطابق ۲۷، ۲۸، ۲۹ اگست ۱۹۲۴ء کو جمعیۃ علمائے ہند دہلی کے دفتر میں منعقد ہوا ۔ اس اجلاس میں جہاں اور بہت سی تجویزیں پیش ہوئیں ان میں ایک یہ بھی تجویز تھی کہ مسلمانوں کے فرقوں میں باہمی اختلاف کے اسباب اور اس کے دفع کرنے کی صورتوں پر غور کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی جائے ۔ مولانا محمد میاں اس مجلس منتظمہ کی رپورٹ کا

حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"جمعیۃ العلماء کا یہ اجلاس ان ناگوار فسادات کو جو مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں پیش آتے رہتے ہیں سخت افسوس کی نظر سے دیکھتا ہے اور ان کے رفع کرنے کے لئے حسب ذیل اصحاب کی ایک کمیٹی منتخب کرتا ہے:
مولانا ابراہیم صاحب، مولانا داؤد غزنوی، مولانا مرتضی حسن صاحب مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، مولانا عبد الباری صاحب، مولانا عبد القدیر صاحب، حکیم اجمل صاحب۔" (جمعیۃ کیا ہے صفحہ ۱۰۳/۲ج تجویز نمبر ۱۴/۱۷)

مذکورہ تجویز سے علامہ عثمانی کی شرکت اور ان کا اس کمیٹی میں انتخاب ان کی اہمیت اور خدمات پر واضح دلیل ہے۔

علامہ مجلس منتظمہ کے اجلاس بمقام مراد آباد میں

جمعیۃ کی مجلس منتظمہ کا ایک اور اجلاس خصوصی ۱۵ رجمادی الاخری ۱۳۴۳ھ مطابق ۱۱ رجنوری ۱۹۲۵ء بوقت گیارہ بجے دن واقع ہوا۔ اس میں جہاں اور بہت سی تجویزیں پاس ہوئیں ایک یہ بھی پاس ہوئی "جمعیۃ کیا ہے" کے رپورٹر لکھتے ہیں :۔

"تجویز نمبر ۲۱/۲۴ جمعیۃ علمائے ہند کا یہ اجلاس عدم تعاون کے پروگرام پر غور کرنے کے لئے حسب ذیل کمیٹی مقرر کرتا ہے۔ یہ کمیٹی اپنی رپورٹ مرتب کر کے آئندہ جمعیۃ مرکزیہ کے اجلاس میں پیش کرے۔ ارکان سب کمیٹی یہ ہیں :۔

(۱) مولانا ابو المحاسن محمد سجاد صاحب (۲) مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی
(۳) مولانا حسین احمد صاحب (۴) مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب
(۵) مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری۔" (جمعیۃ کیا ہے صفحہ ۱۰۵/۲ج)

حضرت عثمانی اجلاس مجلس عاملہ جمعیت برمکان حکیم اجمل خاں دہلی میں

یہ فوری اور ہنگامی اجلاس ۳۰ جمادی الاخریٰ ۱۳۴۳ھ مطابق ۲۶ جنوری ۱۹۲۵ء کو منگل کے روز حکیم اجمل خاں صاحب کے مکان پر دہلی میں منعقد ہوا۔ جس میں گورنمنٹ برطانیہ کی حجاج پر پاسپورٹ اور واپسی ٹکٹ کی پابندیوں کے خلاف گورنمنٹ سے احتجاج کرنا تھا۔ رپوٹر کی رپورٹ کے مطابق اس میں مفتی کفایت اللہ صاحب، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں، حکیم اجمل خاں وغیرہم شامل ہوئے چونکہ آخری جنوری کو یہ قانون اسمبلی میں پیش ہونا تھا اس لئے دیگر ارکان مجلسِ منتظمہ کو تار دیئے گئے۔ رپورٹر لکھتے ہیں:

"اس (تجویز۲) کے بعد مولانا مرتضیٰ حسن تشریف لائے اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب، مولانا انور شاہ صاحب، مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی اور اپنی جانب سے متفقہ طور پر تحریری رائے پیش کی جس کا مقصد قانون ہذا کو صریح مداخلت مذہبی ظاہر کرنا تھا۔ ڈھائی بجے جلسہ ختم ہوگیا۔"

(جمعیۃ کیا ہے ص۱۰۹ ج ۲)

الحاصل اس مجلس منتظمہ میں بھی علامہ عثمانی فعال کی حیثیت سے شریک ہیں۔

علامہ کا تذکرہ سالانہ اجلاس ہفتم جمعیت منعقدہ کلکتہ میں؛

۱۱ مارچ تا ۱۴ مارچ ۱۹۲۶ء مطابق ۲۵-۲۶-۲۷-۲۸ شعبان ۱۳۴۴ھ کے سالانہ اجلاس ہفتم بصدارت سید سلیمان ندوی میں بھی علامہ موجود نظر آتے ہیں۔ رپورٹر اس اجلاس کی عملی کاروائیوں اور تجاویز کے ضمن میں لکھتے ہیں:-

"تجویز نمبر ۱۶/۱۸ .... جمعیۃ علماء کا یہ اجلاس صدر و ناظم جمعیۃ کو

اختیار دیتا ہے کہ جب مالی حالت اجازت دے تو وہ مجلس عاملہ کا جلسہ طلب کریں اور اس کی رائے اور صوابدید کے ساتھ معتمد اور مستند علماؒ کی نگرانی میں ترجمہ و تفسیری فوائد تیار کرا کے طباعت کی کارروائی شروع کردیں۔ تفسیری فوائد کا کام مولانا شبیر احمد صاحب کے سپرد کیا جاتا ہے، مولانا موصوف کی علامہ سید سلیمان صاحب اعانت کریں گے۔"

(جمعیت کیا ہے، صفہ ۱۲۲ و صفہ ۱۲۳ جلد دوم)

اس عبارت سے علامہ عثمانی کی شرکت معلوم ہوتی ہے اور اگر شرکت نہ بھی ہو تو دیکھنا یہ ہے کہ تمام علمائے ہند میں علاّمہ عثمانی کے لئے فوائد لکھنے کی خدمات طے کرنا ان کی تفسیری لیاقت اور علوم قرآنی میں مہارت کا واضح ثبوت ہے الحمدللہ اگرچہ جمعیت کی طرف سے تو نہیں البتہ قدرت کے انتخاب کی بنا پر مدینہ پریس کے مالک مولوی مجید حسن صاحب کی درخواست پر علامہ شبیر احمد عثمانی نے فوائد تفسیری کا وہ شاہکار انجام دیا ہے جس کی خوبی اور عمدگی تمام علماء میں مسلم ہے اور یہ تفسیری فوائد اس قدر مقبول ہوئے ہیں کہ اب تک کے تمام تفسیری فوائد ان کے سامنے ماند پڑ گئے ہیں۔

علامہ عثمانی کی یاد مجلس مرکزیہ جمعیت علماء ہند منعقدہ دہلی میں

مجلس عاملہ کا یہ اجلاس ۲۰ ر ۲۱ اپریل ۱۹۲۶ء مطابق ۷ - ۸ ر شوال ۱۳۴۴ھ دہلی میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کی تجویز نمبر ۱ میں رپورٹر لکھتے ہیں :-

"تجویز ۱۔ جمعیۃ مرکزیہ کا یہ اجلاس بالاتفاق مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب۔ مولانا محمد انور شاہ صاحب۔ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی۔ مولانا نثار احمد صاحب کو وفد حجاز کے لئے نمائندہ منتخب کرتا ہے۔

اس وفد کو اختیار ہے کہ مولانا محمد عرفان یا مولانا عبد الحلیم صدیقی کو اپنا سیکریٹری منتخب کرے۔" (جمعیت کیا ہے ص ۱۲۴ ج ۲)

اس وفد میں حضرت مولانا انور شاہ صاحب تو تشریف نہ لے جا سکے البتہ علامہ عثمانی، مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا عبد الحلیم ندوی تشریف لے گئے تھے۔ اس سلسلے میں ہم تجلیات عثمانی میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ تاہم حجاز سے وفد کی واپسی پر جو جمعیت عاملہ کا اجلاس ۲-۳ محرم ۱۳۴۶ھ مطابق ۳-۴ جولائی کو ہوا ہے اس میں تجویز ۵ کے الفاظ یہ ہیں :-

" وفد حجاز کی رپورٹ پیش ہوئی۔ قرار پایا کہ صدر محترم کو پورا اختیار دیا جائے کہ وہ اس کی اشاعت کی جو مناسب تجویز فرمائیں اختیار کریں۔ ارکان وفد کی خدمات کا اعتراف کیا گیا اور صدر محترم اور دوسرے ارکان کا شکریہ ادا کیا گیا"۔ (جمعیت کیا ہے ص ۱۳۳ ج ۲)

آٹھواں سالانہ اجلاس جمعیۃ علمائے ہند اور علامہ عثمانی!

یہ اجلاس پشاور میں بصدارت استاذ محترم مولانا محمد انور شاہ صاحب ۷ ر سے ۱۰ ر جمادی الاخریٰ ۱۳۴۶ھ مطابق ۲ ر تا ۵ ر دسمبر ۱۹۲۷ء منعقد ہوا۔ اس اجلاس کی تجاویز میں تجویز نمبر ۱۵ بھی ہے جس میں طلاق وغیرہ کے مسائل میں غیر مسلم حکام کے فیصلے کو غیر معتبر قرار دیتے ہوئے مسلمان حاکم کی ضرورت محسوس کی گئی کہ حکومت مسلمانوں کے نکاح اور فسخ نکاح، خلع، طلاق کے لئے با اختیار شرعی قاضی مقرر کرے۔ قاضی کے اختیارات کے سلسلے میں ایک سب کمیٹی بنائی گئی جو حسب ذیل علماء پر مشتمل کی گئی :-

مولانا حسین احمد صاحب، مولانا ثناء اللہ صاحب، مولانا محمد سجاد صاحب، مولانا سید محمد انور شاہ صاحب، مولانا محمد نعیم صاحب، مولانا قطب الدین

صاحب ، مولانا عبدالماجد صاحب ، مولانا شبیر احمد صاحب ، مولانا سید سلیمان صاحب ندوی ، مولانا عبدالحکیم صاحب پشاوری.

(جمعیت کیا ہے صفحہ ۱۴۰ ج ۲)

اسی اجلاس پشاور کی ایک اور تجویز میں حضرت عثمانی کا تذکرہ آتا ہے۔ رپورٹر لکھتے ہیں :۔

" جمعیۃ علمائے ہند کا یہ جلسہ اس اعلان کے ساتھ کہ سود کی حرمت قرآن پاک کی نص قطعی سے ثابت ہے اور کوئی شخص کسی حرام کو حلال نہیں کرسکتا۔ علماء و واقفینِ معاملاتِ تجارت کی حسب ذیل کمیٹی منتخب کرتا ہے جو حالاتِ حاضرہ کی تنقیح و تحقیق کرے اور شرعی تیسیر (سہولت) کا لحاظ رکھتے ہوئے کتاب و سنت کی روشنی میں جمہور مسلمین کی رہنمائی کرے اور ظاہر کردے کہ حوادث جدیدہ میں کتنے امور جائز اور کتنے ناجائز اور حرام۔ کمیٹی کے ارکان یہ ہوں گے :۔

حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب ، مولانا سید حسین احمد صاحب، مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی ، مولانا سید سلیمان صاحب ندوی ، مولانا عبدالقہار صاحب (مروت ولا) مولانا عبدالحکیم صاحب پشاوری ، مولانا نعیم الدین صاحب مراد آبادی ، مولانا عبدالماجد صاحب بدایونی، مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادی ، مولانا قطب الدین صاحب فرنگی محل ، مولانا نثار احمد کانپوری ، مولانا معین صاحب اجمیری، مولانا محمد علی صاحب ، سیٹھ عبداللہ ہارون صاحب ، میاں ہاشم غلام علی مصطفیٰ صاحب "

(جمعیت کیا ہے صفحہ ۱۴۳ و صفحہ ۱۴۴ ج ۲)

مذکورہ بالا عبارتیں جو ہم نے " جمعیت کیا ہے " سے پیش کی ہیں اس بات

کی وضاحت میں واضح حقیقتیں ہیں کہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نے جمعیۃ العلماء میں رہ کر دین اور قوم کی وہ خدمات جلیلہ انجام دی ہیں کہ جن کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ نہ صرف جمعیۃ العلماء ان کی جولانگاہ تھی بلکہ تمام متحدہ ہندوستان کے دینی اور سیاسی پلیٹ فارم ان کی تقریروں سے گونجتے رہے ہیں۔

دسمبر ۱۹۲۷ء کے پشاور اجلاس کے بعد "جمعیۃ العلماء کیا ہے" میں علامہ عثمانی کا آخر تک کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ رپورٹ کی دوسری جلد ۲۴۸ صفحات پر ہے لیکن علامہ کا ذکر ۱۶۹ صفحات پر پہنچ کر ختم ہو گیا ہے۔ دراصل یہ ایک خاکہ ہے جو مولانا محمد میاں صاحب نے مختصراً پیش کیا ہے۔ نہ صرف علامہ کا نام مذکورہ صفحے کے بعد نہیں، بلکہ حضرت شاہ صاحب، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب، مولانا مرتضیٰ حسن صاحب وغیرہم کسی کا بھی ذکر نہیں۔ البتہ مولانا عثمانی کی بعض تحریروں سے ۱۹۲۷ء کے بعد بھی مجلس شوریٰ اور بعض سالانہ جلسوں میں شرکت کے متعلق پتہ چلتا ہے۔ مراسلات سیاسیہ میں ایک جگہ مولانا محمد منظور نعمانی کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں:

"غالباً ۳۹ء میں اجلاس جمعیۃ العلمائے ہند دہلی کے موقع پر یاد ہو گا کہ آپ نے قبل از اجلاس کچھ گفتگو مجھ سے کی تھی۔ مجھے بہت کچھ امید ہو گئی تھی کہ آپ جیسے لوگ وہاں میری ہمنوائی کریں گے۔ میں ورکنگ کمیٹی میں دو روز تک ان حضرات سے بحثتا رہا۔ خیر اس میں تو آپ شامل نہ تھے پھر سبجیکٹ کمیٹی میں مسئلہ آیا آپ بھی اس میں شریک تھے۔ میں نے اپنے خیالات کا برملا اظہار کیا۔" (مراسلاتِ سیاسیہ ص۲۱)

اس عبارت سے ۱۹۳۹ء کے اجلاس دہلی میں شرکت، ورکنگ کمیٹی اور سبجیکٹ کمیٹی میں بحث اور سرگرمی نیز جمعیۃ العلماء سے ایک گونہ بیزاری و تکدر کا

پتہ چلتا ہے۔ ایک اور خط سے جو آپنے سعید الدین صاحب بہاری کے جواب میں انہیں لکھا ہے آپ کا ۱۹۴۴ء تک جمعیت سے منسلک رہنے اور ۱۹۴۵ء میں اس کی رکنیت سے علیحدہ ہو جانے کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:۔

"میں کچھ مدت سے جمعیۃ العلماء دہلی سے علیحدہ ہو چکا ہوں اور سہارنپور سیشن کے بعد ادھر سے جو رکنیت کی دعوت دی گئی تھی میں نے لکھ دیا تھا کہ اب میں اس کا رکن بننا پسند نہیں کرتا۔" (مراسلات سیاسیہ ص۷)

ہمارا مقصد یہ ہے کہ ۱۹۱۹ء سے لیکر ۱۹۴۴ء کے آخر تک علامہ جمعیت العلماء کے رکن رکین کی حیثیت سے رہے اور آپ نے جمعیت کی زبردست خدمات کیں۔ ضرورت ہے کہ جمعیۃ العلماء ہند کے دفتر سے ان تمام تجاویز اور تقاریر کا ریکارڈ حاصل کر کے ان کے سوانح زندگی کا جزبنایا جائے، امید ہے کہ انشاء اللہ اس کے لئے قدرت کبھی موقع عطا فرمائے گی۔ ہم سردست علامہ کی سیاست کے اس دور کو ۱۹۴۴ء پر ختم کرتے ہیں اور دیگر حالات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ البتہ ۱۹۴۵ء کے بعد کے سیاسی دور اور تعمیر پاکستان کی خدمات جلیلہ کے دور کا آئندہ اوراق میں انشاء اللہ تعالیٰ نئے عنوان سے ذکر کریں گے۔ البتہ اس دور کی سیاست سے متعلق جو جمعیۃ العلماء سے وابستگی اور ۱۹۴۴ء تک سے متعلق ہے کچھ مزید معلومات آپ کو ہماری کتاب "تجلیاتِ عثمانی" میں ملیں گی۔ وہاں مطالعہ فرمائیے۔

پھر دارالعلوم کی طرف

منتشر کارنامے

تصفیۂ عقائد و مسائل آپ کی سیاسیات، اسلام پر حملہ آوروں کے مقابلہ میں مدافعانہ کوششیں، دارالعلوم کی وکالت درس و تدریس کا سلسلہ اور اس پر القاسم کی تحریری مساعی کوئی معمولی خدمات نہ تھیں۔

مدافعانہ مساعی میں آپ کی ایک کوشش یہ رہی کہ آپ کے دور اور اس سے ذرا پہلے کے زمانہ میں ایک سلسلہ یہ چل نکلا اور بعض عقل کے بندوں نے یہ روش اختیار کی کہ جو چیز ہماری عقل میں نہ آئے وہ اسلام کی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ ان کو دراصل اپنی عقل کے متعلق غلط فہمی ہوئی۔ انہوں نے معجزات کا ہی قطعاً انکار کر دیا۔ اس سلسلے میں علامہ کے مضامین العقل والنقل نے ہندوستان میں غلغلہ برپا کر دیا۔ حتیٰ کہ جب آپ کے اس مضمون کی قسط کو القاسم میں چھپنے سے دیر ہو جاتی تو القاسم کے قارئین کی طرف سے تقاضے ہوتے۔ آپ نے اس مضمون میں نہایت عالمانہ، فلسفیانہ اور سلجھے ہوئے پیرائے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ عقل سلیم اور نقل صحیح میں کبھی مخالفت نہیں ہو سکتی۔

خطبۂ جمعہ عربی میں جمعیۃ الانصار کے زمانہ میں خواجہ عبدالحی صاحب جو کہ درجۂ تکمیل دارالعلوم کے طالب علم تھے اور بعد ازاں جامعہ ملیہ کے پروفیسر اور اب[1] اسلامیہ کالج لاہور میں اسلامیات کے

---

[1] جب ہم اگست ۱۹۶۲ء میں اس کتاب پر نظر ثانی کر رہے تھے تو خواجہ صاحب (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

لیکچر رہیں ان کو خیال پیدا ہوا کہ جمعہ کا خطبہ اپنی زبان میں ہونا چاہیئے۔ یہ بات، اور کہاں، دارالعلوم میں گونجی۔ حضرت عثمانی نے اس خیال کی تردید میں خطبہ جمعہ عربی زبان میں ہونے پر ذیقعدہ ۱۳۳۲ھ میں زبردست فتویٰ لکھا۔ جو مذکورہ ماہ و سنہ کے القاسم میں چھپا۔ جس پر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب، حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب، حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب وغیرہم کے تائیدی دستخط ہیں۔ اس تحریک کے کچھ عرصہ بعد بقول خواجہ صاحب جیسا کہ انہوں نے مجھے تفصیلات بتائیں موصوف عثمانی شملہ کسی جلسے میں پہنچے تھے۔ اتفاق سے خواجہ صاحب کا بھی شملہ جانا ہوا۔ مولانا مبین صاحب دیوبندی جو وہاں خطیب تھے ان سے خواجہ صاحب نے خطبۂ جمعہ کے متعلق تقریر کرنے کی درخواست کی لیکن انہوں نے جواب میں کہا کہ مولانا عثمانی یہاں آئے ہوئے ہیں لہذا یہ تقریر مناسب نہیں۔ پھر مذکورہ مضمون اسی سلسلے میں لکھا گیا۔

ایک اور اہم مسئلہ! کیا حق بات ایک ہی ہوتی ہے؟

دارالعلوم کے ایک قدیم تعلیم یافتہ فاضل نے علامہ کو خط لکھا کہ کتنے مسائل ایسے ہیں کہ جن میں ائمہ کا سخت اختلاف ہے مثلاً امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کو امام اعظمؒ منع فرماتے ہیں اور امام شافعیؒ پڑھنے کا حکم دیتے ہیں تو کیا یہ مختلف اجتہادات سب کے سب صحیح ہیں یا حق ایک ہی بات ہو سکتی ہے۔ اس پر آپ کا ایک زبردست مضمون ہدیہ سنیہ کے نام سے القاسم میں چھپا جو نہایت ہی محققانہ ہے۔ اس مضمون میں سائل کے بعض دیگر سوالات پر بھی کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ مضمون شوال ۱۳۳۶ھ کے القاسم میں طبع ہوا۔ اور ہم نے جو انوار عثمانی کے نام سے علامہ کے مکتوبات مرتب کر کے چھپوائے ہیں اس میں سب سے پہلا یہی مکتوب ہے۔ ملاحظہ ہو

انوارِ عثمانی مکتوبات علامہ شبیر احمد رحمۃ اللہ علیہ مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ کراچی مدرسہ[1] عربیہ اسلامیہ نیوٹاؤن جامع مسجد۔ اب ہم حیاتِ عثمانی پر ایک اور نظر اگست ۱۹۷۲ء میں ڈال رہے ہیں جبکہ اس کی کتابت ہو رہی ہے۔[2]

آیت صوم پر محققانہ تفسیر

القاسم کے دور میں امرتسر سے ایک پرچہ تہذیب الاخلاق نکلنا شروع ہوا جس میں ڈاکٹر صاحب (کپورتھلوی) کا ایک مضمون نکلا جس میں: "فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۝ کی تفسیر میں یہ ظاہر کیا کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں اور وہ روزہ نہ رکھنا چاہیں تو مسکینوں کو کھانا کھلائیں۔ اس کے رد میں آپ نے ایک نہایت محققانہ مضمون لکھا جس میں آیت مذکورہ کی صحیح تفسیر پیش کی اور لوگوں کے بگڑتے ہوئے عقائد کو سنبھالا۔ یہ مضمون بھی القاسم کے ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ میں چھپا

دار العلوم میں معزز مہمانوں کی آمد

خوب یاد ہے کہ مولانا مظہر الدین شیرکوٹی ایک دفعہ دیوبند تشریف لائے غالباً یہ ۱۹۲۱ء کی بات ہے اس سے پہلے آپ کے تعلقات دار العلوم اور متوسلین دار العلوم سے بگڑ گئے تھے بہرحال آپ آئے اور نودرہ میں آپ نے تقریر کی۔ مولانا عثمانی نے ان کی تقریر کے جواب میں نہایت شستہ اور شگفتہ تقریر فرمائی۔

---

[1] موجودہ نام جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن ہے۔ نجیب

[2] مذکورہ کتابت ادھوری رہ گئی اور کتاب کی طباعت التوا کا شکار ہوگئی، اب مکتبہ دار العلوم کراچی کے زیرِ انتظام اگست ۱۹۸۱ء میں دوبارہ کتابت شروع ہوئی ہے۔ نجیب

مولانا مدنیؒ کی کراچی سے رہائی

خلافت کے زمانے میں غالباً ۱۹۲۱ء میں جب مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ دو سال قید فرنگ سے ۱۹۲۳ء میں واپس آئے تو دارالعلوم میں آپ کے لئے مولسری کے احاطے میں جلسہ ہوا۔ اسٹیج نودرہ کے برآمدے کے درمیانی دروازے پر بنائی گئی۔ قرآن کریم کی تلاوت کے بعد جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے اپنے نرم لہجے میں مدبرانہ مگر مشفقانہ تقریر فرمائی۔ ان کے بعد مولانا عثمانی مرحوم جو انہی مقاصد کے لئے وکیل کل تھے تقریر کے لئے کھڑے ہوئے اور فرمایا:

"اس میں شک نہیں کہ آپ کے ایامِ قید فرنگ میں ہم آپ سے وہ رابطہ قائم نہ رکھ سکے جو تعلقات کی بنا پر ہونا چاہیئے تھا لیکن یہ یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ کی یاد سے ایک گونہ ہمارے دل خالی نہیں رہے جس کا ثبوت مختلف مجالس میں آپ کے تذکرے دیں گے جن میں آپ کی یاد رہا کی۔ میں نہایت احتیاط سے یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ آپ کے سامنے میں ایسی کوئی بات کہنے کے لئے آمادہ نہیں ہوں کہ جس کا وجود میرے دل میں تو نہ تھا اور شیطانی وسوسے سے دھوکا کھا کر مبالغہ آمیز رنگ میں آپ کی جدائی میں بیقراری اور دل فگاری کے لفظوں سے یاد کروں جو حقیقت کے خلاف ہی نہیں بلکہ دیانت و امانت کے بھی خلاف ہو۔"

(شنیدہ راقم الحروف)

اس موقعہ پر علامہ نے نہایت صاف اور حق نژوہ الفاظ میں لیکن دوستانہ روابط کے مناسب الفاظ میں وہ زبردست تقریر کی کہ مجمع پھڑک اٹھا۔ یہ وہ دور تھا کہ دارالعلوم میں مولانا عثمانی کا طوطی بول رہا تھا۔ بعد ازاں

مولانا مدنی کے اعزاز میں مہتمم صاحب اور طلبہ نے پارٹیاں دیں۔ خوب یاد ہے کہ ان پارٹیوں میں ہمارے محترم دوست مولانا حامد الانصاری غازی اور مولوی آفاق احمد سیکروی نے مدحیہ قصیدے پڑھے تھے۔ علامہ عثمانی بھی ان پارٹیوں میں خصوصیت سے بلائے جاتے تھے۔

مولانا شیروانی اور حضرت عثمانی

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب شیروانی دارالعلوم کے ممبر ہونے کی حیثیت سے دارالعلوم میں آیا جایا کرتے اور نودرے میں ان کی تقریر ہوئی تو مولانا حبیب الرحمٰن صاحب تو مہتمانہ تقریریں کرتے لیکن شیروانی مرحوم کی تقریروں کا حق گوئی کے انداز میں سلجھا ہوا منطقانہ اور محققانہ جواب آپ ہی دیتے۔

سر محمد شفیع کی دارالعلوم میں آمد اور تقریر، علامہ عثمانی کی جوابی تقریر

ایک دفعہ غالباً ۱۹۲۳ء میں خلافت کے ہنگامے کے فرو ہو جانے کے بعد سر محمد شفیع دارالعلوم میں تشریف لائے اور آپ نے اپنی تقریر میں کہا کہ خلافت کے زمانے میں دارالعلوم نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ تو مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی تقریر کے بعد علامہ نے تقریر فرمائی، اور فرمایا:۔

جب دنیا میں سیلاب آتے ہیں تو اس کے بہاؤ میں شیر، اژدہے، سانپ اور دوسرے جانور سب بہے چلے جاتے ہیں۔ اس طوفان میں کسی کا رکنا دشوار ہی نہیں بلکہ اس وقت جانوں کا بچانا بھی دشوار ہو جاتا ہے اسی طرح خلافت کا ایک سیلاب اٹھا جس میں ہندوستان کے مسلمان بہ نکلے۔ دارالعلوم جو مسلمانانِ ہندوستان کی واحد مذہبی نمائندہ درسگاہ ہے یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ اس مذہبی مسئلہ سے متاثر نہ ہوتی۔ ہاں یہ فرق

ہے کہ دار العلوم ہمیشہ اعتدال کے درجے سے کبھی اپنا قدم آگے نہیں بڑھاتا
چنانچہ اس موقع پر بھی اس کے لئے جب چارہ نہ ہوا تو اس نے اپنے فرائض
کی ادائی میں اعتدال کا درس ہاتھ سے نہ چھوڑا۔"

علامہ نے کچھ ایسی مرعوب کن اور مدلل تقریر فرمائی کہ سر شفیع صورت حال سے سخت متاثر ہوئے اور فاضل مقرر کی معقول باتوں کو تسلیم کرتے ہی بنی، یاد ہے کہ سر موصوف نے دار العلوم کو سو روپیہ بطور چندہ عنایت فرمایا جس پر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے اپنے مدبرانہ الفاظ میں فرمایا تھا کہ یہ سو روپیہ ہمیں ہزاروں کی برابر ہیں۔

جمعیۃ الطلبہ اور علامہ عثمانی

دار العلوم میں ایک انجمن "جمعیۃ الطلبہ" تھی جس میں تقریریں، مناظرے اور مباحثے ہوتے تھے۔ میں نے بھی ایک دفعہ تقریر میں دوسرے نمبر کا انعام لیا تھا۔ اس انجمن میں عموماً ایسے ہی طلبہ حصہ لیتے تھے جو تقریر کر سکتے یا مضمون لکھ سکتے۔ میرے زمانے سے پہلے بھی اور میرے عہد طالب علمی بھی حضرت عثمانی ہی طلبہ کو تقریروں اور تحریروں کے نشیب و فراز اور اصول و ضوابط کی تعلیم و تربیت دیتے۔ جن طلبہ میں تقریر و تحریر کا فطری جوہر ہوتا تو وہ علامہ کی طرف رجوع کرتے یا جمعیت کی شکل میں مولانا ان کی رہبری فرماتے۔ اس مقصد کے لئے جب تک آپ دار العلوم میں رہے آپ ہی کو موزوں ترین سمجھا جاتا۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی علامہ کی زیر تربیت

میرے دور طالب علمی میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی دار العلوم میں داخل ہوئے غالباً یہ ۱۳۴۰ھ مطابق ۱۹۲۲ء کا سال تھا۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بدو فطرت سے

شعلہ مقال مقرر اور گلبار انشا نگار تھے۔ خلافت میں خوب حصہ لیتے رہے۔ اسی عہد میں وہ دیوبند کے مدرسہ عالیہ میں داخل ہوئے اس لئے آتے ہی چمک اٹھے۔ اور بڑے بڑے اساتذہ کے یہاں اپنا ربط ضبط قائم کرلیا۔ حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب اور مولانا عثمانی کے یہاں کافی آمد و رفت تھی۔ یہ دونوں حضرات بھی شفقت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ بہر حال مولانا سیوہاروی نے جمعیت الطلبہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ چند اور طلبہ بھی ان کے ساتھ ہوگئے جن میں سے غالباً مفتی عتیق الرحمٰن صاحب، مولانا محمد یحییٰ تھانوی، مولوی انیس احمد صاحب کاندھلوی مرحوم برادر خورد مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی، مولوی عبدالبصیر صاحب سیوہاروی مرحوم۔ یہ چاروں پانچوں مقابلے میں بعض اوقات تقریریں کرتے اور حضرت مولانا عثمانی ان کے سرپرست اور جج بنتے۔ خوب یاد ہے کہ ایک دفعہ نودرہ میں سب کی تقریریں ہوئیں اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی تقریر کو مولانا عثمانی نے بہت پسند فرمایا۔ ایک دفعہ علامہ نے نودرے کی چھت پر ان حضرات کی انجمن میں فصاحت و بلاغت پر تقریر فرمائی۔ میں بھی اس میں شریک تھا۔ گرمیوں کا موسم تھا اور وہاں خوب ہوا کا لطف آتا تھا۔

خطابت جمعہ میرے عہد طالب علمی میں جمعہ کا خطبہ شہر کی عالیشان جامع مسجد میں مولانا عثمانی ہی دیتے تھے اور نماز بھی وہی پڑھاتے تھے۔ مہینے میں ایک دو دفعہ جامع مسجد میں آپ کی تقریر بھی ہوتی شہر والے اگرچہ مدرسہ والوں کے عموماً مخالف رہتے لیکن مولانا عثمانی سے محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔

⁂

جمعہ کے بعد مہتمم مولانا حبیب الرحمٰن، کی کوٹھی میں اجتماع اور علامہ عثمانی کی تقریر

جمعہ کی نماز کے بعد اکثر اساتذہ دارالعلوم مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی کوٹھی پر جو دفتر اہتمام تھی جمع ہوتے ان میں مولانا عثمانی ضرور ہوتے۔ علمی مسائل کا چرچا ہوتا آپ اپنا اظہار خیال کرتے اور نہایت دل فریب، دل پذیر اور اثر انگیز کلام کرتے۔ چائے کا دور چلتا اور یہ مجمع عصر تک جما رہتا۔ ہر جمعہ کو یہی صورت ہوتی تھی۔

شیخ الہند رح کے مکان پر ہر ہفتہ بعد نماز جمعہ درس قرآن

غالباً ۱۹۲۲ء میں آپ نے حضرت شیخ الہند کے دولت کدہ پر ہفتہ وار بعد نمازِ جمعہ درس قرآن کریم جاری کیا، مگر یہ زیادہ دیر جاری نہ رہا۔ لیکن جو کچھ آپ نے لیکچر دئے وہ آپ کی شانِ تفسیری کا بہترین نمونہ تھے۔

طلبہ کو مناظرے کی تربیت دیتے اور اہم مسائل پر تقریریں فرماتے۔ ایک دفعہ نودرہ کی درسگاہ میں "اعجازِ قرآنی" پر کئی لیکچر دئے۔ یہ تقریریں "اعجاز القرآن" کے نام سے رسالہ کی شکل میں چھپی ہوئی ہیں۔

قتلِ مرتد پر آپ نے ایک دن ایک رات میں ایک رسالہ لکھا جو "الشہاب" کے نام سے مشہور ہے۔ اور یہ رسالہ جلد چھپ کر تیار ہوا اور دو تین رسالوں کی طلائی جلدیں تیار کرا کے شاہ افغانستان امان اللہ خاں کے پاس روانہ کی گئیں۔

علامہ عثمانی سے ایک ہندو جوگی کا دارالعلوم میں مکالمہ

ایک دفعہ ایک جوگی لٹے بکھرے، ہاتھ میں چمٹا، سر برہنہ دارالعلوم میں آیا

اور یہاں آکر علامہ عثمانی سے تبادلۂ خیال کیا۔ جوگی تھا ہندو مذہب کا عالم۔ کتب خانے کے اس بالائی کمرے میں دونوں کی گفتگو ہوئی جو مطبخ کے قریب صحن کی طرف بھی کھلتا تھا۔ علامہ نے جوگی کو خاموش کر دیا۔

سفر موگا غالباً ۱۹۲۲ء یا ۱۹۲۳ء میں موگا تشریف لے گئے۔ وہاں کا ڈاکٹر متھرا داس آنکھیں بنانے میں بہت مشہور تھا۔ آپ کی اس نے بہت قدر کی اور آپ سے وہ بہت متاثر ہوا پھر آپ سے ملنے دیوبند بھی آیا۔ جب آپ موگے سے تشریف لائے تو طلبۂ دار العلوم آپ کو لینے کے لئے اسٹیشن پر پہنچے۔ بہت شاندار استقبال ہوا۔ میں بھی شریک استقبال تھا۔

سفر حجاز
اور
مؤتمر مکہ میں شرکت

سنہ ۱۳۴۴-۴۵ھ مطابق سنہ ۱۹۲۶ء

علامہ عثمانی کے پہلے سفر حج کا ذکر آچکا ہے۔ دوسری مرتبہ آپ میرے قیام دیوبند کے زمانے میں حجاز تشریف لے گئے۔

اس سفر کا پس منظر یہ ہے کہ جب جنگ عظیم میں شریف مکہ نے جو اس وقت ترکوں کی طرف سے والیٔ مکہ معظمہ تھا، ان سے غداری کی تو انگریزوں نے شریف حسین کو حجاز کی عنان حکومت دیدی۔ ترک تمام عرب سے بے دخل ہو چکے تھے۔ سرزمین حجاز پر بظاہر شریف حسین لیکن بباطن انگریزوں کا اقتدار تھا کہ قدرت نے نجد کے سلطان' ابن سعود کو کھڑا کیا اور وہ طوفان بنکر یلغار کرتا ہوا پہنچا اور اس نے حجاز پر اپنا تسلط جمالیا اور شریف مکہ کو اس کی غداری کا صلہ

مل گیا۔ ترکوں سے نمک حرامی جلد ہی رنگ لائی ؎

دیدی کہ خونِ ناحق پروانہ شمع را،

چندیں اماں نداد کہ شب را سحر کند

لیکن ابن سعود حنبلی مذہب تھے۔ عبدالوہاب نجدی کے ہم مشرب تھے کہ وہ بھی حنبلی تھا۔ انہوں نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی خدمت کا چارج لیتے ہی مآثر حجاز کو منہدم کرادیا۔ صحابہؓ کے تمام پختہ مزارات کو پیوست زمین کردیا، قبروں کا نام ونشان نہ چھوڑا۔ البتہ کچی قبریں نشانی کے طور پر رہنے دیں۔ ترکوں نے تقریباً تمام متبرک اور محترم (شخصیتوں کی) قبروں پر قبے بنوادئے تھے، اوران پران کے نام بھی کندہ کرادئے تھے لیکن سب کو صاف کرادیا گیا۔ جنگِ اُحد کے شہدار بالخصوص امیر حمزہؓ رضی اللہ عنہم کی قبریں ہموار حالت میں ہیں۔ جو میں نے اپنی آنکھوں سے ۱۹۶۵ء میں دیکھی ہیں۔ اب چاروں طرف صرف پتھروں کے ٹکڑے رکھے ہوئے ہیں۔ جنت البقیع میں بھی مزارات کا یہی حال ہے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ اسلام کے فرزند یہاں آکر قبروں کو سجدہ کرتے ہیں۔ لہٰذا ان مآثر ہی کو اڑادیا۔ ایسا کرنے سے دنیائے اسلام میں ہیجان پھیل گیا اور مشرق سے لیکر مغرب تک اضطراب اور جوش وغضب کی لہر دوڑ گئی۔ احتجاج کیا گیا۔ جس کے نتیجہ میں سلطان ابن سعود نے ممالک اسلامیہ سے تبادلۂ خیال کے لئے ایک مؤتمر (اجتماع) منعقد کی۔ جس میں ہندوستان، کابل، مصر، شام، حجاز، روس وغیرہ کے علمار کو دعوت دی گئی۔ ہندوستان سے بھی علمار بلائے گئے۔ چنانچہ جمعیت العلمائے ہند دہلی کی طرف سے علامہ

لہ غالباً محترم مصنف کو سہو ہوگیا ہے۔ مصلح موصوف محمد بن عبدالوہاب تھے۔ جو اگرچہ اصولی طور پر حنبلی تھے مگر انہوں نے ایک جدید مکتبۂ فکر کی بنیاد رکھی۔ نجیب

شبیر احمد عثمانی، مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی، مولانا عبد الحلیم صاحب صدیقی، اور خلافت کمیٹی کی طرف سے مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور مولانا سید سلیمان ندوی، شوال ۱۳۴۴ھ مطابق مئی ۱۹۲۶ء میں ہندوستان سے مکہ معظمہ روانہ ہوئے۔

علامہ کی ڈائری

اس سفر میں آپ کے پاس ایک چھوٹی سی ڈائری تھی یہ ڈائری مجھے کراچی میں آپ کے چھوٹے بھائی بابو فضل حق عثمانی سے ملی۔ اس میں علامہ نے اپنے حالات سفر و مؤتمر لکھے ہیں۔ راقم الحروف کے پاس اس کی بعینہٖ ولفظہٖ نقل موجود ہے۔

اس ڈائری کے پہلے صفحے پر علامہ نے ان کتابوں کی فہرست درج کی ہے جو اس سفر میں آپ اپنے ہمراہ لے گئے تھے۔ کتابیں حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ از مبیضہ فتح الملہم شرح مسلم از ابتدار تا آخر مابیض (یہ آپ کی فتح الملہم شرح مسلم کا مسودہ ہے جو آپ لکھ رہے تھے۔ غالباً اس سفر میں بعض علماء کو دکھانا اور سنانا ہوگا۔ یا سفر میں شرح لکھنا مقصود ہوگا۔ انوار)

۲۔ حمائل شریف مترجمہ شیخ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ (تلاوت کیلئے ہوگی۔ م)

۳۔ رسالہ اکفار الملحدین (مصنفہ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحبؒ)

۴۔ حجۃ اللہ البالغہ (حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ)

۵۔ العرف الشذی (تقریر مطبوعہ حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ)

۶۔ آثار السنن علامہ نیموی (بہار)

۷۔ مفتاح الصحیحین۔

۸۔ کلید خزائن قرآنی۔

۹۔ تبویب القرآن۔

۱۰۔ مفردات امام راغبؒ۔

۱۱۔ الھدیۃ السنیہ والتحفۃ الوہابیۃ النجدیہ۔

۱۲۔ البطار المنن۔

ڈائری کے دوسرے صفحے پر لکھا ہے "جیند کے مسلمانوں کے لئے دعا۔ مولوی محمد محسن صاحب" اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاست جیند جو پنجاب میں سکھوں کی ریاست ہے ان کے مسلمان ان دنوں مظلوم ہوں گے۔ اور مولوی محسن صاحب نے آپ سے مقامات مقدسہ میں دعا کے لئے عرض کیا ہوگا۔

حجاز کے لئے مئی ۱۹۲۷ء میں دیوبند سے دہلی

آپ مئی ۱۹۲۷ء کے پہلے ہفتے میں دیوبند سے دہلی برائے سفر حجاز روانہ ہوئے۔ جب آپ اس سفر کے لئے دیوبند سے روانہ ہوکر دہلی پہنچے تو پانچویں صفحہ پر ڈائری میں اس طرح حساب درج کیا ہے۔

شبیر احمد

ٹکٹ از دیوبند تا دہلی	عـہ/ ۹	(۱ - ۹ - ۰)
ٹانگہ وقلی وغیرہ متفرقات	۱۳/	
جوتا از دہلی	۱۱/ ہے	(3 - ۱۱ - ۰)
سلیپر	عـہ/ ۱۵	(۱ - 15 - ۰)
جائے نماز	عـہ/ ۶	(۱ - 6 - ۰) صـہ ۳

۱۲ مئی ۱۹۲۷ء کو بمبئی میں عظیم الشان جلسہ اور علامہ کی صدارت

ایک دو روز دہلی قیام فرماکر مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کے ہمراہ آپ ۸ یا ۹ مئی کو بمبئی روانہ ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ ۱۲ مئی کو علامہ کی زیر صدارت بمبئی میں ایک

عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا جس کا ذکر آپ نے اپنی ڈائری میں صفحہ سات پر حسب ذیل الفاظ میں فرمایا ہے:-

"۱۲ مئی کی شب میں بندہ کی صدارت میں بمبئی میں جلسہ ہوا۔ اجتماع بہت تھا اور جلسہ نہایت شاندار اور موثر رہا۔ اثنائے راہ میں گودھرہ، دوحد اور سورت سے بڑے جوش کے ساتھ لوگ خدا حافظ کہنے کو آئے"۔

اس عبارت سے علامہ کی اس عظمت کا پتہ چلتا ہے جو جلسہ کی صدارت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ نیز یہ بھی کہ بمبئی اور سورت کے لوگ آپ کو بکثرت الوداع کہنے کو آئے۔

حجاز کو روانگی اور ورود

بمبئی جو ان دنوں خلافت کا مرکز تھا وہاں سے مولانا شبیر احمد عثمانی، مفتی کفایت اللہ صاحبؒ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی ۱۲ مئی کے بعد مکہ معظمہ کو روانہ ہوئے غالباً یہ ذیقعدہ کا ابتدائی مہینہ ہوگا یا شوال کا آخری ہفتہ۔ بہرحال ان تاریخوں میں یہ وفد مکہ معظمہ پہنچ گیا۔

آغاز مؤتمر اور علامہؒ کی تقریریں از ۱۴ ذیقعدہ سنہ ۱۳۴۴ھ

یہ وفد مکہ معظمہ پہنچا اور ۱۴ ذیقعدہ سنہ ۱۳۴۴ھ مطابق مئی سنہ ۱۹۲۶ء سے مؤتمر کی کارروائی شروع ہوئی۔ جن مسائل پر آپ نے تقریریں فرمائیں اور جو وہاں کا مرکزِ خیال تھا وہ مآثر شریفہ، انہدام قبہ ہائے مزارات صحابہ وغیرہم، غلاف کعبہ، اخراج نصاریٰ از جزیرۃ العرب کے مسائل تھے۔ ہم نے ان مسائل سے متعلق علامہ کی تقریریں "تجلیات عثمانی" میں درج کی ہیں وہاں ملاحظہ فرمائی جائیں۔ اور اب ستمبر سنہ ۱۹۷۲ء میں علامہ عثمانی کے خطبات جو نظریۂ پاکستان سے متعلق ہیں ناچیز نے مرتب کئے ہیں جن میں علامہ کی مؤتمر مکہ کی

تقریریں لفظ بلفظ ہم نے درج کر دی ہیں اور جو چھپ کر مکمل ہو گئے ہیں۔
بہر حال اب مؤتمر کارروائی خود علامہ کی زبانی سنئے۔ ڈائری میں لکھتے ہیں:

امیر ابن سعود سے ملاقات اور علامہ کی پہلی تقریر

"۱۴ ر ذی القعدہ (۱۳۴۴ھ) کو سید رشید رضا مصری ہمارے یہاں بغرض ملاقات آئے۔ اور ساڑھے تین بجے عربی ٹائم سے دونوں وفدوں کو موٹروں پر سوار کر کے امیر ابن سعود کے پاس لے گئے۔ اور اس سے بیشتر امیر کی طرف سے پیغام آیا کہ آپ لوگ کس وقت ملاقات پسند کرتے ہیں۔ وہاں پہنچے (تو دیکھا کہ) دو رویہ سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ امیر کے نمائندوں نے دروازہ پر استقبال کیا۔ امیر ابن سعود نے سب سے کھڑے ہو کر مصافحہ کیا اور دعائیہ کلمات کہتے رہے۔ پھر رسمی الفاظ شکریہ وغیرہ کے کہے۔ پھر سید سلیمان ندوی نے تقریر کی جس میں زیادہ تر زور اس پر تھا کہ ہم عرب سے اثر اجانب واغیار کا ہٹانا چاہتے ہیں۔ درمیان میں شوکت علی محمد علی کی کچھ ترجمانی کرتے رہے جس میں جیل وغیرہ کا ذکر تھا۔ بعدہٗ مولوی عبدالحلیم صدیقی نے تقریر کی بعدہٗ بندہ نے ایک مبسوط تقریر کی۔ جس میں ان کے مکارم اخلاق اور اکرام ضیف کو بیان کر کے اپنی جماعت دیوبند اور اپنے مسلک کی تصریح کر کے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر زور دیا۔" (ڈائری ص ۱۱، ۱۲، ۱۳)

حق گوئی وبیباکی

مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ سب سے پہلی ملاقات میں آپ نے اپنے عقائد اور جماعت کے مسلک کا ذکر کرنا مناسب سمجھا۔ بعد ازاں تقریر کے آخر میں حق گوئی اور بے باکی اور اظہار خیال میں آزادی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"پس جبکہ آپ نے ہم کو شرف بخشا اور خود دعوت دی تو ضرور ہے کہ ہم صاف صاف مشورہ دیں۔ خیانت نہ کریں، ہم جھوٹ نہیں کہیں گے اور نہ اپنے بواطنِ امور کو پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں بلکہ صاف مشورہ دیں گے اگر آپ قبول کریں گے فبہا و نعمت، رد کر دیں گے تو ہم اپنے گھر واپس چلے جائیں گے۔ لیکن بحول اللہ و قوتہ اپنا فرض ادا کر کے جائیں گے۔" (ڈائری صفہ ۱۶)

موصوف کے ان جملوں میں علمائے حق کی سی بے باکی اور جرأت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ آپ تقریر کے بعد سلطان نے تقریر کی جس میں توحید پر زور اور شرک و بدعات کا رد تھا اور اس طرف اشارہ تھا کہ یہود و نصاریٰ کو اللہ تعالیٰ نے اس لئے کافر کہا ہے کہ وہ اپنے انبیاء کی قبروں کو پوجتے اور سجدے کرتے ہیں اور ان کو خدا کہتے ہیں لہذا وہ مسلمان جو قبروں کو سجدہ کرتے ہیں وہ بھی اسی ضمن میں شامل ہیں۔ اتنا لکھنے کے بعد علامہ لکھتے ہیں کہ اس پر بندہ نے پھر تقریر کی اور مسلمان قبر پرستوں اور یہود و نصاریٰ میں فرق بتایا جو تجلیات میں موجود ہے۔

علامہ کی اس تقریر سے سلطان ابن سعود پر بہت اچھا اثر ہوا اور انہوں آپ کی تقریر کو سراہا، حضرت عثمانی لکھتے ہیں:۔

"بعدہٗ امیر نے کہا میں آپ کا ممنون ہوں۔ آپ کے خیالات اور بیان میں بہت رفعت اور علوّ ہے اور دقیق مسائل پر مشتمل ہے۔"

یہ پہلی مجلس جب ختم ہو گئی تو سب باہر نکلے۔ علامہ لکھتے ہیں:۔

علامہ کا عتیقی کی طرف سے حق گوئی پر شکریہ اور سید سلیمان کی طرف سے تحسین

"اس گفتگو میں علاوہ وفدین (جمعیۃ العلماء و خلافت) کے عبدالعزیز عتیقی اور حافظ وہبہ وغیرہ بھی تھے۔ باہر نکل کر عتیقی نے میرا شکریہ ادا کیا۔ کہ آپ نے نہایت صراحت سے خیالات ظاہر کئے۔ سید سلیمان ندوی نے کہا کہ تو نے اپنا فرض بے خوف و خطر ادا کیا۔ والحمد للہ علیٰ ذالک حمداً کثیراً۔ سب مجمع کو خوشی ہوئی۔

اس ملاقات کی اجمالی کیفیت اُم القریٰ مورخہ ۱۶ ر ذوالقعدہ ۱۳۴۴ھ میں چھپی۔ ۱۶ ر ذوالقعدہ کو جو ہمارے رویت ہلال کے موافق ۱۵ ر تھی۔ شیخ عبدالعزیز عتیقی نے بیان کیا کہ جلالۃ الملک تقریروں سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ شبیر احمد عثمانی کی تقریر سے بہت محظوظ اور متاثر ہوئے اور اپنے بعض علماء اور اصحاب رائے و فکر سے بعض اجزائے تقریر نقل کئے۔"

(ص ۲۳ و ۲۵ تا ۲۷)

اس پہلی مجلس کے بعد کا حال علامہ اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں:۔

"۱۶ ر (ذوالقعدہ) کو مبادی مؤتمر طے کرنے کے لئے ایک لجنہ تحضیریہ قائم ہوئی۔ جمعیت کی طرف سے مولانا کفایت اللہ صاحب اس میں تشریف لے گئے اور خلافت کی طرف سے سید سلیمان۔ یہ جلسہ سید رشید رضا کی قیامگاہ پر ہوا۔ رشید رضا صاحب نے ایک یادداشت پیش کی کہ اس پر ابھی مباحثہ ہوگا۔

دو روز علماء کا اجتماع ہوا۔ پہلے دن سلطان بھی شریک رہے مگر مجلس میں بدمزگی ہوئی۔ دوسرے روز سب کاموں کا فیصلہ مؤتمر پر رکھا گیا۔"

(ص ۲۷ و ۲۸ و ۲۹)

اس دو دن کی کارروائی کے بعد علامہ آگے چل کر ایک اور میٹنگ کا ذکر کرتے ہیں، جس میں انہوں نے شرکت فرمائی ہے۔

سلطان اور مولانا کفایت اللہ صاحب کی تقریریں

۲۵۔ ذوالقعدہ کو دوپہر کے وقت سلطان نے جمعیت العلماء کا وفد بلایا۔ اول سلطان نے کچھ تقریر کی پھر مولانا کفایت اللہ صاحب نے مبسوط تقریر فرمائی۔ جس میں مآثر و مقابر کے متعلق تشدد ترک کرنے کے متعلق فرمایا۔ اس کے بعد بندہ نے کہا کہ میں تین روز سے محموم (بخار زدہ) اور وجعان (درد مند) تھا۔ مگر مسئلہ مہم ہے جس کی فخامتِ شان کی وجہ سے کچھ کہنا ضرور ہے۔

علامہ عثمانی کی شاہ کے سامنے ایک اور تقریر

پہلے ہم آپ کی عنایتوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں صمیم قلب سے اور اللہ دلوں کے حال کو جانتا ہے ہم متکلفین میں سے نہیں اور نہ میں مذاق سیاست اور رجال سیاست میں سے ہوں۔ میں ملوکیت اور جمہوریت کے قصہ سے تعرض نہیں کرنا چاہتا کہ دوسرے لوگ جو اس کے اہل ہیں وہ آپ سے اس میں کلام کریں گے۔ ہمارا مشغلہ تعلیم و تدریس ہے۔ ہم کو جن چیزوں سے تعلق ہے ان کو ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

ہندوستان میں ہمیں جو خبر پہنچی کہ آپ بلاد مقدسہ میں فاتحانہ داخل ہو گئے اور اسی کے ساتھ یہ بشارت بھی کہ شریف حسین کے ذمائم اور قبائح سے یہ سرزمین پاک ہو گئی جیسا کہ مجھ سے پہلے شیخ رئیس الوفد نے بیان کیا۔ ہم کو یہ بشارت بھی ملی کہ حجاز کے راستے مامون ہو گئے اور حجاج و زائرین کے لئے کوئی کھٹکا نہیں رہا تو ہم نے خدا کا شکر ادا کیا۔ مگر ہمارے نزدیک

سب سے عظیم بشارت جس نے ہمارے کانوں کو کھٹکھٹایا وہ یہ تھی کہ ایک بادشاہ خصوصاً ان بلاد مقدسہ میں جو مہد اسلام ہیں اور جن سے ہدایت کے چشمے پھوٹے ہیں یہ پکارتا ہے کہ ہمارا قانون صرف کتاب وسنت ہے وہ صرف اسی کی طرف دعوت دیتا ہے اور اسی کو ہر معاملے میں حکم ٹھہراتا ہے تو یہ آواز ہمارے نزدیک سب سے زیادہ عزیز اور محبوب اور اس زمانے میں سب سے زائد نادر آواز تھی۔ بسیط ارض پر آج کوئی ملک اور مسلمان بادشاہت نہیں جو یہ اعلان کرے کہ ہم یورپ اور انسانوں کے بنائے ہوئے اور تراشے ہوئے قوانین کی جگہ صرف کتاب وسنت کو دستور العمل بناتے ہیں۔ صرف آپ کی طرف سے ہم نے یہ آواز سُنی اس لئے آپ کے ساتھ کلام کرنا ہمیں سہل ہوا۔ جو شخص ہوا پر چلے اور ہوا پر بیٹھے اور ہوا پر کھڑا ہو اس سے کوئی معقول بات کہنا بیکار ہے لیکن ہمارے اور آپ کے درمیان اگر نزاع ہو تو خدا کے فضل سے ایک مسلّم حَکم موجود ہے اور وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلعم ہے۔" (صفحات ڈائری از ۳۰ تا ۳۷)

اس تقریر کے بعد علامہ نے قبر پرست، قبروں پر چراغاں کرنے والے مسلمانوں کے بدعتی ہونے لیکن کافر نہ ہونے پر مدلل بحث کی جو تجلیات عثمانی میں موجود ہے۔ البتہ مذکورہ بالا تقریر تجلیات میں موجود نہیں جو ہم نے یہاں نقل کی ہے۔ اس بیان میں موصوف نے نہایت بے باکی مگر قدر مرتبہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے اعلیٰ درجہ کی حق گوئی سے کام لیا ہے۔ نیز قانون اسلامی کے حجاز میں رواج دینے پر نہایت ہی مسرت کا اظہار کیا ہے۔

نجدی حنبلی ہیں

علامہ نے سلطان ابن سعود کے سامنے ان کے حنبلی ہونے پر جو روشنی ڈالی ہے وہ ان الفاظ سے واضح ہے نیز

ائمۂ اربعہ میں ایک دوسرے کے اجتہاد پر فتویٰ دینے اور بعض مسائل میں ایک دوسرے کے اجتہاد پر عمل کرنے کا حسب ذیل عبارت میں اظہار فرمایا ہے جس کا ہم نے تجلیات میں ذکر نہیں کیا۔ آپ نے سلطان سے فرمایا :-

علامہ عثمانی کا بیباکانہ اظہار خیال اپنی حنفیت اور شاہ کی حنبلیت پر تقریر

ہمارے یہاں یہ مشہور تھا کہ نجدی تقلید کے دشمن اور اس کو شرک سمجھتے ہیں اور ائمہ اربعہ کی کچھ پرواہ نہیں کرتے لیکن ہم نے الهدية السنية میں شیخ محمد بن عبدالوہاب کے بیٹے شیخ عبداللہ کی تحریر پڑھی جس میں لکھا ہے کہ ہم اجتہاد کا دعویٰ نہیں کرتے بلکہ فروع و احکام میں ہم امام احمد بن حنبلؒ کے متبع ہیں اِلّا یہ کہ کوئی نص جلی صریح غیر مخصص معارض یا قوی سند یا قابلِ تاویل آجائے تو ہم احمد بن حنبل کا مذہب چھوڑ کر ائمہ اربعہ میں سے کسی کا قول اختیار کرلیتے ہیں۔ بہرحال ائمہ اربعہ کے دائرے سے باہر نہیں جاتے حتیٰ کہ حافظ ابن تیمیہ اور ابن قیم کا قول طلاق ثلاث (تین طلاقوں) کے مسئلہ میں ہم نے اسی لئے چھوڑ دیا ہے کہ وہ ائمہ اربعہ سے علیحدہ تھا۔

اگر آپ ایسے حنبلی ہیں تو ہم ٹھیک ایسے ہی حنفی ہیں۔ اور یہ حنبلیت ایسی ہے کہ مسلمانوں کا سواد اعظم یعنی مقلدین ائمہ اربعہ کے نزدیک چنداں محلِ طعن نہیں ہوسکتا۔ اگر ہوگا تو اس شرذمہ قلیلہ (تھوڑی سی جماعت) کے نزدیک ہوگا جو اپنے آپ کو اہل حدیث کہتی ہے اور ہمارے یہاں اس کا نام غیر مقلدین کی جماعت ہے کیونکہ وہ اپنے کو ہر ایک امام کی تقلید سے علیحدہ کرلیتے ہیں بلکہ ان میں کے بعض تقلید ائمہ کو شرک۔

بتلاتے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ آپ یہ حنبلیت زیادہ نمایاں اور اس سے زائد مشتہر ہو جتنی کہ اب تک ہوئی ہے۔" (صفحات ڈائری از ۳۸ تا ۴۰)

اس عبارت میں حضرت عثمانی نے بڑی لطیف تبلیغ کی ہے یعنی عبدالوہاب نجدی[^1] کے بیٹے عبداللہ کی تحریر کو حجت بنا کر سلطان ابن سعود کے لئے حنبلی ہونے اور تقلید و پیروی کرنے کی طرف نفیس پیرائے میں اشارہ کیا ہے بلکہ یہ بھی فرما دیا ہے کہ آپ کو چاہئے کہ آپ اپنے مقلد ہونے کی شہرت دور دور تک پہنچائیں تاکہ لوگوں کی یہ غلط فہمی دور ہو جائے کہ آپ غیر مقلد یا اہل حدیث ہیں ؎

آئین جوانمرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

مذکورہ تقریر کے بعد موصوف نے قبروں کے گرا دینے اور مقامات مقدسہ کی زیارت کرنے، غلاف کعبہ اور تطہیر جزیرۃ العرب پر تقریریں فرمائیں، جو تجلیات میں درج ہیں۔

مجادلہ پر اظہار خیال

حضرت عثمانی نے ۳۰ ر ذو القعدہ کی ایک اور مجلس کا ذکر حسب ذیل الفاظ میں فرمایا جو علمی بھی اور اس کا بیان کرنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ کیونکہ آپ کی ہر بزم علم و فضل کی جیتی جاگتی تصویر ہوتی تھی۔ لکھتے ہیں:۔

قاضی القضاۃ بلیہد کی ایک مجلس میں علامہ کی علمی موشگافیاں

"۳۰ ر ذو القعدہ کو قاضی القضاۃ اور اشہر علمائے نجد عبداللہ بن بلیہد نے مدعو کیا۔ دونوں وفد گئے۔ وہاں فلسطینی وفد کے ارکان اور بعض دوسرے معززین بھی تھے۔ کوئی خاص

[^1]: یہ بھی ایک عجب ستم ظریفی ہے کہ یہ تحریک بانی کے باپ عبدالوہاب نجدی کے نام سے مشہور ہوئی حالانکہ حقیقۃً اس کے بانی عبدالوہاب نجدی کے بیٹے شیخ محمد (ابن عبدالوہاب) نجدی ہیں، عوام اصل بانی کے نام سے ہنوز ناواقف ہیں۔ اشفاق احمد

مسئلہ نہ تھا۔ مختلف مذاکرات ادبی و علمی رہے۔

مجادلہ کی مشروعیت (جواز) پر میں نے قَدْ جَادَلْتَنَا فَأَكْثَرْتَ جِدَالَنَا (اے نوح! تو نے ہم سے جدال کیا اور بہت کیا) پیش کیا۔ اور امام ابوالحسن اشعری کے استدلال کا حوالہ دیا اور کہا کہ کہیں اکثار مجادلہ (بکثرت مجادلہ) کی ضرورت ہوتی ہے۔ قوم نوح علیہ السلام نے کفر و ضلالت میں تمادی (تجاوز) کی اس لئے اکثار مجادلہ کی ضرورت ہوئی۔ چنانچہ دوسری جگہ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّنَهَارًا الیٰ آخر الآیات فرمایا۔ مجادلے کے معنیٰ کسی مسئلہ یا معاملہ میں زور اور جد کے ساتھ کلام کرنا ہے کما فی قولہ تعالیٰ یُجَادِلُنَا فِیْ قَوْمِ لُوْطٍ اِنَّ اِبْرَاهِیْمَ لَحَلِیْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِیْبٌ۔ یہاں مجادلہ کی ذم نہیں۔ نہ یہ مجادلہ فی آیات اللہ ہے۔ البتہ اس مجادلہ کے غیر مؤثر پر تنبیہ کر دی ہے۔ یَا اِبْرَاهِیْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا، اِنَّهٗ قَدْ جَاءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ" (ص ۵۳-۵۴)

موصوف نے ۱۴ ذوالقعدہ سے ۳۰ تک کے حالات یہاں تک ختم کر دئے بعد ازاں لکھتے ہیں:۔

"۴ ذوالحجہ سنہ ۱۳۲۴ھ کو لجنۃ الاقتراحات میں کسوۂ کعبہ (غلاف کعبہ) کا مسئلہ پیش ہوا کہ اس میں بہت اسراف ہوتا ہے۔ اس کے مصارف گھٹا کر دوسرے وجوہِ خیر میں صرف کئے جائیں۔ حریر اور ذہب (ریشم اور سونے) کا استعمال بالاتفاق حرام ہے۔ اس پر محمد علی صاحب (جوہر) اور عبداللہ شیبی نے سختی سے مخالفت کی" صفہ ۵۸-۵۹)

اس کے بعد علامہ نے غلاف کعبہ کا تاریخی پس منظر بیان کر کے اس کے جواز

پر زبردست تقریر کی جو " تجلّیات " اور " خطبات عثمانی " میں موجود ہے۔ اور جس میں عبداللہ شیبی اور مولانا محمد علی جوہر مرحوم کی تردید کی۔

اس کے بعد ۵ ر ذی الحجہ کی کارروائی کے متعلق حضرت عثمانی تحریر فرماتے ہوئے وضاحت کرتے ہیں :-

" ۵ ر ذوالحجہ کو لجنۃ الاقتراحات[1] میں بڑی ردّ وکد کے بعد جزیرۃ العرب کی تجویز پیش ہوئی اس کی مخالفت میں رئیس وفد رُوسیہ نے طویل تقریر کی .... اس پر میں نے (تطہیر کے متعلق) تقریر کی "

آپ نے رئیس وفد رُوس کی تردید کی اور ثابت کیا کہ کم از کم جزیرۃ العرب سے نصاریٰ کے اخراج کا اعلان کر دیں۔ بعد ازاں رفتہ رفتہ ان کو نکال باہر کریں۔ چنانچہ اس کی تائید کی گئی۔ موصوف لکھتے ہیں :-

" شیخ قاضی ابوالعزائم نے اس کی بہت داد دی "

جناب مولانا عثمانی نے جزیرۂ عرب سے انگریزوں کو نکالنے کے لئے جو مدلّل تقریر فرمائی وہ بھی راقم الحروف نے تجلّیات کے صفحہ ۳۸۰ پر بلفظہٖ درج کی ہے وہاں ملاحظہ فرمائی جائے۔

۵ ر ذوالحجہ کی کارروائی کے بعد جو تطہیر جزیرۃ العرب سے متعلق تھی علامہ کی ڈائری ختم ہوگئی اور اس کے بعد آپ نے کچھ تحریر نہیں فرمایا جس سے صاف واضح ہے کہ ۱۴ ر ذیقعدہ ۱۳۴۴ھ سے ۵ ر ذی الحجہ تک مؤتمر کے جلسے ہوتے رہے اور بعد ازاں حج کے موقع پر جو ۸ ر ذی الحجہ سے ۱۲ ر ذی الحجہ تک پانچ روز ہوتے ہیں جلسے ختم ہوگئے۔

---

[1] لجنۃ الاقتراحات : وہ مجلس جس میں ریزولیشن اور تجاویز زیر غور پر جرح و قدح ہوتی تھی۔ انوار

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم جو خود اس میں شریک تھے، لکھتے ہیں :۔

"مکہ میں مؤتمر کے جلسے ایک ماہ کے قریب ہوتے رہے۔ ان میں ہم لوگ شریک ہوتے رہے اور اکثر مولانا شبیر احمد صاحب بھی ہوتے تھے"

(معارف اپریل ۱۹۵۰ء صفحہ ۳۰۲)

جائزہ اب تک کی مولانا عثمانی کی ان تقریروں کا جو آپ نے مؤتمر مکہ میں کیں جائزہ لیا جائے اور محتاط تبصرہ کیا جائے تو یہ :

۱۔ آپ کی تقریروں نے ابن سعود کو سخت متاثر کیا اور قبر پرست مسلمانوں اور یہود و نصاریٰ میں سلطان نے جو امتیاز قائم نہ رکھا تھا اس کو صحیح راہ دکھائی جس سے سلطان اپنے موقف سے ہٹتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور مولانا عثمانی کے سامنے ہتھیار ڈالتے نظر آتے ہیں۔

۲۔ شیخ عبدالعزیز عتیقی اور حافظ وہبہ علامہ عثمانی کی تقریر پر داد دیتے نظر آتے ہیں۔ اور مولانا سید سلیمان ندوی بھی اس تحسین میں ہمنوا ہیں۔

۳۔ شیخ عبدالعزیز عتیقی کی روایت کے مطابق کہ انہوں نے کہا کہ سلطان مولانا عثمانی کی تقریروں سے بہت محظوظ ہوئے اور ان کی تقریروں کے نوٹ بھی لئے۔ عتیقی صاحب نے علامہ کی تقریر سن کر یہ کہا کہ اس قسم کے مضمون ہم نے پہلی مرتبہ سُنے ہیں۔

۴۔ نجد کے مشہور اور حجاز کے جید عالم ابن بلیہد بھی بغلیں جھانکتے نظر آتے ہیں اور علامہ عثمانی کے سامنے ان کی کوئی پیش نہ جا سکی۔

۵۔ ۳۰ ذوالقعدہ کو جو عبداللہ بن بلیہد کے یہاں دعوت میں مدعو کئے

علہ شیخ عبدالعزیز عتیقی اور حافظ وہبہ فاضل علمائے نجد میں سے تھے۔ جیسا کہ علامہ نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے۔ مصنف

گئے تو وہاں بھی آں موصوف مسئلہ مجادلہ پر روشنی ڈالتے نظر آتے ہیں جو نہایت ہی کامیاب بصیرت کے ساتھ پیش کی ہے۔

۶۔ ۴ ذی الحجہ کی میٹنگ میں غلاف کعبہ کی تائید میں شیخ عبداللہ شیبی کو اپنی مدلل تقریر سے پسپا کرتے نظر آتے ہیں اور ساتھ میں مولانا محمد علی جوہر کو بھی ساکت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

۷۔ جزیرۂ عرب سے انگریزوں کو نکالنے کے سلسلے میں روس کے علما کے رئیس الوفد سے بحث کرتے نظر آتے ہیں اور اپنی قوت استدلال کے سامنے ان کا سر جھکا دیتے ہیں۔ چنانچہ شیخ قاضی ابوالعزائم علامہ کی تائید میں پیش پیش نظر آتے ہیں اور ایک مصری عالم ذرا بحث کرتے نظر آتے ہیں تو ان کو دندان شکن جواب دے کر مبہوت بنا دیتے ہیں۔

یہ ہے وہ مختصر سا جائزہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ علمائے دنیائے اسلام پر آپ کی دھاگ بیٹھ چکی تھی۔ میرے دوست شیخ احمد عقاد مبخر روضۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم و مہمان نواز سلطان نے مجھے بتایا کہ جب علامہ عثمانی حرم میں جاتے تو عربوں کی انگلیاں ان کی طرف اٹھتیں اور وہ کہتے کہ ھٰذا عالمٌ ھندیٌ کبیر یعنی یہ تو ہندوستان کا زبردست عالم ہے۔ یہ زبردست اور وحید عالم ہونے کی روایت مجھ سے شیخ احمد عقاد نے بیان کی جو اس وقت علمائے مؤتمر کی مہمانی پر متعین تھے۔ انہی شیخ احمد عقاد نے مجھے بتایا کہ مولانا عثمانی کی حرم کعبہ میں بھی زبردست تقریر ہوئی۔

اس موقع پر چل کر ہم آپ کے سامنے مولانا عمر دراز بیگ صاحب مینیجنگ پروپرائٹر روزنامہ "جدت" مراد آباد کا بیان پیش کرتے ہیں جو انہوں نے مفتی کفایت اللہ کی وفات کے بعد اخبار الجمعیت دہلی کے المفتی نمبر میں دیا ہے

اور جو خود بھی اس مؤتمر کو آنکھوں سے دیکھتے رہے ہیں۔ لکھتے ہیں :۔

"قبوں کو چونکہ ابن سعود شاہ حجاز نے گروایا تھا اس پر جمعیت کے وفد نے اعتراض کیا تھا۔ ابن سعود نے کہا کہ ہمارے علماء سے اس پر بحث و مباحثہ کر لیجئے چنانچہ جمعیت کے وفد اور سعودی علماء کا ایک مشترکہ جلسہ ہوا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی و حضرت مفتی صاحب نے احادیث نبوی کی روشنی میں اپنے دلائل اور براہین سعودی علماء سے منوا لیئے"۔ (اخبار الجمعیت دہلی المفتی نمبر ۳۱ ۲۳ فروری ۱۹۵۳ء)

آخر میں ہم علامہ عثمانی کی ایک آخری تقریر پیش کرتے ہیں جو آپ نے مؤتمر کے آخری اجلاس میں مکہ معظمہ سے رخصت ہوتے وقت فرمائی تھی۔ اور جس کو زمیندار اخبار لاہور نے بعینہٖ اپنی اشاعت مورخہ ۱۷ صفر ۱۳۴۵ھ مطابق ۲۷ اگست ۱۹۲۶ء بروز جمعہ میں پہلے صفحہ پر نمایاں کر کے شائع کیا تھا۔ یہ اخبار اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔ اور ہم اسی کی قائم کردہ سرخیوں کے ساتھ یہ تقریر یہاں درج کرتے ہیں۔ یہ تقریر ہم نے خطبات عثمانی میں بھی درج کی ہے :۔

اعلائے کلمۃ الحق

مولانا شبیر احمد عثمانی کی درد اسلامی میں ڈوبی ہوئی تقریر

سلطان ابن سعود کے عدل اور دیانتداری کا اعتراف

مولانا شبیر احمد عثمانی نے مؤتمر مکہ کے آخری اجلاس میں حسب ذیل تقریر ارشاد فرمائی (اخبار زمیندار)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

حضرات! میرا عقیدہ ہے کہ آپ کی وہ تمام قراردادیں جو آپ نے موتمر میں منظور کی ہیں۔ اور وہ ساری گفت وشنید جو آپ کے مابین جاری رہی۔ اس وقت تک بے سود ہے کہ ارکان موتمر کے مابین اخوت اور دوستی کے رشتے استوار نہ ہو جائیں اور آپ کے توسط سے مسلمانانِ اکناف عالم اخوت و مودت کے ایک محکم رشتے میں مربوط نہ ہو جائیں اس لئے ہمیں نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی مدد کرنا لازمی ہے اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم میں سے ہر ایک فرد عامۃ المسلمین کے حالات کی نگرانی رکھے اور اپنے عزیز اوقات میں سے ایک حصہ اسلام کے مصالح عمومی پر غور وخوض کرنے اور مسلمانوں میں اتحاد اور اتفاق پیدا کرنے کے اسباب و وسائل تلاش کرنے کے لئے وقف کر دے میرے نزدیک اس مقصد کے حصول کے لئے سب سے بڑا ذریعہ اور سب سے بڑا وسیلہ وہ ہے جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے مکہ مکرمہ اور اس کے ماحول کی تطہیر سے ہمارے لئے مہیا کر دیا ہے۔ سرزمین مقدس باغیوں اور خائنوں کی خباثتوں سے پاک ہو گئی ہے اب مسلمان آزاد ہو گئے ہیں کہ اخوت اسلامیہ کی توثیق و تجدید شریعت محمدیہ کے احیاء اور کلمۃ اللہ کے اعلاء کے لئے بلا خوف وخطر بلاد مقدسہ میں جوق در جوق آئیں۔ اللہ سبحانہٗ کے علم وقضا میں اس عظیم وجلیل کا انصرام صاحب الجلالۃ عبد العزیز بن السعود نصرہ اللہ وایدہ بروح منہ کے ہاتھوں کا مرہون تھا! مرکزِ اسلام اور قبلہ مسلمین کو شریف حسین اور اس کے پٹھوؤں سے آزاد کرانے اور بلد الامین میں عالم اسلامی کے ایک ایسے آزادانہ اجتماع کا دروازہ کھولنے کی توفیق اللہ تعالیٰ نے انہیں کو عطا فرمائی! اور اب مسلمانانِ عالم خدا کے اس گھر میں بیٹھ کر اپنے مصالح و منافع کے لئے باہم مشورہ کر سکتے ہیں اور اللہ تعالےٰ

کے خوف کو دل میں جگہ دے کر ملامت کنندہ کی ملامت سے بے پرواہ ہو سکتے ہیں۔ یہ سب سے بڑا فضل اور سب سے بڑا کرم ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے سلطان عبدالعزیز کو سرفراز فرمایا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا وہ احسان ہے۔ جس سے اللہ تعالیٰ نے قرنہا قرن سے کسی فرد کو مشرف نہیں فرمایا۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ۔

حضرات! ہم نے مؤتمر کے سارے حالات مشاہدہ کیئے ان کے کیف و کم کا سارا منظر ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اجلاس پر کبھی انبساط کا نشاط افروز عالم طاری ہو جاتا تھا اور کبھی انقباض و کبیدگی چھا جاتی تھی! اور بعض اوقات ہم آپس میں ایسی باتیں کرنے لگتے تھے جن سے دلوں میں کدورت پیدا ہو جانے کا اندیشہ لاحق ہو جاتا تھا! بلکہ اگر کسی بھائی کو مجالس کے امور کا تجربہ ہو تو بعید نہیں کہ وہ بعض باتوں کو اپنی توہین و تذلیل پر محمول کرلے لیکن ہمیں مسلمانوں سے حسنِ ظن رکھنے کا حکم ہے۔

جب موسیٰ علیہ السلام غصے اور افسوس سے بھرے اپنی قوم کی طرف واپس آئے تو تورات کی الواح کو زمین پر دے پٹکا اور اپنے بھائی کو داڑھی اور سر سے پکڑ کر گھسیٹنے لگے۔ ہارون علیہ السلام نے یہ معذرت پیش کی کہ اے میرے ماں جائے مجھے داڑھی اور سر سے پکڑ کر نہ کھینچ۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں تم یہ نہ کہنے لگو کہ تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا۔ پس اگر ہم میں سے کسی نے مؤتمر میں اپنے بھائی کی ڈاڑھی پکڑ کر کھینچی ہے تو غصہ کے فرو ہو جانے کے بعد لازم ہے کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے نقش قدم پر چلتے ہوئے یہ کہے رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِأَخِي وَأَدْخِلْنَا فِي رَحْمَتِكَ وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ (اے پروردگار مجھے اور میرے بھائی کو بخش

دے۔ ہم پر اپنی رحمت نازل فرما۔ تو سب سے زیادہ رحمت کرنے والا ہے) مومنین قانتین کی یہی شان ہے وہ لوگ جن کے سینوں میں دولتِ اخلاص مضمر ہے اور وہ لوگ جن کی غرض و غایت اصلاح ہے ان کا یہی شیوہ ہے مندوبین عالم اسلام کا یہی اجتماع جس طریق پر وقوع پذیر ہوا اس کی نظیر زمانۂ سابقہ میں مفقود ہے۔ پس ہم پر لازم ہے۔ کہ اس شہر کے پروردگار کا جس نے ہمیں خوف سے مامون اور ظاہری و باطنی نعموں سے مالا مال کیا اس عظیم الشان احسان پر سجدۂ شکر بجا لائیں۔ اس کے بعد ہم پر جلالۃ السلطان عبدالعزیز کا شکریہ ادا کرنا بھی لازم ہے۔ جن کے ہاتھ سے اللہ تعالیٰ نے یہ جلیل القدر کام سرانجام دلایا۔ بلاد مقدسہ کے خادم کی حیثیت سے ان کو خاص عزت و عظمت حاصل ہے۔ اور خصوصاً جب کہ عظمۃ السلطان عدل، دیانتداری، وسعتِ قلب اور حسنِ اخلاق کی گوناں گوں صفات سے متصف ہیں کتاب اللہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسوۂ خلفائے راشدین و سلف صالحین و ائمہ متبوعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے متبع ہیں مزید برآں اللہ تعالیٰ نے ظالموں سرکشوں اور قطاع الطریق کے دلوں میں ان کا رعب ڈال دیا ہے۔ حج و زیارت کے راستے بالکل مامون ہو گئے ہیں جن لوگوں نے مکہ و مدینہ کے مابین سفر کیا کیا ہے ان سے بالتواتر اسی شہادت کی تائید و تصدیق ہوتی ہے شہادت دینے والے مختلف جماعتوں اور فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ایک حقیقت میں وہ سب متفق اللسان ہیں کہ راستے بالکل مامون ہیں!

جس طرح حجاز کی حکومت کو عالم اسلامی پر سیادت و قیادت میں برتری حاصل ہے اسی طرح اس پر ذمہ داریاں بھی اسی نسبت سے زیادہ اور

وسیع ہیں حکومت حجاز ان اسلامی قوی کے لئے جو مؤتمر میں مدعو کی گئی ہیں، وسیلۂ ربط ہے۔ اور امیر حجاز مؤتمر کی روحِ رواں ہے اگر اس میں فساد پیدا ہو گیا تو ساری مؤتمر پر فساد طاری ہو جائے گا۔

حضرات! مؤتمر حجاز کی کامیابی زیادہ تر حجاز کی مقامی حکومت کی استقامت اس کی توجہ اور اس کے اس احساس پر منحصر ہے کہ وہ صرف نجد کی نہیں بلکہ سارے مسلمانوں کی حکومت ہے۔ اور مسلمانانِ عالم اور حکومتِ حجاز دونوں پر ایک دوسرے کے حقوق ہیں حکومت حجاز کو ان حقوق کے ادا کرنے میں خوف خدا، دیانتداری، صبر بالحق، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ضرورت ہے ان فرائض کی بجا آوری میں حکمت، تسہیل، فراخدلی، فیاضی اور تدریج کی ضرورت ہے۔ تاکہ کسی بُری بات کے ازالہ کرنے سے کوئی بات پیدا نہ ہو جائے جو اس سے بھی زیادہ بُری، زیادہ ضرر رساں اور زیادہ پریشان کن ہو ہم ان بدعات و منکرات کے ازالہ کو جو اسلامی ممالک اور ان بلادِ مطہرہ میں پھیل چکی ہیں بُرا نہیں سمجھتے۔ بلکہ ہماری مراد یہ ہے کہ اہم تر مقصد کو مقدم رکھا جائے! جب دو آفتیں پیش نظر ہوں اور ان میں سے ایک کو اختیار کرنا، بمقتضائے حالات لابدی ہو! تو ان دو مصیبتوں میں سے اس مصیبت کو بدرجۂ مجبوری اختیار کر لینا چاہیئے! جو مقابلتاً ہلکی ہو۔ اور مصائب و آفات سے نجات حاصل کرنے میں حکمت و آہستگی کا شیوہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اور غلوّ و تعمق سے بچنا چاہیئے!

کیونکہ تعمق فی الدین ہی پہلے لوگوں کے لئے باعث ہلاکت بنا ہے۔ کسی چیز پر شرک بدعت یا گمراہی کا حکم لگانے میں جلدی نہیں کرنی چاہیئے!

مفاسد کا موازنہ شریعت مصالحہ عامہ کے نقطۂ نظر سے کرنا چاہیئے!!

حضرات! آپ میری تقریر کا مقصد جانتے ہیں۔ یہ تفصیل کا موقعہ نہیں ہے! عظمۃ السلطان نے ہماری باتوں کو شرف سماعت بخشا اور ہماری تصریحات کو پسند کیا۔ اور اس بات کی طرف اشارہ کیا۔ کہ ہم علماء نجد وغیرہ کے ساتھ بحث و مذاکرہ کریں۔ ہم نے اکثر علماء کے ساتھ گفتگو کی۔... جس قدر مبادلۂ خیالات ہوا ہے، امید ہے کہ وہ ضرور بارآور ہوگا! اور مسلمانوں میں اعتدال پیدا ہو جائے گا! مؤتمر کو چاہیئے کہ یک زبان ہو کر حکومت حجاز کو اس بنیادی اصول کا احساس کرائے! اجماعت کی آواز میں جو تاثیر ہوتی ہے وہ افراد میں نہیں ہوتی۔ فَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ"

مولانا عثمانی کی مذکورہ بالا تقریر زمیندار میں اس وقت شائع ہوئی ہر جب آپ دیوبند تشریف لا چکے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر اور دیگر حضرات بھی ہندوستان پہنچ چکے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر سلطان ابن سعود کے مخالفین میں سے تھے۔ چنانچہ آپ نے سلطان ابن سعود کی مخالفت میں اپنے اخبار ہمدرد میں آتے ہی ایک دو آرٹیکل لکھے۔ مولانا ظفر علی خان مالک وایڈیٹر اخبار زمیندار لاہور سلطان ابن سعود کی موافقت میں تھے اور انہوں نے مولانا محمد علی جوہر کی تردید کی اور علامہ شبیر احمد عثمانی کی آخری تقریر زمیندار میں شائع کی۔ اسی ۲۷ راگست ۱۹۲۷ء کے پرچے میں مولانا محمد علی جوہر کی تردید میں تین کالم کا تردیدی مضمون لکھا ہے جس میں ان کے ان اعتراضات کا جواب دیا ہے جو ان کے الفاظ سے مترشح ہوتے تھے اور جن کو ہندوستان کے مسلم اخبارات نے اچھالنا شروع کر دیا تھا۔

خواجہ حسن نظامی بھی شروع شروع میں سلطان ابن سعود کے مخالف تھے لیکن بعد میں وہ پھر پینترا بدل کر ان کے حق میں ہو گئے تھے۔ اسی اخبار کے افکار وحوادث میں مولانا ظفر علی خاں نے مولانا جوہر مرحوم کے کراچی میں خالق دینا ہال کے لیکچر پر زبردست پھبتی کسی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"مولانا محمد علی جوہر جو اپنی پلکوں کی زبانی اپنے دل اور جگر کے گداز کی کہانی سنانے کے لئے ہمیشہ مضطرب رہتے ہیں کراچی کے خالق دینا ہال میں روئے اور پھوٹ پھوٹ کر روئے .... حضرت مولانا نے اپنے سسکی وعظ میں نجد کے اخوان الشیاطین پر برستے ہوئے یہ کمال تو دکھایا ہی تھا کہ دیکھتے دیکھتے ہر طرف آنسوؤں کا ایک دریا بہنے لگا جس کی منجدھار میں سلطان ابن سعود کی ملوکیت کی کشتی ڈبکوں ڈبکوں کر رہی تھی ...... حضرت خواجہ حسن نظامی بہت بڑے نباض واقع ہوئے ہیں ..... ایک وقت تھا کہ خواجہ صاحب نے سلطان ابن سعود کو "مہدی" کے خطاب سے یاد کیا تھا لیکن عرب کے اس مہدی کی قبہ شکنی سے ناراض ہو کر آپ تھوڑی دیر کے بعد ہی اس کو فرعون کہنے لگے۔"

غرض یہ ہے کہ ہندوستان کا بریلوی طبقہ تو سلطان کا سخت مخالف تھا اور ابھی تک مخالف ہے اور ایک طبقہ ان کے قطعاً موافق تھا اور اب بھی ہے وہ اہل حدیث کا طبقہ ہے لیکن مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے علمائے دیوبند کی ترجمانی میں اعتدال کو اختیار کیا ہے۔ انہوں نے حجاز کے راستوں کے مامون ہو جانے، شریعت اسلامی کے قوانین کو رائج کرنے کے سلسلے میں سلطان کی تعریف کی ہے، اور یہ بھی کہ سرزمین حجاز میں شرک کا استیصال سلطان کا بہترین کارنامہ ہے لیکن

ساتھ ہی قبوں کے گرا دینے کو اچھا ظاہر نہیں کیا بلکہ سلطان ابن سعود کے سامنے برملا اس فعل کو مستحسن قرار نہیں دیا اور نہ ہی قبروں پر عرس، چراغاں کرنیوالے مسلمانوں کے متعلق کفر کے فتوے کی موافقت کی بلکہ فرمایا کہ اس قسم کے لوگوں کو ہم مبتدع کہہ سکتے ہیں لیکن کافر نہیں کہہ سکتے یا ان کے اموال و دماء کو مباح نہیں کہہ سکتے۔ البتہ ان کا یہ فعل قابل تعزیر ضرور ہے۔ بہر حال علامہ کا رویہ ان سب میں معتدل، حکیمانہ، متین اور عالمانہ رہا۔

ابن سعود مرحوم کے عہد حکومت میں ہندوستان سے جو بعض حجاج گئے اور واپس آئے تو ان کے بریلوی خیالات کے رشتہ داروں میں عجب کشمکش پیدا ہوئی زمیندار کی مذکورہ اشاعت کے پرچے میں ایک خبر یہ بھی ہے:۔

مولوی دیدار علی کی سنگدلانہ فتوے بازی "کوچہ چراغگراں میں ایک حاجی مسمیٰ شیخ محمد طفیل صاحب نے حج سے واپس آکر فریضۂ حج کی ادائیگی کی خوشی میں برادری کو دعوت طعام دی۔ اس کی برادری کے چند آدمی جو مولوی دیدار علی صاحب کے مریدان باصفا میں تھے اس کے پاس آکر کہا کہ تم نے حج کیا ہے۔ اس نے کہا ہاں۔ پھر انہوں نے کہا کیا تم نے نجدیوں کے ساتھ نماز پڑھی؟ اس نے کہاں ہاں۔ انہوں نے کہا کیا تم نجدی ہو؟ اس نے کہا کہ کیا آپ میرے عقیدے سے اچھی طرح واقف ہیں۔ انہوں نے کہا نہیں تم وہابی ہو۔ تمہارے گھر کا کھانا ہم پر حرام ہے۔ چنانچہ مولوی دیدار علی کے تقریری فتوے پر اس شخص کی برادری کا اس سے انقطاع کرا دیا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ حاجی بے چارہ برادری سے انقطاع ہونے پر سخت غمزدہ اور صاحب فراش ہے۔"

یہاں پہنچکر ہم اب پھر علامہ کی مؤتمر کی آخری تقریر کا جائزہ لیتے ہیں۔ درمیان میں اس وقت کی ہندوستانی سیاسیات اور ماحول کا ہم نے معلومات اور واقفیت عامہ کے لئے تذکرہ کردیا ہے۔ اب جائزے کی طرف آئے ہیں۔

تقریر کا جائزہ

علامہ کی آخری تقریر جو آپ نے مؤتمر میں فرمائی۔ راقم الحروف کے نزدیک مؤتمر کی روح تھی۔ کیونکہ اس اسلامی اجتماع کا مقصد صرف

نشستند و گفتند و برخاستند

ہی نہیں ہونا چاہیئے تھا بلکہ دنیائے اسلام میں اتحاد، یگانگت اور آئندہ کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ اخوت کی جڑوں کو مضبوط کرنا تھا۔ چنانچہ آپ نے صرف انہی چند مسائل پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ موتمر کو آئندہ کے لئے امت مسلمہ کی خاطر ایک پروگرام دیا ہے جس کی تعلیم حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے دی تھی۔ اور وہ ہے آئندہ کے لئے مسلمانوں کا ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ اور درد و غم میں شریک ہونا اور اسی جذبے سے سرشار ہمیشہ آپ کا دل رہا چنانچہ موتمر اسلامی کراچی میں بھی آپ نے یہی کوشش فرمائی۔

موتمر مکہ کی یہ کارروائیاں ہندوستان کے اخباروں میں چھپتی رہیں اور آپ کی ہندوستان میں دھوم مچ گئی۔ زمیندار اخبار نے تو خاص طور پر علامہ کی تقریروں اور تجویزوں کو پُرزور سرخیوں کے ساتھ شائع کیا۔ بہر حال موتمر ختم ہوئی۔ لیکن دنیائے اسلام کے جلیل القدر علماء پر حضرت مولانا کی دھاک بیٹھ گئی۔

مدینہ منوّرہ

ڈائری میں کہیں مدینہ منورہ کے سفر کا ذکر نہیں لیکن آپ اس سفر میں مدینہ منورہ تشریف لے گئے تھے۔ کیونکہ ڈائری میں یہ موجود ہے

کہ وہاں مولانا حسین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بھائی کے بچوں کو جو مدرسۃ العلوم الشرعیہ کے مہتمم ہیں مٹھائی وغیرہ دی ہے اور کچھ نقد بھی۔ تاہم میرے ذاتی علم میں یہ بات ہے کہ آپ حج اور موتمر سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔

علامہ کی حجاز سے ہند کو روانگی اور علماء کا روانگی و داع کہنا

جب موصوف حجاز سے واپس ہوئے تو جدے کی بندرگاہ پر حجازی اور دیگر ممالک کے علماء اور معززین نے آپ کو اور اہل وفد کو الوداع کہا۔ علامہ اپنی ڈائری میں تودیع کے متعلق کچھ اشارے لکھے ہیں مثلاً جدہ کا منظر، مصریوں اور دیگر حضرات کا الوداع کہنا۔ جہاز پر دعوت دینا ہر طبقہ کے ممتاز اشخاص اور علماء کا موجود ہونا۔ کامراں کا جلسہ۔ یہ اشارے ہیں جن سے آپ کے وداعیہ وقت کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔

واپسی پر جو سامان ہمراہ تھا

حجاز سے جو تبرکات آپ نے اپنے ہمراہ لئے اور جو سامان سفر میں جدے سے ساتھ تھا ڈائری میں اس کی فہرست لکھی ہے جو حسب ذیل ہے:-

بکس کلاں[1]، بکس خورد[2]، بکس تبرکات[3]، پیٹی زمزم[4]، پیٹی کھجور[5]، زنبیل[6] ہندی، بستر[7]، توشہ دان[8]، لوٹا گلاس[9] چھتری[10]، تکیہ[11] مولوی عرفان صاحب کے پاس بستر میں ہے اور روغن[12] بلسان مفتی (کفایت اللہ) صاحب کی شرکت میں ہے۔ ٹین[13] حلوے کا۔ (ڈائری صفحہ ۶)

علاوہ ازیں وہ کتابیں بھی ہمراہ تھیں جو ساتھ لے گئے تھے۔ غالباً وہ بکس کلاں میں تھیں۔ اسی ڈائری میں سفیر بالشویک سے ملاقات کا جملہ بھی درج ہے۔

مراجعت ہند

حضرت عثمانی مئی میں روانہ ہوئے تھے اور اگست ۱۹۲۶ء مطابق صفر ۱۳۴۵ھ میں ہندوستان واپس تشریف لائے۔

اخبار زمیندار مؤرخہ ۲۷ر اگست ۱۹۲۶ء مطابق ۱۷ر صفر ۱۳۴۵ھ جمعہ کی اشاعت میں حسب ذیل خبر آپ کی آمد سے متعلق شائع ہوئی :

"حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رکن وفد جمعیۃ العلماء جو ابھی ابھی سفر حجاز سے تشریف لائے ہیں دیوبند پہنچ گئے ہیں۔ اطلاع موصول ہوتی ہے کہ نصیبِ اعداء آپ کی طبیعت کچھ ناساز ہو گئی ہے۔ دُعا ہے کہ شافی مطلق انہیں صحت عاجلہ عطا فرمائے۔"

اس خبر سے صاف ظاہر ہے کہ آپ ۲۷ر اگست سے کچھ دن پہلے دیوبند پہنچے ہیں۔ اور گذشتہ سطور میں بمبئی کے جلسے کی صدارت میں آپ کو یہ معلوم ہو ہی چکا ہے کہ آپ نے ۱۲ر مئی کی شب میں بمبئی کے ایک عظیم الشان جلسے کی صدارت کی تھی جب کہ آپ وہاں سے حجاز کو روانہ ہونے والے تھے گویا کہ آپ کے ساڑھے تین ماہ اس سفر میں صرف ہوئے۔

علامہ عثمانی کا دیوبند میں زبردست استقبال

جب علامہ دیوبند پہنچے تو اسٹیشن پر طلبہ، اساتذہ اور اہل شہر نے زبردست استقبال کیا۔ راقم الحروف نے وہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ تمام اسٹیشن کچھا کھچ بھرا ہوا تھا اور تل دھرنے کو بھی جگہ نہ تھی۔ دیوبند واپسی پر سب سے پہلا جمعہ آپ ہی نے جامع مسجد میں حسب عادت پڑھایا۔ خوب یاد ہے کہ جمعہ کے بعد جامع مسجد میں آپ کی تقریر ہوئی اور آپ نے وہاں کے حالات سنائے۔ ان میں سے ایک بات یہ یاد رہ گئی کہ "مولانا عبد الحلیم صدیقی" سے سلطان ابن سعود نے پوچھا" الیش عبادۃ یعنی العبادۃ ای شیٔ (عبادت کی کیا تعریف ہے) تو مولانا عبد الحلیم کا جواب شفا بخش نہ ہونے پر میں نے اپنی کرسی آگے بڑھا کر عبادت کی حقیقت پر روشنی ڈالی۔ حجاز سے واپسی پر آپ کے ارد گرد ہجوم رہتا۔ کیونکہ اس

مؤتمر کی کارروائیوں کے سننے کے لئے لوگ بیتاب تھے ۔ بہرحال علامہ کا یہ سفر نہایت مبارک اور نہایت کامیاب رہا ۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

شیر کوٹ میں آمد (دسمبر ۱۹۲۶ء) مؤتمر مکہ سے واپسی کے چند ماہ بعد علامہ راقم الحروف کے وطن شیر کوٹ ۔ ضلع بجنور (یو ۔ پی) میں اپنے دوست مولانا عماد الدین صاحب انصاری شیر کوٹی کی دختر فرخندہ اختر طیبہ کی شادی میں جو منشی نصیر الدین سے ہوئی تھی تشریف لے گئے۔ آپ کے ہمراہ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی اور مولانا عبد السمیع صاحب دیوبندی اساتذۂ دار العلوم بھی تھے ۔ میں بھی ہمسفر تھا شیر کوٹ کے لئے دھام پور کے اسٹیشن پر اترے وہاں سے شیر کوٹ تین میل تھا ۔ راستے میں کھودریا پڑتا تھا جو شیر کوٹ کے کنارے پر بہتا ہے ۔ وہاں آپ کے استقبال کے لئے اہل شیر کوٹ جمع تھے ۔ خوب یاد ہے کہ ان سب حضرات نے مغرب کی نماز کھودریا کے اُس پار پڑھی اور مجھے امام بنا دیا گیا ۔ میں اس زمانے میں جوانی میں تو قدم رکھ چکا تھا مگر ان کی امامت کے قابل نہ تھا ۔ بہرحال مولانا انصاری کے یہاں پہنچے ۔ شام کو نکاح ہوا ۔ یہ جمعرات کا دن تھا ۔ اگلے روز جمعہ تھا ۔ جمعہ کی نماز کے لئے جامع مسجد میں تشریف لے گئے ۔ بعد نماز جمعہ کے مسجد میں جلسہ ہوا ۔ جلسے سے پہلے آپ کے خیر مقدم میں دو قصیدے پڑھے گئے ۔ ایک تو بندہ نے عربی میں لکھا تھا جو خود پڑھا ۔ دوسرا قصیدہ استاذی مولانا عبد القیوم صاحب ارشق شیر کوٹی نے لکھا تھا وہ بھی راقم الحروف نے ہی پڑھا تھا ۔ اپنا قصیدہ تو یاد نہیں رہا اور ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں میری شاعری کی بیاض کے ساتھ کپور تھلہ میں ہی ضائع ہو گیا ۔ استاذی مولانا عبد القیوم

صاحب شیر کوٹ کے اردو فارسی کے قدیم ماہر اساتذہ میں سے ہیں۔ ان کا قصیدہ یہ ہے جو میں نے موصوف سے حیات عثمانی کے لئے حاصل کیا تھا۔ شاعر موصوف کی قائم کردہ سرخیوں کے ساتھ خیر مقدم پڑھئے جو حسب ذیل ہے :۔

خیر مقدم

بیعت الفاظ معانی بتقریب ورود میمنت آمود طبیب روحانی حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی

از خاکپائے اہل علوم احقر عبد القیوم ارشق شیر کوٹی

اللہ اللہ کیا نشاط افزا ہے عالم کی بہار ؎ بر رشک گلزار جناں ہے ہر خیابانِ چمن
قطرے قطرے سے ہر شبنم کے عیاں فیضانِ حق ؎ ذرہ ذرہ دشت کا ہے غیرتِ لعلِ یمن
ہر گلِ تر سے ہویدا ہر رنگ و بوئے روئے دوست ؎ جلوہ زارِ یار ہے ہر برگِ نسرین و سمن
قمریوں کا ورد ہے حق سرہ بالائے سرو ؎ بلبلِ دستاں سرا ہے شاخ گل پر نغمہ زن
نکہت ہر گل چمن میں صبحدم ہے عطر بیز ؎ ہر کلی کہتی ہے یہ، یوسف کا ہوں میں پیرہن
ہے نضارت گلشنِ عالم کی تیرے فیض سے ؎ ابرِ رحمت بن کے برسا فضل تیرا ذوالمنن
یوں تو فیضِ عام اک عالم پہ ہے چھایا ہوا ؎ آج فضلِ خاص اس قصبہ پہ ہے پرتو فگن
یعنی شادی کدخدائی میں نصیر الدین کی ؎ لائے ہیں تشریف حضرت افتخارِ دیوبن
آمد آمد کی خبر سنتے ہی سارا شیر کوٹ ؎ رشکِ جنت بن گیا، پہلے جو تھا بیت الحزن
آج بر آئی تمنائے دلی ہر ایک کی ؎ دل میں اک مدت سے تھا شوقِ زیارت موجزن
مولوی شبیر احمد لوذعی و یلمعی ؎ سب سے اعلیٰ سب سے افضل زبدۂ اہل زمن
قطب الاقطابِ زمانہ سالکِ راہِ ہدیٰ ؎ یادگارِ خاص شیخ الہند محمود الحسن
حامیِ دینِ متین و ماحیِ بدعات و کفر ؎ جو کہ ہے الحاد کا اور زندقہ کا بیخ کن

ایسا عالم، ایسا فاضل ایسا عابد با ورع — کوئی دیکھا ہو تو بتلائے ہمیں چرخِ کہن
وہ اکابر کا نمونہ وہ سلف کی یادگار — جس کی طبعِ نکتہ رس ہے واقفِ سرّ و علن
مدح حاضر میں کروں اب دل میں ہے تجھ سے خطاب — آبِ حیواں تو ہے اور سب قوم ہے تشنہ دہن
خیر مقدم کے لئے ہیں دیدہ و دل فرشِ راہ — تھے ترے مدت سے جویا سب مرے اہلِ وطن
وصف تیرے کر سکے یہ نطق کا یارا نہیں — مدح تیری کیا کرے میری زباں میرا دہن
تیرے احسانات ہیں جو قوم پر اے فخرِ قوم — صفحۂ دل پر ہمارے ثبت ہیں سب من و عن
سعی و کوشش تو نے جو کچھ موتمر مکہ میں کی — سب نے اخبارات میں اس کو پڑھا ہے مجملاً
مصلحانِ قوم ہیں جو آج کل مشہورِ خلق — تجھ سے استقلال و اطمینان کا سیکھیں چلن
تیرے استدلال کے آگے ہو سر بر کیا مجال — قائلِ تثلیث ہو یا ہو پرستارِ وثن
تو جو دکھلائے دمِ تقریر اعجازِ کلام — بت گریں سجدے میں اور ایمان لائے برہمن
مبداءِ فیاض سے کیا نطق ہے تجھ کو ملا — چٹکیاں لیتا ہے دل میں تیرا اندازِ سخن
حبذا اخلاق نکو قول مخالف سے کبھی — تیری پیشانیِ انور پر نہیں پڑتی شکن
مخلصانہ ہے دعا ارشق کی یہ شام و سحر — تیرے فیضِ عام سے ہوں مستفیض اہلِ وطن

اصدقا کو روز و شب ہوئے ترے عزت نصیب
اور واژوں بخت اعدا کے لئے دار و رسن

نذرِ بندۂ عاصی ارشق

٢٦ ٦ ١٩

جب راقم الحروف یہ خیر مقدم پڑھ رہا تھا تو جلسے پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جامع مسجد میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ اس کے بعد علامہ نے تقریر فرمائی اور مردہ دلوں کی کھیتیوں کو سرسبز و شاداب کر دیا۔

غریب خانے پر چائے پارٹی

جمعہ کی تقریر کے بعد میرے غریب خانہ پر چائے کی دعوت تھی جس پر میں نے موصوف کو مدعو کیا تھا اور بھی معززین شہر تھے خوب لطف مجلس رہا۔ بقول شاعر ؎

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

مولانا ارشق صاحب کے خیر مقدم میں دو تاریخی باتوں کا ثبوت ملتا ہے ایک تو یہ کہ مؤتمر مکہ میں آپ کی سرگرمیوں کا اخبار میں چھپنا دوسرے "بندۂ عاصی ارشق" کے نیچے سنہ ۱۹۲۶ء کا درج فرمانا۔ اس سے یہ صاف معلوم ہو گیا کہ علامہ کا شیرکوٹ کا سفر سنہ ۱۹۲۶ء میں مؤتمر مکہ کے بعد ہوا۔ اور چونکہ جاڑوں کا موسم تھا اور علامہ نے ایک گرم اونی چوغہ پہن رکھا تھا اور یہ دسمبر کی تعطیلات کے دن تھے کہ مولانا انصاری شیرکوٹی جو اس وقت اسلامیہ ہائی سکول جالندھر میں پڑھاتے تھے دسمبر کی تعطیل میں شیرکوٹ آئے تھے۔ لہذا یہ سفر آخری عشرۂ دسمبر سنہ ۱۹۲۶ء میں ہوا۔

تبلیغی کارنامے

بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ

دنیا میں جس قدر انبیاء تشریف لائے ان سب کا فریضہ وحیِ الٰہی اور احکامِ خداوندی کی تبلیغ تھا۔ سب سے آخری پیغمبر محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر دین مکمل ہوگیا جو قیامت تک جاری رہے گا۔ جب سورج دن کو روشن ہوتا ہے تو اور کسی روشنی کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن جب چھپ جاتا ہے تو سورج کی شفق روشنی کا کام دیتی ہے پھر تاریکی چھا جاتی ہے۔ پیغمبر اعظم نبوت کے نیّر اعظم کی روشنی کے سامنے کسی روشنی کی ضرورت نہیں جب وہ دنیا سے رخصت ہوگئے تو قرآن کی شفق قیامت تک کام کرے گی اور پھر قیامت آجائے گی اس لئے کسی نبی کے آنے کے لئے درمیان میں وقفہ نہیں ملتا۔ البتہ علماء امّت اسلامیہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب بن کر دینِ اسلام کی شمع روشن کرتے رہیں گے۔ یوں تو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ تبلیغ کا فریضہ انجام دے لیکن خاص طور پر علماء کا۔ اسی لئے علماء کے متعلق حدیث نبوی ہے:

علماءُ امتی کانبیاءِ بنی اسرائیل۔	"میری امّت کے علماء، انبیاء بنی اسرائیل کی مانند ہیں۔"

کون ایسا عالم ہے جس نے اپنے دور میں کسی نہ کسی شکل میں تبلیغ نہ کی ہو البتہ علماء میں بھی بعض خاص علماء ہوتے ہیں جن کی علمی لیاقت، فضیلت، منزلت اور عظمت کے باعث دین کو بڑی ترقی ہوئی اور ہوتی ہے اور ہوتی

رہے گی۔ انہی علماء دیدہ ور اور فضلاء دانشمند میں علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ وہ ایک ایسے جامع صفات عالم تھے جو علوم عقلیہ اور علوم شرعیہ میں بڑا اونچا مقام رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں اپنے زمانے کے شعلہ مقال مقرر اور عظیم المرتبہ انشا پرداز تھے۔

جمعیۃ الانصار کے جلسوں میں، دلی کی راج دہانی میں فتحپوری کی ملازمت کے دوران کی مجلسوں میں، خلافت اور جمعیۃ العلماء کے پلیٹ فارموں پر، عربی مدارس کی جلسہ گاہوں اور سیاسی مجالس میں وہ تمام ہندوستان میں اپنی جادو بیانی میں مشہور ہو چکے تھے۔ آپ جیسے مقرر ہندوستان میں چند ہی تھے اور یوں بولنے والے ہزاروں سہی۔

مقامات تقریر میں نے جہاں تک مطالعہ کیا ہے کونسا ایسا شہر ہے جہاں آپ کی تقریریں نہ ہوئی ہوں۔ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، کراچی، حیدر آباد سندھ، بہاولپور، ملتان، لاہور، جالندھر، فیروزپور، امرتسر، لدھیانہ، انبالہ، گوجرانوالہ، گجرات، راولپنڈی، شملہ، ایبٹ آباد، سہارنپور، مانسہرہ، میرٹھ، بجنور، شیرکوٹ، کھوٹا، دھام پور، دہلی، علیگڑھ، خورجہ، بلند شہر، مظفر نگر، نہٹور، مراد آباد، آگرہ، کانپور، لکھنؤ، گیا، دیوبند، بڈھانہ، رڑکی، بریلی، مدراس، بمبئی، کلکتہ، سورت، حیدر آباد دکن، ڈھاکہ، پشاور، کوہاٹ، بنوں، ہزارہ، گجرات کاٹھیاوار، غازی آباد، سنبھل، ہوشیارپور، سرگودھا وغیرہ وغیرہ۔ غرض یہ ہے کہ ہندوستان کے تمام شہروں اور بڑے بڑے قصبوں میں کوئی جگہ ہو گی جہاں آپ کی تقریریں نہ ہوئی ہوں۔ پھر ہر قسم کے مذہبی، سیاسی، ادبی، علمی تقریروں کے آپ کو بے شمار مواقع میسر آتے۔ خاص خاص ملکی انجمنوں کے ماتحت کتنے ہی مذہبی جلسوں میں تقریریں کیں۔ اسلام کی سربلندی اور غیر مسلموں

کی تردیدوں میں ملکی دورے کئے۔ ان میں سے بعض انجمنوں کے ماتحت اجلاسوں میں تقریروں کا ہم کچھ حال بیان کرتے ہیں :-

انجمن خدام الدین لاہور میں علامہ عثمانی کی تقریر

جب حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری نے انجمن خدام الدین کی لاہور میں بنیاد ڈالی تو بعض مخالفین نے ان کے خلاف زبردست پروپیگنڈہ کیا۔ مولانا احمد علی صاحب نے اپنے جلسوں میں حضرت مولانا سید محمد انور شاہؒ صاحب اور حضرت مولانا شبیر احمدؒ صاحب کو تقریروں کے لئے مدعو کیا۔ یہ حضرات تشریف لاتے رہے۔ پہلی دفعہ لاہور میں ایک اشتہار شائع کیا گیا کہ ان کے جلسے میں شرکت ناجائز ہے۔ اس کا اثر اُلٹا ہوا۔ اور اُس جلسے میں لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ علامہ اقبال، سر محمد شفیع، مولانا ظفر علی خاں، سر عبدالقادر اور بڑے بڑے اہل علم جلسے میں شریک ہوئے۔ علامہ شبیر احمد صاحب کی تقریر نے اہل لاہور پر جادو کا اثر کیا اور ان کو یہ کہتے بنی ؎

اثر لبھانے کا پیارے ترے بیان میں ہے
کسی کی آنکھ میں جادو تری زباں میں ہے

علامہ اقبال، سر محمد شفیع اسی مجلس سے علامہ عثمانی کے معتقد ہو کر اٹھے۔

اور پھر اسی قسم کی مجالس سے متاثر ہو کر سر محمد شفیع نے کہا تھا :-

"کاش میری ماں مجھے وہاں تعلیم دیتی جہاں مولانا شبیر احمد نے تعلیم پائی ہے"

مولانا ظفر علی خاں مرحوم زمیندار مورخہ ۱۶ ر دسمبر ۱۹۴۹ء میں مولانا عثمانی کی تقریر کے متعلق لکھتے ہیں :-

"جن لوگوں نے مرحوم کی تقریریں سُنی ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مولانا

کے ایک ایک لفظ میں علم وعرفان کا سمندر موجزن ہوتا تھا۔ اور ایک ایک بات میں دنیا بھر کے حقائق پوشیدہ ہوتے تھے"۔

حیدر آباد دکن میں علامہ عثمانی کی تقریریں

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی "معارف" کے پرچے میں جو اپریل ۱۹۵۰ء کی اشاعت ہے، لکھتے ہیں:۔

" ایک میلاد کی مجلس میں میرا ان کا ساتھ ہو گیا۔ اسی جلسے میں خود حضور نظام بھی آنے والے تھے۔ میری تقریر ہو رہی تھی کہ وہ آگئے۔ میرے بعد مولانا شبیر احمد صاحب نے تقریر شروع کی۔ حضور نظام نے بڑی داد دی اور اہل محفل محظوظ ہوئے۔ مولانا شبیر احمد صاحب بڑے خطیب و مقرر تھے۔ ان کی تقریروں میں کافی دلائل ہوتے تھے اور سیاسی و علمی اور تبلیغی اور واعظانہ ہر قسم کے بیان پر ان کو قدرت حاصل تھی۔ ذہانت و طباعی اور بدیہہ گوئی ان کی تقریروں سے کافی نمایاں ہوتی تھی"۔

علامہ عثمانی کی حق گویانہ، حیدر آباد میں تقریر

اسی معارف کے پرچے میں علامہ سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں:۔

" ایک وقت ایسا آیا کہ جب نظام (عثمان علی خاں) پر تفضیلیت کا غلبہ تھا اور اتفاق سے وہ مکہ مسجد میں نماز پڑھنے آتے تھے تو مرحوم (مولانا شبیر احمد صاحب) نے تقریر فرمائی جس میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل بہت دلنشیں طریقے سے بیان گئے تھے۔ اس دن لوگوں کو مرحوم کی تقریر سے بڑی خوشی ہوئی اور ان کے بے باکانہ اظہار حق کی سب نے تعریف کی"۔ (اسی تقریر میں علامہ عثمانی نے فرمایا تھا کہ " اگر آج حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیرہن کا ٹکڑا ابھی نظام صاحب کو مل جائے تو آپ اس کو اپنے تاج

میں لگانا باعث فخر تصور فرمائیں گے۔ اس پر نظام صاحب اپنی جگہ سے اچھل پڑے اور فرمانے لگے بے شک مولانا"

مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادی صدق اخبار میں لکھتے ہیں :۔

"اپنے وقت کے زبردست متکلم، نہایت خوش تقریر واعظ، محدث و مفسر سب کچھ ہی تھے" (دسمبر ۱۹۴۹ء اخبار صدق)

آزاد اخبار کے ایڈیٹر احمد سعید صاحب اختر لکھتے ہیں :۔

"حلقۂ علماء میں ایسا قادر الکلام مقرر اور ایسا بلیغ البیان خطیب شاید عرصے تک میسّر نہ ہو۔ جب آپ تقریر کے لئے کھڑے ہوتے تو یوں معلوم ہوتا کہ علم و کمال کا سمندر موجیں مار رہا ہے اور علم و عرفان کی سوتیں رہ رہ کر ابل رہی ہیں۔ وہ تقریر و تحریر میں اپنے وقت کے امام تھے"

(آزاد دسمبر ۲۳ ر ۱۹۴۹ء)

مدرسۃ البنات جالندھر میں علامہ عثمانی کی تقریر

مدرسۃ البنات جالندھر جس کے بانی اور مدیر مولانا عبدالحق عباس تھے اور اب یہ مدرسہ ایک عظیم الشان کالج کی شکل میں لاہور میں جاری ہے۔ اس کے ایک جلسے میں تقریر فرمائی اور لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں گرانقدر رائے کا اظہار فرمایا تقریر کیا تھی لڑکیوں کی تعلیم پر حکیمانہ اور محققانہ اظہار خیال تھا۔ پبلک بے حد خوش ہوئی اور اگرچہ بعض امور میں علامہ نے مخالفانہ انداز اختیار کیا لیکن خود بانی مدرسہ نے بھی بہت پسندیدگی کے ساتھ اس تقریر کو سراہا۔ میں خود اس تقریر میں موجود تھا۔ غالباً یہ ۱۹۳۳ء کا زمانہ تھا۔

مدرسہ خیر المدارس جالندھر و حال ملتان میں علامہ عثمانی کی تقریر

مدرسہ خیر المدارس جس کے بانی مولانا خیر محمد صاحب جالندھری

ہیں اور جواب ملتان میں اپنی روایتی شان سے جاری ہے اس کے بعض جلسوں میں سے ایک جلسے میں بمقام جالندھر غالباً ۱۹۳۶ء میں مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری، مولانا مدنی علیہم الرحمۃ نے شرکت فرمائی۔ ظہر کی نماز کے بعد ایک روز علامہ عثمانی نے "اَوْفُوْا بِالْعُقُوْد" پر تقریر فرمائی۔ لاؤڈ اسپیکر اس وقت نہ تھا۔ جلسہ اس وقت کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مخلوق ٹوٹ پڑی تھی۔ علامہ نے وہ دھواں دھار تقریر کی کہ لوگوں پر جادو کر دیا۔ میں خود اس تقریر میں موجود تھا۔

علامہ عثمانی کی ڈھاکے میں نواب سلیم اللہ خاں کے یہاں ایک حکیمانہ تقریر ۱۴ راپریل ۱۹۱۴ء

تجلیاتِ عثمانی میں ہم نے تاریخی حیثیت سے اس کا اظہار کیا ہے کہ دار العلوم دیوبند کا ایک وفد جن میں حضرت سید مولانا محمد انور شاہ، مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری وغیرہم تھے۔ ۴ راپریل ۱۹۱۴ء کو روانہ ہوا۔ ۶ر اپریل کو وفد کلکتہ پہنچا۔ چھ یوم قیام کے بعد ۱۱ راپریل ۱۹۱۴ء بروز ہفتہ کلکتے سے ڈھاکہ روانہ ہوا اور ۲۱ راپریل کو نواب سلیم اللہ صاحب کے پاس ڈھاکہ پہنچا۔ وہاں حضرت عثمانی نے لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ پر ایک زبردست تقریر فرمائی جس سے نواب صاحب اور سامعین پر بڑا گہرا اثر ہوا اور ان کے دلوں کی حالت ہی بدل گئی۔

علامہ عثمانی کی قادیانیوں کے خلاف مساعی ۱۳۴۳ھ مطابق ۱۹۲۵ء

دار العلوم دیوبند اور وہاں کے علماء نے مخالفینِ اسلام کا ہمیشہ مقابلہ کیا بانیٔ دار العلوم دیوبند کی تمام عمر اہلسنت والجماعۃ اور اسلام کی تائید اور قادیانیوں، آریوں، عیسائیوں، دہریوں سناتن دھرمیوں کی مخالفت میں گذری۔ دار العلوم دیوبند سے ایک وفد پنجاب

کے دورے کو نکلا تاکہ قادیانیت کے دجل و فریب کی دھجیاں اڑا دی جائیں۔ حضرت سید محمد انور شاہ اور مولانا عثمانی بھی اس وفد سے جا ملے۔ فیروزپور میں قادیانیوں سے مناظرے کی ٹھہری۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ حیاتِ انور کے مقالے میں لکھتے ہیں :-

" مناظرے کے بعد شہر (فیروزپور) میں ایک جلسۂ عام ہوا جس میں حضرت شاہ صاحب اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کی تقریریں فیروزپور کی تاریخ میں ایک یادگار خاص کی نوعیت رکھتی ہیں۔ بہت سے وہ لوگ جو قادیانی دجل کے شکار ہو چکے تھے اس مناظرے اور تقریروں کے بعد اسلام پر لوٹ آئے "۔ (حیات انور صـ ۳۶۱)

قادیانیت کے استیصال میں پنجاب اور سرحد کا دورہ ۱۳۴۳ھ، ۱۹۲۵ء

حضرت مفتی صاحب، حیاتِ انور کے اسی مضمون میں تحریر فرماتے ہیں کہ :-

" یہ علم کے پہاڑ (حضرت شاہ صاحب اور مولانا شبیر احمد صاحب، مولانا مرتضیٰ حسن صاحب وغیرہم) پنجاب کے ہر بڑے شہر میں پہنچے اور مرزائیت کے متعلق اعلانِ حق کیا۔ منکرین کو رفعِ شبہات کی دعوت دی۔ لدھیانہ، امرتسر، لاہور، گوجرانوالہ، گجرات، راولپنڈی، ایبٹ آباد، مانسہرہ، ہزارہ، گھوٹہ وغیرہ میں ان حضرات کی بصیرت افروز عالمانہ تقریریں ہوئیں "۔ (حیات انور صـ ۳۶۱)

انجمن ضیاء الاسلام کراچی کے ماتحت آریوں اور علامہ عثمانی کا مناظرہ ۱۳۲۹ھ

انجمن ضیاء الاسلام نے کراچی میں آریوں سے مناظرے کے لئے علامہ عثمانی کو بذریعہ

تار دعوت نامہ بھیجا ۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب القاسم میں لکھتے ہیں :۔

"۲۲ رمضان (۱۳۲۹ھ) کو (مولانا شبیر احمد عثمانی) کراچی روانہ ہوئے اور وہاں آپ کے نہایت مؤثر وعظ ہوئے اور مناظرہ بھی ہوا جن کا اہل کراچی پر گہرا اثر ہوا ۔ وہاں سے کامیاب لوٹے اور تار آیا کہ مولانا شبیر احمد صاحب نے نہایت کامیابی حاصل کی" (القاسم شوال ۱۳۲۹ھ)

الغرض علامہ جہاں جاتے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے فتح ونصرت کا پھریرا اڑاتے واپس آتے ۔

آگرہ کے نواح میں شدھی اور سنگھٹن کے مقابلے میں دار العلوم کی مبنیہ کامیابی

آگرے کے اطراف میں ملکانوں کی قوم رہتی تھی جو مسلمان تھے اور اب بھی ہیں ۔ خلافت کی تحریک اور ہندو مسلم اتحاد کے بعد آریوں نے مسلمانوں کو ہندو بنانا شروع کر دیا ۔ اس تحریک کے شعلے آگرہ اور اطرافِ آگرہ میں بھڑک اٹھے ۔ بہت سے مسلمان ہندو ہو گئے ۔ دراصل ان مسلمانوں کو صحیح معنیٰ میں اسلام کی تعلیمات نہیں پہنچی تھیں وہی ہندوانہ رسم ورواج ان کے اندر موجود تھے اور نام کے مسلمان تھے ۔ اگر آپ اس فتنۂ ارتداد کی پوری تفصیلات پڑھنا چاہتے ہیں تو دار العلوم کی ۱۳۴۱ھ کی رپورٹ پڑھئے ، اس میں آپ کو تمام تفصیلات ملیں گی ۔ حقیقت یہ ہے کہ دار العلوم جن مقاصد کے لئے جاری کیا گیا تھا اس کے طلبہ اور علماء نے شدھی اور سنگھٹن کی جڑیں اکھاڑ کر پھینک دیں اور جو لوگ مرتد ہو گئے تھے نہ صرف وہ حلقۂ اسلام میں دوبارہ داخل ہو گئے بلکہ بہت سے ہندو بھی مسلمان ہو گئے ۔

شدھی تحریک کا پس منظر

شدھی کا پس منظر دار العلوم دیوبند کی رپورٹ میں یہ ہے :۔

"اخبار کیسری لاہور نے اپنی ایک اشاعت میں آریہ سماج کو ساڑھے چار لاکھ ملکانہ نومسلم راجپوتوں کو شدھی کر لینے کی طرف توجہ دلائی تھی۔ یہ اس تحریک کی پہلی بنیاد تھی جس کو اخبار کیسری نے شروع کیا تھا۔"

(رپورٹ دارالعلوم دیوبند ۱۳۴۱ھ ص۵)

لیکن اس میں گورنمنٹ برطانیہ اور پنڈت شردھانند کو بھی اصل میں دخل تھا برطانیہ نے شردھانند کو کئی لاکھ روپیہ دیا اور ہندو مسلم اتحاد ختم کرنے کے لئے یہ چال چلی جو بڑی کامیاب رہی۔ دارالعلوم دیوبند اس فتنے کے استیصال کیلئے اٹھا اور پہلا وفد ۱۲ جمادی الثانیہ کو حالات کی تفتیش کے لئے روانہ ہوا۔ یہ وفد پہلے دہلی پہنچا اور مولانا عبدالحلیم صاحب نائب ناظم جمعیۃ العلمائے ہند دہلی سے مل کر حالات معلوم کئے۔ دہلی سے گوڑگانواں پہنچا۔ وہاں سے علیگڈھ گیا اور خلافت کمیٹی کے دفتر پہنچا سیکریٹری صاحب سے ملے۔ معلوم ہوا کہ فتنۂ ارتداد کی رپورٹ صحیح ہے۔

ملکانوں کو آریوں نے کس طرح بہکایا

دارالعلوم کی رپورٹ میں درج ہے کہ:۔

"آریوں کو جب معلوم ہوا کہ ملکانہ قوم مذہب سے ناآشنا ہے ..... اور بالکل بھولی بھالی ہے تو ان کو یہ کہکر بہکایا گیا کہ تم درحقیقت ہندو ہو تمہارے آباء و اجداد کو عالمگیر نے تلوار کے زور سے مسلمان بنالیا تھا .... ملکانہ قوم غریب ہے اس لئے .... ہندو مہاجنوں سے قرضہ معاف کرا دینے کا بھی وعدہ کیا گیا۔" (رپورٹ ص۶)

دارالعلوم سے پہلا وفد ۷ رجب ۱۳۴۱ھ کو روانہ کیا گیا۔ مولوی محمد شعیب ہزاروی کو معلوم ہوا کہ آریہ ملکانوں کو اچھیزہ میں شدھی کریں گے۔ مولوی محمد شعیب صاحب نے آریوں کو مقابلے کا چیلنج دیا لیکن وہ مناظرے سے بھاگ گئے۔ انہوں نے

وہاں تقریر کی۔ تقریر کے بعد دو ملکانوں کی چوٹی کاٹی گئی۔

پھر معلوم ہوا کہ اکترہ گاؤں پورا شدھی ہونے والا ہے۔ یہ وہاں پہنچے اور تبلیغ کی۔ آریہ بہت جمع تھے۔ لیکن اکترہ والے شدھ ہونے سے بچ گئے۔ مولوی شمس القمر مولوی محمد شعیب کے ہمراہ تھے۔

دوسرا وفد دارالعلوم دیوبند سے ۳۰ رجب کو روانہ ہوا۔ اس وفد کے امیر مولوی سرور حسین تھے۔ بھوگی پور پہنچے وہاں کے لوگوں نے ہندو ہونے سے منع کر دیا اور آریوں کو صاف جواب دے دیا۔

تیسرا وفد ۵ رشعبان ۱۳۴۱ھ کو اور چوتھا مولانا میرک شاہ صاحب کشمیری مدرس دارالعلوم دیوبند کی سرگردگی میں اکیس ارکان پر مشتمل ۱۷ رشعبان ۴۱ھ کو آگرے پہنچا وہاں انہوں نے تبلیغ کا دفتر قائم کیا۔ پانچواں وفد جو بیس مبلغین پر مشتمل تھا ۳ رمضان کو روانہ ہوا اور مختلف دیہات میں بھیج گیا۔ یہ سخت گرمی کا زمانہ تھا۔ ۲۲ رشوال کو ایک اور وفد روانہ کیا گیا جو پانچ افراد پر شامل تھا۔ ۲ رذیقعدہ کو ساتواں وفد بھیجا گیا۔ دارالعلوم کے طلبا نے جابجا مدارس قائم ہوئے۔ وہ مقامات جہاں مدارس قائم کئے یہ ہیں :۔

علاقہ بھرتپور میں	ڈیک، کہو، بیرکھیڑہ، کامہ، بلدیو ماس، (الور میں) تسئی، موضع سمرہ اعظم پہاڑی، گوبندگڑھ، بڑاد۔
تفصیل مدارس آگرہ	اکترہ کلاں، اکترہ خورد، گتھلا، بریرہ تحصیل کھیراگڑھ غیاث پورہ، دھتورہ۔
تفصیل مدارس ضلع مین پوری وایٹہ	امر سنگھ کا نگلا، جواہر پور، اتمرا، مقصود پور عرف آم کا نگلا، موضع فیروز پور سلونی، شہباز پور، دہروبی،

تلوک پورہ، امان پورہ، گھنو کا نگلہ، پیپرہ شکروالی، لوہاری، کوراولی، تلسی، دلیل نگر، کونڈر تھانہ ایکہ

(علیگڈھ میں)، موضع ٹھگوان ڈاکخانہ ڈیری فارم چیرت۔

دوبارہ قبولِ اسلام

بہت سے مواضع کو شدھی سے بچالیا گیا اور موضع برّاڑ علاقہ بھرت پور، ان دونوں کے بتیس خاندان مولوی فیاض سلہٹی مبلغ دارالعلوم دیوبند کی کوشش سے دوبارہ مسلمان ہوگئے۔ نگلہ امر سنگھ کے ۲۴ مسلمان ہندو ہوگئے تھے پھر دوبارہ مسلمان ہوگئے۔ اسی طرح چوتھا گاؤں موضع چھچھرواڑی کے ملکانے بھی دوبارہ مسلمان ہوگئے۔

ہندوؤں کا مسلمان ہونا

مرتدین کو دوبارہ مسلمان بنانے کے علاوہ ہندوؤں میں سے ۷۵، اشخاص مبلغین دارالعلوم کی کوششوں سے مشرف باسلام ہوئے۔

الغرض مولانا میرک شاہ صاحب، امیر وفد، مولانا محمد ابراہیم صاحب شیرکوٹی، مولوی مختار حسن صاحب شاہجہانپوری، مولوی محمد متین صاحب، مولوی عبدالمجید صاحب مظفر آبادی، مولوی سرور حسین صاحب، سید شمس الحسن صاحب مبلغین دارالعلوم اور طلبۂ دارالعلوم نے اسلام اور دارالعلوم دیوبند کا حق ادا کردیا۔ ان حضرات نے ۱۵۸ علاقوں میں دورے کئے اور لوگوں کو شدھ ہونے سے بچایا اور مساجد تعمیر کرائیں، مدارس جاری کئے۔

مذکورہ بالا مبلغین کے علاوہ دارالعلوم یا دارالعلوم کے ماتحت تبلیغ کرنے والوں کی تعداد ۷۷، آدمیوں کی تھی۔ جن میں مفتی عتیق الرحمٰن صاحب دیوبندی ناظم ندوۃ المصنفین دہلی، قاری محمد یامین صاحب مدرس دارالعلوم بھی تھے۔

مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کا دورہ اور ۲۷ مئی سنہ ۱۹۲۳ء کو آگرے میں زبردست تقریر

ہم نے اس تبلیغی مشن کی تمہید حضرت مولانا شبیر احمد صاحب کی خاطر اور دارالعلوم دیوبند

کی خدماتِ جلیلہ کی خاطر اٹھائی ہے۔ الغرض علمائے دیوبند میں مولانا سید مرتضیٰ احسن صاحب، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، مولانا سراج احمد صاحب اور مولانا عبدالسمیع صاحب رحم اللہ علیہم اجمعین نے بھی دورے کئے اور تقریریں کیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لکھتے ہیں:۔

"۲۷ مئی (۱۹۲۳ء) کو بمقام آگرہ ایک عظیم الشان جلسے میں مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کی زبردست تقریر ہوئی"۔ (رپورٹ ص۱۹)

علامہ شبیر احمد صاحب کی تقریر نے آگرے کے لوگوں کو بیدار کردیا اور اس کام کی اہمیت کو مسلمانوں نے سمجھا اور ایسے اٹھے کہ آریوں اور ہندوؤں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچالیا۔ معلوم ہے کہ یہ زمانہ مئی کی سخت گرمی کا مہینہ تھا۔ علامہ اس گرمی میں وہاں پہنچے۔ کراچی کے مناظرے کے وقت بھی رمضان المبارک کے ایام تھے جو یقیناً مشقت کے دن تھے۔

نومبر ۱۹۲۱ء، جمعیۃ العلماء لاہور کے جلسے میں علامہ عثمانی کی معرکۃ الآرا تقریریں

اخبار تسنیم، ۲۰ دسمبر ۱۹۴۹ء کی اشاعت میں مولانا نصر اللہ خاں عزیز لکھتے ہیں:۔

"(علامہ شبیر احمد عثمانی) ایک جادو بیان مقرر تھے۔ لاہور میں مولانا ابو الکلام آزاد کی صدارت میں جمعیۃ العلماء ہند کی کانفرنس ہوئی تھی اس میں مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کی تقریر نہایت معرکۃ الآرا تھی"۔ (یہ کانفرنس نومبر ۱۹۲۱ء میں ہوئی)۔

سلسلۂ ہائے تقاریر خورجہ، بلندشہر اور بڈھانہ میں

ہمارے پیش نظر اس وقت ایک کتاب " قاصمۃ الظہر فی بلند شہر " ہے۔ اس کتاب میں شیخ عبدالغنی خورجوی اور حافظ محمد عظیم صاحب بلندشہری تاجر کے درمیان خط وکتابت ہے جس کا مقصد عبدالغنی صاحب خورجویؔ کی ذمہ داری علمائے دیوبند کو بلانے کی اور حافظ محمد عظیم صاحب بلندشہری تاجر کی ذمہ داری مولانا احمد رضاخاں صاحب کو بلانے کی تھی۔ علمائے دیوبند نے مناظرے کا وعدہ کرلیا لیکن مولانا احمد رضاخاں صاحب نہ آئے۔ پھر بلندشہر کے اصحاب میں سے احمد حسن صاحب امام العیدین، محمد خان آنریری مجسٹریٹ، حکیم سردار احمد خاں طبیب بلندشہر، حکیم نیاز احمد بلندشہری، حاجی پیر علی صاحب، حافظ اکبر علی صاحب بلندشہری نے اہل شہر کے سامنے فیصلہ سُنایا کہ دیوبند سے مولانا محمود حسن، مولانا اشرف علی اور مولانا خلیل احمد صاحب بلندشہر میں مولانا احمد رضاخان صاحب سے مناظرے کے لئے تیار رہیں لیکن حافظ عظیم صاحب کی تحریروں اور خطوط کے باوجود مولانا احمد رضاخاں صاحب نہ آسکے۔ اس تمام رودٗاد کے اول میں عبدالغنی صاحب لکھتے ہیں :۔

> " خورجہ میں ابتداء ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۱۰ء میں چودھری عبدالرحیم صاحب مرحوم نے مدرسہ عربی خازن العلوم بذاتِ خاص جاری کیا جس کا تکفل اپنی ذات سے وابستہ رکھا اور جناب مولانا عماد الدین صاحب شیرکوٹی اس کے مُدرس اوّل مقرر ہوتے۔ مولانا موصوف کا غایت تعلق مولانا شبیر احمد صاحب دیوبندی سابق مدرس مدرسہ فتحپوری زمانہ طالب علمی سے تھا۔ مولانا شبیر احمد صاحب بوجہ تعلق قدیم مولانا عماد الدین

صاحب سے ملاقات کے لئے تشریف لائے اور خورجہ میں وعظ فرمایا۔ مولانا عماد الدین صاحب بلند شہر کے حالات سے باخبر ہو چکے تھے مولانا شبیر احمد صاحب کو بلند شہر میں وعظ فرمانے کے لئے مُصر ہوئے اور دونوں صاحب بلند شہر تشریف لے گئے جن کے ہمراہ جماعت کثیر اہل خورجہ کی تھی جس میں بندہ بھی موجود تھا۔ بروز جمعہ وعظ ہوا جس کے بعد اس معاملے کے متعلق جس کو آئندہ پیش کیا گیا ہے بندہ اور حافظ محمد عظیم میں گفتگو ہوئی۔"

(قاصمۃ الظہر مطبوعہ قاسمی صا)

مولانا عثمانی تو تقریر فرما کر تشریف لے گئے لیکن ان کے بعد بعض دیوبندی اور بریلوی معتقدین میں دونوں مکتبہ ہائے خیال کے درمیان مناظرہ کرانے کا خیال پیدا ہو گیا۔ مجھے یقین ہے کہ مولانا عثمانی نے کوئی ایسی بات وعظ میں نہیں فرمائی ہوگی جو اختلافی ہو کیونکہ ان کی عادت کسی اختلافی بات کے چھیڑنے کی نہ تھی۔ یہ سلسلہ مولانا شبیر احمد صاحب کے بعد ۱۳۲۸ھ تک شہر والوں نے لمبا کر دیا تا آنکہ نوبت بمناظرہ رسید لیکن مولانا احمد رضا خاں صاحب تو تشریف نہ لائے البتہ ان کے معتقدین میں سے ایک صاحب مولوی کرامت علی عشرۂ محرم میں آئے ان کے آنے سے پہلے بلند شہر میں ان کی آمد کا اشتہار شائع ہوا کہ وہ ان تمام امور سے نقاب اٹھائیں گے جو علمائے دیوبند قابلِ اعتراض باتیں کہتے ہیں۔ "قاصمۃ الظہر" کی حسب ذیل عبارت پڑھئے:-

"مولوی کرامت اللہ خان صاحب ۹ محرم کو بلند شہر تشریف لا چکے اور بروز عشرہ جامع مسجد بلند شہر میں وعظ ہوا۔ ادھر مشہور واعظ مولانا محمد ابراہیم دہلوی بھی اسی روز بلند شہر پہنچ لئے۔ دیوبند سے جناب مولانا مولوی انور شاہ صاحب کشمیری مدرس مدرسہ دیوبند، جناب

مولانا مولوی شبیر احمد صاحب مدرس مدرسہ دیوبند، جناب مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوری مدرس مدرسہ دیوبند ۹ محرم ۱۳۲۹ھ کی شام کو خورجہ پہنچ لئے۔ صبح عشرہ (۱۰ محرم) کو بندہ (یعنی شیخ عبد الغنی) حضرات علمائے دیوبند اور مولانا عبد الرحمٰن خان صاحب رئیس خورجہ و مولانا عماد الدین صاحب مدرس مدرسہ خازن العلوم کو لیکر بلند شہر پہنچا۔"

(قاصمۃ الظہر)

۱۱ محرم ۱۳۲۹ھ، علامہ عثمانی کی دوسری تقریر بلند شہر میں؛

۱۳۲۷ھ، ۱۹۱۰ء کے بعد علامہ عثمانی کی دوسری تقریر بلند شہر میں ہوئی۔ شیخ عبد الغنی لکھتے ہیں :-

"۱۱ محرم ۱۳۲۹ھ کی صبح کو سرائے کی مسجد میں قبل جمعہ مولانا مولوی شبیر احمد صاحب نے نہایت پُر اثر وعظ فرمایا کہ جس کی تاثیر اور حقانیت کو سامعین کے دلوں سے پوچھا جائے۔ بعد نمازِ جمعہ اس مسجد میں مولانا و بالفضل اولٰنا بحر العلوم زمانہ جناب سید انور شاہ صاحب مدفیوضہم العالیہ نے وعظ فرمایا اللہ اللہ! اہلِ بلند شہر نے دیکھ لیا کہ علمائے ربانی یہ ہوتے ہیں حضرت مولانا نے سنّت و بدعت کی تحقیق نہایت فصاحت و بلاغت اور وضاحت سے فرمائی جس کا بیان میں لانا ہماری قدرت سے باہر ہے۔ عصر کا وقت آگیا بعد نمازِ عصر پھر حضرت مولانا مولوی حکیم سید مرتضیٰ حسن صاحب نے ایک مختصر مگر نہایت پرجوش تقریر فرمائی کہ جس سے لوگوں کے دل ہل گئے۔"

(قاصمۃ الظہر ص ۲۷ و ۲۸)

مذکورہ عبارتوں سے حضرت عثمانی کے خورجہ اور بلند شہر میں تشریف لیجانا اور وہاں تقریریں کرنے کا پتہ چلتا ہے۔

حضرت مولانا عماد الدین صاحب انصاری نے جو بقید حیات[1] ہیں فرمایا کہ جب میں ابتدائے ملازمت میں بڈھانے ضلع مظفر نگر میں پڑھاتا تھا تو میری وجہ سے اکثر وہاں تشریف لاتے۔ خصوصاً تربوزوں کے زمانے میں کہ بڈھانے کے تربوز بہت شیریں ہوتے تھے حالانکہ بڈھانے تک پہنچنے میں اسٹیشن سے جائے قیام تک بیل گاڑی کا سفر کرنا پڑتا تھا اور راستے میں دریا بھی پڑتا تھا۔ بعض اوقات پیدل دریا کو عبور کرتے ہوئے بھی میرے پاس تشریف لائے ہیں۔

علامہ عثمانی اور تبلیغ عام کا حق

یہ ہم نے علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی سرگرمیوں کے چند واقعات پیش کئے ہیں۔ ورنہ متحدہ ہندوستان کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں آپ کی تبلیغی، سیاسی اور علمی تقریریں نہ ہوئی ہوں۔

گویا علامہ عثمانی نے ایک عالمِ ربّانی کی حیثیت سے تمام ملک میں اللہ کے دین اور اس کے کلمے کو پہنچا دیا اور ساری عمر خدا اور اس کے رسول کی تعلیم حاصل کرنے اور پڑھانے اور دین پر کتابیں لکھنے میں گذار دی۔

فیض عثمانی کی ہمیشہ فراوانی

وہ اگرچہ دنیا سے رخصت ہو گئے لیکن ان کی تفسیر گھر گھر ان کی یاد دلاتی ہے اور ان کا یہ کارنامہ قیامت تک جاری رہے گا۔ فعلیہ الرحمۃ۔

---

[1] جب ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۰ء میں بندہ یہ کتاب لکھ رہا تھا اس وقت مولانا موصوف بقید حیات تھے لیکن اب جب میں ۱۹۶۹ء میں کتاب پر نظر ثانی کر رہا ہوں تو آپ کا انتقال جون ۱۹۶۳ء میں ہو چکا ہے۔ مصنف

آسمانِ علم و فضل پر آفتابِ عثمانی کی ضیا باری

ہم نے آپ کے علم و فضل پر "تجلیاتِ عثمانی" میں سب کچھ لکھ دیا ہے یہاں موصوف کے علم و فضل پر مزید خامہ فرسائی کی بظاہر ضرورت نہ تھی کیونکہ آپ کی شہرت کا آفتاب نصف النہار زندگی کے جس بلند آسمان پر پہنچ چکا تھا وہ

آفتاب آمد دلیل آفتاب ؎ گر دلیلے خواہی از وے رومتاب

کا مصداق بن چکا تھا۔

"تجلیات" میں ہم نے علماء، فضلا، سیاست داں، حکام، اُدباء اور شعراء کے وہ تمام اقوال پیش کیے ہیں جن میں موصوف کی علمی لیاقت اور ان کے کمال سب نے بیک زبان خراج تحسین و عقیدت پیش کیا ہے لیکن "حیاتِ عثمانی" میں بھی قدرے روشنی ڈال کر سوانح زندگی کو مکمل کرنا مقصود ہے۔

مقامِ علم قارئین نے گذشتہ اوراق سے اندازہ لگالیا ہے کہ علامہ کی شہرت ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہنچ چکی تھی اور آپ کی علمی و خطابی اور قلمی طاقتوں کا لوہا تمام اہل علم و فضل نے مانا ہوا تھا۔ ذکاوت، ذہانت، سلامتی طبع، حکمت اور اس پر شیریں کلامی اور قلمی زور کی آمیزش نورٌ علیٰ نور تھی۔ دماغ سلجھا ہوا اور دل روشن تھا اس لئے آپ کی علمی، صلاحتیں بے داغ تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ معاصرین اور متاخرین ان کے علمی شاہکاروں کی طرف عقیدت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ مخالف مکتبہ ہائے فکر بھی ان کی فضیلت پر انگلی نہیں اٹھا سکے۔

بلکہ ان کی تصنیفات سے استفادہ کرتے ہیں ۔ بریلوی مکتبہ خیال کے آدمی بھی ان کے تفسیری فوائد کو زیر مطالعہ رکھتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔

وہ جو کچھ فرماتے اور لکھتے پورے توازن اور پورے اعتماد کے ساتھ فرماتے اور تحریر کرتے تھے ۔ پہلے بات کو پورے تولتے اور پھر بولتے تھے اور پھر اس پر ثابت قدم ہو جاتے تھے ۔ علامہ کی تحریر اور تقریر میں کبھی متانت، سنجیدگی اور علمی وقار کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا تھا ۔ ایک مضمون جس پر وہ قلم اٹھاتے، اور اسی عنوان پر کوئی دوسرا اظہار کرتا تو آپ اس میں بھاری نظر آتے تھے ۔

اسی خیال کو استاذ محترم مولانا محمد طیب صاحب نے اپنے ایک مضمون میں ظاہر فرمایا ہے ۔ لکھتے ہیں :۔

> " تحریر کی شگفتگی مسلم تھی ۔ ایک ہی مضمون کئی لکھتے اور اسی کو وہ قلمبند فرماتے تو سب پر ان کی تحریر کی شگفتگی نمایاں رہتی تھی "۔
>
> (رسالہ دار العلوم مئی ۱۹۵۶ء)

مولانا محمد طیب صاحب کی مذکورہ تحریر میں حضرت عثمانی کی شگفتگی تحریر سے صرف یہی مطلب نہیں ہے کہ ان کی تحریروں میں الفاظ آرائی ہی تھی بلکہ معنوی بلندی اور تحقیق مضمون کے ساتھ ساتھ تحریر میں فصاحت و بلاغت بھی ہوتی تھی ۔ قاری محمد طیب صاحب کے اس خیال کی تائید کرتے ہوئے ایسے مضامین پیش کرنے کے لئے قلم کو مجبور پاتے ہیں جن میں بعض متقدمین اور متاخرین یا معاصرین نے طبع آزمائی کی ہے اور اس پر علامہ عثمانی نے بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں زبان، طرز بیان اور علمی و تحقیقی سامان میں تقابل پیش نظر ہے۔

سر سید اپنے دور کے سادہ اردو لکھنے والے سمجھے گئے ہیں اور علمی مقام میں ایک طبقے نے انہیں بہت اونچا کہا ہے ۔ یوں تو ان کی کئی تصنیفات ہیں لیکن

زندگی کی آخری تصنیف جس کو وہ خود اپنا شاہکار زندگی تصور کرتے تھے ان کی تفسیرِ قرآن ہے جو صرف پندرہ پاروں تک لکھی گئی۔ اسی تفسیر میں سے ہم سرسیدؒ کی بعض آیات کی تفسیر پیش کرتے ہیں جن پر علامہ عثمانی نے بھی قلم اٹھایا ہے۔

قرآن کریم کے اردو اور فارسی میں ترجمے اور تفسیریں

تقابل کرنے سے پہلے ایک تاریخی مختصر خاکہ قرآن کریم کے اردو، فارسی میں تراجم اور تفاسیر کے بارے میں پیش کرتے ہیں، جو حسب ذیل ہے :-

ترجمہ فارسی از شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ۱۱۵۰ھ

سب سے پہلے فارسی زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ ہندوستان میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ۱۱۵۰ھ میں کیا اور فوائد قرآنیہ مختصراً فتح الرحمٰن کے نام سے تحریر فرمائے۔ یہ ترجمہ مطبع مصطفائی میرٹھ میں چھپا جس کے حاشئے پر تفسیر عباسی شائع کی گئی۔

تفسیر فارسی از شاہ عبد العزیز صاحبؒ

بعد ازاں شاہ ولی اللہؒ کے بڑے فرزند شاہ عبد العزیزؒ نے تفسیر عزیزی کے نام سے فارسی میں تفسیر لکھی جو نامکمل رہی۔

ترجمہ اُردو از شاہ عبد القادرؒ و شاہ رفیع الدینؒ ۱۲۰۵ھ

سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ فارسی کو بھی زوال آیا اور اُردو نے ترقی کی تو شاہ ولی اللہؒ کے دوسرے صاحبزادے شاہ عبد القادر صاحبؒ نے ۱۲۰۵ھ / ۱۸۰۲ء میں اُردو میں ترجمہ کیا اور اُردو میں تفسیری مختصر فوائد لکھے جو موضح القرآن کے نام سے موسوم ہیں۔ اور غالباً دو سال بعد ۱۲۰۷ھ / ۱۸۰۴ء میں شاہ رفیع الدینؒ نے صاف اردو زبان میں ترجمہ کیا۔ ان کے بعد

اردو میں کتنی تفسیریں اور ترجمے ہوئے جن میں مولانا اشرف علی صاحب کی تفسیر بیان القرآن اور اردو ترجمہ فاضل دیوبند، مولانا عبدالحق صاحب مفسر تفسیر حقانی فاضل دیوبند، شیخ الہند مولانا محمود حسن اسیر مالٹا فاضل دیوبند اور اس پر علامہ شبیر احمد عثمانی فاضل دیوبند کا ترجمہ، سرسید کی پہلے پندرہ پاروں کی تفسیر، مرزا حیرت دہلوی، مولوی فتح محمد جالندھری، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولوی فیروز الدین، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے ترجمے، تفسیریں اور فوائد طبع ہوئے۔

پاکستان اور ہندوستان میں جو ترجمے عموماً شائع اور ذائع ہیں ان میں شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین، مولانا اشرف علی اور شیخ الہند مولانا محمود حسن اور تفسیری فوائد علامہ شبیر احمد عثمانی کے ہیں۔ آئندہ اوراق میں ہم سرسید اور علامہ عثمانی کی تفسیروں کے حصے پیش کرتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ ایک ہی مضمون پر دونوں نے قلم اٹھایا ہے اور کون زیادہ کامیاب ہے۔

پہلا موازنہ

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَیْدِیَكُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَی الْكَعْبَیْنِ (سورۂ مائدہ رکوع ۲)

(یعنی) اے اہل ایمان جب تم نماز کا ارادہ کرو تو اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک دھوؤ اور اپنے سروں کا مسح کرو اور پاؤں کو ٹخنوں تک دھوؤ۔

سرسید کی تفسیر

(فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ) اس آیت اور اس کی بعد کی آیتوں میں طہارت کا ذکر ہے۔ کوئی شخص قرآن مجید کی آیتوں اور ان حدیثوں سے جو طہارت کے باب میں ہیں یہ نہیں خیال کر سکتا کہ طہارت سے مقصود اصلی صرف منہ اور ہاتھ پاؤں کا دھونا یا نہانا یا ظاہری نجاست کا بہانا ہے بلکہ اس سے مقصود اندرونی نجاستوں کا دور کرنا ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ "بنی الدین علی النظافة" اور ایک حدیث میں آیا ہے کہ "الطهور شطر الایمان" ظاہر ہے کہ ایمان یقین قلبی یا اعتقاد کا نام ہے۔ پس جو امر کہ دلی یقین قلبی اعتقاد پر مبنی ہو نہ اس کی بنیاد ظاہری نظافت پر ہو سکتی ہے اور نہ ظاہری طہارت کا اس کا جز ہونا ممکن ہے۔ ایمان ایک روحانی امر ہے اور اسی لئے روحانی نظافت اس کی بنیاد اور روحانی طہارت اس کا جزو

علامہ عثمانی کی تفسیر

امت محمدیہ پر جو عظیم الشان احسانات کئے گئے ان کا بیان سنکر ایک شریف اور حق شناس مومن کا دل شکر گذاری اور اظہار وفاداری کے جذبات سے لبریز ہو جائے گا اور فطری طور پر اس کی یہ خواہش ہو گی کہ اس منعم حقیقی کی بارگاہ رفیع میں دست بستہ حاضر ہو کر جبین نیاز خم کرے اور اپنی غلامانہ منت پذیری اور انتہائی عبودیت کا عملی ثبوت دے۔ اس لئے ارشاد ہوا کہ جب ہمارے دربار میں حاضری کا ارادہ کرو یعنی نماز کے لئے اٹھو تو پاک و صاف ہو کر آؤ۔ جن لذائذ دنیوی اور مرغوبات طبعی سے متمتع ہونے کی آیت وضو سے پہلی آیت میں اجازت دی گئی یعنی طیبات اور محصنات وہ ایک حد تک انسان کو ملکوتی صفات سے دور اور بہیمیت سے نزدیک کرنے والی چیزیں ہیں اور کل احداث (موجبات وضو و غسل) ان ہی کے استعمال سے لازمی نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتے ہیں

ہو سکتی ہے۔ (آگے چلکر لکھتے ہیں)

پس صاف ظاہر ہے کہ اللہ جس طہارت کو دوست رکھتا ہے وہ ہاتھ پاؤں پر پانی ڈالنا اور بدن پر پانی بہانا نہیں ہے بلکہ وہ دلی و روحانی طہارت ہے جس کو دوست رکھتا ہے۔ ہاں ظاہری طہارت کا بھی اور بالتخصیص جبکہ کوئی شخص کسی عبادت میں اور خصوصاً فرض عبادت میں مصروف ہو خدا نے حکم دیا ہے اور وضو کو شرطِ نماز یا طہارت کو مفتاحِ صلوٰۃ قرار دیا ہے یہ حکم بھی مثل احکام محافظ کے ہے جو نماز سے علاقہ رکھتے ہیں جیسے قیام و قعود و سجود وغیرہ۔

لہٰذا مرغوبات نفسانی سے یکسو ہو کر جب ہماری طرف آنے کا قصد کرو تو پہلے بہیمیت کے اثرات اور اکل و شرب کے پیدا کئے ہوئے تکدرات سے پاک ہو جاؤ یہ پاکی وضو اور غسل سے حاصل ہوتی ہے نہ صرف یہ کہ وضو کرنے سے مومن کا بدن پاک ہو جاتا ہے بلکہ جب وضو باقاعدہ کیا جائے تو پانی کے قطرات کے ساتھ گناہ بھی جھڑ جاتے ہیں۔

تنقید

ایک ہی آیت پر یہ دونوں تفسیریں آپ کے سامنے ہیں۔ سرسید کی تفسیر کی ظاہری خوبی یہ ہے کہ اس کی زبان سادہ اور اس کی اردو بالکل عام فہم ہے۔

دوسرے پیرے کی عبارت کا آخری جز اپنی عبارت کے اعتبار سے چست ہے لیکن تیسرے پیرے کی عبارت میں ڈھیلا پن ہے۔ تینوں پیروں کی اردو میں یکسانیت اور ہمواری نہیں ہے۔

اس آیت تطہیر کا پہلی آیات سے رابطہ بیان نہیں کیا گیا جس کے باعث معانی کے تسلسل میں خلا پیدا ہو گیا ہے۔

سرسید نے جیسا کہ ان کی تفسیر کے اس ٹکڑے سے "کہ طہارت سے مقصود اصلی صرف مُنہ اور ہاتھ پاؤں کا دھونا یا نہانا یا ظاہری نجاست کا بہانا نہیں ہے بلکہ اس سے مقصود اندرونی نجاستوں کا دور کرنا ہے" صاف ظاہر ہے کہ طہارت کو صرف باطنی طہارت میں منحصر کر کے تفسیر کے جامع و مانع پہلو کو احتیاط ہی نہیں بلکہ اصلیت سے گرا دیا ہے۔ الطھور شطر الایمان وغیرہ کی حدیث کا صحیح مطلب وہ نہیں ہے جو انہوں نے بیان کیا ہے۔ حکیمانہ انداز تو اس امر کا مقتضی تھا کہ تطہیر قلبی روحانی کا سررشتہ بھی ہاتھ سے نہ چھوڑتے اور آیت کے ظاہری صحیح محمل و مصداق یعنی تطہیر ظاہر پر بھی روشنی ڈالتے۔ معنی کے جس پہلو پر سرسید نے زور دیا ہے اس میں شدت اور یک جانبی کا پہلو زیادہ روشن نظر آرہا ہے۔

اس عبارت سے تو انحصار تطہیر روحانی معلوم ہوتا ہے مگر آگے چل کر پھر یوں بھی فرماتے ہیں:

"ہاں ظاہری طہارت کا بھی اور بالتخصیص جبکہ کوئی شخص کسی عبادت میں اور خصوصاً فرض عبادت میں مصروف ہو خدا نے حکم دیا ہے اور وضو کو شرط نماز یا طہارت کو مفتاحِ صلوٰۃ قرار دیا ہے"

قاری اب خود فیصلہ کرلے کہ آیا ان دونوں تحریروں میں اجتماعِ ضدین اور تناقض و تباین نہیں ہے؟ اس کے برعکس اب مولانا عثمانی کی تفسیر پر نظر ڈالئے اور ظاہری و معنوی احتیاطات کا امتزاجی رنگ ملحوظ رکھئے۔

حضرت عثمانی کی اردو عبارت میں فصاحت، بلاغت، جامعیت اور چستی پائی جاتی ہے۔ کلام میں شکوہِ لفظی و معنوی ابھر رہا ہے۔ علمیت کا پہلو نمایاں نظر آرہا ہے۔ ظاہری تطہیر کے پہلو اور آیت کے صحیح مصداق کو پیش نظر رکھتے ہوئے تطہیر قلبی و روحانی کو کس حکیمانہ انداز میں ادا کیا گیا ہے کہ تفسیر آیت اور حکمت کے تمام

تقاضوں کا پورا احساس قائم ہے۔ پھر پہلی آیات سے ربط میں جو سرسید کے یہاں خلا تھا اس کو عثمانی کی تفسیر میں پُر کر کے پاٹ دیا ہے۔

علامہ عثمانی نے دونوں پہلوؤں پر برابر کا رنگ دیا ہے۔ عبارت میں ناہمواری نہیں۔ اوپر سے نیچے تک عبارت کی موجیں برابر کا مدوجزر دکھا رہی ہیں۔ احتیاطِ مقام اور حکمتِ کلام کی نزاکت کا احساس پوری عبارت میں موجود ہے۔

بہرحال ظاہری اور بدیہی طور پر مولانا کا پلہ بھاری نظر آتا ہے۔

دوسرا موازنہ

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ج وَ مَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ م وَ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ لا كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ج وَ مَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

(ترجمہ) "وہی ہے جس نے آپ پر کتاب نازل کی۔ اس میں بعض آیتیں محکم ہیں وہ کتاب کی اصل ہیں اور دوسری متشابہ ہیں۔ لیکن جن کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہات کی پیروی کرتے ہیں گمراہی پھیلانے کی غرض سے اور مطلب معلوم کرنے کی وجہ سے۔ اور ان کا مطلب کوئی نہیں جانتا بجز اللہ کے (لیکن) پختہ اہل علم کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے کہ ہر ایک ہمارے رب کی طرف سے اتری ہیں۔ اور اہل عقل ہی سمجھتے ہیں۔"

آیات مذکورہ کے متعلق

سرسید کی تفسیر ــــ اور ــــ علامہ عثمانی کی تفسیر

محکمات اور متشابہات کی بحث بہت دقیق اور طویل ہے۔ علماء نے اس کے بیان میں بہت بڑی علمیت خرچ کی ہے۔ مگر مختصر بات یہ ہے کہ عربی زبان کے محاورے میں محکم اس بات کو کہتے ہیں جو ایسی صاف ہو جس سے ایک ہی مطلب سمجھ میں آوے اور دوسرے مطلب کو نہ آنے دے اور متشابہ اس بات کو کہتے ہیں جس کے کئی مطلب سمجھ میں آتے ہوں اور بخوبی تمیز نہ ہو سکتی ہو کہ کونسا مطلب مقصود ہے۔ یا جو معنی اس کے الفاظ سے متبادر ہوتے ہوں وہ مقصود نہ ہوں بلکہ وہ الفاظ بطور تمثیل یا بطور مجاز و استعارہ کے آئے ہوں

. . . .

(مثلاً) سب سے بڑا اصول مسلمانی مذہب کا توحید ہے اور اس کے بعد اعمال حسنہ، وہ اس خوبی و عمدگی اور

نصاریٰ نجران نے تمام دلائل سے عاجز ہو کر بطور معارضہ کہا تھا کہ آخر آپ حضرت مسیح کو "کلمۃ اللہ" اور "روح اللہ" مانتے ہیں بس ہمارے اثبات مدعا کے لئے یہ الفاظ کافی ہیں۔ یہاں اس کا تحقیقی جواب ایک عام اصول اور ضابطہ کی صورت میں دیا ہے جس کے سمجھ لینے کے بعد ہزاروں نزاعات و مناقشات کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ اس کو یوں سمجھو کہ قرآن کریم بلکہ تمام کتب الٰہیہ میں دو قسم کی آیات پائی جاتی ہیں۔ ایک وہ جن کی مراد معلوم و متعین ہو خواہ اس لئے کہ لغت و ترکیب وغیرہ کے لحاظ سے الفاظ میں کوئی ابہام و اجمال نہیں نہ عبارت کئی معنیٰ کا احتمال رکھتی ہے نہ جو مدلول سمجھا گیا وہ عام قواعد مسلمہ کے مخالف ہے اور یا اس لئے کہ عبارت و الفاظ میں گو لغۃً کئی معنیٰ کا احتمال ہو سکتا تھا لیکن

صفائی سے قرآن مجید کی آیات میں بیان ہوئے ہیں جن میں کسی طرح دوسرا احتمال ہو ہی نہیں سکتا۔ سورۂ انعام میں فرمایا ہے کہ " اس کے سوا کوئی معبود ہی نہیں، ہر چیز کا وہی خالق ہے، اسی کی عبادت کرو"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سورہ نساء میں کتنا صاف طور پر بیان کر دیا ہے کہ " خدا صرف شرک کو نہیں بخشے گا اور اس کے سوا جتنے گناہ ہیں اگر چاہے گا بخش دے گا۔

پس یہ تمام آیات اور ان کی مانند اور بہت سی آیتیں آیاتِ محکمات ہیں جن کا مطلب سوائے ایک کے کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

خدا کی نسبت عرش پر بیٹھنا، اس کے ہاتھ ہونے، اس کا منہ ہونا بیان ہوا ہے ان الفاظ سے بجز ایسے تخت کے جس کو ہم نے دیکھا ہے اور بجز ان ہاتھوں کے جو ہمارے بدن میں ہیں اور بجز اس منہ کے جو زیادہ سے زیادہ شان و شوکت والا ہم نے دیکھا شارع کی نصوص مستفیضہ یا اجماع معصوم یا مذہب کے عام اصول مسلمہ سے قطعاً متعین ہو چکا کہ متکلم کی مراد وہ معنی نہیں یہ ہے ایسی آیات کو محکمات کہتے ہیں اور فی الحقیقت کتاب کی ساری تعلیمات کی جڑ اور اصل اصول یہی آیات ہوتی ہیں۔ دوسری قسم آیات کی متشابہات کہلاتی ہے یعنی جن کی مراد معلوم و متعین کرنے میں کچھ اشتباہ و التباس واقع ہو جائے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس دوسری کی آیات کو پہلی قسم کی آیات کی طرف راجع کر کے دیکھنا چاہیئے جو معنی اس کے خلاف پڑیں ان کی قطعاً نفی کی جائے اور متکلم کی مراد وہ سمجھی جائے جو آیات محکمات کے مخالف نہ ہو اگر باوجود اجتہادِ وسیع بلیغ کے متکلم کی مراد کی پوری تعیین نہ کر سکیں تو دعویٰ ہمہ دانی کر کے ہم کو حد سے گذرنا نہیں چاہیئے جہاں قلتِ علم اور قصورِ استعداد کی وجہ سے بہت سی حقائق پر ہم دسترس نہیں پا سکتے اس کو بھی اس فہرست میں شامل کر لیں

ہے اور کوئی معنی ہمارے خیال میں نہیں آسکتے مگر خدا تعالیٰ اس طرح سے تخت پر بیٹھنے اور ایسے مُنہ کے ہونے سے مبرا ہے۔ حشر اجساد، نعیم جنت، عذاب دوزخ کا جن آیتوں میں بیان ہوا ہے وہ سب آیتیں متشابہات میں سے ہیں۔ .... جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ خرابی ڈالنے کے لئے ان کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور ان کی غلط تاویل کرتے ہیں اور جو لوگ علم میں راسخ ہیں وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ بیان ہوا ہے وہ سب خدا کے پاس سے آیا ہے اس لئے وہ اس قسم کی تاویلوں کے درپے نہیں ہوتے اور کہتے ہیں کہ وہ علۃ العلل جسے خدا کہتے ہیں وَحدہٗ لاشریک ہے، وہی علۃ العلل تمام چیزوں کی خالق ہے، ایسی علۃ العلل کے ضرور ہے کہ اس میں ایسی چیز بھی ہو جس کو ہم زندگی کہتے ہیں، ایسی چیز نہ ہو جس کو ہم موت کہتے ہیں۔ اس میں کوئی ایسی چیز بھی ہونی ضروری ہے جس کو ہم لفظ سمع و بصر و حلم، رحم، غضب و قہر سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس میں کوئی ایسا

مگر زنہار ایسی تاویلات اور ہیر پھیر نہ کریں جو مذہب کے اصولِ مسلّمہ اور آیات محکمہ کے خلاف ہوں مثلاً قرآن کریم نے مسیح علیہ السلام کے متعلق تصریح کردی "اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ" یا "اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ"...... اور جا بجا ان کی الوہیت اور ان کی ابنیت کا رد کیا اب ایک شخص ان سب محکمات سے آنکھیں بند کرکے "كَلِمَتُهٗ اَلْقٰهَا اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ" وغیرہ متشابہات کو لے دوڑے اور اس کے وہ معنی چھوڑ کر جو محکمات کے موافق ہوں ایسے سطحی معنی لینے لگے جو کتاب کی عام تصریحات اور متواتر بیانات کے منافی ہوں تو یہ کجروی اور ہٹ دھرمی نہیں تو اور کیا ہوگی۔ بعض قاسی القلب چاہتے ہیں کہ اس طرح مغالطہ دیکر لوگوں کو گمراہی میں پھنسا دیں اور بعض کمزور عقیدہ والے ڈھلمل یقین ایسے متشابہات سے اپنی رائے و ہوا کے مطابق کھینچ تان کر مطلب نکالنا

امر بھی ہونا ضرور ہے کہ جن کاموں کو ہم ہاتھ پاؤں مُنہ وغیرہ کے ساتھ منسوب کرتے ہیں اس میں بھی منسوب کر سکیں کیونکہ اس کے علت العلل وخالق جمیع اشیاء کے ہونے کو ایسی چیزوں کا اس میں ہونا لازم ہے اس لئے ہم اس کے حی لایموت، سمیع، بصیر، علیم، رحمٰن، و رحیم، قہار و جبار ہونے پر یقین کرتے ہیں۔ مگر اس امر کی کہ اس کی حیات کیا ہے اور عدم موت کیا ہے اس کا سمیع و بصیر و علیم و رحمٰن و رحیم و جبار و قہار ہونا کیا ہے اور کیسا ہے کچھ تاویل نہیں کرتے اور کہتے ہیں لَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗ اِلَّا اللّٰهُ، ہاں اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا سا نہیں۔ پس ہمارے نزدیک آیاتِ متشابہات پر ایمان لانے کے یہی معنیٰ ہیں اور فطرت انسانی کا یہی اقتضاء ہے۔

چاہتے ہیں۔ حالانکہ ان کا صحیح مطلب صرف اللہ ہی کو معلوم ہے۔ وہ ہی اپنے کرم سے جس کو جس قدر حصہ پر آگاہ کرنا چاہے کر دیتا ہے جو لوگ مضبوط علم رکھتے ہیں وہ محکمات و متشابہات سب کو حق جانتے ہیں انہیں یقین ہے کہ دونوں قسم کی آیات ایک ہی چشمے سے آئی ہیں جن میں تناقض و تہافت کا امکان نہیں اس لئے وہ متشابہات کو محکمات کی طرف لوٹا کر مطلب سمجھتے ہیں۔ اور جو حصہ ان کے دائرۂ فہم سے باہر ہوتا ہے اسے اللہ پر چھوڑتے ہیں وہی بہتر جانتے ہیں ہمیں ایمان سے کام ہے ....

.... راسخین فی العلم اپنے کمالات علمی اور قوتِ ایمانی پر مغرور و مطمئن نہیں ہوتے بلکہ ہمیشہ حق تعالیٰ سے فضل و عنایت کے طلبگار رہتے ہیں تاکمائی ہوئی پونجی ضائع ہو جائے اور خدا نکردہ دل سیدھے ہونے

(تفسیر سرسید جلد اول، آل عمران رکوع ۹)

کے بعد کج نہ کر دئے جائیں۔ بحدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم (امت کو سنانے کے لئے) اکثر یہ دعا کیا کرتے تھے "یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰی دِیْنِکَ"

(فوائد القرآن عثمانی مطبوعہ مدینہ پریس بجنور، آل عمران رکوع ۹)

ادبی تنقید

سرسید کی عبارت سادہ اور سلیس ہے۔ محکمات اور متشابہات کی تعریف آسان لفظوں میں سمجھائی گئی ہے۔ مضمون ذہن نشین کرنے کیلئے بہت سی مثالیں تائیداً پیش کی ہیں۔ حتیٰ کہ جہاں نقاط دئے گئے ہیں وہاں سرسید کی دی ہوئی مزید امثلہ کو زیادہ سمجھ کر چھوڑ دیا گیا ہے تاہم ان تائیدی امثلہ کے چھوڑنے سے توازن پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔ بہر حال مفہوم دل نشین کرنے کے لئے عبارت میں وسعت سے کام لیا ہے۔

سرسید کا پہلا ہی جملہ بولتا ہوا ہے لیکن دوسرا جملہ یعنی "علما نے اس کے بیان میں بہت بڑی علمیت خرچ کی ہے" ادبیت سے ذرا گر گیا ہے۔ "علمیت خرچ کی ہے" تو پھر بھی نبھ سکتا تھا لیکن "بہت بڑی علمیت خرچ کی ہے" قطعاً نامانوس ہے۔ تمام عبارت میں بعض جملے فصیح و سادہ ہیں اور بعض غیر فصیح۔

سرسید کے اس جملہ میں کہ "سب سے بڑا اصول مسلمانی مذہب کا توحید ہے"

مسلمانی مذہب" کی ترکیب نامناسب ہے۔ اس جملہ کو یوں ادا کرنا چاہئے تھا کہ" سب سے بڑا اصول مذہب اسلام کا توحید ہے" لیکن پھر بھی ترتیب عبارت کے اصول کے پیش نظر یوں ہونا چاہئے" مذہب اسلام کا سب سے بڑا اصول توحید ہے"۔ محکم کی تعریف کرتے ہوتے ہوئے سرسید لکھتے ہیں" عربی زبان کے محاورے میں محکم اس بات کو کہتے ہیں جو ایسی صاف ہو جس سے ایک ہی مطلب سمجھ میں آوے اور دوسرے مطلب کو نہ آنے دے"۔

اس عبارت کے آخری قطعہ یعنی" جس سے ایک ہی مطلب سمجھ میں آوے اور دوسرے مطلب کو نہ آنے دے" کو قاری خود ہی دیکھ سکتا ہے کہ یہ جملہ فورٹ ولیم کالج سے پہلی ابتدائی اردو کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ سیدھے طریقہ پر یوں کہا جاتا ہے کہ" محکم ایسی بات کو کہتے ہیں کہ جس کے صرف ایک ہی معنیٰ ہوں اور دوسرے معنیٰ کی اس میں کوئی گنجائش نہ ہو"۔ اسی طرح آوے لاوے وغیرہ الفاظ غیر فصیح ہیں۔

سرسید کی تفسیر پر معنوی تنقید

تفسیر کے اس حصہ کی معنویت کا جہاں تک تعلق ہے تو سرسید کی محکم کی تفسیر محاورۂ عرب کے مطابق ہے جیسا کہ انہوں نے خود کہا ہے مگر اصطلاحاً یہ تعریف جامع و مانع نہیں ہیں۔ کیونکہ ایک لفظ کے محاورۂ عرب میں کچھ معنیٰ ہیں لیکن اصطلاحِ قرآن میں اس کے کچھ اور معنیٰ ہوں تو یہ تعریف مدعا کو فوت کر کے رکھ دے گی مثلاً صلوٰۃ کے معنیٰ عربی لغت میں دعا کے ہیں لیکن اصطلاحِ قرآن میں اس خاص طریقہ کو صلوٰۃ کہا جاتا ہے جس میں تکبیر تحریمہ، رکوع، سجود، قومہ، جلسہ، سلام وغیرہ ہو اور اوقاتِ خمسہ کے مطابق جس میں رکعات کی تعداد کا لحاظ رکھا جائے۔ اسی طرح بالفرض محاورۂ عرب میں ایک لفظ کے خاص معنیٰ ہیں لیکن حدیث یا

قیاس یا اجماعِ اُمّت میں اس کے معنیٰ از رُوئے اصطلاح دوسرے ہوں اور وہی متعین کرلئے گئے ہوں تو یہ تعریف کس طرح جامع ہوگی ۔ حالانکہ لُغت کے اعتبار سے اس کے صرف ایک ہی معنیٰ ہوسکتے ہیں ۔ علامہ عثمانی نے تعریف کا کوئی گوشہ تاریک نہیں چھوڑا ۔

پھر متشابہات کی تعریف میں اللہ تعالیٰ کے عرش اور اس کے لوازمات جو تعریف متشابہ کی سرسید نے کی ہے وہ ٹھیک ہے مگر اس کے ضمن میں جو حشرِ اجساد یعنی قبروں سے مُردوں کا اجسام کے ساتھ اُٹھنے کی مثال متشابہ میں دی ہے وہ جماہیرِ مفسرین ، علماء ، عقائدِ حقّہ وغیرہ کے قطعاً خلاف ہے بلکہ قرآن کریم کی محکم آیات میں صاف طور پر مُردوں کا انہیں اجسام کے ساتھ اُٹھنا ، کفار کے مقابلہ میں معرکہ آراء نظریہ و عقیدہ پیش کیا گیا ہے ۔ اسی طرح نعیمِ جنّت اور عذابِ دوزخ کو متشابہات میں سے قرار دینا درست نہیں ۔

علامہ عثمانی پر ادبی تنقید

علامہ عثمانی نے جن الفاظ ، جملوں اور عبارت میں مذکورہ آیات اور محکم و متشابہ کی تفسیر کی ہے وہ عبارت جامع ، مانع ، شگفتہ اور بلیغ ہے ۔ اس میں وہی ادبی شکوہ ہے ۔ یکسانیت کے ساتھ ایک ہی سا ذوقِ ادبیت چلا جارہا ہے ۔ ایسا نہیں کہ کہیں ہونٹ چاٹتے رہ جائیں اور کبھی منہ سے لقمہ اگل دینے پر مجبور ہوجائیں ۔ ہاں البتہ بعض الفاظ علامہ کے یہاں مشکل ہیں مثلاً نصوصِ مستفیضہ ، اجماعِ معصوم وغیرہ ۔

معنوی تنقید

علامہ عثمانی نے آیاتِ محکمات اور متشابہات کی جو تفسیر کی ہے وہ اصول تفسیر

کے مطابق جامع اور مانع تفسیر ہے جن کا ماخذ کتب متداولہ متقدمین ومتاخرین ہے۔ اور درحقیقت مختصر عبارت میں محتاط اسلوب کے ساتھ اس کی تعریف اس سے زیادہ جامع و مانع اور کیا ہوسکتی ہے جس پر کوئی اعتراض لازم نہیں آتا۔ سرسید کی تفسیر میں پہلی آیات سے ربط نہ دینے کی وجہ سے تفسیر میں خلا باقی رہ گیا ہے لیکن عثمانی نے وفد نجران کے تاریخی پس منظر سے رابطہ ظاہر کرکے نہ صرف خلا کو بھر دیا ہے بلکہ آیات کی تفسیر میں جو جامعیت یہاں ہے وہ سرسید کی تفسیر میں نہیں ہے۔

تیسرا موازنہ

مذکورہ بالا ہر دو تفسیری تقابل کے بعد اب ہم سرسید اور جناب عثمانی کے دو نظریوں کے تصادم میں دو عبارتیں پیش کرتے ہیں۔ حضرت سرسید اپنے رسالہ تہذیب الاخلاق میں اس مفہوم کو پیش کرتے ہیں کہ مذہب میں جو چیزیں انسان کی عقل میں نہیں آتیں وہ دراصل کچھ اور ہی مطلب رکھتی ہیں ورنہ شریعت عقل سے باہر چیزوں کی انسان کو تکلیف نہیں دیتی بلکہ یہ ضروری ہے کہ جس چیز کی شریعت تکلیف دے یا کوئی نظریہ اور حقیقت بیان کرے وہ سمجھ میں آسکے۔ موصوف کے یہاں فرشتے، جنّات وغیرہ جن کو وہ انسانی سمجھ سے باہر خیال کرتے ہیں ان کے نزدیک فرشتوں سے نیکی اور جنات سے برائی مراد ہے۔ اسی طرح وہ معجزات کے بھی قائل نہیں کہ انسانی ادراک سے باہر ہیں اسی خیال کو سرسید نے حسب ذیل عبارت میں پیش کیا ہے اور مولانا عثمانی نے اس کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ شریعت کی کوئی چیز ایسی نہیں جو معقول نہ ہو البتہ عقلیات کا معیار مختلف ہے۔ دونوں صاحبان لکھتے ہیں:۔

سرسید	علامہ عثمانی
ہمارا یہ اصول نہایت صحیح ہوا ہے کہ انسان صرف بسبب عقل کے	میرا سرسید سے یہ سوال ہے کہ جس عقل کو وہ تکلیف شرعی کے واسطے

جو اس میں ہے مکلف ہوا ہے۔ بس جس بات پر وہ مکلف ہوگا ضروری ہے کہ فہم انسانی سے خارج نہ ہو ورنہ معلول کا وجود بغیر علّت کے لازم آتا ہے جو محال و ممتنع ہے۔ پس جن اخلاق کے پکڑنے اور چھوڑنے پر انسان مکلف ہے وہ ضرور عقل انسانی سے خارج نہیں۔"
(تہذیب الاخلاق جلد دوم ص۱۲۵)

علّت قرار دیتے ہیں اس سے کیا مراد ہے۔ آیا فقط قوت ادراک کا انسان میں موجود ہونا یا اس سے ہر ہر چیز کو تفصیلاً جاننا۔ اگر پہلی صورت اختیار کی جائے تو بعض احکام و اخلاق کے فوائد و علل پر مطلع نہ ہونے سے علّت و معلول میں جدائی کس طرح لازم آئی اور اگر خدانخواستہ سرسید نے دوسری شق کو لیا ہے تو میں تسلیم نہیں کرتا کہ جو علّت تکلیف کی سرسید نے قرار دی ہے وہ صحیح ہے۔"
(العقل والنقل مقالات عثمانی ص۲۹۱)

سرسید پر ادبی تنقید

جہاں تک ادبیت کا تعلق ہے سرسید کی مذکورہ عبارت میں بعض ترکیبیں مثلاً "بسبب عقل کے جو اس میں ہے" بھونڈی ترتیب ہے، اسی طرح "ہمارا یہ اصول نہایت جنچا ہوا ہے" کی بجائے "جنچا تلا ہے" ہونا چاہیئے۔ "اخلاق پکڑنے" کی ترکیب بھی اچھی نہیں بلکہ "اخلاق اختیار کرنے" کے الفاظ موزوں تھے۔ غرض عبارت میں جھول نظر آتا ہے۔

اس کے برعکس حضرت عثمانی کی عبارت اوپر سے نیچے تک مربوط اور چست ہے، کہیں بھی لچک نظر نہیں آتی۔ اس لئے ان کا طرز نگارش بہتر ہے۔

معنویت

معنویت میں بھی مولانا عثمانی کا پلہ بھاری نظر آتا ہے کیونکہ

سرسید مرحوم کا یہ فرمانا کہ مذہب کی ہر چیز انسان کے ذہن میں آجائے ضروری نہیں، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ بہت سے افراد انسانی کے اذہان اور عقول وہاں تک نہ پہنچ سکیں اگرچہ مذہب کی وہ باتیں قطعاً حکمت آمیز ہوں۔

مولانا نذیر احمد اور مولانا شبیر احمد

مولانا نذیر احمد اور مولانا عثمانی

مولانا عثمانی اور سرسید کے مذکورہ بالا مشترک اور ہم مضمون خیالات کے موازنے سے گذر کر اب ہم قارئین کرام کو ضیافتِ طبع کے لئے مولانا نذیر احمد صاحب دہلوی طرف لئے چلتے ہیں جو کہ راقم الحروف کے ہم ضلع یعنی قصبہ ویرانہ رہڑ ضلع بجنور تحصیل نگینہ کے رہنے والے تھے اور جن کو مہدی حسن مرحوم نے اردو کے عناصر خمسہ میں سے ایک عنصر کہا ہے۔ وہ مولانا نذیر احمد کے متعلق لکھتے ہیں:۔

" اعلیٰ درجے کی عربیت کے ساتھ بے مثل قدرتِ بیان، وسیع ذخیرۂ الفاظ اور وہ تصرفات جو جدتِ خیال اور ظریفانہ نکتہ سنجیوں کے لحاظ سے صرف اس شخص کا حصہ ہیں، لٹریچر کی ہیں۔" (افادات مہدی)

ڈاکٹر عبدالحق سیکریٹری انجمن ترقی اردو مولانا نذیر احمد صاحب کے متعلق لکھتے ہیں:۔

" روزمرہ کے معمولی واقعات جو صبح و شام ہماری آنکھوں کے سامنے ہمارے گھروں میں اندر اور باہر واقع ہوتے رہتے ہیں ان کا بیان کرنا مولانائے مرحوم پر ختم ہے۔"

رام بابو سکسینہ ہسٹری آف اردو لٹریچر (تاریخ ادب اردو) میں مولانا موصوف کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"مولانا (نذیر احمد) کی عبارت بہت آسان اور صاف اور سادہ ہوتی ہے البتہ کبھی کبھی بڑے بڑے عربی و فارسی کے غیر مانوس الفاظ لے آتے ہیں اور کہیں رنگین عبارت اور صنائع بدائع سے اور بعض مواقع پر انگریزی الفاظ سے بھی کام لیتے ہیں جن سے ہمارے نزدیک عبارت میں بجائے چستی اور خوبصورتی کے بھونڈا پن اور خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔"

ان خیالات کی روشنی میں مولانا نذیر احمد کا ایک زبردست علمی شاہکار ترجمہ و فوائد قرآن کے ساتھ علامہ عثمانی کے فوائد تفسیری آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ جن سے دونوں اہل علم و ادب کا موازنہ آسانی سے ہو سکے گا۔ یہاں یہ بھی ظاہر کر دوں کہ دونوں حضرات مولانا بھی ہیں اور ڈاکٹر بھی۔ علامہ عثمانی کو ان کی وفات کے بعد پنجاب یونیورسٹی لاہور نے ۱۹ دسمبر ۱۹۴۹ء کے کانووکیشن جلسہ تقسیم اسناد میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی تھی۔

ناقدین کا خیال ہے کہ ڈاکٹر نذیر احمد کے کارناموں میں سب سے بڑا کارنامہ ان کا ترجمۂ قرآن حکیم اور اس کا حاشیہ ہے۔ خود ڈاکٹر نذیر احمد کو بھی اس چیز پر فخر رہا ہے۔ چنانچہ مقدمۂ قرآن میں ڈاکٹر نذیر احمد لکھتے ہیں۔

"میں قرآن کے ترجمہ کی ضرورت مدتوں سے سمجھا بیٹھا تھا مگر ایسی جرأت کرتے ہوئے جی ڈرتا تھا کہ خدا کا کلام ہے اور دین اسلام کا دار مدار اسی پر ہے اس کے ترجمے کو بڑی لیاقت اور معلومات چاہیئے ------

---- جب میں نے تیسیر میں سے کتاب التفسیر کا ترجمہ کیا اور اس ضمن میں آیات قرآنی کا تو ایک دم سے میری رائے بدل گئی اور میں نے کہا آیات قرآنی جیسی حدیث میں ویسی قرآن میں ------ اس خیال نے ایسا آکر دبایا کہ میں نے تیسیر کا ترجمہ تو کیا موقوف اور بسم اللہ کر کے قرآن

کا ترجمہ شروع کر دیا۔

اپنی چھاچھ کو کون کھٹا کہا کرتا ہے ہر کس را عقلِ خود بکمال، میں تو اپنے ترجمہ کی تعریف کروں ہی گا۔ مگر اپنے منہ میاں مٹھو کا طعنہ کون سُنے۔ میں تو بس اتنا ہی کہتا ہوں کہ میں نے ترجمے کے عیب وصواب ترجمے کی مشکلات کلام الٰہی کی عظمت ان سب باتوں کو اچھی طرح سے سوچ سمجھ کر خالصتاً لوجہ اللہ ترجمہ کے لئے قدم اٹھایا ہے وقت اور محنت اور زر کے صرف کرنے میں کسی طرح کا دریغ نہیں کیا۔"

مقالہ نگار کو اس سے بحث نہیں کہ ڈاکٹر نذیر احمد کا ترجمہ کیسا ہے۔ صحیح یا غلط جیسا کہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی اور دوسرے بہت سے علماء نے ان پر کڑی نکتہ چینی کی ہے اور بہت سی غلطیاں نکال کر رکھ دی ہیں۔ مولانا تھانوی نے ایک مستقل رسالہ " اصلاح ترجمہ دہلویہ " سے معنون تحریر فرمایا جس کا حوالہ حیاتِ النذیر" میں سید افتخار عالم بلگرامی نے دیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

" ہاں مولوی محمد اشرف علی صاحب تھانوی کا ایک رسالہ " اصلاح ترجمہ دہلویہ" کے نام سے ہماری نظر سے اور گذرا ہے۔ اس میں مولانا نے صاف الفاظ میں لکھ دیا ہے کہ بامحاورہ بے محاورہ ہونے کا فیصلہ کرنا تو اہل زبان کا کام ہے مگر دوچار متفرق مقام پر نظر ڈالنے سے اتنا معلوم ہوا کہ اس میں خود مطالب قرآنیہ بھی کہیں متن سے اور کہیں حاشیہ سے بدل گئے ہیں۔ چونکہ ایسی حالت میں بجائے منفعت کے عام مسلمانوں کو اس سے مضرت پہنچنے کا قوی اندیشہ تھا اس لئے اس کا انسداد ضروری ہوا۔ عام مسلمانوں کے حفاظتِ دین کی ضرورت سے ترجمہ مذکورہ بالا بالاستیعاب اول سے آخر تک دیکھنا پڑا جن لغزشوں کا گذر عقائد و احکام تک نہ تھا ان سے

زیادہ تعرض نہیں کیا گیا مگر جن کا اثر عقائد و احکام تک پہنچتا ہوا دیکھا اور کوئی توجیہہ قریب بھی نہ بن سکی ان کو ضبط کیا گیا" (اصلاح ترجمہ دہلویہ)

رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں :۔

" مولانا کا سب سے بڑا کارنامہ ان کا اردو ترجمہ قرآن شریف ہے جو نہایت آسان اور بامحاورہ زبان میں کیا گیا ہے۔ مولانا نے چار عالموں کی مدد سے پورا ترجمہ نہایت محنت و جانکاہی سے تین برس کے عرصہ میں پورا کیا۔ مگر اس میں بھی اتنا نقص ضرور ہے کہ بعض جگہ ترجمہ کی متانت قائم نہ رہی اور اصل الفاظ کا مطلب اردو الفاظ و محاورات کے بیجا تصرف سے جاتا رہتا ہے اور نیز یہ کہ کثرتِ تشریح اور اضافۂ تمثیلات کی وجہ سے ترجمہ ترجمہ نہیں رہتا بلکہ ایک تفسیر کی شان پیدا ہو جاتی ہے"

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے " البوادر النوادر" میں بھی اس ترجمہ پر تبصرہ فرمایا ہے۔ غرض بہت سے معقول لوگوں نے اعتراضات کئے ہیں۔ علمائے ندوہ نے بھی پچاس اعتراضات چنے تھے جن کا حوالہ "حیات النذیر" کے مرتب نے دیا ہے۔ آخر کار مرتب نے یہ لکھ کر آگے قدم بڑھایا ہے :۔

" اب رہی یہ بات کہ فاضل مترجم نے درحقیقت ترجمۃ القرآن میں کوئی غلطی کی ہے یا نہیں اس کا تصفیہ ہم سے متعلق نہیں۔ یہ کام ہے علماء تفسیر و قرآن کا"

یہ غلطیاں ڈاکٹر نذیر احمد سے کیوں ہوئیں اس کا جواب ڈاکٹر نذیر احمد کا مقدمہ قرآن خود دے گا۔ ڈاکٹر صاحب مقدمہ میں لکھتے ہیں :۔

" پس یہ ترجمہ براسہ قرآن کا ترجمہ ہے نہ دوسرے ترجموں کی طرح کسی ترجمہ کا ترجمہ۔ اس کا ماخذ قرآن کے الفاظ ہیں نہ کسی مفسر یا مترجم کے۔ پھر ہم

دونوں (یعنی مولانا نذیر احمد اور ابو عبد الرحمن محمد پنجابی) نے ترجمہ پر نظر ثانی کی۔ مولوی محمد صاحب ترجمہ پڑھتے اور میں عبارت کی سلاست اور الفاظ کی نشست کا دھیان رکھتا اور ترجمے کو الفاظ قرآن سے ملاتا اور پھر ہم دونوں میں پہلے کی طرح بحث ہوتی۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ بحث میں رنجش ہو جاتی۔"

آگے چل کر ڈاکٹر نذیر احمد لکھتے ہیں:۔

"ایسی کاوش کے ساتھ ترجمہ اور نظر ثانی کرنے پر بھی ہم نے بہتیرا چاہا کہ لوگ ترجمے کو دیکھیں اور نکتہ چینی کریں مگر کسی نے ہامی نہ بھری۔"

ان تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ ترجمۂ قرآن میں ڈاکٹر نذیر احمد نے خود اعتمادی کے ہاتھوں ٹھوکریں کھائی ہیں کہ محض اپنے اور محمد صاحب کے طے کئے ہوئے ترجمہ پر بھروسہ کر بیٹھے۔ شاہ عبد القادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ کی طرف رجوع نہیں کیا۔ پھر مولوی محمد صاحب بھی ڈاکٹر صاحب سے بگڑ بگڑ بیٹھے تھے معلوم ہوا کہ وہ بھی ان کے ترجمہ سے اتفاق نہ کرتے ہوں گے۔ پھر اس عبارت سے کہ "ہم نے بہتیرا چاہا کہ لوگ ترجمے کو دیکھیں اور نکتہ چینی کریں مگر کسی نے ہامی نہ بھری۔" معلوم ہوتا ہے کہ ان کو خود بھی اپنے ترجمے میں تذبذب تھا اور دوسرے بھی بے اطمینانی کے باعث دیکھنا یا تنقید کرنا پسند نہ کرتے ہوں گے اور یہ ان کے زمانہ کے علماء ہی ہوں گے۔

میرا مقصد ڈاکٹر نذیر احمد کے قرآن کے ترجمہ اور تفسیر پر اس تنقید سے صرف اس قدر ہے کہ میں یہ بتا سکوں کہ علامہ عثمانی کی تفسیر کے متعلق ہندوستان کے کسی گوشے سے کوئی مخالف آواز سوائے تعریف کے نہیں اٹھی۔ اپنے اور پرائے سب نے اَحْسَنْتَ کہکر لبیک کہی۔

اس مرحلے پر پہنچکر جبکہ ڈاکٹر نذیر احمد کی اردو ادبی گل کاریوں کے متعلق ناقدین کی رائیں آپ کے سامنے آچکی ہیں، اب تفسیر کی عبارتیں پیش کر کے علامہ شبیر احمد اور ڈاکٹر نذیر احمد کا ادبی اور علمی موازنہ کرنے کا وقت آگیا ہے۔

پہلا موازنہ

اَللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَیَبْسُطُهٗ فِی السَّمَآءِ كَیْفَ یَشَآءُ وَ یَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَاۤ اَصَابَ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اِذَا هُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ ۝ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِیْنَ ۝ فَانْظُرْ اِلٰۤى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَیْفَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْیِ الْمَوْتٰى ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝

(ترجمہ) اللہ ہے جو چلاتا ہے ہوائیں پھر وہ اٹھاتی ہیں بادل کو پھر پھیلاتا ہے اس کو آسمان میں جس طرح چاہے اور رکھتا ہے اس کو تہ بتہ پھر تو دیکھتا ہے مینہ کو کہ اس کے درمیان میں سے نکلتا ہے پھر جب اس کو پہنچاتا ہے جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں میں تو وہ خوشیاں کرنے لگتے ہیں اگرچہ وہ اس سے پہلے ہی ناامید تھے پس دیکھ لو اللہ کی رحمت کی نشانیوں کی طرف کہ کیونکر زندہ کرتا ہے زمین کو اس کے مُردہ ہوجانے کے بعد بیشک وہی مُردوں کو زندہ کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

(پارہ ۲۱ سورۂ روم رکوع ۸)

⁂

ڈاکٹر نذیر احمد دہلوی کی تفسیر

لہ بادل کی اصل یہ ہے کہ وہ ایک طرح کی بھاپ ہے جو آفتاب کی گرمی کی وجہ سے ہر ایک گیلی اور سیلی چیز اور خصوصاً سمندر سے پیدا ہوتی ہے پھر ہوا بحکم خدا بھاپ کو اڑائے اڑائے پھرتی اور اوپر کی سردی پاکر وہ بھاپ پانی ہو کر برستی ہے بعینہ ایسی صورت ہے جیسے دیگچی میں پانی گرم کرو اوپر سے دیگچی کو ڈھک دو گرمی پاکر پانی سے بھاپ اٹھے گی اور چپنی سے لگ کر بوندوں کی شکل میں ٹپکے گی مگر شروع سے اخیر تک یہ تمام تصرفات خدا ہی کے حکم سے ہوتے ہیں ورنہ سمندر اور سیلہ اور دھوپ اور ہوا سبھی چیزیں ہوتی ہیں اور برسات اور جھاڑے دونوں موسم سوکھے گذر جاتے ہیں پانی کی بوند بھی نہیں برستی اس لئے کہ خدا بندوں کو ان کی نافرمانیوں کی سزا دیتا اور بارانِ

علامہ شبیر احمد عثمانی کی تفسیر

لہ پہلے فرمایا تھا کہ مقبول اور مردود جدا کر دیے جائیں گے۔ منکروں پر ان کے انکار کا وبال پڑے گا۔ وہ اللہ کو اچھے نہیں لگتے۔ اب بتلاتے ہیں کہ اس کا اظہار دنیا ہی میں ہو کر رہے گا۔ کیونکہ اللہ کی عادت اور وعدہ ہے کہ مجرمین و مکذبین سے انتقام لے اور مومنین کاملین کو امداد و اعانت سے دشمنوں پر غالب کرے۔ بیچ میں ہوا کا ذکر اس واسطے آیا کہ جیسے بارانِ رحمت کے نزول سے پہلے ہوائیں چلتی ہیں اسی طرح دین کے غلبہ کی نشانیاں روشن ہوتی ہیں جاتی ہیں۔ ۲ یعنی پہلے کسی طرف اور پیچھے کسی طرف اسی طرح دین بھی پھیلائے گا چنانچہ پھیلا دیا۔ ۳ اسی طرح جو ایمانی اور روحانی بارش سے منتفع ہوں گے وہ خوشیاں منائیں گے ۴ یعنی پہلے سے لوگ

رحمت کو روک لیتا ہے ؎

نبارد ہوا تا نہ گوئی ببار

زمین نا ورد تا نہ گوئی ببار

؎ زمین پڑتی پڑی ہوتی ہے تو اس میں نباتات کی قسم کی کوئی چیز نہیں ہوتی ۔ زمین کی اسی حالت کو مرنا فرمایا پھر جب زمین جوتی بوئی گئی اور اس کی پیداوار لگی ہوا سے ہلنے اور لہلہانے زمین کی اس حالت کو اس کی زندگی سے تعبیر کیا کیسے اچھے استعارے ہیں ۔

(پارہ ۲۱ سورہ روم رکوع ۵)

ناامید ہو رہے تھے حتیٰ کہ بارش آنے سے ذرا پہلے تک بھی امید نہ تھی کہ مینہ برس کر ایسی جگ پڑ لوہ ہو جائے گی ۔ انسان کا حال بھی عجیب ہے ذرا دیر میں ناامید ہو کر بیٹھ جاتا ہے پھر ذرا سی دیر میں خوشی سے کھل پڑتا ہے ؎ یعنی چند گھنٹے پہلے ہر طرف خاک اڑ رہی تھی اور زمین خشک، بے رونق اور مردہ پڑی تھی ناگہاں اللہ کی مہربانی سے زندہ ہو کر لہلہانے لگی بارش نے اس کی پوشیدہ قوتوں کو کتنی جلد ابھار دیا ۔ یہ ہی حال روحانی بارش کا سمجھو اس سے مردہ دلوں میں جان پڑے گی اور خدا کی زمین ظھر الفساد فی البر والبحر والی موت کے بعد دوبارہ زندہ ہو جائے گی ۔ ہر طرف رحمت الٰہی کے نشان اور دین کے آثار نظر آئیں گے جو قابلیتیں مدت سے مٹی میں مل رہی تھیں مارا

رحمت کا ایک چھینٹا ان کو ابھار کر
نمایاں کر دے گا ۔ چنانچہ حق تعالےٰ
نے بعثتِ محمدی کے ذریعہ سے یہ جلوہ
دنیا کو دکھلا دیا ۔ ہمارے صوبہ کے
شاعر حکیم نے کیا خوب کہا ہے ؎
ہے یہ وہ نام خاک کو پاک کرے نکھار کر
ہے یہ وہ نام خار کو پھول کرے سنوار کر
ہے یہ وہ نام ارض کو کر دے سما ابھار کر
اکبر اسی کا ورد تو صدق سے بیشمار کر
صَلِّ علیٰ محمدٍ صَلِّ علیٰ محمدٍ

ڈاکٹر نذیر احمد کی اردو نہایت ہی سادہ ہے ۔ سلاست و روانی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے ۔ اردو بامحاورہ ہے ۔ طرز ادیبانہ ہے ۔ جملے نکھرے نکھرے سے معلوم ہوتے ہیں ۔ درمیانِ تفسیر میں فارسی کے شعر نے بہار کا سماں پیدا کر دیا ہے جو ان کے ذوقِ ادب کا عنوان ہے ۔ البتہ گیلی اور سیلھی نے عبارت کو پھسپھسا بنا دیا ۔ اسی طرح چپنی کا لفظ بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا ۔ یہی حال سمندر اور سیلھ اور دھوپ کے جملے کا ہے ۔ اگر سیلھ کی بجائے رطوبت یا نمی کا لفظ ہوتا تو بہتر ہوتا ۔ اسی طرح زمین پڑتی پڑی ہوتی ہے بھی زبان پر اچھا نہیں لگتا ۔

علامہ عثمانی کی عبارت میں بھی شگفتگی ، شان و شکوہ ، روانی اور تحریر میں تازگی معلوم ہوتی ہے ۔ الفاظ ستھرے ستھرے اور جملے نتھرے نتھرے ہیں ۔ تفسیر کے آخر میں اکبرؔ کے اشعار نے روح میں عشق اور عشق میں حسن پیدا کر دیا ہے ۔ برمحل اشعار کی چسپیدگی نے آسمانِ ادب پر چار چاند لگا دیے ہیں جو

ان کے ادبی سلیقہ کی بہار ہے۔ صَلِّ عَلٰی محمدٍ کے تکرار نے ترنم کی کیف زا مستیوں سے رُوح میں ارتعاش پیدا کر دیا ہے۔

علامہ شبیر احمد کی تمام عبارت میں خط کشیدہ جملے کتنے فصیح ہیں۔ ایک لفظ بھی ساری تحریر میں غیر فصیح نظر نہیں آتا، جگ پر لو کی ترکیب یہاں کتنی پیاری معلوم ہوتی ہے۔

تفسیر کی معنوی صورت کا جہاں تک تعلق ہے ڈاکٹر نذیر احمد نے ان آیات کا مطلب سمجھانے کی کوشش نہیں کی صرف ایک فلسفیانہ نکتہ حل ضرور کیا ہے جو علامہ عثمانی نے حل نہیں کیا البتہ اس مضمون کی بیشتر کی آیات میں انہوں نے فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے بادل اور بخارات نیز بارش پر تبصرہ کیا ہے، اس وجہ سے یہاں چھوڑ دیا۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے ان آیات کا پہلی آیات سے ربط ظاہر نہ کر کے تفسیر کا حق ادا نہیں کیا۔ دکھانا یہ تھا کہ ان آیات سے بالائی سلسلہ میں کیا ربط ہے اور اثنار کلام میں ہواؤں اور بادلوں کا ذکر کیوں آیا اور پھر کفار کی حالت کی طرف کلام ربانی نے کیوں رُخ پھیر لیا۔ آخر ان ہواؤں کے چلنے اور بادلوں کے برسنے، زمین مُردہ کے زندہ ہونے اور پھر مُردوں کے زندہ کرنے اور آخر میں "عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ" کہکر قدرت کا اظہار کرنے میں کیا کیا مضامین مستتر ہیں۔ علامہ عثمانی کی شروع سے لیکر آخر تک انہی آیتوں کے نمبروں کی تفسیر نے ربط، استعارہ اور بارش سے زمین کے لہلہانے اور رحمتِ روحانی کی بارش سے کفار کی مُردہ دلوں کو زندہ کرنے کی تمام شقیں اور رکروٹیں واضح کر دی ہیں جس کے باعث آیات کے معانی سمجھنے میں کوئی تشنگی باقی نہیں رہتی۔

✻✻✻

دوسرا موازنہ ۲

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ ؕ اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّھَا کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیْتُوْنَۃٍ لَّا شَرْقِیَّۃٍ وَّلَا غَرْبِیَّۃٍ ۙ یَّکَادُ زَیْتُھَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ ؕ یَھْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَیَضْرِبُ اللّٰہُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۙ

ترجمہ) اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے ۔ اس کے نور کی مثال (ایسی ہے) جیسے ایک طاق میں ایک چراغ ہو ۔ وہ چراغ ایک شیشے میں دھرا ہو ۔ وہ شیشہ چمکتے ہوئے تارے کی مانند ہے ۔ اس میں ایک بابرکت درخت زیتون کا تیل ہے ۔ (وہ چراغ) نہ مشرق کی طرف ہے اور مغرب کی طرف، قریب ہے کہ اس کا تیل روشن ہو جائے اگرچہ اس میں آگ نہ لگی ہو ۔ روشنی پر روشنی ہے ۔ اللہ اپنی روشنی کی جس کو چاہے راہ دکھلائے ۔ اللہ لوگوں کے لئے مثالیں بیان کرتا ہے اور اللہ ہر چیز کو جانتا ہے (مرتب)

ڈاکٹر نذیر احمد	علامہ شبیر احمد
دنیا کا کوئی نور اللہ کے نور کو نہیں پا سکتا تاہم لوگوں کے سمجھانے کے لئے دنیا ہی کا کوئی نور لینا ہوگا	نور الٰہی سے ہدایت وعرفان کا جو خصوصی حصہ ملتا ہے اس کی مثال ایسی سمجھو گویا مومن قانت کا جسم

سو جس نور سے خدا کے نور کو تشبیہ دی گئی ہے اس میں عمدہ صفتیں جمع ہیں کہ چراغ ہے تو یہ مطلق نور ہوا۔ پھر طاق میں رکھا ہے تاکہ روشنی منتشر نہ ہو پھر صرف چراغ نہیں بلکہ شیشے کی قندیل میں ہے اور شیشہ بھی نہایت شفاف ہے اور تیل جو اس چراغ میں جلتا ہے زیتون کا ہے کہ دنیا کے تمام تیلوں سے اس کی روشنی صاف ہوتی ہے اور یوں بھی زیتون کا درخت بڑا مبارک درخت ہے کہ لوگوں کے اس میں چند در چند فائدے ہیں۔ اور زیتون بھی سایہ پرور کہ باغ کے نہ پورب کی طرف واقع ہے نہ پچھم کی طرف بلکہ بیچ باغ میں ہے اور ہمہ وقت سایہ میں رہتا ہے کہ ایسے درخت کا تیل خواہی نخواہی عمدہ سے عمدہ ہوگا۔ پھر وہ چراغ بت خانے یا شراب خانے یا قمار خانے

ایک طاق کی طرح ہے جس کے اندر ایک ستارہ کی طرح چمکدار شیشہ (قندیل) رکھا ہو۔ یہ شیشہ اس کا قلب ہوا۔ جس کا تعلق عالم بالا سے ہے۔ اس شیشہ (قندیل) میں معرفت و ہدایت کا چراغ روشن ہے یہ روشنی ایسے صاف و شفاف اور لطیف تیل سے حاصل ہو رہی ہے جو ایک نہایت ہی مبارک درخت (زیتون) سے نکل کر آیا ہے اور زیتون بھی وہ جو کسی حجاب سے نہ مشرق میں ہو نہ مغرب میں یعنی کسی طرف دھوپ کی روک نہیں۔ کھلے میدان میں کھڑا ہو جس پر صبح و شام دونوں وقت کی دھوپ پڑتی ہے۔ تجربہ سے معلوم ہوا کہ ایسے زیتون کا تیل اور بھی زیادہ لطیف و صاف ہوتا ہے۔ غرض اس کا تیل اس قدر صاف اور چمکدار ہے کہ

کا نہیں ہے بلکہ خانۂ خدا میں جل رہا ہے اور وہاں خدا پرست لوگ خلوصِ دل سے خدا کی عبادت میں مصروف ہیں۔ اتنی صفتوں کا چراغ ہو تو کسی قدر اس کو دور کی مشابہت ہو سکتی ہے۔

(پارہ ۱۸ سورۂ نور رکوع ۱۱ ترجمہ و تفسیر ڈاکٹر نذیر احمد)

بدون آگ دکھلائے ہی معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود روشن ہو جائے گا۔ یہ تیل میرے نزدیک اسی حُسنِ استعداد اور نورِ توفیق کا ہوا جو نورِ مبارک کے القا سے بدو فطرت میں مومن کو حاصل ہوا تھا۔ اور جس طرح شجرۂ مبارکہ "لاشرقیۃ ولا غربیۃ" فرمایا تھا وہ نورِ ربّانی بھی جہت کی قید سے پاک ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ مومن کا شیشۂ دل نہایت صاف ہوتا ہے اور خدا کی توفیق سے اس میں قبولِ حق کی ایسی زبردست استعداد پائی جاتی ہے کہ بدون دیا سلائی دکھلائے ہی جل اٹھنے کو تیار ہوتا ہے۔ اب جہاں ذرا آگ دکھائی یعنی وحی و قرآن کی تیز روشنی نے ان کو مَس کیا فوراً اس کی فطری روشنی بھڑک اٹھی اسی کو "نُورٌ عَلٰی نُوْرٍ" فرمایا۔ باقی یہ

سب کچھ اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے جس کو چاہے اپنی روشنی عنایت فرمائے اور وہی جانتا ہے کہ کس کو یہ روشنی ملنی چاہیئے کس کو نہیں۔ ان عجیب و غریب مثالوں کا بیان فرمانا بھی اسی غرض سے ہے کہ استعداد رکھنے والوں کو بصیرت کی ایک روشنی حاصل ہو حق تعالیٰ ہی تمثیل کے مناسب موقع و محل کو پوری طرح جانتا ہے۔ کسی دوسرے کو قدرت کہاں کہ ایسی جامع اور موزوں مثال پیش کر سکے۔ آگے فرمایا کہ وہ روشنی ملتی ہے اس سے کہ جن مسجدوں میں کامل لوگ صبح و شام بندگی کرتے ہیں۔" (تفسیر عثمانی مطبوعہ مدینہ پریس)

تنقید جو آیات پیش نظر ہیں اس میں توازن کی جولانیاں دکھلانے کا مفسرین کو خوب خوب موقع ملا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان آیات میں نور ربانی کی تشبیہ سے وضاحت کی گئی ہے جس میں روحانی انوار جگمگ کر رہے ہے۔ اس موقع پر مفسرین خصوصاً وہ جو اہل نظر ہیں اپنے قلم اور

صفائے قلب کی جلوہ آرائیاں کرتے ہیں۔ اسی لئے اس مقام کو شبیری اور نذیری توازن کا جولانگاہ بنایا گیا ہے۔

نذیری تفسیر کی عبارت تمام کی تمام فصیح ہے کوئی لفظ غیر فصیح نظر نہیں آتا۔ عبارت میں سادگی، سلاست، صفائی کے علاوہ لوچ، گھلاوٹ اور شیرینی ہے۔ تحریر کے جملے آپس میں ایک دوسرے سے نہایت خوش اسلوبی سے مربوط ہیں کہ کوئی خلا نظر نہیں آتا۔

شبیری تفسیر کی خامہ طرازی میں بھی فصاحت و بلاغت، جوش و تسلسل، یکسانیت، شان و شکوہ ہے۔ بندشیں چست، جملے اور الفاظ درست بجائے خود فصیح اور موزوں ہیں۔ نہ صرف شیرینی و شستگی بلکہ تحریر میں ایک چمک ایک تنویر اور ایک خاص کشش ہے جو نگاہ اور دل دونوں کو بس میں لانا چاہتی ہے۔ نذیری عبارت اگر فصیح اور سادہ ہے تو شبیری تحریر فصیح تر اور ہلکی سی رنگین ہے جو تقاضائے مقام ہے۔

معنوی توازن

معنوی حیثیت کے وزن کا اندازہ لگانا دونوں کی گل کاریوں سے واضح ہے۔ نذیری تفسیر میں صرف اللہ کے نور کی مثال پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بس لیکن تفسیر کی اندرونی تہوں کو نذیری قلم نے ٹچ نہیں کیا ہے۔ شبیری تفسیر میں حقیقتوں کے چہروں سے نقاب کو الٹ کر رکھ دیا ہے اور تشبیہ، مشبہ بہ اور مشبہ وغیرہ سب کی بال کی کھال نکال کر رکھ دی ہے۔ نذیری تفسیر کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیے قرآن کریم کے ترجمے سے زیادہ کوئی چیز نہیں سوائے ایک دو جملوں کے لیکن اس کے برعکس شبیری تفسیر میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ "نور الٰہی سے ہدایت و عرفان کا جو خصوصی حصہ ملتا ہے اس کی مثال ایسی سمجھو گویا مومن قانت کا جسم ایک طاق کی طرح

ہے ......الخ۔ پھر شیشہ کو قلب کہکر استعارہ کی وضاحت کی گئی ہے پھر عالمِ بالا سے تعلق قائم کرتے ہوئے اس شیشہ (قندیل) میں معرفت و ہدایت کا چراغ روشن کر کے دکھایا ہے۔ علامہ عثمانی نے زیتون کو درختوں کے درمیان میں قائم نہیں رکھا بلکہ علیحدہ ثابت کیا ہے جس سے لاشرقیۃ ولاغربیۃ کی تفسیر پر کافی روشنی پڑتی ہے کیونکہ خدا کا نور کسی چیز سے گھرا ہوا نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے درخت زیتون کو درمیان باغ میں رکھا ہے حالانکہ یہاں اصل مقصود فوت ہوتا ہے کیونکہ مقصد یہ ہے کہ اللہ کا نور ہر گوشہ میں یکساں ہے۔ علامہ عثمانی نے درخت زیتون کے دھوپ میں رہنے سے تجربتاً اس کے تیل میں لطافت ثابت کی ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے سایہ میں رکھکر اس کے تیل کو عمدہ بتایا ہے۔ علامہ عثمانی نے پھر تفسیر کے آخر میں بطور خلاصہ تشبیہ کی وجہ تام اور تفسیر کا مغز پیش کر دیا ہے ڈاکٹر نذیر احمد کے یہاں یہ جنس مطلق نہیں ملتی۔ ڈاکٹر نذیر کے یہاں انسان کی طلب نہیں بجھتی۔ علامہ عثمانی کے یہاں سے تشنہ پیاس بجھا کر آرہا ہے۔ تفسیر نذیری میں تفسیر کا حق ادا نہیں کیا گیا جس سے قاری کے سامنے غرضِ قرآنی کا آخری پہلو نظر آجائے۔ تفسیر شبیری میں تحقیق، علمیت، روحانیت اور حقیقت تشبیہ کی تکمیل ہے۔ انہوں نے زیتون کے تیل سے قاری کو یہ بتلایا کہ اس سے مُراد وہ حُسنِ استعداد اور نورِ توفیق ہے جو نورِ مبارک کے القاء سے بدو فطرت میں مومن کو حاصل ہوا ہے۔

تیسرا موازنہ

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ
بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ۝ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ
كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ يَخْرُجُ مِنْ

مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (پارہ ۱۴ رکوع ۱۵)

(ترجمہ) اور (اے انسان) تیرے پروردگار نے (شہد کی) مکھی کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ تو پہاڑوں میں گھر بنا اور درختوں میں جہاں ٹٹیاں باندھتے ہیں پھر ہر طرح کے میوے کھا۔ پھر اپنے راستوں میں جو صاف پڑے ہیں چل پھر۔ ان (شہد کی مکھیوں) کے پیٹ سے پینے کی چیز مختلف رنگوں کی نکلتی ہے۔ اس (شہد) میں لوگوں کے لئے شفاء ہے۔ یقیناً اس میں غور کرنے والوں کے لئے نشانی ہے۔ (مرتب)

تفسیر نذیری	تفسیر شبیری
۳ شہد کی مکھیوں کے عجیب حالات ہیں کہ ان کے چھتوں کے خانے اصول علم ریاضی کے مطابق بنے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کہ تھوڑی سی تھوڑی جگہ میں بہت سے بہت شہد آئے۔ شہد کے چھتے میں ایک سلطنت کا سا انتظام پایا جاتا ہے۔ مکھیوں کی ایک ملکہ ہوتی ہے اور چھتے کی تمام مکھیاں اس کی فرمانبردار مکھیوں میں کئی قسم کی مکھیاں ہوتی ہیں۔	لـه شہد کی مکھی کو حکم دینے کا یہ مطلب ہے کہ اس کی فطرت ایسی بنائی ہے جو باوجود ادنیٰ حیوان ہونے کے نہایت کارگری اور باریک صنعت سے اپنا چھتہ پہاڑوں درختوں اور مکانوں میں تیار کرتی ہے۔ ساری مکھیاں ایک بڑی مکھی کے ماتحت رہ کر پوری فرمانبرداری کے ساتھ کام کرتی ہیں، ان کے سردار کو "یعسوب" کہا جاتا ہے جس کے ساتھ مکھیوں کا

کچھ شہد جمع کرنے والی۔ کچھ پہرا دینے والی۔ پہاڑی لوگ بیٹیوں کے جہیز میں شہد کے چھتے دیتے ہیں۔ جو چھتا دینا منظور ہوا اس کی ملکہ کو پکڑ کر حوالے کر دیا۔ سب مکھیاں اس کے ساتھ ہو لیں۔ مکھیاں بہار کے موسم میں شہد جمع کرتیں اور موسم خزاں کے لئے اس کا ذخیرہ رکھتیں۔ جب ان کو چھتے کا چھوڑ دینا منظور ہوتا ہے تو باقیماندہ تمام شہد چاٹ جاتی ہیں۔ غرض ان مکھیوں میں بہت سے عجائبات قدرتِ الٰہی ہیں۔ جن طریقوں سے مکھیاں شہد جمع کرتیں اور اس کی حفاظت رکھتی ہیں انہی کی نسبت فرمایا ہے کہ یہ طریقے خدا نے ان کو تعلیم کئے ہیں ۱۲

(فوائد و تفسیر ڈاکٹر نذیر احمد)

جلوس چلتا ہے۔ جب کسی جگہ مکان بناتی ہیں تو سب خانے "مسدس متساوی الاضلاع" کی شکل پر ہوتے ہیں۔ بدون مسطر و پرکار وغیرہ کے اس قدر صحت و انضباط کے ساتھ ٹھیک ایک ہی شکل پر تمام خانوں کا رکھنا آدمی کو حیرت زدہ کر دیتا ہے۔ حکماء کہتے ہیں کہ مسدس کے علاوہ کوئی دوسری شکل اگر اختیار کی جاتی تو لامحالہ درمیان میں کچھ جگہ فضول خالی رہتی۔ فطرت نے ایسی شکل کی طرف رہنمائی کی جس میں ذرا سا فرجہ بھی بیکار نہ رہے۔

۲؎ کُلِی اور فَاسْلُکِی سب اوامرِ تکوینیہ ہیں یعنی فطرۃً اس کو ہدایت کی کہ اپنی خواہش اور استعداد و مزاج کے مناسب ہر قسم کے پھلوں اور میووں میں سے اپنی غذا حاصل کرے۔ چنانچہ مکھیاں اپنے چھتے سے نکل کر رنگ برنگ کے پھول پھل

چوستی ہیں جن سے شہد اور موم وغیرہ حاصل ہوتا ہے۔ غذا حاصل کرنے اور کھاپی کر چھتے کی طرف واپس آنے کے راستے صاف کھلے پڑے ہیں کوئی روک ٹوک نہیں چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ مکھیاں غذا کی تلاش میں بعض اوقات بہت دور نکل جاتی ہیں پھر بے تکلف اپنے چھتے میں واپس آجاتی ہیں ذرا راستہ نہیں بھولتیں۔ بعض نے فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا سے یہ مطلب لیا ہے کہ قدرت نے تیرے (مکھی کے) عمل و تصرف کے جو فطری راستے مقرر کر دیئے ہیں ان پر مطیع و منقاد بنکر چلتی رہ مثلاً پھول پھل چوس کر فطری قویٰ و تصرفات سے شہد وغیرہ تیار کر (چھتے سے) مختلف رنگ کا شہد نکلتا ہے۔ سفید، سرخ، زرد۔ کہتے ہیں کہ رنگتوں کا اختلاف موسم، غذا اور مکھی کی عمر وغیرہ کے اختلاف سے پیدا ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔ بہت سی بیماریوں میں صرف شہد خالص یا کسی دوسری دوا میں شامل کر کے دیا جاتا ہے جو باذنِ اللہ مریضوں کی شفایابی کا ذریعہ بنتا ہے۔ حدیث صحیح میں ہے کہ ایک شخص کو دست آرہے تھے اس کا بھائی حضور کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ نے شہد پلانے کی رائے دی۔ شہد پینے کے بعد اسہال میں ترقی ہوگئی۔ اس نے پھر حاضر ہو کر عرض کیا کہ حضرت دست زیادہ آنے لگے، فرمایا صَدَقَ اللّٰہُ وَکَذَبَ بَطْنُ اَخِیْکَ" (اللہ سچا ہے اور تیرے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے) پھر پلاؤ۔ دوبارہ پلانے سے بھی وہی کیفیت ہوئی۔ آپؐ نے پھر وہی فرمایا۔ آخر تیسری مرتبہ پلانے سے دست بند ہوگئے اور طبیعت صاف ہوگئی۔ اطبا نے اپنے اصول کے موافق کہا ہے کہ بعض اوقات پیٹ میں "کیموس فاسد" ہوتا ہے جو پیٹ میں پہنچنے والی ہر ایک غذا اور دوا کو فاسد کر دیتا ہے اس لئے دست آتے ہیں۔ اس کا علاج یہی ہے کہ

مسہلات دی جائیں۔ تاکہ "کیموس فاسد" خارج ہو۔ شہد کے مسہل ہونے میں کسی کو کلام نہیں۔ گویا حضورؐ کا مشورہ اسی طبی اصول کے موافق تھا۔ مامون رشید کے زمانے میں ثمامہ عبسی کو جب اسی قسم کا مرض ہوا تو اس زمانے کے شاہی طبیب یزید بن یوحنا نے مسہل سے اس کا علاج کیا اور یہی وجہ بتلائی۔ آج کل کے اطبا شہد کے استعمال کو استطلاقِ بطن کے علاج میں بے حد مفید بتلاتے ہیں۔" (تفسیر القرآن عثمانی)

ادبیت دونوں تفسیریں قارئین کے سامنے ہیں۔ نذیری تفسیر کی عبارت کے سادہ ہونے میں کوئی کلام نہیں لیکن اس عبارت میں تسلسل اور روانی مفقود ہے۔ مثلاً

"پہاڑی لوگ بیٹیوں کے جہیز میں مکھیوں کے چھتے دیتے ہیں، جو چھتا دینا منظور ہوا اس کی ملکہ کو پکڑ کر حوالے کر دیا۔ سب مکھیاں اس کے ساتھ ہولیں۔"

ان تینوں جملوں میں پہلے اور دوسرے دونوں جملوں کے افعال میں موافقت ہونی چاہئے۔ عبارت یوں ہوتی کہ جو چھتا دینا منظور ہوتا ہے اس کی ملکہ کو پکڑ کر حوالے کر دیتے ہیں اور سب مکھیاں اس کے ساتھ ہولیتی ہیں۔

تفسیر شبیری کی تحریر میں اس قسم کی غلطی کا ارتکاب بالکل نظر نہیں آتا۔ شروع سے آخر تک عبارت کی زنجیر کی کڑیاں شہد کی مکھی کے "متساوی الاضلاع" چھتے کی مانند عین برابر اور ایک دوسرے سے مربوط نظر آتی ہیں اور کہیں خلا آنکھ کو نہیں کھٹکتا۔

معنویت تفسیر نذیری میں مکھیوں کے نظام، چھتے کی ساخت، ان کا باہمی رعایا اور پرجا کا سارشتۂ حیات، ان کی فصلِ خزاں کے لئے شہد کی فراہمی پر

دور بینی، چھتے سے اڑنے پر شہد کا چاٹنا ان تمام امور کی مناسب حکمت عملیوں پر تبصرہ کر کے حکمت الٰہی کی حیرت زا کارفرمائیوں کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ لیکن نظم قرآنی کے بقیہ حصوں مثلاً "فاسلکی سبل ربک ذللا" ... "شراب مختلف الوانها" "شفاء للناس" جیسی قابل فکر وغور آیات کو چھوا تک نہیں۔ ایک مفسر کی قابلیت کا تقاضا یہ ہے کہ آیت کے کسی گوشہ کو تشنۂ تکمیل نہ رہنے دے۔

تفسیر شبیری میں اس تمام آیت قرآنی کے چہرے کو روشن کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ چھتے کی "مسدس متساوی الاضلاع ساخت کی حکمت" چھتوں، پہاڑوں میں مسکن، راعی اور رعایا کا رابطۂ زندگی، غذاؤں اور پھولوں سے رس کا چوسنا، مکھیوں کے لئے راہوں کا کشادہ کر دیا جانا شہد کا اقتضائے عمر و طبع کے لحاظ سے مختلف اللون ہونا، شہد کا شفا بننا، پھر حدیث پر بھی شبیری نگاہ کا ہونا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مریض کو شہد پلا کر علاج کا سائنٹفک تجربہ کرنا اور مزید برآں "کیموس فاسد" کا تجزیہ کرنا نیز ثمامہ عیسی کا یزید بن یوحنا سے معالجہ کی مثال پیش کرنا، غرض شروع سے آخر تک یوں معلوم ہوتا ہے کہ علامہ عثمانی نہ صرف مفسر، نہ صرف محدث، نہ صرف حکیم، نہ صرف ادیب بلکہ ان کی تاریخ پر بھی پوری نظر ہے۔ اور ان کی نگاہ سے مناسب مقام کوئی چیز اوجھل نہیں ہے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می بینم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

علامہ شبلی اور علامہ عثمانی

قلم کی رفتار میں تبختر سا نظر آتا ہے۔ شاید اس کے احساسات زیادہ تیز ہو چکے ہیں مقام یقیناً نہایت نزاکت کا ہے۔ اس لئے اگر دماغ خامہ بھی نازک خیال بن جائے تو حیرت کی کیا بات ہے۔ علم و فضل کے پھولوں کی خوشبوئیں مہک رہی ہیں، علمیت کے گلشن میں تازہ غنچے کھل کر پھول بن گئے ہیں۔ بہاریں ہی بہاریں ہیں۔ ناظرین دیکھیے گلشن فضل و ادب کے دو باغبانوں نے علم کے چمن سجائے ہیں۔ نونہالان چمن کیا کیا گل بداماں ہیں۔ ان دونوں گلچینوں نے چمن سے پھول لے کر گلدستے بنائے ہیں جو کبھی نہیں مرجھائیں گے۔

وہ دیکھیے علمی نمائش ہو رہی ہے۔ شبلی کے گلدستے کیسے قرینے سے سجے سجائے رکھے ہیں کہ نگاہیں فردوس بہار بن گئی ہیں۔ ناممکن ہے کہ ان گلدستوں کے پھولوں کی رنگت میں کوئی فرق آئے۔ اے لو کیا نئے نئے قسم کے پھول ہیں اس سے پہلے اس طرح کے خوبصورت پھول شاید ہی دیکھنے میں آئے ہوں۔ سنو کوئی ان گلدستوں کے نام لیکر پکار رہا ہے۔ سیرۃ النبی، الفاروق، شعر العجم۔ یہ گلہائے رنگین علمی نمائش کے گلدستوں میں شبلی کے بہترین دیدہ زیب اور دلفریب مناظر پیش کر رہے ہیں۔ انہیں آنکھوں سے لگا کر دیکھو اور قوت شامہ کو ان کی خوشبوئیں سنگھا کر پوچھو کہ ان کی مہک دماغ کے پردوں میں بس کر سکون و فرحت کے کیسے لخلخے سنگھا رہی ہے۔

سرسید کے پاس ذہن رسا تھا لیکن مذہبی کمند کوتاہ تھی۔ عنقائے معانی کو پھانسنے میں کامیاب نظر نہیں آتے۔ جہاں حقیقت کی ضرورت ہوتی ہے تحقیق کے ہتھیار اٹھا کر بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارتے ہیں، ممکن ہے آپ کو

اختلاف ہو لیکن ہتھیار ڈالتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مولانا نذیر احمد اپنے دور کے بے نظیر ناول نگار ہیں مگر انہوں نے اپنے موضوعات کا آشیانہ بعض کو مستثنیٰ کرتے ہوئے بلندی پر تعمیر نہیں کیا۔ اس لئے ان کا مقام بلند نظر نہیں آتا۔ نذیر احمد تحقیقاتِ علمی کی گھاٹیوں سے پانی نہ پی سکے۔ میدانِ تدقیق و تحقیق کے نشیب و فراز سے پیٹھ پھیر کر بھاگے اور سطاحت کے میدان میں آکھڑے ہوئے۔

مولانا حالی اپنے زمانے کے بے نظیر سوانح نگار ہیں۔ ان کی سادگی، واقعات و سوانح کی صحت بجائے خود قابلِ فخر و ناز ہے۔ ان کا میدان تصنیف "سوانح نگاری" ہے۔

افاداتِ مہدی میں مہدی کی یہ رائے پڑھئے :۔

"سرسید سے معقولات" الگ کر لیجئے تو کچھ نہیں رہتے، نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے۔ شبلی سے تاریخ لے لیجئے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے۔ حالی بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ لیکن محمد حسین آزاد صرف انشاء پرداز ہیں جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں۔"

مہدی کی اس تنقید کا زور محمد حسین آزاد کی انشاء پردازی پر پڑتا ہے۔ مجھے ان کی تائید یا تردید سے صرف اس قدر بحث ہے کہ آزاد لاریب بجائے خود بہترین نثار ہے، حالی کی طرح سوانح نگاری، سرسید کی معقولات، شبلی کی طرح تاریخ کا سہارا لیکر چلنے کی اسے ضرورت نہیں مگر اس کے برعکس میں اپنے قلم کو یہ لکھنے پر مجبور پاتا ہوں کہ پروفیسر آزاد صرف انشاء نگار ہی ہیں اس کے بغیر وہ جی نہیں سکتے لیکن تحقیقی روایات میں آزاد بری طرح فیل ہیں۔ مگر شبلی کی گہری نگاہیں،

تحقیق علمی کے دریا بہتے دیکھتی ہیں۔ ان کی نگاہیں ان سمندروں میں ناخدایانہ مہارت سے تیرتی غوطہ مارتی اور احتیاط سے باہر نکل آتی ہیں۔

علامہ شبلی کی علمی اور ادبی قوتوں پر تبصرے کے بعد ہم آپ کے سامنے ان کی اور علامہ عثمانی کی مشترک المضامین تصنیفات، اول الذکر کی الکلام اور موخر الذکر کی الاسلام رکھتے ہیں۔ لہذا علمی دلچسپیوں کے سلسلے میں ہم آپ کے سامنے ان دونوں اہل علم، اہل قلم کے مشترک علمی مضامین پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ وجودِ باری تعالیٰ کے متعلق ہر دو محققین لکھتے ہیں:-

وجود باری تعالیٰ

علامہ شبلی

انسان کو آغاز تمیز میں جن بدیہی اور حسی مقدمات کا علم ہوتا ہے ان میں ایک یہ ہے کہ وہ جب کسی کو مرتب، باقاعدہ اور منظم دیکھتا ہے تو اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ کسی دانشمند نے ان چیزوں کو ترتیب دیا ہے۔ اگر کسی جگہ ہم چند چیزیں بے ترتیب رکھی دیکھیں تو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ آپ سے آپ یہ چیزیں اکٹھی ہو گئی ہونگی لیکن جب وہ اس ترتیب اور سلیقہ سے

علامہ عثمانی

انہوں (مادہ پرستوں) نے ہم کو ایک نہایت علیم و حکیم اور ہمہ صفت موصوف خدا سے علیحدہ کر کے ایک ایسے خدا (مادہ) پر قناعت کرنے کی رائے دی جو بالکل اندھا بہرا، گونگا اور بے حس و بے شعور ہے جس کا کوئی کام نہ قصد و اختیار سے ہو سکتا ہے نہ مصنوعات میں کسی قسم کی ترتیب اور تناسب پیدا کرنے پر قادر ہے۔ نہ اس میں سمجھ کا مادہ ہے نہ وہ کسی قاعدہ و قانون

کھینچی گئی ہوں کہ ایک ہوشیار صناع بھی بمشکل ان چیزوں کو چن سکتا ہے تو یہ خیال کبھی نہیں ہو سکتا کہ آپ سے آپ یہ ترتیب پیدا ہو گئی ہو گی۔ اس کو ایک اور واضح مثال میں سمجھو خواجہ حافظ یا نظامی کا کوئی شعر لو اس کے الفاظ الٹ پلٹ کر کے کسی معمولی آدمی کو دو اور اس سے کہو کہ الفاظ کو آگے پیچھے رکھکر ترتیب دے ۔ وہ سو سو طرح الٹ پلٹ کرے گا لیکن اتفاقیہ طور سے بھی کبھی یہ نہ ہو گا کہ حافظ اور نظامی کا شعر نکل آئے ۔ حالانکہ وہی الفاظ ہیں وہی حروف ہیں ، وہی جملے ہیں صرف ذرا سی ترتیب کا پھیر ہے ۔ پھر کیونکر ممکن ہے کہ نظام عالم جو اس قدر با قاعدہ مرتب اور موزوں ہے وہ خود بخود قائم ہو گیا ہو ۔

(الکلام ، از شبلی ص ۳۶ و ۳۷)

سے واقف ہے ، نہ اس کو امور انتظامیہ کی اطلاع ہے حالانکہ جس عالم کے فاعل کی ہم کو کھوج لگانا تھی وہ عالم کائنات کا ایسا مجموعہ ہے جس کے ہر ہر جز میں بیش قیمت حکمتیں ودیعت رکھی ہوئی ہیں جس کے عجیب و غریب اسرار کا مشاہدہ کرتے کرتے عقل انسانی تھک جاتی ہے اور جس کے بہت تھوڑے حصہ کا تتبع کرنے سے حکما رکو، اور خصوصاً ان مادیین کو یہ اعتراف کرنا پڑا ہے کہ مظاہر فطرت کی جس قدر باریکیاں ہم معلوم کر سکے ہیں وہ اس سے بہت ہی کم ہیں جو اب تک معلوم نہیں ہو سکیں ۔ علم تشریح ، علم الافلاک ، علم الحیوانات ، علم نباتات اور علم طبقات الارض کے ماہرین سے دریافت کرو ، جو رازہائے قدرت تم نے موجودات عالم میں آج تک دریافت کئے ہیں وہ کس قدر ہیں اور ان کی حفاظت

کے واسطے کتنے دفتر اور کتب خانے
تم کو درکار ہوئے ہیں۔
(الاسلام، از عثمانی ص ۱۶ و ۱۷)

وجود باری تعالیٰ پر علامہ شبلی اور علامہ عثمانی کا زور قلم، روانی اور شور کا ایک دریا بہا رہا ہے۔ ادبی موجیں دونوں کی مسلسل عبارت میں کس طرح تیزی اور جوش سے رواں دواں ہیں کہ قوت استدلال میں ایک خاص سطوت و دبدبہ پایا جاتا ہے۔ فن خطابت میں دونوں علامہ شان امتیازی رکھتے ہیں چنانچہ ان عبارتوں میں خطابت کا طرز خاص طور پر نمایاں اور ابھرا نظر آتا ہے۔ علامہ شبلی کی ذیلی عبارت ملاحظہ ہو :-

"اس کو ایک اور واضح مثال میں سمجھو۔ خواجہ حافظ یا نظامی کا کوئی شعر لو اس کے الفاظ الٹ پلٹ کر کے کسی معمولی آدمی کو دو اور اس سے کہو کہ الفاظ کو آگے پیچھے رکھ کر ترتیب دے۔"

شبلی کی یہ عبارت خطابی طرز نگارش کی آئینہ دار ہے۔ اب علامہ عثمانی کی مذکورہ بالا عبارت حسب ذیل ٹکڑے پر نظر ڈالئے :-

"علم تشریح، علم الافلاک، علم الحیوانات، علم نباتات، اور علم طبقات الارض کے ماہرین سے دریافت کرو جو راز ہائے قدرت تم نے موجودات عالم میں آج تک دریافت کئے ہیں وہ کس قدر ہیں اور ان کی حفاظت کے واسطے کتنے دفتر اور کتب خانے تم کو درکار ہوئے ہیں"

عثمانی کی عبارت کا یہ ٹکڑا بھی طرز نگارش خطابیہ کی نمائندگی کر رہا ہے۔ غرض دونوں کی عبارتوں کو پڑھئے اور ملا کر مسلسل ایک کے دوسرے سے ڈانڈے ملا دیجئے کانٹا بدلا ہوا بالکل نظر نہ آئے گا۔

جہاں تک مضمون کی معنویت اور قوت علمیہ کا تعلق ہے علامہ شبلی عالم کے نظام اور ترتیب سے وجود باری پر استدلال پیش کر رہے ہیں اور تمثیلیہ طور پر حافظ اور نظامی کے شعر کی ترتیب سے عالم کے نظام کی تائید کے ذریعہ اثبات باری تعالیٰ پیش کر رہے ہیں۔ علامہ شبلی کی اس عبارت میں صرف اتنی ہی چیز ہے اور بس، لیکن علامہ عثمانی کی عبارت میں مصنوعاتِ عالم کی ترتیب اور تناسب کا بھی ذکر ہے اور اس کے علاوہ کائنات کی حکمت اور علوم تشریح، افلاک، حیوانات، نباتات اور علم طبقات الارض کی طرف توجہ دلاکر جو کچھ خزانے ان علوم میں قدرت و حکمت الٰہی کے دبے پڑے ہیں عثمانی ان سے وجود باری پر استدلال پیش کر رہے ہیں۔ غرض عثمانی کے یہاں ایک پیرے میں دو دلیلیں ہیں اور بہت سی چیزوں کی طرف اشارے ہیں اور علامہ شبلی کے یہاں صرف ایک ہی نظریہ ہے البتہ مثال سے اس کو واضح کیا گیا ہے۔

مسئلہ توحید

علامہ شبلی	علامہ عثمانی
حقیقت یہ ہے کہ جن اسباب سے ہم کو خدا کے وجود کا یقین ہوتا ہے بعینہٖ وہی اسباب اس بات کے بھی شاہد ہیں کہ خدا ایک ہی ہے۔ نظام عالم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گو بظاہر وہ کثیر الاجزاء یا کثیر الافراد ہے لیکن سب ملکر	اس سارے سلسلۂ عالم کی مثال ایسی ہے جیسے کہ مشینوں اور کلوں کے کارخانوں اور گھڑیوں وغیرہ میں بہت سی کلیں اور پرزے آگے پیچھے ہوتے ہیں۔ پھر اگر کوئی کام لینا منظور ہوتا ہے اول کل کو ہلاتے ہیں اور سب کلیں بہ ترتیب ہلتی

ایک ہے۔ یعنی اس کل ایک ایک پُرزہ دوسرے سے اس قدر وابستہ ہے کہ وہی ایک شخص اس کو چلا سکتا ہے جو تمام پُرزوں کا موجد اور ان کے باہمی تناسب کا محافظ ہو اسی دلیل کو قرآن مجید میں اس طرح ادا کیا ہے:
لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا۔

ہیں اور آخر میں جو کام مقصود ہوتا ہے وہ اخیر کی کل سے ہوتا ہے اب ظاہر ہے کہ یہ کلیں خود بخود نہیں ہلتیں کیونکہ وہ بے حس و حرکت جمادات میں سے ہیں ان کے واسطے جب تک کوئی ذی عقل اور صاحب ارادہ کام لینے والا نہ ہو گا ہرگز کام نہ چلے گا۔ اسی طرح سلسلۂ عالم کے واسطے علت العلل اور فاعل حقیقی ایک خدائے تعالیٰ ہے۔

علامہ شبلی اور علامہ عثمانی دونوں محققین کی اردو نگاری پر اس سے پہلے موازنے میں جو رائے قائم کی گئی ہے وہی یہاں بھی کارفرما ہے۔ میں نے پہلے یہ رائے قائم کی تھی کہ اگر ایک کی عبارت کے ساتھ دوسرے کی عبارت کو متصل کر لیا جائے تو عبارت کے زور اور قوتِ استدلال میں کوئی فرق نظر نہیں آئے گا۔ بلکہ علامہ عثمانی کے کلام میں علامہ شبلی کی بہ نسبت خفیف سا جوش اور سطوت زیادہ نظر آتی ہے۔ دونوں کی عبارت میں روانی، حلاوت اور سلیقۂ ادبیت موجود ہے۔

توحید کے اثبات میں معنوی پہلو کی قدریں تقریباً برابر سرابر ہیں۔ نقطہ ہائے خیال میں فرقدین کی طرح پورا پورا توازن و تقابل نظر آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے دو مقابل کے فلاسفر حکمت و علم کے میدان میں فلسفہ و کلام کے گولہ بارود سے قلم و دماغ کی توپیں اور ٹینک لیکر ایک دوسرے کے سامنے ڈٹے کھڑے ہیں۔

اثبات نبوت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ شبلی

(۱) نبوت کی حقیقت معلوم ہونے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نبی ہونا ایک بدیہی مسئلہ رہ جاتا ہے، نبی کی حقیقت جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اجزائے ذیل سے مرکب ہے:

۱۔ خود کامل ہو۔

۲۔ دوسروں کو کامل کر سکتا ہو۔

۳۔ اس کے علوم و معارف اکتسابی نہ ہوں بلکہ منجانب اللہ ہوں۔

یہ تمام باتیں جس کمال کے ساتھ آپ کی ذات مبارک میں موجود تھیں کیا ابتدائے آفرینش سے آج تک اس کی کوئی نظیر مل سکتی ہے؟

(۲) غور کرو وہ شخص جس نے کسی قسم کی ظاہری تعلیم نہ پائی ہو جس نے

علامہ عثمانی

انبیاء علیہم السلام کے دلوں میں اوّلاً تو خدا کی محبت اور اخلاص اس درجہ ہو کہ ارادۂ معصیت کی گنجائش ہی نہ نکلے۔ دوسرے یہ کہ اخلاق پسندیدہ جو اعمال حسنہ کی جڑ ہیں ان کے اندر فطرتی طور پر راسخ ہوں تاکہ جو کام بھی وہ کریں قابلِ اقتدا اور جو فعل بھی ان سے سرزد ہو باعثِ ہدایت سمجھا جائے تیسرے یہ کہ فہم و فراست ان امتیوں کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ کی ہو کیونکہ کم فہمی فی نفسہ عیب ہونے کے علاوہ اس وجہ سے بھی ان کے حق میں مضر ہے کہ کلام خداوندی کے اسرار غامضہ کا سمجھنا اور دقیق علل پر مطلع ہونا اور ہر ذکی و غبی کو احکام دلنشین طریقے سے سمجھا دینا بغیر عقل صحیح اور فہم کامل کے ہرگز متصور ہی

آنکھ کھول کر اپنے گرد و پیش بُت پرستی کے سوا اور کچھ نہ دیکھا ہو، جس کے کانوں میں ناقوس کے سوا اور کوئی آواز نہ آئی ہو جس نے الٰہیات، اخلاق، اصولِ معاشرت، قانونِ تمدن کے متعلق ایک حرف بھی کسی سے نہ سُنا ہو دفعۃً منظرِ عام پر آئے اور ایک طرف تو فلسفۂ اخلاق، تزکیۂ رُوح، الٰہیات، معاد، قانونِ معاشرت، اصولِ تمدن کے وہ دقائق اور نکات بتائے جو کسی حکیم کسی فلسفی، کسی مقنن، کسی پیغمبر نے کبھی نہیں بتائے تھے۔ دوسری طرف تمام قوم کی قوم میں جو اس وقت جہالت و وحشت، جور و ظلم فسق و فجور، سفاکی و خونریزی میں ڈوبی ہوئی تھی پاکیزہ اخلاقی اور سچائی کی وہ رُوح پھونک دے کہ دفعۃً ان کی کایا پلٹ جائے بجز

نہیں - - - - - - - -

- - - - - - - - - -

اس بدیہی معیارِ رسالت کے مان لینے کے بعد جو میں ابھی عرض کر چکا ہوں حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا ثبوت بالکل آسان ہو جاتا ہے کیونکہ آپ کے بے شمار علمی و عملی کارنامے اس وقت بھی دنیا کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہیں۔ اور نہ تمام اولوالعزم انبیاء علیہم السلام کے معجزات ملکر آپ کے معجزات کی ہمسری کر سکتے ہیں، آپ کے فہم و اخلاق کا موافق و مخالف کو اعتراف کرنا پڑا ہے - - - - - - -

عرب کی جہالت، درشت مزاجی، گردن کشی کون نہیں جانتا جس قوم میں ایسی جہالت ہو کہ کوئی کتاب ان کے پاس آسمانی ہو نہ زمینی اور ان کے اخلاق کا یہ حال ہو کہ قتل و غارت وغیرہ

محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اور کون ہو سکتا ہے؟

(۳) غور کرو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت تمام دنیا کی کیا حالت تھی ہندو اور مصری سینکڑوں خدا یا اوتار مانتے تھے، عیسائی تثلیث کے قائل تھے، صابئین ستارہ پرست تھے، مجوسی یزداں و اہرمن دو خدا تسلیم کرتے تھے، یہودی توحید کے قائل تھے مگر جس قسم کا خدا مانتے تھے وہ انسان سے کچھ ہی بڑھکر بلکہ بہت سی باتوں میں برابر یا گھٹ کر تھا۔ اہل عرب یا تو خدا کے سرے سے قائل ہی نہ تھے یا مانتے تھے تو اس قسم کا خدا مانتے تھے جس کے نہایت کثرت سے لڑکیاں (یعنی ملائکہ) تھیں، بہت سے فرقے ہر دن کا الگ الگ خدا مانتے تھے۔

ایک معمولی حرکت ہو عقل و فہم کی یہ کیفیت کہ پتھروں کو اٹھا لائے اور پوجنے لگے اور گردن کشی کی یہ صورت کہ کبھی کسی بادشاہ کی اطاعت قبول نہ کریں، جفاکشی کی یہ نوبت کہ ایسے ملک میں شاد و خرم گذار دیں۔ ایسے جاہلوں، اور خودسروں کو راہ پر لانا ہی دشوار تھا چہ جائیکہ علم الٰہیات، علم معاملات، علم عبادات، علم اخلاق، علم سیاستِ مُدن میں رشک حکما ر نامدار بنا دیا۔ یہاں تک کہ دنیا نے ان کے شاگردوں کی شاگردی کی۔

ڈاکٹر لیبان کہتا ہے:

"اس پیغمبر اسلام، اس نبی اُمّی کی بھی ایک حیرت انگیز سرگذشت ہے جس کی آواز نے ایک قوم ناہنجار کو جو اس وقت تک کسی ملک گیر کے زیر حکومت نہیں آئی تھی رام

(۴) یہ انسان کی فطرت ہے کہ جو
خیال اس کے دل میں آتا ہے
وہ انہی واقعات، روایات
اور خیالات سے ماخوذ ہوتا ہے
جو اس کے گرد و پیش پھیلے ہوتے
ہیں، انہی سے وہ ادل بدل
کر ایک دوسری صورت بنالیتا
ہے۔ اب غور کرو کہ اگر اس
فطرت کی رو سے آنحضرت
(صلی اللہ علیہ وسلم) کے دل میں
خدا کا خیال آتا تو اس قسم کا
ہوتا جو اس زمانے کے لوگوں کا
تھا لیکن آپ نے جس خدا کی
تلقین کی وہ ایسا خدا تھا جو واحد
محض ہے جس کی ذات اور صفات
میں کسی قسم کا اشتراک نہیں جو نہ
زمین میں ہے نہ آسمان میں نہ
اوپر نہ نیچے نہ دائیں نہ بائیں
نہ زمان میں نہ مکان میں اور
پھر ہر جگہ ہے، جو ایک ایک ذرہ
کو جانتا ہے، چیونٹی کے پاؤں

کیا اور اس درجہ پر پہنچایا
کہ اس نے عالم کی بڑی بڑی
سلطنتوں کو زیر و زبر کر دیا
اور اس وقت بھی وہی نبی
اُمّی اپنی قبر کے اندر سے
لاکھوں بندگانِ خدا کو کلمۂ
اسلام پر قائم رکھے ہوئے
ہے۔"
اگر انصاف کرو تو آپ کے حسنِ
اخلاق کا اندازہ کرنے کے لئے یہی
کافی ہے کہ آپ نہ کہیں کے بادشاہ
تھے نہ بادشاہ کے گھرانے میں پیدا
ہوئے تھے نہ کچھ زیادہ مال و
دولت آپ نے جمع کر رکھا تھا نہ
باپ دادا نے کوئی اندوختہ میراث
میں چھوڑا تھا نہ آپ کے پاس
تنخواہ دار فوج نہ اہل وطن آپ کے
ہمراہ تھے نہ قبیلہ والوں کو آپ کے
مذہب سے ہمدردی تھی ایسی بیکسی
اور بےلبسی کے عالم میں آپ نے
ان تند خو گنواروں کو ایک صدائے

کی آہٹ سُن لیتا ہے، ہمارے دل کے چھپے ہوئے بھیدوں کو جانتا ہے، ایسا منزّہ ایسا کامل ایسا بالاتر خدا انسان خود اپنے خیال سے نہیں پیدا کر سکتا بلکہ وہی خدا یہ خیال پیدا کرا سکتا ہے جو ان صفات کے ساتھ موصوف ہو۔

نامانوس سے مخاطب کیا کہ جس سے بڑھ کر اس وقت ساری دنیا میں کوئی مکروہ آواز نہ تھی اور نہ ایسی صدا دینے والے سے زیادہ ان کے نزدیک کوئی شخص ان کا دشمن اور بدخواہ سمجھا جا سکتا تھا۔ یہ وہی لاالٰہ الااللہ کی آواز تھی کہ جس نے دفعتہً تمام عرب میں تہلکہ ڈال دیا۔ جس سے باطل معبودوں کی حکومت میں ہونچال آنا شروع ہو گیا۔ اور جس کی چمک سے اس کفر اور جہالت کی تاریکیوں میں بجلی سی کوند گئی گویا وہ ایک زور شور کی ہوا تھی جس کے چلتے ہی شرک و بت پرستی کے بادل چھٹ گئے اور آفتابِ توحید ابر کے پردے سے باہر نکل آیا، یا ابابیلِ رحمت تھی جس کی بوچھاڑ نے مخلوق پرستی کے سیاہ ہاتھیوں کے پرخچے اڑا دئے اور خدا کے گھر کو ان کی زد سے بچا لیا۔

نبوت و رسالتمآب محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے اثبات میں علامہ شبلی کا طرز تحریر ادیبانہ ضرور ہے لیکن منطقیانہ استدلال کے غلبہ نے ادب پر غلبہ حاصل کر لیا ہے، نگارش میں صفائی ہے، روانی ہے شبلی کا دوسرا اور تیسرا قطعۂ عبارت، شوکت و شان میں پہلے اور چوتھے پیرے سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ چوتھے پیرے کی عبارت میں ضعف اور خستگی پیدا ہو گئی ہے جیسا کہ ذوقِ سلیم شہادت دے سکتا ہے۔

علامہ عثمانی کی عبارت میں شبلی کی بہ نسبت زیادہ جوش، زیادہ دبدبہ، جزالت اور تسلسل ہے اور عبارت میں استعارہ، شوخی اور تشبیہانہ رنگینی اور جدت اسلوب ہے بالخصوص آخری قطعۂ عبارت کا جواب شبلی کی متوازن عبارت میں مفقود ہے۔ قاری پڑھ کر خود اندازہ لگا سکتا ہے۔ ذرا عثمانی کی عبارت کے حسب ذیل جملے دیکھئے:۔

۱۔ آپ نے ان تندخو گنواروں کو ایک صدائے نامانوس سے مخاطب کیا کہ جس سے بڑھ کر اس وقت ساری دنیا میں کوئی مکروہ آواز نہ تھی۔

۲۔ یہ وہی لا الٰہ الا اللہ کی آواز تھی جس سے باطل معبودوں کی حکومت میں بھونچال آنا شروع ہو گیا۔

۳۔ جس کی چمک سے اس کفر اور جہالت کی تاریکیوں میں بجلی سی کوند گئی۔

۴۔ ایک زور شور کی ہوا تھی جس کے چلتے ہی شرک و بت پرستی کے بادل چھٹ گئے۔ اور آفتاب توحید ابر کے پردے سے باہر نکل آیا۔ یا ابابیلِ رحمت تھی جس کی بوچھاڑ نے مخلوق پرستی کے سیاہ ہاتھیوں کے پرخچے اڑا دئے۔

علامہ شبلی کی عبارت مذکورہ بالا عثمانی جملوں کے جواب سے قاصر ہے۔ علامہ عثمانی کی ساری کی ساری عبارت کی موجیں پورے بہاؤ کے ساتھ ٹھاٹھیں مارتی

چلی جارہی ہے اور درحقیقت اس قسم کے کلامی مسائل میں ایک متکلم کا یہ فرض بھی ہے کہ وہ اپنی قوتِ استدلال کی خاطر بولتے ہوئے الفاظ اور جملے استعمال کرے۔

رہا معنویت کا تعلق تو علامہ شبلی نے اثباتِ نبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے حسب ذیل دلائل پیش کئے ہیں:۔

۱۔ نبی خود کامل ہو۔

۲۔ دوسروں کو کامل کرسکتا ہو۔

۳۔ اس کے علوم و معارف اکتسابی نہ ہوں بلکہ منجانب اللہ ہوں۔

علامہ عثمانی نے رحمت دو عالم کی نبوت کے اثبات میں جو اصول پیش کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ انبیاء علیہم السلام کے دلوں میں محبت و اخلاصِ خداوندی اتنا ہو کہ معصیت کی گنجائش ہی نہ نکل سکے۔

۲۔ اخلاق پسندیدہ جو اعمال حسنہ کی جڑ ہیں ان کے اندر فطری طور پر ہوں تاکہ وہ دوسرے کے لئے نمونہ بن سکیں۔

۳۔ فہم و فراست اُمتیوں کے اعتبار سے زیادہ ہو تاکہ اسرار و غوامضِ الٰہیہ سمجھ سکیں اور دوسروں کو سمجھا سکیں۔

ان اصولوں پر غور کرنے اور ان کا تجزیہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ شبلی نے پہلا معیار نبوت یہ قائم کیا ہے کہ "نبی خود کامل ہو" اور علامہ عثمانی نے یہ فرمایا ہے کہ نبی میں اخلاصِ خداوندی کے باعث معصیت کی گنجائش نہ ہو۔ خلاصہ یہی نکلتا ہے کہ نبی میں نبوت کی استعداد کا کمال اور اطاعت خداوندی پر فطری ملکہ ہونا چاہیئے۔

دوسرا اصول بھی شبلی اور عثمانی کا متحد نظر آتا ہے۔ علامہ شبلی نے فرمایا ہے

کہ نبی دوسروں کو کامل کر سکتا ہو اور علامہ عثمانی کا نظریہ بھی یہی ہے کہ نبی میں اخلاق پسندیدہ فطری طور پر راسخ ہوں کہ وہ دوسروں کے لئے نمونہ بن سکیں۔ اس اصول کے صاف یہ معنی ہیں کہ وہ اپنے کمالِ اخلاق سے دوسروں کو کامل بنا سکے۔

تیسرے اصول میں علامہ شبلی نے کہا ہے کہ نبی کے علوم و معارف اکتسابی نہوں بلکہ منجانب اللہ ہوں علامہ عثمانی نے اسی نظریہ کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ اس کا علم تمام انسانوں سے بڑھ کر ہو۔ اور جب علم سب سے زیادہ ہوگا تو ظاہر ہے کہ وہی سب میں نبوت کا حقدار ہوگا۔

الغرض دونوں کا توازن برابر کا نظر آتا ہے۔ البتہ شبلی نے مختصر الفاظ میں ان اصول کو پیش کیا ہے اور اصولوں کی علت بیان نہیں کی۔ عثمانی نے ان اصولو کے ساتھ ان کی علتوں اور اسباب پر بھی مختصر سی روشنی ڈال دی ہے۔

ان اصولوں کے قائم کرنے کے بعد شبلی نے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے اثبات میں یہ استدلال کیا ہے کہ آنحضرت نے باوجود اُمّی محض ہونے کے اپنی قوم کو علوم و معارف، اقتصادیات و تمدن اور روحانیت کے آسمان پر پہنچا دیا۔ یہ نبی ہی کا کام ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد شبلی نے تمام دنیا کی حالت کا نقشہ کھینچ کر اور شرک و بت پرستی کا بیان کر کے توحید کی ضرورت کا احساس دلایا ہے جس کی سرکار مدینہ نے توجہ فرمائی اور قوم کو موحّد بنا دیا۔

تیسری دلیل خدا کی وحدانیت کے ساتھ اس کی صفات پر روشنی ڈال کر پیش کی ہے کہ نبی کے ہی ذہن میں یہ بات آسکتی ہے کہ خدائے واحد قید زمان و مکان سے پاک اور منزّہ ہے۔

علامہ عثمانی نے رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے اثبات میں آپ کے

علمی اور عملی کارناموں کا ذکر کیا ہے۔ دوسری دلیل میں نہایت شد و مد سے عرب کی سرکشی، خونریزی، نافرمانی اور جہالت کی تصویر کھینچکر ایسی حالت میں اہل عرب کو دنیا و دین کے علوم و معارف سکھانے سے استدلال نبوت کیا ہے اور شبلی سے بڑھ کر کیا ہے اس کے ساتھ علامہ عثمانی نے ڈاکٹر لیبان کا مقولہ تائید میں پیش کیا ہے۔ پھر عثمانی نے تیسرے استدلال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقی و علمی کارناموں سے عرب کی کایا پلٹنے کا جو اظہار کیا ہے وہ ثمرۂ نبوت ہے اور ایک بات جو بے انتہا پتہ کی بتائی ہے وہ یہ ہے کہ غربت، بےکسی، بےبسی کا نقشہ کھینچکر نبی امی کا ایسا عظیم الشان کارنامہ نبوت کی بہترین دلیل ہے۔ یہ ہے وہ توازن جس میں علامہ عثمانی کا پلہ جھکا ہوا نظر آتا ہے۔

علامہ شبلی اور علامہ عثمانی کے ادبی و علمی توازن کا جائزہ لگانے کے لئے قاری کے سامنے جو کچھ مختصر سا مواد پیش کیا گیا وہ بصیرت کے لئے بظاہر کفایت کرسکے گا۔ البتہ اس مقام پر ایک اور شان تقابل پیش کرنا علمی و ادبی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا اور وہ تقابل ہے عربی کی عبارت کا اردو میں صرف ترجمہ کا۔ یہاں تقابل ایک ہی عبارت کے ترجمہ سے وابستہ نہیں کیونکہ مجھے کوئی ایسی عبارت بجستجوئے بسیار بھی نہ مل سکی جو دونوں میں مشترک ہو اس لئے دو عربی عبارتیں اور ان کے ترجمے علامہ شبلی کی طرف سے اور اسی طرح دو عربی عبارتیں اور ان کے تراجم علامہ عثمانی کی طرف سے ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔

لیکن اس سے پہلے یہ اشارہ کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اہل علم کے نزدیک یہ امر مسلم و محقق ہے کہ کسی کتاب یا عبارت کا دوسری زبان میں صحیح، بامحاورہ ترجمہ جس قدر مشکل ہے اس قدر کسی کتاب کا اسی فن میں تصنیف کرنا مشکل نہیں۔ کیونکہ ترجمہ میں مصنف کے کلام کا اسلوب، مد و جزر، قوت و شوکت الفاظ،

تسلسل بعینہ اسی طرز کا ہونا چاہیئے جس سے اصل مصنف کے ادبی اور علمی تیور بگڑنے نہ پائیں۔ اس مختصر سی اہمیت کے بعد علامہ عثمانی اور شبلی کے ترجمے دیکھیئے:۔

از علامہ شبلی

ثم ان سبحانہ وتعالیٰ
اخبرنا بما وعد نابہ فی
الدار الآخرۃ من النعم
والعذاب واخبرنا بما
یؤکل ویشرب وینکح و
یفرش وغیر ذلک فلولا
معرفتنا بما یشبہ ذلک
فی الدنیا لم یفہم ما
وعدنابہ ونحن نعلم
مع ذلک ان تلک الحقائق
لیست مثل ھذہ حتی قال
ابن عباس لیس فی الدنیا
مما فی الجنۃ الا الاسماء

"پھر خدائے پاک نے ہم کو اس آرام
اور رنج کی خبر دی جس کا قیامت
میں وعدہ کیا ہے اور وہ اس طرح
کہ طعام، شراب، ازدواج اور
فرش کا ذکر کیا تو اگر اس قسم کی
چیزوں سے ہم دنیا میں واقف
نہ ہو چکے ہوتے تو ان موعود چیزوں کو
کیونکر سمجھ سکتے۔ تاہم ہم یہ بھی جانتے
ہیں کہ یہ چیزیں دنیا کی چیزوں کے
مانند نہیں ہیں یہاں تک کہ
ابن عباسؓ کا قول ہے کہ دنیا اور
آخرت کی چیزوں میں نام کے سوا
اور کسی چیز میں مشارکت نہیں"۔
(الکلام شبلی)

علامہ ابن تیمیہ کی مندرجہ ذیل عربی عبارت کا ترجمہ

از علامہ عثمانی

فمن جرب مايقولونه (اى الانبياء) ويقوله غيرهم وجد الصواب معهم والخطاء مع مخالفهم كما قال الرازى مع انه من اعظم الناس طعنا فى الادلة السمعية حتى ابتدع قولا ماعرف به قائل مشهور غيره وهو انها تفيد اليقين ومع هذا فانه يقول لقد تاملت الطرق الكلامية والمناهج الفلسفية فما رأيتها تشفى عليلاً وتروى غليلا ووجدت اقرب الطرق طريقة القرآن.

"تو جو شخص انبیاء علیہم السلام کے ارشادات اور لوگوں کے اقوال کا تجربہ کرے گا وہ یقیناً انبیاء کو حق پر اور ان کے مخالفوں کو خطا پر پائے گا۔ دیکھو رازی جو سب سے زیادہ سمعی روایات کو غیر معتبر ٹھہرانے والے ہیں یہاں تک کہ انہوں نے ایسی بات کہی جو ان سے پہلے کسی نے بھی نہ کہی تھی یعنی یہ کہ روایات سے کبھی یقین کا مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس رازی کو بھی یہ کہنا پڑا میں نے فلسفہ اور علم کلام کے طریقوں میں بہت تامل کیا مگر ان کو ہرگز ایسا نہ پایا جو ایک مریض کو شفا بخشیں یا کسی پیاسے کو سیراب کرسکیں ہاں تمام راستوں میں نزدیک تر راستہ قرآن کا ہے۔"

(مقالات عثمانی ص ۲۲۵)

دونوں تراجم آپ کے سامنے ہیں۔ طبیعت سلیم اور ذوق ادب کی روشن شمع کو رہبر بنائیے اور دیکھئے کہ علامہ شبلی اور عثمانی دونوں کے تراجم بامحاورہ ہیں لیکن جو شستگی اور جزالت و چستی علامہ عثمانی کے ترجمہ میں ہے وہ شبلی کے یہاں نہیں ہے۔

اچھا تراجم کا ایک ایک انموذج اور ملاحظہ فرمائیے۔

ترجمہ عبارت امام غزالی از علامہ شبلی

ثم ان المتخیلة یفعل مثل ما یفعل فی حال الرؤیا المحتاجة الی التعبیر بأن یاخذ تلك الاحوال ویحاکیها و یستولی علی الحسیة حتی یوثر ما یتخیل فیها من تلك فی قوة نبطاسیا بان ینطبع الصورة الحاصلة فیها فی البنطاسیا المشارکة فیشاهد صور الٰهیة عجیبة مرئیة واقاویل الٰهیة مسموعة هی مثل تلك المدرکات الوحیة و هذا ادون درجات المعنی المسمی بالنبوة۔

"پھر قوت متخیلہ وہی عمل کرتی ہے جو تعبیر خواب کی حالت میں کرتی ہے، یعنی یہ کہاں واقعات کو لیتی ہے اور ان کی نقل اتارتی ہے اور قوت حسیہ پر چھا جاتی ہے یہاں تک کہ یہ تخیل قوت حس پر اس قدر اثر ڈالتا ہے کہ قوت متخیلہ میں جو صورتیں تھیں وہ حس مشترک میں اتر آتی ہیں تو اس حالت میں عجیب عجیب خدائی صورتیں نظر آتی ہیں اور خدائی آوازیں سنائی دیتی اور وہ ایسی ہوتی ہیں جیسے کہ وحی کے مدرکات اور یہ اس وصف سے جس کو نبوت کہتے ہیں کمتر درجہ ہے"۔ (الکلام صـ ۲۳۳)

ترجمہ عبارت امام غزالی از علامہ عثمانی

فلا اغناء بالعقل عن السماع ولا اغناء بالسماع عن العقل فالداعی الی محض التقلید مع عزل العقل بالکلیة جاهل والمکتفی بمجرد العقل عن انوار القرآن والسنة مغرور فایاك ان تكون من الفريقين وكن جامعًا بين الاصلين فان العلوم العقلية كالاغذية و العلوم الشرعية كالادوية والشخص المريض يستضر بالغذاء متى فاته الدواء فكذلك امراض القلوب لا يمكن علاجها الا بالادوية المستفادة من الشريعة وهي وظائف العبادات

" نہ عقل کو نقل سے استغنا اور نہ عقل نقل سے بے نیاز ہے جیسا کہ عقل کو معزول کر کے محض تقلید کی طرف بلانے والا جاہل ہے اسی طرح وہ شخص بھی دھوکے میں ہے جو قرآن وسنت کے انوار سے علیحدہ ہو کر صرف اپنی عقل پر بھروسہ کرے تو تم کو ان دونوں گروہوں میں سے کسی میں بھی نہ ہونا چاہئے۔ بلکہ عقل ونقل کا جامع بننا چاہئے کیونکہ علوم عقلیہ عقل کی غذا اور علوم شرعیہ اس کی دوا ہیں اور جو مریض دوا کا استعمال نہ کرے اس کو غذا کے استعمال سے نقصان پہنچ جاتا ہے۔ یہی حالت دل کے امراض کی ہے کہ ان کا علاج شرعی دواؤں سے یعنی ان عبادات اور اعمال ہی ہو سکتا ہے جن کو انبیاء علیہم السلام

والاعمال التی رکبھا الانبیاء صلوات اللہ علیھم لاصلاح القلوب فمن لایداوی قلبہ المریض بمعالجات العبادۃ الشرعیۃ واکتفی بالعلوم العقلیۃ استضر بھا کما یستضر المریض بالغذاء وظن من یظن ان العلوم العقلیۃ متناقضۃ للعلوم الشرعیۃ وان الجمع بینھما غیر ممکن ظن صادر عن عمی فی عین البصیرۃ نعوذ باللہ منہ

نے اس کام کے لئے ترکیب دیا ہے۔ پس جس کا دل بیمار ہو اور وہ طب شرعی کے بموجب اس کا معالجہ بھی نہ کرے اور علوم عقلیہ کو اپنے حق میں کافی سمجھے وہ اس طرح ہلاک ہوگا جس طرح بیمار آدمی غذا سے ہلاک ہو جاتا ہے، باقی جو لوگ سمجھے علوم عقلیہ کو علوم شرعیہ کے خلاف تصور کرتے ہیں اور دونوں میں تطبیق محال سمجھتے ہیں یہ ان کا خیال اس وجہ سے ہے کہ ان کی بصیرت کی آنکھیں اندھی ہیں، خدا کی پناہ۔" (العقل والنقل)

علامہ شبلی اور علامہ عثمانی دونوں کے ترجمے عالمانہ، ادیبانہ اور بامحاورہ ہیں، لیکن ترجمہ کی شان کا اعلیٰ معیار یہ ہے کہ ترجمہ اس طرح کیا جائے کہ ترجمہ ترجمہ نہ رہے بلکہ مترجم اس رنگ میں ترجمہ کرے کہ گویا اس نے مصنف کے اصلی جوہر کو اپنے مستقل اور مسلسل مضمون میں اپنا لیا ہے۔ یہ خوبی عثمانی کے ترجمہ میں آپ کو زیادہ نمایاں نظر آئے گی۔ علاوہ ازیں عثمانی کا ترجمہ زیادہ سلیس اور سبک ہے اور روزمرہ کے زیادہ مطابق ہے۔

یہاں پہنچ کر شبلی اور عثمانی کا توازن قاری کے لمحاتِ فکر پر ختم کیا جاتا ہے۔ ہم نے جو آپس میں توازن قائم کیا ہے یہ ہمارا اپنا ذوق ہے۔ آپ کو اپنی رائے قائم کرنے کا حق ہے۔

ابوالکلام اور علامہ عثمانی

مولانا ابوالکلام کے علمی، ادبی اور سیاسی کارناموں کے چرچے گھر گھر ہیں۔ کونسی بزم فضل و ہنر ہے جہاں اُن کی شمع علم و ادب روشن نہیں۔ ان کی لیاقت اور قابلیت نے ہندوستان کے گوشے گوشے سے خراج تحسین حاصل کیا ہے۔ ان کے کارناموں سے فضائیں گونج رہی ہیں۔ وہ قلم و زبان دونوں کے مرد میدان ہیں۔ ان کی تقریریں میں جادو اور ان کی تحریریں میں سحر ہے۔ آسمان شہرت پر ان کی ہستی ماہتاب بن کر اس وقت چمکی جب وہ الہلال پر اپنے قلم کی گلکاریاں کر رہے تھے اور البلاغ کا دامن ہیروں سے بھر رہے تھے۔

۱۹۰۵ء میں بنگال کی تقسیم ہوئی اور ۱۹۱۱ء میں دربار میں اس کی تنسیخ کا حکم صادر ہوگیا۔ تقسیم میں مسلمانوں کے فوائد تھے اور تنسیخ میں مضار اس لئے ہندوستان کے مسلمانوں میں سیاسی انقلاب نے ایک کروٹ بدلی انہی دنوں الہلال نکلا۔ ۱۹۱۴ء ہلال بدر بن چکا تھا اور اس کی چمک کے ساتھ مولانا ابوالکلام کی چمک بھی بڑھتی چلی گئی۔ فضل الدین احمد صاحب تذکرۂ ابوالکلام کے دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

> "الہلال کا سب سے کارنامہ جو ہمیشہ تاریخ ہند میں یادگار رہے گا وہ پائدار مذہبی انقلاب ہے جو یکایک مسلمانوں میں اس کی دعوتِ حق سے پیدا ہوگیا۔"

"مذہبی دعوت و تبلیغ، پولٹیکل پالیسی، علمی و ادبی مباحث، طرزِ تحریر و انشاء الفاظ و تراکیب کوئی بات ایسی نہیں ہے جس میں اس

(الہلال) نے اپنا مجتہدانہ رنگ ہاتھ سے دیا ہو۔ اسی خصوصیت کا نتیجہ ہے کہ یکایک ملک تمام پچھلے رنگ مٹ گئے۔"

غرض مولانا ابوالکلام کی زندگی کا اٹھان قومی بیداری اور سیاسی و ادبی مشاغل کا مرکز بن گیا۔ سلسلۂ سیاست و آزادئ ہند میں قید فرنگ کی کڑیاں بھی جھیلیں چنانچہ غبار خاطر کے بہت سے ذرات خطوط کی شکل میں قلعہ احمد نگر کے روشن دانوں کی یادگار تازہ کر رہے ہیں اور اسی طرح تذکرہ کی تحریریں بھی جیسا کہ مقدمہ سے پتہ چلتا ہے، گورنمنٹ بنگال کے، بنگال بدر ہو جانے کے حکم پر اپریل ۱۹۱۶ء کے بعد ابوالکلام کے قیام رانچی کی دماغی تخلیق کے نتائج ہیں۔

مولانا ابوالکلام تحریر و تقریر، تصنیف و تالیف، سیاست و انقلاب کے لمحوں سے کھیلتے رہے تاآنکہ ملک کے نامور لیڈر بن گئے اور ادھر مشہور صاحب قلم اردو کے مشہور ادیب سجاد مرحوم بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی (علیگ) لکھتے ہیں:

"ایک طرف تمدن جدید کروٹ لے رہا تھا اور دوسری طرف ایک انسان کی ہمہ گیر قوتیں روبکار تھیں جن کی ہر جنبش کنگرۂ فرعونیت کو متزلزل اور وقار نمرود کو پامال کر سکتی ہے۔ مولانا ابوالکلام کا دماغ ان معجزات میں سے ہے جو کارکنان قضاء و قدر کی حیرت انگیز کرشمہ طرازیوں کو نمایاں کرتے رہتے ہیں۔"

مولانا ابوالکلام آزاد کی تصانیف میں تذکرہ اور ترجمان القرآن رہتی دنیا تک ان کی یادگار رہے گی۔ یہی سجاد مرحوم لکھتے ہیں:۔

"جب مولانا آزاد قرآن لیکر اٹھے مسلمان مبہوت ہو گئے کہ تیرہ سو برس کے صحیفے میں حال ہی کے لئے نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے نکات و حقائق پوشیدہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام کی شخصیت ان بلند نظر شخصیتوں

میں سے ہے جن کی عظمتوں کا محاصرہ نہیں کیا جا سکتا۔ دورِ جدید میں اگر مذہب کو کسی نے سیاست سے صحیح طور پر ملا دیا ہے اور علماء کے کھوئے اقتدار کو دوبارہ حاصل کر لیا ہے وہ تنہا مولانا ابو الکلام آزاد ہیں۔"

غرض مولانا ابو الکلام ایک زبردست اہلِ علم ہیں۔ ان میں علم و فضل کے علاوہ ادبیت کا جو سلیقہ ہے اس سے بھی کسی کو انکار کی گنجائش نہیں البتہ یہ ضرور ہے کہ عربیت و فارسیت کے خمیری اور فطری اثرات نے انہیں الفاظ مشکلہ کے استعمال پر مجبور کر دیا ہے جس سے اہلِ ادب کا ایک طبقہ بیزار ہے وہ ان کی کس قسم کی ادبیت ہے تذکرہ کی حسب ذیل عبارت پڑھئے:۔

" فی الحقیقت یہی معنی ہیں دیگر صدہا معانی و حقائق ثابتہ کے ساتھ اس رفع ذکر کے کہ " ورفعنالک ذکرک " اور یہی وہ مقام ہے کہ جب اصحابِ کشف و مشاہدات کے سامنے کھلا تو انہوں نے حقیقت محمدیہ کے احاطہ و حیات اور عدمِ زوال و بقا و استمرار کو تمام انبیاء کرام کے حقائق تعینات سے مافوق اور بوجہ دائرۃ الدوائر اور مرکز ادوار تعینات مابعد اور نقطۃ الحیات فی الاصل و الحقیقت ہونے کے تمام انوار تعینات و وجود کو اس کی نورانیت کے سامنے بے فروغ و ماند پایا۔"

اسی قسم کی بے شمار عبارتوں سے تذکرہ بھرا پڑا ہے۔ سلیس اور سادہ عبارتیں بھی تذکرہ میں ضرور ہیں مگر کم۔ اگر تذکرہ پڑھ کر قاری کے کچھ پلے نہ پڑے تو وہ ادب سعی مشکور نہ بنے گا۔ اسی قسم کی عبارتوں کے متعلق ہسٹری آف اردو لٹریچر میں رام بابو سکسینہ کی یہ عبارت دیکھئے:۔

" اگر لوگوں کا میلانِ طبع اس طرف ہے کہ عبارت میں مشکل اور غیر مانوس فارسی عربی الفاظ بالقصد استعمال کئے جائیں تاکہ عبارت

شاندار اور وقیع معلوم ہو .... ہمارے خیال میں اس طرز کے مخترع مولانا ابوالکلام آزاد ہیں جنہوں نے اپنے مشہور اخبار الہلال میں اس کو بہت برتا ہے ۔ مولانائے موصوف مذہب اور سیاسیات پر بڑے زبردست لکھنے والوں میں ہیں۔" (ص ۹۴)

اسی الفاظ مشکلہ اور دقیق سنجی پر برجوہن دتاتریہ کیفی نے بھی کڑی تنقید کی ہے ۔ لکھتے ہیں :۔

" قاہرہ اور بیروت کی عربی اصطلاحوں کے باوجود مولانا ابوالکلام آزاد استدلالی اسلوب کے آخری نمائندہ ہیں۔" (کیفیہ صفحہ ۲۹۸)

یہ سب کچھ مانا مگر ابوالکلام کی اردو روش اور اردو زبان میں شان وشوکت اور بے پناہ دبدبہ وسطوت ہے یوں معلوم ہوتا ہے کہ بادل گرج رہے ہیں اور بجلی کڑک رہی ہے اور اس عالم میں ایک دم بارش برسنے لگی اور بڑی بڑی بوندیں تڑ تڑ پڑنے لگیں ۔ یا ایک دریا ہے جس کی بلند موجیں سنائے سے بھی چلی جاتی ہیں ۔ ان کی سلیس عبارتوں کے نمونے توازن عثمانی میں آپ دیکھیں گے ۔

یہاں پہنچکر مجھے اپنے سلسلۂ تحریر کو علامہ عثمانی کی طرف موڑنا ہے ، اور پاکستان کے اس شیخ الاسلام اور ہندوستان کے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام کا موازنہ کرنا ہے ۔

دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنو

علم وفضل کے ان دوسکولوں کے فیوض ہند اور بیرون ہند میں دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں پہلے سکول سے علامہ عثمانی کا تعلق ہے اور وہ شیخ الہند

مولانا محمود الحسنؒ اسیر مالٹا جیسے بے مثل روحانی وسیاسی رہنما کے ارشد تلامذہ میں سے ان کے ایک محبوب شاگرد ہیں۔ مولانا ابو الکلام آزاد علامہ شبلی جیسے پیکر علم وتحقیق کے چہیتے شاگرد اور تربیت یافتہ ہیں۔ دارالعلوم اسلاف کے قدیم مسلک روحانی اور خالص اسلامی خدمت کا علمبردار ہے اور ندوہ جدید طرز اور علمی اقدار اور اردو زبان کا شگفتہ پھول ہے۔

الغرض علامہ عثمانی اور مولانا ابو الکلام علم وفضل کے دو شہسوار ہیں۔ ان دونوں نے تفسیریں لکھی ہیں۔ دونوں کی تفسیروں کے اقتباسات ہدیۂ ناظرین ہیں ملاحظہ فرمائیں اور جائزہ لیں کہ علم وادب کی کرنیں ان دونوں میں کس طرح "نور علیٰ نور" کا مصداق بن رہی ہیں۔

سُبْحَانَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ۝

"پاک ہے (وہ ذات) جو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی جس کے ماحول کو ہم نے بابرکت بنایا ہے تاکہ ہم اپنی قدرت کے نمونے دکھائیں۔ وہی سننے اور دیکھنے والا ہے۔"

مولانا آزاد ابو الکلامؒ آزاد	علامہ عثمانی شیخ الاسلامؒ
واقعۂ اسریٰ کی نوعیت کیا تھی؟ یہ عالم بیداری میں پیش آیا یا عالم خواب میں، صرف روح	اس کی ذات نقص وقصور اور ہر قسم کے ضعف وعجز سے پاک ہے جو بات ہمارے خیال میں بے انتہا

پر طاری ہوا تھا یا جسم بھی اس میں شریک تھا اس بارے میں صحابہ و سلف کا اختلاف معلوم ہے۔ اکثر صحابہ و تابعین اس طرف گئے ہیں کہ رُوح و جسم دونوں پر طاری ہوا لیکن حضرت عائشہؓ، حذیفہ بن یمان، حسن، معاویہ، ابن اسحاق وغیرہم سے مروی ہے کہ یہ ایک روحانی معاملہ تھا۔

اصل یہ ہے کہ انبیاء کرام (علیہم السلام) کے احوال و واردات ایک ایسے عالم سے تعلق رکھتے ہیں جس کے لئے ہماری عام تعبیرات کام نہیں دے سکتیں۔ ہماری ہر تعبیر کسی ایسی حالت کا تصور پیدا کردے گی جو عام طور پر ہمیں پیش آتی رہتی ہیں۔ لیکن انبیاء کرام کو جو جو حالات پیش آتے ہیں ان کی نوعیت ہی دوسری ہوتی ہے۔ وہ ہمارے محسوسات و مفہومات کے دائرہ سے باہر کے معاملات ہیں۔

عجیب معلوم ہوا اور ہماری ناقص عقلیں اسے مستبعد سمجھیں، خدا کی قدرت و مشیت کے سامنے وہ کچھ بھی مشکل نہیں (یہی قدرت ہے کہ رب قدیر) صرف ایک رات کے محدود حصے میں اپنے مخصوص ترین اور مقرب ترین بندہ (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو حرم مکہ سے بیت المقدس تک لے گیا۔ اس سفر کی غرض کیا تھی آگے چل کر لِنُرِيَهُ مِنْ اٰيٰتِنَا میں اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ خود اس سفر میں یا بیت المقدس سے آگے کہیں اور لے جاکر اپنی قدرت کے عظیم الشان اور حکیمانہ انتظامات کے عجیب و غریب نمونے دکھلانے منظور تھے۔ سورۂ نجم میں ان آیات کا کچھ ذکر کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ سدرۃ المنتہیٰ تک تشریف لے گئے اور نہایت عظیم الشان آیات کا مشاہدہ فرمایا۔ وَلَقَدْ رَاٰهُ

خود نبوت کی حقیقت کیا ہے؟
وحی کا معاملہ کیونکر انجام پاتا ہے؟
کیا اس بارے میں ہماری کوئی تعبیر
بھی حقیقت حال کی کامل تعبیر
ہو سکتی ہے؟ صحیحین کی ایک
حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا
جب وحی آتی ہے تو ایسا معلوم
ہوتا ہے جیسے صلصلۃ الجرس کی
آواز ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسی
تمثیل ہے جو اس لئے اختیار کی
گئی کہ اس معاملہ کا ایک قریبی
تخیل ہمارے اندر پیدا ہو جائے
ورنہ وحی کی آمد محض گھنٹیوں
کی آواز کی طرح نہیں ہو سکتی۔
پس اسریٰ کے معاملہ کے لئے
بھی ہماری محدود تعبیرات کام
نہیں دے سکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ
صحابہ کے تاثرات مختلف ہوئے۔
جن لوگوں نے اس کی نفی کی کہ بیداری
میں پیش آیا تھا وہ اس طرف
گئے کہ یہ ہماری جسمانی نقل و حرکت

نَزْلَةً أُخْرٰى عِنْدَ سِدْرَةِ
الْمُنْتَهٰى عِنْدَهَا جَنَّةُ
الْمَأْوٰى إِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ
مَا يَغْشٰى مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَ
مَا طَغٰى لَقَدْ رَاٰى مِنْ
اٰيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى (النجم)
علماء کی اصطلاح میں مکّہ سے
بیت المقدس تک کے سفر کو اسراء
اور وہاں سے اوپر سدرۃ المنتہیٰ
تک کی سیاحت کو معراج کہتے ہیں
اور بسا اوقات دونوں سفروں
کے مجموعہ کو ایک ہی لفظ اسراء یا
معراج سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔
معراج کی احادیث تقریباً
تیس صحابہ سے منقول ہیں جن میں
معراج و اسراء کے واقعات
بسط و تفصیل سے بیان ہوئے
ہیں۔ جمہور سلف و خلف کا عقیدہ
یہ ہے کہ حضور پُر نور کو حالتِ
بیداری میں بجسدہِ الشریف
(مع جسم اطہر) معراج ہوئی۔

کی طرح کا معاملہ نہ تھا۔ جن لوگوں نے اس پر زور دیا کہ بیداری میں پیش آیا تھا وہ اس طرف گئے کہ اسے محض خواب کی طرح کا معاملہ نہیں کہہ سکتے۔ اور اس میں شک نہیں کہ دونوں اپنے تاثرات میں برسرِ حق تھے۔ خود صحیحین کی حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا میں اس وقت ایک ایسے عالم میں تھا کہ نہ تو سوتا تھا اور نہ جاگتا تھا۔ بین النائم والیقظان۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ اس معاملہ کو نہ تو ایسا معاملہ قرار دے سکتے ہیں جیسا ہمیں جاگتے میں پیش آیا کرتا ہے نہ ایسا جیسا سوتے میں دیکھا کرتے ہیں۔ وہ ان دونوں حالتوں سے ایک مختلف قسم کی حالت تھی۔ اور ہماری تعبیرات میں اس کے لئے کوئی تعبیر نہیں۔

(ب) آیت (۶۰) وما جعلنا الرؤیا التی اریناك الا

صرف دو تین صحابہ و تابعین سے منقول ہے کہ واقعۂ اسراء و معراج کو منام (نیند) کی حالت میں بطور ایک عجیب و غریب خواب کے مانتے تھے۔ چنانچہ اسی سورت میں آگے چل کر جو لفظ " وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِيْ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ " آتا ہے۔ اس سے یہ حضرات استدلال کرتے ہیں۔ سلف میں سے یہ کسی کا قول نہیں کہ معراج حالت بیداری میں محض روحانی طور پر ہوئی۔ جیسا کہ بعض حکماء و صوفیہ کے مذاق پر تجویز کیا جا سکتا ہے۔ روح المعانی میں ہے۔ ولیس معنی الاسراء الذھاب یقظة کالانسلاخ الذی ذھب الیه الصوفیة والحکماء فانه وان کان خارقاً للعادة ومحلا للتعجب ایضاً الا انه امر لا تعرفه العرب ولم یذھب

فتنۃ للناس میں رؤیا سے مقصود یہی واقعہ ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن عباس، سعید بن جبیر، حسن، مسروق، قتادہ، مجاہد، عکرمہ، ابن جریج وغیرہم سے ایسا ہی مروی ہے۔ اور حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ اس پر محققین تفسیر کا اجماع ہو چکا ہے پس جن مفسروں نے یہاں رؤیا سے مراد کوئی دوسری رؤیا لی ہے مثلاً فتح مکہ کی رؤیا، وہ قابل اعتنا نہیں کیونکہ سورت بالاتفاق مکی ہے اور وہ واقعہ ایک عرصہ کے بعد مدینہ میں پیش آیا تھا اور تطبیق کے لئے طرح طرح کے تکلفات کرنا قرآن کو چیستان بنا دینا ہے۔ ان مفسروں نے یہ تکلفات اس لئے کئے کہ رؤیا کا اطلاق خواب پر ہوتا ہے۔ اور اگر اس رؤیا سے مقصود واقعہ اسریٰ ہو تو پھر ان صحابہ کا قول تسلیم کر لینا پڑے گا جو اس کے

الیہ احد من السلف الخ

بیشک ابن قیم نے زاد المعاد میں عائشہ صدیقہ، معاویہ، حسن بصری رضی اللہ عنہم کے مسلک کی اس طرح توجیہہ کی ہے لیکن اس پر کوئی نقل پیش نہیں کی محض ظن و تخمین سے کام لیا ہے۔ ابن اسحاق وغیرہ نے جو الفاظ ان بزرگوں کے نقل کئے ہیں ان میں کہیں حالتِ بیداری کی تصریح نہیں بہرحال قرآن کریم نے جس قدر اہتمام اور ممتاز و درخشاں عنوان سے واقعۂ اسراء کو ذکر فرمایا اور جس قدر جد و مستعدی سے مخالفین اس کے انکار و تکذیب پر تیار ہو کر میدان سے نکلے، حتیٰ کہ بعض موافقین کے قدم لغزش کھانے لگے یہ اس کی دلیل ہے کہ واقعہ کی نوعیت محض ایک عجیب و غریب خواب یا سیر روحانی کی نہ تھی۔ روحانی سیر و انکشافات

بیداری میں ہونے کے قائل نہیں۔
لیکن تعجب ہے کہ ان لوگوں نے
حضرت عبداللہ بن عباس کی
تفسیر پر نظر نہ ڈالی۔ حضرت
عبداللہ بن عباس ان صحابہ میں
ہیں جو معراج کو عالم بیداری کا
واقعہ سمجھتے تھے اور اس مذہب
کے سب سے بڑے پیشرو تھے۔ با
ایں ہمہ انہوں نے بھی اس آیت
میں رؤیا کی یہی تفسیر کی ہے کہ
واقعۂ اسریٰ مراد ہے۔ رؤیا
عَیْنٍ اُرِیْھَا رَسُوْلُ اللّٰہِ
صلی اللہ علیہ وسلم (بخاری)
ایک آنکھوں سے دیکھی ہوئی رؤیا
جو لیلۃ الاسریٰ میں آنحضرت
کو دکھائی گئی تھی۔ اگر حضرت ابن
عباس کو اس آیت کی تفسیر میں کوئی
دقت پیش نہ آئی جو اس مذہب
کے سب سے بڑے قائل تھے تو
پھر اور لوگوں کو کیوں دور از کار
توجیہوں کی ضرورت پیش آئی۔

کے رنگ میں آپ کے جو دعاوی
ابتدائے بعثت سے رہے ہیں وہ کچھ اپنے
اسرار کفار کے لئے کچھ ان سے بڑھ
کر تعجب خیز و حیرت انگیز نہ تھا۔
جو خصوصی طور پر اس کو تکذیب و
تردید اور استہزاء و تمسخر کا نشانہ
بناتے اور لوگوں کو دعوت دیتے
کہ آؤ آج مدعی نبوت کی ایک بالکل
انوکھی بات سنو، نہ آپ کو خاص
اس واقعہ کے اظہار پر اس قدر
متفکر و مشوش ہونے کی ضرورت
تھی جو بعض روایات صحیحہ میں مذکور
ہے بعض احادیث میں صاف
لفظ ہیں " ثم اصبحت بمکۃ"
یا " ثم اتیت مکۃ" (پھر
صبح کے وقت مکہ پہنچ گیا) اگر
معراج کوئی روحانی کیفیت تھی
تو آپ مکہ سے غائب ہی کہاں ہوئے
اور شداد بن اوس وغیرہ کی روایت
کے موافق بعض صحابہ کا یہ دریافت
کرنا کیا معنی رکھتا ہے " کہ رات

اور یہ جو حضرت ابن عباس
نے فرمایا " رویا عین ، ادیھا "
اس نے سارا مسئلہ حل کر دیا اور
وہ حقیقت آشکارا ہو گئی جس کی
طرف ابھی ابھی ہم اشارہ کر چکے
ہیں ۔ یعنی یہ جو کچھ پیش آیا تھا
تو رویا لیکن کیسی رویا ۔ ویسی
ہی رویا جیسی عالم خواب میں ہم
دیکھا کرتے ہیں ؟ نہیں " رویا
عین " ، ایسی رویا جس میں آنکھیں
غافل نہیں ہوتیں ۔ بیدار ہوتی
ہیں ۔ جو کچھ دیکھا جاتا ہے وہ ایسا
ہوتا ہے جیسے آنکھوں سے دیکھا
جا رہا ہو ۔ وما زاغ البصر
ما طغیٰ ، ولقد رأی من
آیات ربہ الکبریٰ ۔
(ترجمان القرآن جلد دوم
صفحہ ۳٦۸ و ۳٦۹)

میں نے قیام گاہ پر تلاش کیا حضور
کہاں تشریف لے گئے تھے ؟ ہمارے
نزدیک " اسریٰ بعبدہ "
کے یہ معنی لینا کہ خدا اپنے بندہ کو
خواب میں یا محض روحانی طور
پر مکہ سے بیت المقدس لے گیا
اس کے مشابہ ہے کہ کوئی شخص
" فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ " کے یہ معنیٰ
لینے لگے کہ اے موسیٰ ! میرے
بندوں (بنی اسرائیل) کو خواب
میں یا محض روحانی طور پر لیکر
مصر سے نکل جاؤ ۔ یا سورہ کہف
میں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا
کا حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقات
کے لئے جانا اور ان کے ہمراہ سفر
کرنا جس کے لئے کئی جگہ " فانطلقا "
کا لفظ آیا ہے اس کا مطلب یہ
لے لیا جائے کہ یہ سب کچھ محض
خواب میں یا بطور روحانی سیر کے
واقع ہوا تھا ۔ باقی لفظ " رویا "
جو قرآن میں آیا اس کے متعلق

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرما چکے ہیں " رُؤْيَا عَيْنٍ أُرِيهَا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "۔ مفسرین نے کلام عرب سے اس کے شواہد پیش کئے ہیں کہ رؤیا کا لفظ گاہ بگاہ مطلق رویت (دیکھنے) کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر اس سے مراد یہی اسراء کا واقعہ ہے تو مطلق نظارہ کے معنی لئے جائیں جو ظاہری آنکھوں سے ہوا تاکہ ظواہر نصوص اور جمہور امت کے عقیدہ کی مخالفت نہ ہو۔ ہاں شریک کی روایت میں الفاظ ضرور ایسے ایسے آئے ہیں جن سے اسراء کا بحالت نوم واقع ہونا معلوم ہوتا ہے مگر محدثین کا اتفاق ہے کہ شُریک کا حافظہ خراب تھا۔ اس لئے بڑے بڑے حفاظِ حدیث کے مقابلہ میں ان کی روایت قابل استناد نہیں ہو سکتی۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری کے اواخر میں حدیث شریک کے اغلاط شمار کرائے ہیں اور یہ بھی بتلایا ہے کہ ان کی روایت کا مطلب ایسا لیا جاسکتا ہے جو عام احادیث کے مخالف نہ ہو۔ اس قسم کی تفاصیل ہم یہاں درج نہیں کر سکتے۔ شرح صحیح مسلم میں یہ مباحث پوری شرح وبسط سے درج کئے ہیں یہاں صرف یہ بتلانا ہے کہ مذہب راجح یہی ہے کہ معراج واسراء کا واقعہ حالت بیداری میں بجسدہ الشریف واقع ہوا۔ ہاں اگر اس سے پہلے یا بعد خواب میں بھی اس طرح کے واقعات دکھلائے گئے ہوں تو انکار کرنے کی ضرورت نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک شب میں اتنی لمبی مسافت زمین وآسمان کی کیسے طے کی ہو گی یا کرۂ نار وزمہریر میں سے کیسے گذرے ہوں گے یا اہل یورپ کے خیال کے موافق جب آسمانوں کا وجود ہی نہیں تو ایک آسمان سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے پر اس شان سے تشریف لے جانا جو روایات میں مذکور ہے کیسے قابل تسلیم ہو گا لیکن

آج تک کوئی دلیل اس کی پیش نہیں کی گئی کہ آسمان واقع میں کوئی شے موجود نہیں اگر ان لوگوں کا یہ دعویٰ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ نیلگونی چیز جو ہم کو نظر آتی ہے فی الحقیقت آسمان نہیں ہے تب بھی اس کا کیا ثبوت ہے کہ اس نیلگونی رنگ کے اوپر آسمانوں کا وجود نہیں ہو سکتا۔

رہا ایک رات میں اتنا طویل سفر طے کرنا تو تمام حکماء تسلیم کرتے ہیں کہ سرعتِ حرکت کے لئے کوئی حد نہیں ہے۔ اب سے ایک سو برس پیشتر تو کسی کو یہ یقین بھی نہیں آسکتا تھا کہ تین سو میل فی گھنٹہ چلنے والی موٹر تیار ہو جائے گی یا دس ہزار فٹ کی بلندی تک ہم ہوائی جہاز کے ذریعہ پرواز کر سکیں گے۔ "اسٹیم" اور "قوت کہربائیہ" کے یہ کرشمے کس نے دیکھے تھے۔ کرۂ نار تو آج کل ایک لفظِ بے معنیٰ ہے۔ ہاں اوپر جا کر ہوا کی سخت برودت وغیرہ کا مقابلہ کرنے والے آلات طیاروں میں لگا دیئے گئے ہیں جو اڑنے والوں کی زمہریر سے حفاظت کرتے ہیں۔ یہ تو مخلوق کی بنائی ہوئی مشینوں کا حال تھا خالق کی بلاواسطہ پیدا کی ہوئی مشینوں کو دیکھتے ہیں تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ زمین یا سورج چوبیس گھنٹے میں کتنی مسافت طے کرتے ہیں۔ روشنی کی شعاع ایک منٹ میں کہاں سے کہاں پہنچتی ہے۔ بادل کی بجلی مشرق میں چمکتی اور مغرب میں گرتی ہے اور اس سرعتِ سیر و سفر میں پہاڑ بھی سامنے آجائے تو پرکاہ کی برابر حقیقت نہیں سمجھتی جب خدا نے یہ چیزیں پیدا کیں کیا وہ قادرِ مطلق اپنے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) کے براق میں ایسی برق رفتاری کی کلیں اور حفاظت و آسائش کے سامان نہ رکھ سکتا تھا جن سے حضور بڑی راحت و تکریم کے ساتھ چشم زدن میں ایک مقام سے دوسرے مقام کو منتقل ہو سکیں۔ شاید اسی لئے واقعۂ اسراء

کا بیان لفظ "سبحان الذی" سے شروع فرمایا۔ تاکہ جو لوگ کوتاہ نظری اور تنگ خیالی سے حق تعالیٰ کی لامحدود قدرت کو اپنے وہم و تخمین کی چہار دیواری میں محصور کرنا چاہتے ہیں کچھ اپنی گستاخیوں اور عقلی ترکتازیوں پر شرمائیں ؎

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن ۔ کہ جاہا سپر باید انداختن

(تفسیر عثمانی پارہ ۱۵ رکوع ۱)

تفسیر و ادب کے دونوں ترجمانوں یعنی عثمانی اور ابوالکلام کی نکتہ آرائیاں معراجِ نبوی کے معرکہ آرا اور دقیق مسئلہ پر آپ کے سامنے ہیں۔ میں نے اس خاص مسئلہ کو اس لئے پیش نظر رکھا ہے کہ دو روشن دماغ، وسیع القلب علماء اس نازک مقام پر اپنی علمی ذمہ داریوں سے کس طرح عہدہ برآ ہوتے ہیں۔

۱ــــــ مولانا ابوالکلام نے ابتداء میں یہ بھی واضح کیا ہے کہ مسئلہ معراج میں صحابہ وغیرہم کی دو جماعتیں ہیں۔ ایک جماعت جو اکثریت پر مشتمل ہے وہ معراج جسمانی کی قائل ہے اور دوسری جماعت جو چند اصحاب پر شامل ہے وہ معراج روحانی اور خواب میں معراج کی قائل ہے۔

۲ــــــ مولانا ابوالکلام نے دونوں جماعتوں کا ذکر کرکے پھر یہ بتایا ہے کہ دونوں اپنے تاثرات میں برسرِ حق تھے۔ غرض یہاں تک مولانا ابوالکلام نے کسی جانب کو اختیار نہیں کیا اور ذمہ دارانہ طور پر دامن بچا کر چل رہے ہیں۔

۳ــــــ پھر آگے چل کر صحیحین کی حدیث بین النائم و الیقظان کا ذکر کرکے یہ فیصلہ کیا ہے کہ "اس معاملہ کو نہ تو ایسا معاملہ قرار دے سکتے ہیں جیسا ہمیں جاگتے میں پیش آیا کرتا ہے نہ ایسا جیسا سوتے میں دیکھا کرتے ہیں۔ وہ ان دونوں حالتوں سے ایک مختلف قسم کی حالت تھی، اور ہماری تعبیرات میں اس کے لئے کوئی تعبیر نہیں ہے۔"

۴۔ اس کے بعد مولانا ابوالکلام نے "وما جعلنا الرؤیا التی اریناک الا فتنۃ للناس" سے معراج کی کیفیت کو رؤیا لکھ کر اور رؤیا سے مراد معراج کا واقعہ بیان کر کے اپنا رجحان حسب ذیل الفاظ میں پیش کیا ہے۔

"جو کچھ پیش آیا، تھا تو رویا لیکن کیسی رویا؟ ویسی ہی رویا جیسی عالم خواب میں ہم دیکھا کرتے ہیں؟ نہیں رویا عین ایسی رویا جس میں آنکھیں غافل نہیں ہوتیں بیدار ہوتی ہیں۔ جو کچھ دیکھا جاتا ہے وہ ایسا ہوتا ہے جیسا آنکھوں سے دیکھا جا رہا ہو۔"

یہاں چلکر مولانا ابوالکلام کا نظریۂ معراج واضح ہو جاتا ہے یعنی وہ معراج کی کیفیت کو بیداری اور خواب کے درمیان کا مقام دیتے ہیں لیکن ان کی تقریر سے یہ بالکل واضح نہیں ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مع جسم اطہر کے آسمان پر تشریف لے گئے تھے بلکہ ان کا رجحان دونوں اقوال کے درمیان نظر آتا ہے تاہم معراج جسمانی کے قائل نظر نہیں آتے۔

علامہ عثمانی

علامہ عثمانی کی تفسیر میں حسب ذیل تفصیلات پر محققانہ روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۔ اسراء اور معراج کے متعلق علماء کی اصطلاح پر تبصرہ ہے۔ حرم محترم سے بیت المقدس تک کے سفر کو اسراء اور بیت المقدس سے عروج آسمانی کو معراج کہا گیا ہے۔ چنانچہ سبحان الذی اسریٰ میں اسراء اور سورۂ نجم سے معراج کا ثبوت پیش کیا گیا ہے۔

۲۔ علامہ عثمانی نے صراحۃً معراج جسمانی کا دعوی کیا ہے اور حالت بیداری میں اسراء اور معراج پر زور دیا ہے اور یہی راجح قرار دیا ہے چنانچہ حدیث معراجِ جسمانی کے متعلق تیس صحابہ کی روایت سے مہر تصدیق لگائی ہے۔

۳ــــ جو چند اصحاب معراج روحانی یا رویا کے قائل ہیں ان پر روایتی جرح کی ہے۔ بعض صوفیار کا بھی رد کیا ہے جن سے حالت بیداری میں معراج روحانی کے قول کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن اس کی علامہ عثمانی نے شد و مد سے رُوح المعانی کا قول نقل کر کے تردید کی ہے۔

۴ــــ علامہ عثمانی نے رویا کے لفظ پر بحث کر کے " وما جعلنا الرؤیا التی ارینٰک " سے رویت بصری پر محاورۂ عرب کے مطابق استدلال کیا ہے۔ پھر اصبحت بمکۃ سے اپنے استدلال کو اور قوی بنایا ہے۔ مزید برآں شداد بن اوس کی روایت سے کہ رات میں نے قیام گاہ پر تلاش کیا حضور کہاں تشریف لے گئے تھے، معراج جسمانی کی تائید کی ہے۔ پھر جماہیر امت کا قول پیش کیا ہے۔

۵ــــ چونکہ علامہ عثمانی نے معراج جسمانی کی تائید کی ہے اس لئے فلاسفہ کی مشکلات عقلیہ کے جوابات دیئے ہیں۔ مثلاً کرۂ زمہریر اور کرۂ ناریہ سے محفوظ رہ کر آسمانوں پر جانا۔ آسمانوں کے وجود سے بھی عہدہ برآ ہونے کا عثمانی نے ذکر کیا ہے۔ اس تیز سفری پر جو استحالہ مخالفین پیش کرتے ہیں اس سے بچاؤ کی بھی دلیلیں پیش کی ہیں غرضکہ عقلی اور نقلی تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھکر معراج جسمانی کا ثبوت دیا ہے۔ اب فیصلہ ناظرین خود کر سکتے ہیں۔ البتہ اتنا کہنا مناسب ہوگا کہ علامہ عثمانی کی تفسیر بہت زیادہ محققانہ ہے۔

۲

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

(ترجمہ) یاد رکھو جو اللہ کے دوست ہیں نہ ان پر کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

مولانا ابوالکلام

قرآن نے ایمان اور اہل ایمان کی نسبت جو کچھ کہا ہے اس میں کوئی بات بھی اس قدر نمایاں نہیں ہے جس قدر کہ لا خوف علیہم ولا ھم یحزنون۔ خوف اور غم دونوں سے وہ محفوظ ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس سورت کی آیت میں بھی یہی بات فرمائی ہے۔ غور کرنا چاہیئے کہ قرآن نے اس وصف پر کیوں اس قدر زور دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کی سعادت کے لئے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی شقاوت کی ساری سرگزشت انہی دو لفظوں میں سمٹی ہوئی ہے۔ خوف اور دکھ جونہی ان دو باتوں سے اسے رہائی مل گئی اس کی ساری سعادتیں اس کے قبضہ میں آگئیں۔ زندگی کے جتنے بھی کانٹے ہو سکتے ہیں سب

علامہ عثمانی

ابن کثیر نے روایات حدیثیہ کی بنا پر اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اولیاء اللہ کو آخرت میں اہوالِ محشر کا کوئی خوف نہیں ہوگا۔ اور نہ دنیا کے چھوٹ جانے پر غمگین ہوں گے۔ بعض مفسرین نے آیت کو کچھ عام رکھا ہے یعنی ان پر اندیشناک حوادث کا وقوع دنیا میں ہوگا نہ آخرت میں۔ اور نہ کبھی مطلوب کے فوت ہونے پر وہ مغموم ہوتے ہیں گویا خوف سے خوفِ حق، یا غم سے غم آخرت کی نفی مراد نہیں بلکہ دنیا میں دنیوی خوف و غم کی نفی مراد ہے جس کا احتمال مخالفت اعدائ وغیرہ سے ہو سکتا ہے وہ مومنین کاملین کو نہیں ہوتا۔ ہر وقت ان کا اعتماد اللہ پر ہوتا ہے اور تمام واقعات تکوینیہ کے خالی از حکمت نہ ہونے کا اعتقاد رکھتے

کو ایک ایک کر کے چنو اور دیکھو خواہ جسم میں چبھتے ہوں خواہ دماغ میں، خواہ موجودہ زندگی کی عافیت میں خلل ڈالتے ہوں خواہ آخرت کی تم دیکھو گے کہ ان دو باتوں سے باہر نہیں ہیں۔ یا خوف کا کانٹا ہے یا غم کا۔ قرآن کہتا ہے ایمان کی راہ سعادت کی راہ ہے جس کے قدم اس راہ میں جم گئے اس کے لئے دونوں کانٹے بے اثر ہو جاتے ہیں۔ اس کے لئے نہ تو کسی طرح کا اندیشہ ہو گا نہ کسی طرح کی غمگینی۔ قرآن نے یہی حقیقت دوسرے پیرایوں میں بھی بیان کی ہے۔ مثلاً آخری پارہ میں سورۂ عصر اسی حقیقت کا اعلان ہے۔

ہیں۔ اس اعتماد و اعتقاد کے استحضار سے انہیں خوف و غم نہیں ستاتا۔

میرے نزدیک "لا خوف علیھم" کا مطلب یہ لیا جائے کہ "اولیاء اللہ" پر کوئی خوفناک چیز (ہلاکت یا معتدبہ نقصان) دنیا و آخرت میں واقع ہونے والی نہیں۔ اگر فرض کیجئے دنیا میں صورۃً کوئی نقصان پیش بھی آئے تو چونکہ نتیجۃً وہ ان کے حق میں نفع عظیم کا ذریعہ بنتا ہے اس لئے اس کو معتدبہ نقصان نہیں کہا جا سکتا۔ رہا کسی سبب دنیوی یا اخروی کی وجہ سے ان کو کسی وقت خوف لاحق ہونا وہ آیت کی اس تقریر کے منافی نہ ہو گا کیونکہ آیت میں یہ خبر دی ہے کہ ان پر کوئی خوفناک چیز نہ پڑے گی یہ نہیں کہا کہ انہیں کسی وقت خوف لاحق نہ ہو گا۔ شاید "لا یحزنون" کے

مناسب لایخافون نہ فرمانے اور لاخوف علیھم کی تعبیر اختیار کرنے میں یہی نکتہ ہو۔ باقی لایحزنون کا تعلق میرے خیال میں مستقبل سے ہے یعنی موت کے وقت اور موت کے بعد غمگین نہوں گے جیساکہ فرمایا:

تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا

لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ وَتَتَلَقَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ.

واللہ تعالیٰ اعلم (تفسیر عثمانی پارہ ۱۱ رکوع ۱۲)

مولانا ابوالکلام

تبصرہ: قرآن کریم کی یہ مختصر سی آیت اولیاء اللہ کے لئے ایک پیغام امن و محبت ہے جس میں ایمان و عشق کی روئدادیں مضمر ہیں۔ جذبات محبت سے لبریز اس آیت کا انتخاب میں نے اسی لئے کیا ہے کہ یہاں قاری ان دونوں اہل علم و تحقیق کی رنگین قلمیوں سے آشنائے حقیقت ہو سکیں۔

ادبی تنقید: جہانتک ادبیت کا تعلق ہے مولانا ابوالکلام کی تحریر کا دوسرا پیرا ادبیت کا مرقع ہے۔ پہلے پیرے میں وہ جان نہیں۔ عبارت میں طمطراق اور جوش کے ساتھ درد ہے۔

معنویت: جہانتک تفسیر کی معنویت کا تعلق ہے اس میں زندگی کے جسمانی ا/ دماغی کانٹوں سے استعارہ کے رنگ میں یہ بات پیش کی گئی ہے کہ دنیاوی زندگی ہو یا آخرت کی زندگی اس میں غم اور خوف کے دو کانٹے چبھتے رہتے ہیں لیکن ایمان کی سعادت جس شخص کے نصیب میں آتی ہے وہ دنیا و آخرت کے خوف اور غم سے مطمئن کر دیا جاتا ہے۔ مولانا ابوالکلام کی تفسیر کا مرکز صرف اسی قدر رہا اور بس۔

⁂

علامہ عثمانی

علامہ عثمانی کی ادبیت میں ایک ہی قسم کی روانی اور تسلسل نیز فصاحت اور جامعیت ہے۔ مولانا ابوالکلام کے یہاں ادب میں جوش، طمطراق اور درد ہے۔ لیکن علامہ عثمانی کے یہاں ادبیت کے ساتھ روحانیت، نورانیت اور تحقیق علمی ہے۔ علاوہ ازیں عثمانی روایت و درایت کے دونوں پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں۔ انہوں نے تفسیر ابن کثیر کا نقطۂ نگاہ پیش کر کے اپنی قرآنی بصیرت کے ماتحت اپنی علمی درایت و انفرادیت کو بھی قائم رکھا ہے۔ مولانا ابوالکلام کے یہاں انفرادیت ہی ہے۔

مولانا ابوالکلام کے یہاں اجمال ہے۔ علامہ عثمانی کے یہاں تفصیل ہے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دنیا میں اگر اولیاء کو غم لاحق ہو یا خوف کے حالات پیش آئیں تو ان کی توجیہ کیا ہے؟ لا یحزن کے مقابلہ میں لا یخافون کیوں نہ فرمایا گیا اس کی حکمت نحوی پر بھی اشارہ ہے۔ پھر غم کو مستقبل کے لئے قرار دینا اور اس کے تائید میں نظائر قرآنی پیش کرنا علامہ عثمانی کے مقام تفسیر کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے۔

میں نے تقابل میں اس امر کا لحاظ رکھا ہے کہ کوئی آیت اپنے دقت مضمون تحقیق علمی یا تنویر روحانی کے لحاظ سے کہاں تک تقابل کا سامان پیدا کر دے گی اس لئے انتخاب میں مختلف قسم کی دقتیں پیش آئی ہیں۔ ان میں سے دو مقام پیش کر دئے گئے ہیں۔ کئی مقام ایسے ملیں گے جہاں مولانا ابوالکلام نے بہت طویل بحث کی ہے اور علامہ عثمانی نے مختصر عبارت میں بقدر ضرورت اس مضمون کو ادا کیا ہے اس لئے اگر مقابلہ میں ان عبارتوں کو پیش کیا جاتا تو بہت طویل سلسلہ بن جاتا لہذا ایسے مواقع کو درمیان میں لانے سے اجتناب کیا گیا ہے۔

۳

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ٥

(ترجمہ) اور جس نے میری یاد سے منہ پھیرا تو اس کے لئے گذران تنگ ہوجائے گی اور ہم اس کو قیامت کے روز اندھا اٹھائیں گے۔

مولانا ابوالکلام

جس نے ہمارے ذکر سے اعراض کیا تو اسے دو حالتیں پیش آئیں گی۔ دنیا میں اس کی زندگی ضیق میں پڑ جائے گی یعنی وہ بظاہر کتنا ہی نہال ہو جائے لیکن دل کی طمانیت اور روح کا انبساط اسے کبھی نہیں ملے گا۔ اور آخرت میں بینائی سے محروم ہو جائے گا سعید انسانوں کی نگاہیں روشن ہوں گی۔ اس کی اندھی۔ وہ جمالِ الٰہی کا نظارہ کریں گی۔ اس کے آگے پردہ پڑا ہوگا كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ۔

علامہ عثمانی

جو انسان اللہ کی یاد سے غافل ہو کر محض دنیا کی فانی زندگی ہی کو قبلۂ مقصود سمجھ بیٹھا ہے اس کی گذران مکدر اور تنگ کر دی جاتی ہے گو دیکھنے میں اس کے پاس بہت کچھ مال و دولت اور سامانِ عیش و عشرت نظر آئیں مگر اس کا دل قناعت و توکل سے خالی ہونے کی بنا پر ہر وقت دنیا کی مزید حرص، ترقی کی فکر اور کمی کے اندیشہ میں بے آرام رہتا ہے۔ کسی وقت ننانوے کے پھیرسے قدم باہر نہیں نکلتا موت کا یقین اور زوالِ دولت کے خطرات الگ سوہانِ روح رہتے

وہ اندھا کیوں ہو جائے گا؟
اس لئے کہ آخرت کی زندگی دنیوی
زندگی کا نتیجہ ہے۔ اس نے دنیا
میں قدرت کی نشانیوں سے آنکھیں
بند کر لی تھیں، اس لئے آخرت
میں بھی اس کی آنکھیں بند
رہیں گی۔ من کان فی ھذہ
اعمیٰ، فھو فی الآخرۃ
اعمیٰ و اضل سبیلا۔
یہاں سے معلوم ہو گیا کہ قرآن کے
نزدیک ثواب آخرت کی حقیقت
یہ ہے کہ نگاہیں جمال الٰہی کے
نظارہ سے شادکام ہوں گی۔
عذاب کی یہ ہے کہ اندھی ہو کر
محجوب ہو جائیں گی۔
(ترجمان القرآن سورہ طٰہٰ)

ہیں۔ یورپ کے اکثر متنعّمین کو
دیکھ لیجئے کسی کو رات دن میں دو
گھنٹے اور کسی خوش قسمت کو تین
چار گھنٹے سونا نصیب ہوتا ہوگا۔
بڑے بڑے کروڑپتی دنیا کے مخصوں
سے تنگ آ کر موت کو زندگی پر ترجیح
دینے لگتے ہیں۔ اس نوع کی خودکشی
کی بہت مثالیں پائی گئی ہیں۔
نصوص اور تجربہ اس پر شاہد ہیں کہ
اس دنیا میں قلبی سکون اور حقیقی
اطمینان کسی کو بدون یاد الٰہی کے
حاصل نہیں ہو سکتا" اَلاَ
بذکر اللہ تطمئن القلوبؕ
لیکن

"ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی"

بعض مفسرین نے "معیشت
ضنک" کے معنی لئے ہیں وہ زندگی
جس میں خیر داخل نہ ہو سکے۔ گویا
خیر کو اپنے اندر لینے سے تنگ ہو گئی۔
ظاہر ہے کہ ایک کافر دنیا کے نشے میں
بدمست ہے اس کا سارا مال و

دولت اور سامان عیش و تنعم آخر کار اس کے حق میں وبال بننے والا ہے۔ جس خوش حالی کا انجام چند روز کے بعد دائمی تباہی ہو اسے خوشحالی کہنا کہاں زیبا ہے۔ بعض مفسرین نے "معیشة ضنکا" سے قبر کی برزخی زندگی مراد لی ہے یعنی قیامت سے پہلے اس پر سخت تنگی کا ایک دور آئے گا جبکہ قبر کی زمین بھی اس پر تنگ کر دی جائے گی۔ "معیشة ضنک" کی تفسیر عذاب قبر سے بعض صحابہ نے کی ہے بلکہ بزار نے باسناد جید ابوہریرہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ بہر حال "معیشت ضنک" میں یہ سب صورتیں داخل ہو سکتی ہیں۔ واللہ اعلم

جو کافر دنیا میں ظاہری آنکھیں رکھتا تھا تعجب سے سوال کرے گا کہ آخر مجھ سے کیا قصور ہوا جو آنکھیں چھین لی گئیں۔ (چونکہ) دنیا میں ہماری آیات سن کر یقین نہ لایا نہ ان پر عمل کیا ایسا بھولا رہا کہ سب سنی ان سنی کر دی آج اسی طرح تجھے بھلایا جا رہا ہے۔ جیسے وہاں اندھا بنا رہا تھا یہاں اسی کے مناسب سزا ملنے اور اندھا کر کے اٹھائے جانے پر تعجب کیوں ہے؟ (تفسیر عثمانی طہ صفحہ ۴۱۵)

تبصرہ :۔ ورق گردانی میں یہ آیت سامنے آگئی۔ پہلے مولانا ابوالکلام ہی کی تفسیر پیش نظر تھی آیت بھی اپنی نوعیت میں خصوصی شان رکھتی تھی۔ اس تفسیر کے بعد تفسیر عثمانی پر نظر ڈالی تو قوت فیصلہ اسی کے توازن پر ٹھٹک گئی۔

ادبیت کا رنگ دونوں عبارتوں میں چمک رہا ہے۔ دونوں کے قلم کی طاقت ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی ہے۔ ادبی جواہر دونوں کے یہاں جگمگ کر رہے ہیں۔

تفسیر کی نوعیتوں میں مولانا ابوالکلام کے یہاں اجمال ہے علامہ عثمانی کے یہاں

قدرے تفصیل زیادہ ہے۔ مولانا ابوالکلام کے یہاں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ ذکرِ الٰہی سے اعراض کرنے والے قیامت کے روز دیدارِ الٰہی سے محروم رہیں گے۔ علامہ عثمانی نے مطلق اندھے پن کا ذکر کیا ہے خواہ دیدارِ الٰہی سے ہو یا اور مناظرِ محشر سے، علامہ عثمانی نے نحشرہ یوم القیٰمۃ کے ماتحت حسب ذیل تفسیر کی ہے جو اختصار کی وجہ سے اوپر درج نہیں کی گئی:

"یعنی آنکھوں سے اندھا کر کے محشر کی طرف لایا جائے گا اور (وہ) دل کا بھی اندھا ہو گا کہ کسی حجت کی طرف رستہ نہ پائے گا۔ یہ ابتدائے حشر کا ذکر ہے پھر آنکھیں کھول دی جائیں گی تا دوزخ وغیرہ احوالِ محشر کا معاینہ کرے۔"

علامہ عثمانی نے ابتدائے محشر کے وقت معرضین ذکرِ الٰہی کے نابینا ہونے کی وضاحت کی ہے۔ بعد ازاں بینا ہو جانے کا ذکر بھی کیا ہے۔ مولانا ابوالکلام کی تفسیر اس سے خاموش ہے۔ نیز مولانا کے یہاں "معیشۃ ضنکا" کی صرف ایک توضیح کی گئی ہے یعنی "دنیا میں اس کی زندگی ضیق میں پڑ جائے گی"۔ علامہ عثمانی نے اہلِ دولت و ثروت کے حالاتِ زندگی اور گزران کی تنگی پر تبصرہ کرتے ہوئے آگے متقدمین مفسرین کی روایات کو بھی اپنی تفسیر میں پیش کیا ہے۔ بایں طور ہمارے سامنے علامہ عثمانی روایت و درایت، نیز متقدمین کے نظریات بھی پیش کر کے معلومات کا ذخیرہ پیش کر دیتے ہیں۔ پھر کتنی خوبی کی بات ان کی تفسیر میں یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی علمیتِ وہبی و ذکاوت کے باوجود متقدمین و متاخرین سے مطابقت کا خاص خیال رکھتے ہیں لیکن اپنی بصیرتِ قرآنی کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

الغرض دونوں کی مکمل تفسیر پر نظر دوڑائیے علامہ عثمانی نے بقدرِ ضرورت

ہر آیت کی علیحدہ علیحدہ تفسیر کی ہے اور زور قلم یکساں چلا گیا ہے مولانا ابوالکلام کے یہاں بعض بعض مضامین پر نہایت طویل کلام کیا ہے اور بعض جگہ توسط سے کام لیا ہے اور کتنی جگہ اپنے نزدیک آیات کو آسان سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہے۔

دل چاہتا ہے کہ ان دونوں روشن دماغ علماء کے تفاسیری مباحث کے نمونے اور پیش کروں لیکن مقالے کا یہ حصہ طول پکڑتا جا رہا ہے۔ اس لیے تفسیر کے یہ تین ٹکڑے پیش کرنا کافی خیال کرتے ہوئے بس کرتا ہوں۔

ہم نے گذشتہ اوراق میں چند ناموران علم کے توازن سے آپ کے لئے اس خیال کے ماتحت سامان ذوق پیدا کیا ہے جس کا اظہار حضرت مولانا محمد طیب صاحب نے فرمایا ہے کہ ایک ہی چیز کو مولانا عثمانی لکھتے ہیں اور اس پر کوئی دوسرا قلم اٹھاتا تو علامہ عثمانی بھاری نظر آتے تھے۔ اب آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ وہ اپنے دور کے کتنے بڑے اہل علم و صاحب قلم تھے۔

غیب کو شہود بنا دینے والا

یوں تو ہم نے علامہ کی علمی پوزیشن اور ان کے حقیقی مقام کا ذکر تجلیات میں کر دیا ہے تاہم علمی سلسلے میں ماہنامہ الفرقان لکھنؤ بابت ماہ صفر ۱۳۶۹ھ مطابق دسمبر ۱۹۴۹ء میں مولانا محمد منظور نعمانی نے نگاہِ اولین میں علامہ عثمانی سے متعلق جو دو صفحوں کا ایک نوٹ لکھا ہے اس میں تحریر فرماتے ہیں :-

"استاذ جلیل حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی (رحمۃ اللہ تعالےٰ رحمۃ الابرار الصالحین) ------------ ہندوستان و پاکستان ہی نہیں بلکہ پورے عالم اسلامی کی جن چند ہستیوں کے علمی رسوخ اور دینی بصیرت پر اس دور میں اعتماد کیا جا سکتا تھا، بلا شبہ حضرت مولانا ان میں سے ایک تھے۔ نظر و مطالعہ کی وسعت،

فکر کی دقت و سلامت اور زبان و بیان کی فصاحت و حلاوت کی صفات، اللہ تعالیٰ نے جس طرح ان میں جمع کر دی تھیں کم از کم اس عاجز نے تو ابھی تک ان میں ان کا کوئی ثانی نہیں دیکھا۔ بارہا اپنے پر یہ گذرا ہے کہ کسی علمی اشکال کو لیکر حضرت ممدوح کی خدمت میں حاضری ہوئی اور اس وقت برجستہ جو کچھ فرمادیا وہی اس اشکال کا آخری اور شافی جواب تھا۔ کبھی کسی مسئلے کی سند کی تلاش و جستجو میں رجوع کیا گیا تو فوراً جواب ملا کہ فلاں فلاں کتاب میں اس کی تصریح موجود ہے۔ جن حضرات کو حضرت موصوف سے علمی استفادے کا موقع ہوا ہوگا انہیں اس میں شک نہیں ہوسکتا کہ ذہانت و ذکاوت فکر کی وقت و متانت اور دماغ کے سلجھاؤ میں وہ آپ اپنی نظیر تھے۔

اسی طرح اپنے مدعا کو بہترین اسلوب اور نہایت دلنشین انداز میں بیان کرنے اور دقیق سے دقیق علمی حقیقتوں کو آسان کر کے سمجھادینے کا جو خاص ملکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موصوف کو عطا فرمایا تھا وہ ان کے لئے ان کے رب کا خاص عطیہ تھا۔

ایک مبصر ناقد نے مولانا کی بعض تقریریں سُنکر ایک زمانے میں کہا تھا اور بالکل صحیح کہا تھا کہ جب مولانا غیبی حقیقتوں کو دلیلوں اور مثالوں سے سمجھانے، اور منوانے کی کوشش کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غیب اب شاید غیب نہیں رہے گا بلکہ شہود بن کر سامنے آجائے گا۔"

(الفرقان ماہ صفر سنہ ۱۳۶۹ھ۔ دسمبر سنہ ۱۹۴۹ء صفحہ ۴)

اس مقام پر پہنچ کر ہم اپنے چھوٹے حقیقی بھائی متوفی ۱۹۵۰ء عزیزم ریاض الحسن فاضل دیوبند مرحوم کے قلم بند کئے ہوئے چشم دید واقعات جو مولانا عثمانی سے متعلق ہیں پیش کرتے ہیں۔ عزیزم پاکستان سے پہلے اور بعد چند سال ملتان چھاؤنی ہائی سکول میں عربی کے ہیڈ تھے اور حضرت علامہ عثمانی دار العلوم کے صدر مہتمم تھے اس وقت وہ دیوبند میں پڑھتے تھے :-

مشاہدات ریاض

۵ - علامہ شبیر احمد صاحب اور مسئلہ تقدیر پر معرکہ آرا تقریریں محرم ۱۳۶۱ھ

دوران تعلیم کا واقعہ ہے جبکہ میں دار العلوم میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ محرم الحرام ۱۳۶۱ھ میں دورۂ حدیث کے تمام طلبہ نے جن میں خود راقم الحروف بھی شامل تھا حضرت شیخ الاسلامؒ سے مسئلہ تقدیر کے بارے میں جا کر عرض کیا کہ کماحقہٗ ہماری تشفی نہیں ہوئی۔ حضرت شیخ الاسلام کوہِ وقار اور علم کا بحر بیکراں تھے اور ہمیں یقین تھا کہ آپ درخواست منظور فرمالینگے۔ چنانچہ حضرت شیخ الاسلامؒ نے تقریباً ایک ماہ تک روزانہ ایک گھنٹہ مسئلہ تقدیر پر تقریر فرمائی میں خود بلا ناغہ حاضر رہتا تھا۔

الغرض ایک ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ علوم اور وہ اسرار جو شاہ ولی اللہؒ کے حصہ میں آئے تھے ان کا جانشین اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ مولینا کی ذات گرامی ہی تھی۔ اس تقریر سے میں یہ اندازہ لگا سکا کہ تمام دنیائے اسلام میں عقائد، فلسفہ، کلام اور الٰہیات کی گتھیوں کو اگر کوئی سلجھا سکتا ہے تو مولینا اور صرف مولینا تھے۔

⁂

۶۔ بغداد و دمشق کے طریقہ تعلیم اور موجودہ جدید طریق تعلیم میں فرق پر تقریریں صفر المظفر ۱۳۶۱ھ

مسئلہ تقدیر پر جب تقریر ختم ہوئی تقریباً ایک ماہ بعد طلبہ نے اصرار کیا کہ بغداد دمشق وغیرہ کی قدیم یونیورسٹیوں کے طریقہ تعلیم اور طلبہ کے حصول تعلیم کے اطوار پر روشنی ڈالیں۔ چنانچہ تقریباً ایک ہفتہ تک علم کی صحیح قدروں اور قدیم و جدید دور کے تدریس کے طریقوں اور حصول علم کے لئے مفید اور کارگر طریقوں سے آگاہ فرماتے رہے۔ حصولِ تعلیم کے متعلق جس قسم کی معلومات اور ہدایات مولانا کی تقاریر میں تھیں ان کا عُشر عشیر بھی کہیں دوسری جگہ نہ پایا۔ علم کی اقدار کے بارے میں جو اشعار شیخ الاسلامؒ نے پیش فرمائے ان میں سے مجھے اس وقت صرف ایک یاد ہے اس سے ان کے زورِ بیان کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے تو لگالیں ؎

وَمِدَادُ مَا تَجْرِیْ بِهٖ اَقْلَامُهُمْ
وَاللّٰهِ خَیْرٌ مِّنْ دَمِ الشُّهَدَاءِ

۷۔ فصاحت و بلاغت قرآن پر تقریر، ربیع الثانی ۱۳۶۱ھ

حضرت شیخ الاسلامؒ جامع علوم تھے علم ادب سے بیحد شغف اور لگاؤ تھا۔ دوران تقریر میں جس قسم کے ادبی نکات مولاناؒ کی تقریر میں میں نے سُنے وہ چیز کہیں نہ پائی۔ زہیر، امرأ القیس کے کلام پر ایک بار لاجواب محاکمہ فرمایا۔ ایک بار دارالعلوم میں صدر الصدور ہونے کے زمانہ میں قرآن اور "فصاحت و بلاغت" کے موضوع پر تقریر فرمائی اور ایک ایسا نکتہ حل فرمایا جو مختصر المعانی کے مصنفؒ علامہ تفتازانی اور تلخیص کے مصنف عبدالرحمٰن دمشقی گو سمجھتے ہوں لیکن اس پوری تشریح اور ان نکات کو شاید یہ بزرگ بھی نہ پہنچ سکے ہوں۔ مولانا کا ارشاد تھا کہ بلاغت و فصاحت کی اگرچہ جدا جدا تعریفیں ہیں لیکن اگر دیکھا جائے تو صحیح معیار استعمال

اور محل استعمال ہے چنانچہ مثال کے طور پر آپ نے والقمل والجراد والضفادع کو پیش کیا کہ ضفادع حد درجہ ثقیل ہے لیکن جملہ کی روانی اور استعمال نے اس کو فصیح ہی نہیں بلکہ افصح بنا دیا ہے۔

۴۔ مقام دارالعلوم اور دیگر مدارس عربیہ پر علامہ عثمانی کی تقریر، ذوالقعدہ ۱۳۶۰ھ

ذوالقعدہ ۱۳۶۰ھ میں علامہ عبدالسلام صاحب ندوی کی زیر قیادت ایک وفد دارالعلوم دیوبند آیا جس کی آمد کا مقصد وحید صرف یہ تھا کہ ہند کے مختلف اسلامی علوم کے مدارس کو ایک لڑی میں پرو یا جائے گا اور ہر مدرسہ سے اس قسم کے خیر سگالی کے وفود آتے جاتے رہیں جس کے ذریعہ اتحاد کا رشتہ استوار رہے۔ علامہ عبدالسلام نے بھی تقریر کی۔ اور آخر میں صدر جلسہ حضرت شیخ الاسلام علامہ شبیر احمدؒ نے نہایت مدلل ومفصل تقریر فرمائی جس میں دارالعلوم ندوۃ العلماء دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس اسلامیہ کا مقابلہ کیا اور بتلایا کہ اسلام کے دور اول سے علماء کا مقصد ہمیشہ ترویج علوم اور اشاعت اسلام رہا لیکن اس زمانہ میں غیر مسلم حکومت اور غیر اسلامی نظام کی بناء پر معاشی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور اس کے بعد کچھ افراد تو ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے صرف دنیا ترقی اور دنیاوی اعزاز ہی کو سب کچھ سمجھا اسلام اور مذہب کو اتنی اہمیت نہ دی۔ اس کے بعد فکر دنیا اور فکر عقبیٰ اور دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم ندوۃ العلما کا مقابلہ کیا اور اکبرؔ کے یہ اشعار پڑھے ؎

ہے دلِ روشن مثال دیوبند ؛ اور ندوہ ہے زبانِ ہوشمند
اب علیگڈھ کی بھی اک تشبیہ لو ؛ اک معزز پیٹ تم اس کو کہو

پیٹ ہے سب سے مقدم اے عزیز
گرچہ فکر عاقبت ہے اصل چیز

۸۔ علامہ عثمانی کی دار العلوم میں وفد جامعہ جامعہ ازہر کی آمد پر عربی میں تقریر

ربیع الثانی ۱۳۵۷ھ، دار العلوم دیوبند میں جامعۃ الازہر قاہرہ کے علماء پر مشتمل ایک وفد آیا تھا جس نے ہند کے تقریباً تمام مدارس میں علمی نظام اور کتب خانوں اور علمی سرگرمیوں کا جائزہ لیا۔ دار العلوم میں حضرت عثمانیؒ صدر تھے۔ مولانا عثمانیؒ نے آخر میں صدارتی تقریر عربی میں فرمائی حقیقت یہ ہے کہ ہندی علماء میں کون ایسا شخص علم وفضل کا مالک ہوگا جو کہ مولانا مرحوم کی عربی تقریر کا جواب پیش کر سکے۔ جامعہ ازہر قاہرہ کے وفد کے لیڈر کو فتح الملہم پیش کی گئی تو اس نے بیحد تعریف کی اور کہا کہ تمام علمائے عرب مل کر اس کی مثال پیش کرنا چاہیں تو محال ہے۔

۹۔ لانگے خان کے باغ عام ملتان شہر میں تقریر مئی ۱۹۴۸ء

حضرت شیخ الاسلامؒ مدرسہ خیر المدارس ملتان کے اجلاس میں شرکت کے لئے تشریف لائے اور اسی روز آل ورلڈ مسلم ایسوسی ایشن کی ملتان شاخ کا اجلاس تھا مخدوم مرید حسین، علامہ اقبال شیدائی وغیرہ تمام موجود تھے۔ مولانا نے ورلڈ مسلم ایسوسی ایشن کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔ پاکستان خدا کا شکر ہے کہ عالم وجود میں آگیا اور اب اس کے استحکام اور شرعی نظام کی ترویج باقی ہے بعض لوگ شرعی حکومت کے نام سے بدکتے اور ڈرتے ہیں کہ کہیں مولوی ہماری کرسیاں اور اعزاز نہ چھین لیں لیکن میں اس غلط فہمی کو دور کرنا چاہتا ہوں مولوی صاحبان ان کرسیوں کے خواہاں نہیں ہاں ہم آپ کو ہی مولوی بنانا چاہتے ہیں۔ اور آپ کو مولوی بننا پڑے گا۔

۱۰۔ علامہ کی صدارت میں لجنۃ اصلاح اللسان کا قیام محرم ۱۳۶۰ھ

۱۳۶۰ھ میں مولینا کی زیر سرپرستی لجنۃ اصلاح اللسان کا قیام عمل

میں آیا جس کا واحد مقصد یہ تھا کہ دار العلوم دیوبند کے طلباء چوبیس گھنٹے عربی زبان استعمال کریں۔ چنانچہ اس انجمن کے اجلاس عام طور پر مولانا ہی کی زیر صدارت ہوتے تھے اور مولانا کی عربی تقاریر بیحد موثر اور اعلیٰ پایہ کی ہوتی تھیں۔ اور مولانا کے فیض سے ہر طالب علم عربی بولنے پر قادر ہو گیا۔ اس عربی ادب کی ترقی کی شہرت جب ندوۃ العلماء لکھنؤ میں پہنچی جو عربی زبان کا مرکز ہے تو سب حیران رہ گئے۔

۸۔ ربیع الثانی ۱۳۶۲ھ | مولانا عبد الخالق ملتانی دار العلوم دیوبند میں مدرس ہو کر پہنچے تو بلا جھجک قاضی مبارک اور بیضاوی وغیرہ میں جہاں اشکال پیش آتے فوراً مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ اور حل فرما کر واپس لوٹتے۔

۳۔ علامہ اپنے زمانے کے غزالی اور رازی تھے | میں نے خود مولینا عبد السمیعؒ سے سُنا کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا عثمانی اپنے زمانہ کے رازی اور غزالی ہیں۔ اور تقریباً یہی الفاظ مولینا محمد ادریس صاحب کاندھلوی مدظلہ سے سننے میں آئے۔ مولینا عثمانی درحقیقت ایک آیت من آیات اللہ تھے۔

پھر دارالعلوم دیوبند کی طرف

مُشاہدات راقم الحروف

علامہ کے علمی کارناموں کا درمیان میں ذکر آجانے سے ہمارے مشاہدات کا سلسلہ ٹوٹ گیا تھا۔ ہم علامہ سے متعلق اپنے آنکھ دیکھے واقعات پیش کر رہے تھے۔ آپ کی علمی اور عملی، سیاسی اور مذہبی خدمات کا تسلسل ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔ یہ واقعات ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۱ء سے ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹۲۸ء تک کے ہیں جب راقم الحروف وہاں مقیم رہا۔ اس اثنا میں ۱۳۴۴ھ میں دارالعلوم کے سالانہ امتحان میں مولانا گل محمد صاحب ناظم مطبخ و کنٹرولر اگزامینشنز کا طلبہ سے دست و گریبان ہونے کا واقعہ پیش آیا۔

۸ شعبان ۱۳۴۴ھ کا دن چونکہ مولانا گل محمد خاں صاحب کے ذمے مطبخ اور طلبہ سے متعلق بعض انتظامات کا معاملہ تھا اور وہ بھی کچھ سخت گیر سے آدمی تھے اس لئے طلبہ اور ان کی آپس میں چشمک تھی۔ امتحان کے نگران ہونے کی حیثیت میں بھی وہ تشدد کو پسند کرتے تھے اس لئے ۸ شعبان ۱۳۴۴ھ کو میرے سامنے پیش آیا کہ طلبہ مولانا گل محمد خاں صاحب سے دست و گریبان ہو گئے۔ میرا اس روز متنبی کا پرچہ تھا میں نے سب واقعات آنکھوں سے دیکھے۔ اور ایسے واقعات کا ایسے مواقع میں ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ میں خود پنجاب یونیورسٹی کے ایف۔ اے، بی۔ اے، مولوی فاضل، منشی فاضل وغیرہ میں ڈپٹی اور سپرنٹنڈنٹ رہا ہوں مجھے ان امور کا کافی تجربہ ہے کہ طلبہ کی نگرانی میں ذرا سا بھی تشدد طلبہ کو کتنا مخالف اور برانگیختہ بنا دیتا ہے۔ بہرحال جو طلبہ مولانا گل محمد صاحب سے چیں بجبیں ہوئے ان میں

یوں تو بہت تھے مگر خاص طور پر جو سامنے آئے ان میں جانؒ محمد بلیاوی، محمد ظہور دربھنگوی، عبدالحنان پشاوری، عبدالعزیز مظفر پوری، سلیم مظفر پوری اور عبدالحق بھاگلپوری تھے۔

مولانا شبیر احمد صاحب نے مہتمم صاحب سے فرمایا کہ عبدالعزیز مظفر پوری ان طلبہ میں شریک نہ تھا لہٰذا مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے اس کے اخراج کا حکم واپس لے لیا اور مولانا عثمانی کے اس فرمانے کے بعد مزید بحث اور تصدیق کی ضرورت کا سوال ہی پیدا نہ ہوا۔

الحاصل ۱۳۴۴ھ گذرا اور ان حالات میں گزرا کہ ۸ رشعبان کو یہ معاملہ پیش آچکا تھا اور پھر ۱۳۴۵ھ آگیا۔ حضرت عثمانی نے دارالعلوم کے بعض انتظامات میں جھول دیکھا تو نیک نیتی سے ایسی اصلاحات کی طرف مشورہ دیا جن سے ایسے واقعات رونما نہ ہو سکیں جیسے کہ مولانا گل محمد صاحب اور طلبہ کے ساتھ ہوئے تھے۔ نیز ان حالات کی چھان بین کا بھی مشورہ دیا جن کے باعث یہ واقعہ ظہور میں آیا۔ بہر حال جو اصلاحی تجویزات انہوں نے پیش کیں ان کا ذکر سنئے۔

٭

دار العلوم دیوبند
میں
علامہ شبیر احمد عثمانی کی طرف سے
بعض اصلاحات کا مشورہ

علامہ شبیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ دار العلوم دیوبند کے فاضل، اعلیٰ مدرس اور ہندوستان کے مشار الیہ مصلح تھے۔ دار العلوم دیوبند کے متعلق ارباب انتظام کو وہ مناسب اور مفید مشوروں اور تجویزوں کے ذریعے فائدہ پہنچانے میں کبھی دریغ نہیں فرماتے تھے۔ چنانچہ جب کبھی وہ محسوس کرتے اپنے بڑے بھائی مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نائب مہتمم اور مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم سے وقت بے وقت دار العلوم میں اصلاحات کی طرف توجہ دلاتے رہتے تھے۔

مجلس شوریٰ کے اجلاس ۲۴ شوال ۱۳۴۵ھ میں علامہ عثمانی کی اصلاحات کی پیشکش

دار العلوم دیوبند ایک دینی ادارہ ہے لیکن دنیا کی زمین پر ہے۔ اس نے اسلام اور مسلمانوں کی بے شمار مذہبی اور ملی خدمات انجام دی ہیں لیکن اس میں اصلاحات کی گنجائش تو رہنی ہی چاہیئے۔ ۱۳۴۴ھ سے ۱۳۴۶ھ تک اور ۱۳۵۴ھ سے ۱۳۶۲ھ تک آپ نے بالخصوص اور ہمیشہ بالعموم ناظمین دار العلوم کو تعلیمی اور انتظامی اصلاحات کی طرف برابر توجہ دلائی۔ ہم ۱۳۴۵ھ دار العلوم دیوبند کی روئداد سے ایسی تجاویز پیش کرتے ہیں جو علامہ نے مہتمم صاحب، مولانا حبیب الرحمٰن رح

اور مجلس شوریٰ کو مورخہ ۲۴ رشوال ۱۳۴۵ھ مطابق ۲۷ راپریل ۱۹۲۷ء کو بعد نماز ظہر دارالعلوم میں پیش کیں۔ ان تجاویز پر حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب اور حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کے بھی دستخط تھے۔ لیکن یہ تجاویز تھیں مولانا شبیر احمد صاحب کی لکھی ہوئیں۔ تجاویز یہ ہیں۔

۱۔ مجلس شوریٰ کے جلسے ہر سال ہونے چاہئیں۔ (ماخوذ از عبارت صفہ ۲۲ رپورٹ ۱۳۴۵ھ)

۲۔ بزمانۂ علالت حضرت مہتمم مولانا محمد احمد صاحب و قیام مولانا حبیب الرحمٰن صاحب بحیدرآباد دکن، دارالعلوم دیوبند کسمپرسی کی حالت میں رہا، اور منتظمین میں ایک گونہ شخصیت پیدا ہوگئی۔ (ماخوذ صفحہ مذکورہ)

۳۔ ۱۳۴۴ھ میں طلبہ کے اضطراب کی وجوہات کا پتہ چلانا اور بعض ملازمین کی سختی کی طرف توجہ دلانا۔

۴۔ دیوبند اور اس کے قرب و جوار میں بعض اہل رائے اور متدین حضرات کا تعین تاکہ وہ مدرسے کا جلد جلد معائنہ کرتے رہیں۔

۵۔ اراکین کی ایک خاص تعداد ایسی ہونی چاہئے جو مدرسے کے اہتمام اور ملازمین کے طرز عمل اور پابندی قواعد و دستور العمل کی بہت جلد جلد آزادانہ جانچ کرسکے۔

۶۔ دارالعلوم کی سالانہ روئداد ہر سال طبع ہونی چاہئے اور اس میں تاخیر نہیں ہونا چاہئے۔

۷۔ مجلس شوریٰ کو چاہئے کہ وہ استبدادی کارروائیوں پر کڑی نظر رکھیں۔

۸۔ تعلیم کی اصلاح اور تبلیغ کے اہم فریضے کے مسائل پر، مدرسین کے طرز تعلیم اور ان کی قابلیت کی اصلاح کا صحیح توازن قائم رکھنے کے لئے اور

طلبہ کی شکایات یا جو کچھ تعلیمی یا اخلاقی خرابیاں ہوں ان کی طرف پیشقدمی ضروری ہے ۔

۹۔ موجودہ اراکین اپنی ذمہ داری کو محسوس فرمائیں ۔

۱۰۔ جماعت شوریٰ میں جلد از جلد ایسے چند اراکین کا اضافہ فرمائیں جو ان شروط کے موافق ہوں جو دارالعلوم کے اصول و قواعد اور اس کے گذشتہ تعامل و توارث سے ثابت ہو چکے ہیں ۔

۱۱۔ تمام اعلیٰ عہدہ داروں مثلاً سرپرست، اہل شوریٰ، مہتمم، نائب مہتمم، سر دفتر، صدر مدرس وغیرہم کے فرائض و اختیارات کی تشخیص و تحدید ہو جائے اور وہ شائع کر دی جائے ۔

۱۲۔ روزہ مرہ کی عام ضروریات کے سوا جو کوئی غیر معمولی ضرورت ایسی پیش آئے جس کے فوراً انصرام کی ضرورت یا تاخیر میں نقصان ہے اور اس لئے رائے جماعت شوریٰ کی حاصل نہیں کی جا سکتی اس کے لئے ایک مختصر مجلس عاملہ بنا دی جائے جس کے مشورے سے ایسی ضروریات بغیر مزید تعویق کے انجام دے سکیں ۔ اور جو امور عام ضابطے کے خلاف مستثنیات کے طور پر کسی ضرورت سے کئے جاتے ہیں ان میں بھی مجلس عاملہ کی رائے حاصل کی جائے اور مجلس عاملہ کا خاص یہ کام ہو کہ وہ اس کی پوری نگرانی رکھے کہ دارالعلوم کے ہر شعبے میں قواعد اور دستور العمل کی پابندی کہاں تک ہوتی ہے ۔ اور حساب و کتاب کہاں تک صحیح رہتا ہے ۔ اس مجلس کے مفصل قانون بنانے کے لئے دو چار آدمی نامزد کر دئے جائیں ۔

۱۳۔ ممبران دارالعلوم میں سے ایک ایک دو دو صیغے کے خاص خاص ممبر نامزد کئے جائیں وہ اس شعبے کی مخصوص طور پر نگرانی کیا کریں اور اس صیغے کی

اصلاح و ترقی کے متعلق غور و خوض کرتے رہیں۔

۱۴۔ نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم کو جہاں تک دارالعلوم کا مسلک قدیم اجازت دے بیش از بیش مفید اور وسیع الاثر بنانے کی کوشش کی جائے۔

۱۵۔ طلبہ کی تہذیب اخلاق کے لئے پوری تدابیر عمل میں لائی جائیں جن میں سب بڑی یہ ہے کہ ان کے مربی عملی طور پر اسوہ (نمونہ) بنیں۔

۱۶۔ تعلیم مبلغین اور عملی تبلیغ کا اہتمام دارالعلوم کی شان کے مطابق ہو اور اس کام کے واسطے ایک خاص جماعت کو مامور کیا جائے کہ وہ اس کا خاکہ تیار کرے اور پھر اس کی سفارشات کو جہانتک وسعت ہو منظور کیا جائے۔

۱۷۔ ہمارے خیال میں ممبران دارالعلوم دو قسم کے ہونے چاہئیں۔ ایک وہ جو اہل فضل و صلاح ہیں اور علم و دیانت کے ساتھ صاحب رائے ہوں۔ ایسے ممبروں کی جماعت کو جماعت منتظمہ دارالعلوم یا جماعت شوریٰ کہا جائے۔ دوسرے وہ جو پہلے طبقے کی طرح اگرچہ صاحب علم و فضل نہیں ہیں لیکن معاملات اور حساب و کتاب اور شعبۂ انتظامیہ میں دستگاہ رکھتے ہوں۔ دارالعلوم کے ہمدرد اور معین اور اس کے شرعی مسلک کو پسند کرنے والے اور اس کی فلاح میں ساعی ہوں ان کو اعزازی ممبر کہا جائے اور ان معاملات دارالعلوم میں جن کے وہ اہل ہیں ان کے مشورے اور عمل سے مدد لی جائے دارالعلوم کے وہ مسائل جو تعلیمی اور شرعی نقطۂ نظر سے زیر بحث آئیں ان میں ان ممبران کی رائے کو قطعاً دخل نہ ہوگا۔ البتہ تعمیر، مطبخ، دفتر اور حسابی معاملات میں ان حضرات سے مدد لی جائے گی۔ باقی پہلا طبقہ یعنی جماعت شوریٰ یا جماعت منتظمہ تمام شعب دارالعلوم کی ہیئت حاکمہ ہو گی۔

یہ وہ اصلاحی خاکہ ہے جو علامہ شبیر احمدؒ صاحب نے مولوی فصیح الدین ممبر

مجلس شوریٰ کی فرمائش پر مجلس شوریٰ میں پیش کیا۔ ان اصلاحات اور تجاویز کے بارے میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ ۱۳۴۵ھ کی رپورٹ میں تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ سب تجاویز اور اصلاحات مہتمم صاحبان اور مجلس شوریٰ پہلے ہی کر چکی ہے چنانچہ رپورٹ میں لکھتے ہیں۔

تفصیلات مذکورہ پر اجمالی نظر اس تفصیل مذکور سے ظاہر ہو گیا کہ مولانا شبیر احمد صاحب نے جو تجویز پیش کی ہے اس میں تحت ۱تا ۱۰ تک جو امور اصولی انتظام طلب درج فرمائے ہیں ان میں کوئی امر بھی ایسا نہیں ہے جو اصول و قواعد دارالعلوم میں داخل نہ ہوا ور جس پر مجلس شوریٰ دارالعلوم نے توجہ مبذول نہ کی ہو...... امید ہے کہ خود مولانا شبیر احمد صاحب خصوصاً اور دیگر حضرات کو عموماً اطمینان ہوگا۔

خود مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم نے بھی دس تجویزیں لکھ کر مجلس شوریٰ کو بھیجدی تھیں تاکہ وہ مجلس شوریٰ میں شرکت سے پہلے ان پر غور کر لیں۔ ان تجویزات میں وہ بھی ہیں جو علامہ شبیر احمد صاحب کی تجاویز کی موافقت میں ہیں۔ آخر میں مہتمم صاحب لکھتے ہیں:۔

”جو تجاویز اصلاحی جناب مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے پیش فرمائی ہیں ان میں سے بہت پہلے حضرت مہتمم صاحب اپنی اصولی تجاویز مذکورہ بخدمت حضرت سرپرست صاحب (حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی) مدظلہ (حال رحمۃ اللہ علیہ) و بعض ممبران کے پاس بذریعہ ڈاک روانہ فرما چکے تھے۔ تاکہ ممبران اپنے موقعہ پر غور کر کے جلسۂ شوریٰ میں اپنی رائے مستحکم طور سے پیش کر سکیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ممبران نے ہر ایک نمبر پر غور کر کے مجلس شوریٰ میں قواعد و ضوابط مرتب کئے“ (رپورٹ ۱۳۴۵ھ ص ۳۱)

مجلس شوریٰ کا دوسرا اجلاس

۲۵؍شوال ۱۳۴۵ھ ۲۸؍اپریل ۱۹۲۷ء

مجلس شوریٰ کا دوسرا اجلاس ۲۵؍شوال ۱۳۴۵ھ مطابق ۲۸؍اپریل ۱۹۲۷ء بروز جمعرات بوقت صبح دارالعلوم میں منعقد ہوا۔ منجملہ اور امور کے حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب نے بحیثیت صدر مدرس اور ممبر مجلس شوریٰ، بتائید حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، تجویز پیش کی کہ مجلس شوریٰ میں مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، مولانا حسین احمد صاحب مدنی (شیخ الحدیث مدرسہ سلہٹ) مولانا کفایت اللہ صاحب مفتی دہلوی کو مجلس شوریٰ کا ممبر بنایا جائے۔ یہ تجویز شاہ صاحب نے لکھکر دی تھی۔ جس پر طے ہوا کہ تھانہ بھون میں حضرت سرپرست کے سامنے یہ تجویز پیش کی جائے۔

مجلس شوریٰ کا جلسہ تھانہ بھون میں؛

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے عرصے سے باہر آمد و رفت بند کر دی تھی۔ اس لئے ۲۹؍شوال ۱۳۴۵ھ مطابق ۲؍مئی ۱۹۲۷ء پیر کے دن بمقام تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ میں ساڑھے تین بجے دوپہر کے بعد مجلس شوریٰ کا اجلاس ہوا۔ جس میں حضرت[۱] مولانا اشرف علی صاحب، حضرت[۲] مولانا سید محمد انور شاہ صاحب، مولانا[۳] مولوی محمد حسن صاحب مراد آبادی رکن مجلس العلما ریاست بھوپال و ممبر شوری، مولوی[۴] حکیم جمیل الدین صاحب نگینوی طبیب دہلی، مولانا[۵] مولوی عبدالرحمٰن صاحب سیوہاری ممبر و رکن مجلس العلماء و مہتمم مدرسہ احمدیہ عربیہ ریاست بھوپال، مولانا[۶] محمد اشفاق صاحب رائپوری نگراں مدرسہ عربیہ سہارن پور، حافظ[۷] محمد فصیح الدین صاحب تاجر میرٹھ و ممبر میونسپل بورڈ، مولوی[۸] سعید الدین صاحب بہادر پنشنر گورنمنٹ

بھوپال شریک ہوئے ۔ باقی مجلس شوریٰ کے تین ممبر یعنی مولانا نواب محی الدین خاں صاحب مرادآبادی، حکیم محمد اسحٰق صاحب کٹھوڑی اور مولوی مشیت اللہ صاحب بجنوری جو مجلس شوریٰ کے دیوبند کے اجلاسوں میں شریک ہوئے تھے رخصت ہو چکے تھے ۔

الغرض حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب کی تحریری تجویز بتائید حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب تھانہ بھون کے اجلاس میں پیش ہوئی حکیم جمیل الدین صاحب اور مولانا عبد الرحمٰن صاحب اور مولانا محمد حسن صاحب نے مفتی کفایت اللہ صاحب کو ممبر بنا لینے کی تائید کی لیکن بقیہ حضرات نے نہیں کی ۔ پھر مولانا شبیر احمد صاحبؒ کے متعلق حاجی فصیح الدین صاحب نے موافقت کی لیکن دوسرے خاموش رہے ۔ لیکن مولانا حسین احمد صاحبؒ کے متعلق کسی نے بھی کچھ نہ کہا ۔ یہ وہ وقت تھا کہ مجلس شوریٰ میں مولانا مدنی کا کوئی موئید نہ تھا اور ایک وقت وہ آیا جب مجلس شوریٰ میں مولانا مدنی کے سب تھے اور انہیں یہ کہنے کا حق تھا ؎

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

تینوں کی ممبری کی تجویز مسترد

الغرض سرپرست صاحب نے فیصلہ دیا کہ "کثرت رائے ان تینوں حضرات کے ممبر نہ کئے جانے کی طرف ہے اسی پر فیصلہ کیا جائے۔" (رپورٹ ۱۳۴۵ھ صفحہ ۳۴، ۳۵)

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ان میں سے تو کسی کو ممبر نہ بنایا گیا لیکن حافظ فصیح الدین کی تحریک پر شیخ رشید احمد صاحب تاجر دہلی کو اور حضرت تھانویؒ کی تحریک پر مولوی حکیم رضی الحسن صاحب کاندھلوی کو ممبر بنا لیا گیا لیکن شاہ صاحب نے دونوں کی مخالفت کی ۔

ان امور کے علاوہ جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی تجاویز اور دیگر امور پر مجلس شوریٰ کے اجلاس ہوتے رہے اور ۳۰ شوال ۱۳۴۵ھ مطابق ۳ مئی ۱۹۲۷ء بمقام تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ میں آخری اجلاس ہوا اور پھر جلسۂ شورائیہ کے بعض اجلاس دیوبند میں تھانہ بھون سے واپسی پر ہوئے۔

دلوں میں گرہیں پڑ گئیں

مجھے کہنا صرف یہ ہے کہ علامہ عثمانی کی اصلاحات کا کچھ نہ کچھ کسی نہ کسی شکل میں ضرور ہوا مگر وہ بات پوری نہ ہوئی جو شاہ صاحب چاہتے تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کا مجلس شوریٰ پر پورا اثر تھا۔ حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب کی تجویز کہ مولانا شبیر احمد صاحبؒ، مولانا حسین احمد صاحبؒ اور مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کو ممبر بنایا جائے مسترد ہو جانے سے دلوں میں گرہیں پڑ گئیں اور یہ اچھا نہ ہوا جن حضرات کا وجود دار العلوم کے لئے باعث خیر و برکت ہوتا وائے ناکامی کہ ان کو مجلس شوریٰ میں اراکین مجلس نے لینے سے خموشی اختیار کی۔ آخر یہ خموشی کس وجہ سے ؏

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

ناقدری ابنائے روزگار

یہاں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ چاہتے اور ارکان شوریٰ کے کان میں ڈال دیتے کہ ان تینوں صاحبان کو مجلس شوریٰ میں لئے جانے کی حضرت سرپرست صاحب کے سامنے پُرزور تائید کریں تو دلوں میں صفائی ہو جاتی اور کدورت کا نام ونشان نہ رہتا۔ بس یہیں سے سمجھ لیجئے کہ میں چھوٹا منہ بڑی بات کہنے لگا ہوں کہ مولانائے مہتمم صاحب نے ان تینوں حضرات کی قدر نہیں کی۔ یہ تینوں حضرات تو اس قابل تھے کہ اگر میں مہتمم ہوتا تو تمام مجلس شوریٰ کو سرپرست کے سوا معطل کر کے ان حضرات کو فہرست کی اولیں سطور میں رکھتا۔ مگر دُر

کے مقابلے میں صدف کی قیمت زیادہ نکلی۔ بقول انیس یہ دنیا والے ؎

دُر کو تو گھٹاتے ہیں بڑھاتے ہیں صدف کو
کھو دیتے ہیں شیشے کے لئے دُرِّ نجف کو

شوال ۱۳۴۴ھ سے شعبان ۱۳۴۵ھ

الحاصل شوال ۱۳۴۴ھ سے شعبان ۱۳۴۵ھ مطابق ۱۹۲۷ء تک کا سال اسی نشیب و فراز میں گزرا۔ شاہ صاحب نے اس سال بھی پوری بخاری شریف اور ترمذی شریف پڑھائی اور یہی شاہ صاحب کی صدر مدرسی کا آخری سال تھا۔ اسی سال اس ناچیز نے شاہ صاحب سے بخاری اور ترمذی پڑھیں۔

شعبان ۱۳۴۵ھ

شعبان ۱۳۴۵ھ میں سالانہ امتحان بخیر و خوبی ہوا مگر سارے سال اختلاف آراء کی کھچڑی پکتی رہی۔ یہانتک کہ شوال ۱۳۴۵ھ سے نیا سال شروع ہوا جو شعبان ۱۳۴۶ھ پر ختم ہوتا تھا۔ بقول حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم:۔

"روئداد ۱۳۴۴ھ سے معلوم ہو چکا ہے اس سال ایک عظیم الشان فتنہ دارالعلوم میں رونما ہوا اور ۱۳۴۵ھ میں بھی وہ فتنہ برابر جاری رہا۔"

(روداد ۱۳۴۵ھ ص۱)

آگے چل کر مہتمم صاحب لکھتے ہیں:۔

"یہ کسی طرح مناسب نہیں ہے کہ (دارالعلوم کے) خوش کن حالات تو لکھے جائیں اور رنجیدہ واقعات پر پردہ ڈال دیا جائے۔ اس لئے گو رنجیدہ واقعات کا اظہار کتنا ہی خلاف طبع اور ناگوار ہو مگر ہم روداد کے صفحات کو ان حالات سے خالی نہیں چھوڑ سکتے۔" (رپورٹ دارالعلوم ۱۳۴۵ھ ص۱)

۴ر شعبان ۱۳۴۵ھ کو شاہ صاحب کی مسجد دارالعلوم میں تقریر

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رپورٹ میں تحریر فرماتے ہیں :۔

" شاہ صاحب کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ : مجھے معلوم ہوا ہے کہ طلبہ کے مطالبات پورے نہیں ہوئے طلبہ کو چاہئے کہ اپنے مطالبات لکھ کر مجھے دیں ۔ میں ان کو حضرت مولانا اشرف علی صاحب کے پاس بھیجدوں گا " (رپورٹ ۱۳۴۵ھ صفہ ۸)

۵ر شعبان ۱۳۴۵ھ کو شاہ صاحب کی مسجد میں دوسری تقریر

اس تقریر میں شاہ صاحب نے فرمایا :۔

" مجھے معلوم ہوا ہے کہ طلبہ، مطالبات کو لکھ کر دینے اور دستخط کرنے میں مہتمم صاحب سے خائف ہیں ۔ لہٰذا طلبہ دورۂ حدیث کو چاہئے کہ مطالبات لکھیں اور اس پر نام کسی کا نہو ۔ بلکہ بجائے دستخط کرنے کے طلبہ دورہ لکھدیں اور مجھے دے دیں "

غرض یہ معاملات بے ساختہ پن میں آگے بڑھ گئے ۔ مطالبات کا معاملہ نہ معلوم کیوں گول رہا ، تا آنکہ شعبان ۱۳۴۵ھ میں مجلس شوریٰ اجلاس شروع ہوئے اور علامہ عثمانی نے وہ مطالبات پیش کئے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے ۔

شوال ۱۳۴۵ھ

شوال ۱۳۴۵ھ سے نیا سال شروع ہوا ۔ طلبہ کا داخلہ حسب دستور جاری رہا تا آنکہ سات سو طلبہ عربی درجے میں داخل ہوئے ۔

فتنہ باغ آسارام پنڈت ۱۲ر ذوالحجہ ۱۳۴۵ھ

۱۲ر ذی الحجہ ۱۳۴۵ھ کو لدھیانے کا رہنے والا ایک طالب علم رحمت اللہ صبح کی نماز کے وقت پنڈت آسارام رئیس دیوبند کے باغ میں

تفریح کے لئے چلا گیا۔ وہاں ایک مندر تھا۔ اس میں ایک مالی اور تین پنڈت تھے۔ پنڈت پوجا پاٹ میں مصروف تھے کہ یہ طالب علم ان کی عبادت کا طریقہ دیکھنے کے لئے مندر کے چبوترے پر چڑھ گیا۔ ایک پوجاری نے سختی سے روکا اور سخت سست کہکر سب مارنے لگے اور پھر پنڈت آسارام کے پاس لے گئے۔ انہوں نے طالب علم سمجھ کر چھوڑ دیا اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کو اطلاع دی۔ طلبہ کو جب خبر ہوئی تو باغ پہنچے اور پنڈتوں کی مرمت کر ڈالی۔ معاملہ حکومت تک پہنچا لیکن مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی حکمت عملی اور پنڈت آسارام کی شرافت سے معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

۱۳۴۶ھ شوال سے ذوالحجہ ۱۳۴۵ھ ماہ وسال ختم ہوا۔ تاآنکہ ۱۳۴۶ھ کا سال گذر رہا ہے مگر دلوں میں تاہنوز اضطراب ہے جو بے چین کر رہا ہے تاآنکہ شعبان ۱۳۴۶ھ آگیا۔ جو امتحان کا زمانہ ہے۔ دارالعلوم میں تقریری امتحانات رجب کے آخر میں اور تحریری امتحانات شعبان میں ہوتے ہیں۔ ہنوز طلبہ کے مطالبات کا معاملہ درمیان میں ہے اب کیا ہوا، اسٹرائک کا آغاز ہوا۔

دارالعلوم دیوبند میں اسٹرائک

رجب وشعبان ۱۳۴۶ھ، ۱۹۲۷ء

علمائے ربانی کا باہمی اختلاف اپنے اندر بے شمار علمی معلومات اور حکمتوں کے سربستہ راز کے انکشاف کا باعث ہوتا ہے۔ ہم اس کو ظاہری نظروں سے دیکھتے ہیں تو اس کے اسباب کچھ نظر آتے ہیں لیکن قدرت کا منشا کچھ اور ہوتا ہے۔

آپ حضرت مولانا محمد طیب صاحب کی زبانی پہلے پڑھ چکے ہیں کہ علامہ عثمانی

کو اپنے برادر بزرگوار مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی سے مختلف امور میں اختلاف ہو جایا کرتا تھا اور میں (مولانا محمد طیب) ان کو منانے کے لئے مامور ہوتا تھا۔ بس اسی قسم کا اختلاف مدرسے کے امور انتظامیہ سے متعلق حضرت عثمانی کو ان دنوں ہوا۔ حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب، حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب، مولانا سراج احمد صاحب، مولانا بدر عالم صاحب، مولانا محمد ادریس صاحب سکروڈھوی، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی، مولانا عتیق الرحمٰن عثمانی، یہ سب حضرات ایک طرف تھے اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی جو مدرسے کے مہتمم تھے اور ان کے ساتھی دوسری جانب تھے۔ اختلاف کی خلیج نے وسعت اور شدت اختیار کر لی۔ طلبہ بھی بعض امور میں انتظامیہ سے چیں بجبیں تھے۔ ہم ان تمام واقعات سے پردہ اٹھانا پسند نہیں کرتے جو درپیش تھے نہ یہ محاکمہ پسند کرتے ہیں کہ کون حق پر تھا اور کون نہیں۔ ہاں اتنا ضرور سمجھتے ہیں کہ انتظامیہ کو مختلف قسم کی مشکلات پیش آیا کرتی ہیں اور جس کے ہاتھ میں اقتدار ہوتا ہے ان سے بعض لغزشوں کا ہو جانا بھی بشریت سے خالی نہیں ہوتا۔ لہٰذا ادب کا مقام یہ ہے کہ ایسے مواقع سے خموشی کے ساتھ گذر جانا ہی مناسب ہے۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ اور حضرت عائشہؓ کے واقعات آپ کے سامنے ہیں۔ لہٰذا صراط مستقیم جو اعتدال کی راہ ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ خموش رہا جائے۔ البتہ ایک خاص ہستی جن کا ہاتھ ہمارے خیال میں اسٹرائک کی ڈور ہلانے میں خصوصیت سے حصہ لے رہا تھا وہ مولانا بشیر احمد عرف بھٹہ مرحوم تھے۔ ان کا دارالعلوم میں تو کوئی دخل نہ تھا لیکن انہوں نے دیوبند میں بھٹہ لگایا تھا اور مدرسے کی تعمیرات کے لئے اس زمانے میں وہ اینٹیں سپلائی کرتے تھے اسی لئے ان کو بھٹہ کہنے لگے تھے۔ خدا ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے بڑے حوصلے کے زندہ دل آدمی تھے۔ کانگریس کے سرگرم ممبر، جمعیۃ العلما

کے کارکن اور ذہین آدمی تھے۔ وہ اسٹرائک میں زبردست حصہ لے رہے تھے۔ خوب یاد ہے کہ مرحوم نے اس زمانے میں طلبہ اور مذکورہ بالا حضرات کا بڑا ساتھ دیا۔

بہر حال تمام طلبہ نے اسٹرائک کردی۔ باہر سے رہبرانِ قوم مصالحت کے لئے آئے۔ مگر معاملہ سلگتا ہی رہا۔ یہ ۱۹۲۷ء کا سال تھا۔ اس اسٹرائک میں، مَیں عجب کشمکش میں تھا۔ میرا وہی حال تھا ؎

دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو
میری دونوں سے ہے آشنائی

ایک طرف تو میرے اساتذہ میں حضرت شاہ صاحبؒ، مولانا شبیر احمد صاحبؒ اور مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ جیسی شخصیتیں تھیں اور دوسری طرف جن اساتذہ سے میرے ذاتی تعلقات تھے ان میں مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند، حضرت میاں سید اصغر حسین صاحبؒ، مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی، مولانا اعزاز علی صاحب شیخ الادب اور مولانا عبدالسمیع صاحب تھے جو اسٹرائک کرنے والوں کے مخالف تھے۔ کچھ طلبہ ایسے تھے جو درسگاہوں میں سبق پڑھنے چلے جاتے میں بھی یہ کرتا کہ چپکے سے اسباق میں جاکر شرکت کرلیتا اور دوسری طرف طلبہ کے جلسوں میں بھی شامل ہوجاتا۔ میں اپنی اس دورخی پالیسی سے سخت پریشان تھا ؎

غرض دوگونہ عذاب است جانِ مجنوں را
بلائے فرقتِ لیلیٰ وصحبتِ لیلیٰ

ایک روز بعد نمازِ مغرب دیوبند کی جامع مسجد میں ایک زبردست جلسہ ہوا۔ تمام طلبہ اس میں موجود تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی نے مجھے سالانہ امتحان کے بائیکاٹ کا ریزولیوشن پیش کرنے کو کہا، بلکہ انہوں نے

خود لکھ کر دیا تھا۔ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ کاٹو تو بدن میں خون نہ تھا۔ کلیجے پر پتھر کی سل رکھ کر ذرا چُستی سے اٹھا مبادا دونوں طرف کے اکابر سے محبت کا بھرم کھل جائے۔ بہر حال امتحان سے اسٹرائک کی مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم کے کہنے پر بادل ناخواستہ میں نے تحریک کر ہی ڈالی اور متفقہ طور پر تمام طلبہ نے اس کی تائید کی۔ اور تائید تو طے شدہ معاملہ تھا۔ میرے اس ریزولیوشن کی خبر بَن میں آگ کی طرح، دارالعلوم میں پھیل گئی۔ اب میں احاطۂ مدرسہ میں داخل ہونے کے قابل نہ تھا۔ امتحان کا تو بائیکاٹ ہو گیا ادھر اہتمام کی جانب سے طلبہ پر مدرسے کے دروازے بند ہو گئے۔ یہ جاڑوں کا موسم تھا' رفتہ رفتہ طلبہ اپنے گھروں کو چلے گئے۔ چند جو رہ گئے تھے وہ مولوی مشفع صاحب کے مکان میں جہاں مولوی عزیز گل کی شادی ہوئی تھی منتقل ہو گئے۔ یہ ایک بڑا مکان تھا اس میں ہی مولانا بشیر احمد بھٹہ، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، مولوی عبدالوحید صدیقی غازی پوری مدیر اخبار "نئی دنیا" دہلی، مولانا حامد الانصاری غازی، مَیں، مولوی محبوب الٰہی منگلوری اور بعض اسٹرائکر اسی مکان میں رہتے تھے۔ میں اور مولانا محبوب الٰہی اور مولانا شکری بہاری مولوی فاضل کی تیاری میں مصروف تھے۔ ہم لوگوں کے اخراجات مولانا بشیر احمد بھٹہ مرحوم ہی اٹھاتے تھے۔ مہاجر اخبار کا اجرا انہی مولانا بشیر احمد اور پارٹی کی طرف سے ہوا۔ مدرسے سے اخبار الانصار نکلتا تھا۔ میں بھی مہاجر کے بعض حصوں کی کتابت کر دیا کرتا تھا اس لئے روٹی کھانے کا استحقاق ہو جاتا۔

شوال ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹۲۸ء

اختلاف آرار کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ دارالعلوم میں شوال ۱۳۴۶ھ میں طلبہ کا داخلہ شروع ہو گیا اور قدیم وجدید کی رونق افروزیاں سے دارالعلوم کی فضا پھر جگمگا اٹھی۔

اس سلسلے کی تاریخ جو شوال ۱۳۴۶ھ سے شروع ہوتی ہے آپ دارالعلوم کی اس سال کی رپورٹ میں پڑھیے۔ تاہم موافقت کی صورت اور اختلاف کو دور کرنے کے لئے علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کی ایک تحریر ان کے گھر سے ہمیں کراچی سے ملی جو علامہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہمارے پاس موجود ہے جس پر حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب، حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب اور علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کے دستخط موجود ہیں تحریر یہ ہے:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ بعد الحمد للہ والصلوٰۃ والسلام علی نبیہ الکریم۔ چونکہ دارالعلوم دیوبند کے اختلافات ومناقشات نہایت ہی ناخوشگوار صورت اختیار کر چکے ہیں جس میں دارالعلوم کے لئے نقصان عظیم ہے اس لئے بارہا ہم نے یہ چاہا اور کوشش کی کہ کوئی معقول ومعتدل اور طمانیت انگیز صورت اس نزاع اور اختلاف کے ختم کرنے کی نکل آئے چنانچہ اس سلسلے میں کئی مرتبہ جدوجہد ہوئی جو ناکامیاب رہی۔ اب ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس اختلاف ونزاع کے تمام کرنے کی بہترین صورت تحکیم ہے۔ یعنی کوئی ایسا بے لوث شخص جس پر فریقین کو دیانۃً پورا اعتماد ہو اس کو حکم ٹھہرالیا جائے۔ بنابریں ہم تینوں جن کے دستخط ذیل میں ثبت ہیں اس باب میں عالیجناب خواجہ ابو المتین شیخ رشید احمد صاحب میرٹھی ممبر دارالعلوم دیوبند کو بصدق ودل حکم قبول کرتے ہیں۔ اگر مجلس شوریٰ اور حضرت سرپرست صاحب دارالعلوم بھی اس تحکیم کو قبول فرمالیں تو جو فیصلہ امور متنازع فیہا کا شیخ صاحب ممدوح فرمائیں گے ہم کو اس کے ماننے میں کسی طرح کا انکار نہ ہوگا۔ اگر شیخ صاحب ممدوح اپنے ہمراہ کسی دوسرے صاحب کو بھی فریقین کے بیانات سننے اور حالات کی تحقیق کرنے میں شریک فرمائیں تو ہم کو اس میں بھی کوئی عذر نہیں ہے۔" ۱۹ شوال ۱۳۴۶ھ

عزیز الرحمٰن عفی عنہ   محمد انور عفا اللہ عنہ   شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ

ڈابھیل کو روانگی

شوال ۱۳۴۶؁ھ کے بعد

تقدیر ربانی کا تدبیر انسانی پر غلبہ؛

علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب، حضرت شاہ صاحب، مولانا سراج احمد صاحب، مولانا بدر عالم صاحب، مولانا محمد ادریس صاحب سکروڈھوی، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب اور اسٹرائک میں حصہ لینے والے اور شرکت کرنیوالے تمام اساتذہ شوال ۱۳۴۶؁ھ کے بعد ڈابھیل (سملک) ضلع سورت چلے گئے یہاں مدرسے کے ناظم شیخ احمد، شاہ صاحب وغیرہم کو مدرسے میں لے آئے اور مولانا محمد صاحب سورتی جو شاہ صاحب کے چہیتے شاگرد تھے اور اسٹرائک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے ان صاحبان کو ڈابھیل لے جانے کا باعث ہوئے۔ تقدیر ربانی، انسانی تدبیر پر غالب آئی اور اس طرح فقہ، حدیث اور تفسیر کے یہ ائمہ دارالعلوم سے جدا ہو گئے۔ ہم تو جب جانتے کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم ان حضرات کو منا لیتے اور کسی قیمت، کسی صورت، کسی انداز، کسی حالت میں بھی ان کو دارالعلوم سے جانے نہ دیتے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔

حضرت مولانا حسین احمد صاحب کی آمد

ان حضرات کے عوض مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو صدر مدرسی پر لا بٹھایا، وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔

الحاصل

جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سملک ضلع سورت میں ان حضرات کی وجہ سے جان پڑ گئی اور اس کی شہرت دور دور ہو گئی۔

بہت سے اسٹرائکر طلبہ بھی وہاں جا داخل ہوئے اور جس جس کے جہاں سینگ سمائے وہ وہاں چلا گیا۔

بہر حال ڈابھیل کا نصیبہ کھل گیا اور ان حضرات کی وجہ سے اس خطۂ ارضی میں تعلیم دین کے چشمے ابلنے لگے۔ بس یہی حکمت ان حضرات کے یہاں اختلاف کی نظر آئی۔ عَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ٥

میں دارالعلوم میں شاہ صاحب سے دورہ پہلے پڑھ چکا تھا یہ سال فنون کا تھا بہر حال فارغ ہو چکا تھا مگر ہمیں سندیں دینے سے انکار کر دیا گیا۔ بعد میں جب ۱۳۵۳ھ میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم دارالعلوم میں صدر کی حیثیت سے تشریف لائے اس وقت ہم لوگوں کے لئے راہ کھلی اور حضرت عثمانی نے سندیں دلوائیں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کا ۱۹۳۰ء میں اسٹرائک سے دو سال بعد انتقال ہو گیا اور حافظ محمد احمد صاحبؒ انہی دنوں میں انتقال فرما چکے تھے۔ بہر حال میں تو مولوی فاضل پاس کر کے ٹریننگ کالج لاہور میں داخل ہو گیا اور وہاں سے او۔ ٹی کا سرٹیفکیٹ لیکر مشن ہائی سکول جالندھر اور پھر زندھیر کالج کپور تھلے میں پروفیسر بن کر چلا گیا۔ اس اثناء میں مولوی فاضل سے پہلے دیوبند کی سند نہ ہونے سے تلاش معاش میں دھکے کھائے

کرنال میں ایک تبلیغی ادارہ غلام بھیک نیرنگ سر رحیم بخش کے زیر انتظام کھولا گیا اس کا اشتہار شائع ہوا۔ ابتداء میں ساٹھ روپیہ تنخواہ رکھی گئی تھی۔ انٹرویو کے لئے امیدواروں کو بلایا گیا۔ میں نے بھی انٹرویو دیا۔ تقریر کی لیکن قسمت برگشتہ تھی، سند پاس نہ تھی اس لئے مجھے نہیں لیا گیا۔

حضرت شاہ صاحب، مفتی صاحب اور مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے

اس دوران میں دیوبند کی فضیلت کا سرٹیفکیٹ دیا تھا۔ یہ حضرات ہم لوگوں سے بڑی ہمدردی فرماتے تھے۔ کئی دفعہ حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضری کا اتفاق ہوا بڑی محبت فرماتے اور حال پوچھتے۔ ایک دفعہ شام کو حضرت کی خدمت میں آپ کے دولت خانے پر پہنچا۔ راستے میں حکیم صفت احمد کے گھر کے سامنے سے گذرا تو ایک کتیا نے میرے پاؤں میں زور سے کاٹ لیا میں اسی حالت میں پہنچا تو مولوی محفوظ علی سے فرمایا کہ ان کے زخم کو دبا دبا کر خالص سرکے سے دھوؤ اور مرچیں پیس کر اس کی ٹکیہ باندھ دو۔ الحمدللہ سب تکلیف رفع ہو گئی۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور مجھے مولوی فاضل میں اس نے پاس کر دیا ملازمت دے دی۔ ملازمت کے بعد کوئی معاشی تکلیف آج تک نہیں پہنچی اور اب بحمد اللہ اسلامیہ کالج لائلپور میں پروفیسر کی حیثیت سے تصنیف کتاب ۱۹۵۹ء میں تقریباً پانسو روپیہ اور پھر ۱۹۶۵ء میں ساڑھے چھ سو روپیہ جبکہ کتاب پر نظر ثانی کر رہا ہوں ماہوار مل جاتے ہیں اور خدائے کریم کا شکر ادا کرتا ہوں مگر سچ تو یہ ہے کہ سب دارالعلوم دیوبند کی جوتیوں کا صدقہ کہ وہاں جو پڑھا اس نے میرے لئے علم کی راہیں کھول دیں۔ اور اب نظر ثانی کے وقت ۱۹۷۲ء میں ریٹائرمنٹ سے دوچار ہوں۔

میں کہاں سے کہاں جا پہنچا۔ عہد ماضی کی یاد نے آنکھوں کے سامنے دھندلے نقوش ابھار کر چمکا دئے۔ رفتہ رفتہ سب معاملات ٹھیک ہو گئے۔

ہاں تو علامہ شبیر احمد صاحب، حضرت شاہ صاحب اور مفتی عزیز الرحمن صاحب رحمہم اللہ تعالیٰ، ڈابھیل چلے گئے اور اختلافات کی بدلیاں یوں جدائی کے دھندلکوں میں چھنٹ گئیں۔

⁂

علامہ عثمانی ڈابھیل سے پہلے حیدرآباد دکن میں

ابھی علامہ عثمانی ڈابھیل تشریف نہیں لے گئے تھے کہ شعبان ۱۳۴۵ھ یعنی ۱۹۲۷ء میں پہلی بار حیدرآباد دکن تشریف لے گئے۔ خیال یہ تھا کہ "فتح الملہم شرح مسلم" جو علامہ عرصے سے لکھ رہے تھے اور اس کی دو جلدوں کا مواد تیار بھی تھا اس کی طباعت کی کوئی صورت نظام دکن کی چشم التفات سے ہو جائے۔ کیونکہ اسلامیان ہند کے لئے اُس دور میں نواب عثمان علی خاں صاحب والی دکن جیسا علماء و فضلاء اور اہل فن کا کوئی قدرداں نہ تھا۔

حیدرآباد میں مولانا کے شاگردوں اور متعارفین کی کوئی کمی نہ تھی ان میں سے حکیم مقصود علی خاں صاحب جو مدرسۂ عالیہ دیوبند کے رکن مجلس منتظمہ تھے وہیں موجود تھے ان کے علاوہ آپ کے شاگردوں میں مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا محمد علی حیدرآبادی ذی اثر صاحبان تھے۔ اور خود علامہ کی شخصیت معمولی شخصیت نہ تھی وہ تو ایسی شمع تھے جس کے روشن ہوتے ہر طرف سے پروانے نثار ہونے کو دوڑتے تھے۔ حیدرآباد میں آپ کی تقریروں کا آغاز ہونا تھا کہ تمام شہر میں دھوم مچ گئی۔ نواب صاحب کے کانوں میں بھی یہ غلغلہ پڑا انہوں نے مکی مسجد میں جس میں نظام صاحب جمعہ کی نماز پڑھا کرتے تھے تقریر کی خواہش کا اظہار کیا چنانچہ حضرت عثمانی نے اس روز جمعہ مکی مسجد میں پڑھا۔ اتفاق سے ان دنوں مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم بھی حیدرآباد میں تھے، ان کی بھی مکی مسجد میں تقریر ہوئی تھی بلکہ ہو ہی رہی تھی کہ نظام صاحب پہنچ گئے کچھ دیر ان کی تقریر سنکر فرمایا کہ یہی ہیں وہ دیوبندی صاحب جن کی تقریر کی دھوم تھی۔ مصاحبین نے کہا نہیں حضور وہ دوسرے صاحب ہیں جو تشریف رکھتے ہیں۔ مولانا عثمانی کا یہ خود بیان ہے جو میں نے اپنے کانوں سے سُنا کہ نظام صاحب نے انہیں بیٹھ

جانے اور علامہ کو تقریر کرنے کی خواہش کی۔ چنانچہ موصوف نے اپنی سحر البیانی سے نہ صرف تمام عمائدین حکومت بلکہ نظام صاحب کو گرویدہ بنالیا۔ اثنائے تقریر میں حضرت عثمانی نے صحابہ کے فضائل بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"اگر نواب عثمان علی خان صاحب کو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے پیرہن کا ٹکڑا بھی مل جائے تو اس کو اپنے تاج میں ٹانکنا باعث فخر تصور فرمائیں گے۔"

اس جملے پر نواب صاحب جو سامنے بیٹھے تھے اپنی جگہ سے اچھل پڑے اور فرمانے لگے "بیشک مولانا۔"

مولانا عثمانی نے یہ جملہ اس لئے فرمایا کہ نظام پر تفضیلت کا رنگ آتا جارہا تھا۔ وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تمام صحابہؓ پر فضیلت کے قائل تھے لیکن دوسرے صحابہؓ کا ادب ملحوظ رکھتے تھے۔

الغرض نظام صاحب پر آپ کی تقریر کا بہت اثر ہوا۔ مولانا عثمانی نے ایک مجلس میں اپنی نشستگاہ پر فرمایا جس میں یہ راقم الحروف بھی موجود تھا کہ مجھ سے نظام صاحب کے مصاحبین نے فرمایا کہ آپ اس طرح تقریر فرمائیں اور اس طرح اور اس بات کا خیال رکھئے اور اس بات کا۔ میری تقریر ہو رہی تھی اور نظام صاحب جھوم رہے تھے۔ نظام صاحب کی خوشی کا یہ ایک واضح ثبوت تھا کہ اگر وہ اپنے خاصے میں سے کسی کو دعوت کے طور پر کچھ بھیجتے تو گویا اس سے بہت زیادہ مسرور ہونے کی نشانی سمجھی جاتی تھی، علامہ کو نظام صاحب نے کئی دفعہ کھانا یعنی خاصہ بھیجا۔

الغرض شہر میں آپ کی متعدد تقریریں ہوئیں اور تمام حیدرآباد آپ کا لوہا مان گیا۔ نظام صاحب نے علامہ کو محکمۂ فتوی کے لئے کوتوال شہر کے ذریعہ ایک ہزار روپیہ ماہوار پر اپنی خدمات سپرد کرنے کی خواہش ظاہر فرمائی لیکن آپ نے

ملازمت سے انکار فرما دیا۔ تاہم نظام صاحب نے تاحیات پچاس روپیہ ماہوار کا وظیفہ مقرر فرما دیا۔

علامہ عثمانی کی نظام دکن سے ایک خاص علمی ملاقات

اس سفر کے بعد علامہ ہر سال حیدر آباد تشریف لے جاتے کیونکہ نظام صاحب نے آپ سے فرمایا تھا کہ اگر آپ جامعہ عثمانیہ سے مستقل تعلق پر راضی نہیں تو کم از کم یہاں سال میں کچھ دنوں کے لئے ضرور تشریف لاکر اہل حیدر آباد کو شرف بخشا کریں۔ دوسرے اسفار میں علامہ کو نظام صاحب نے ملاقات کے لئے کئی مرتبہ اپنے محل میں یاد فرمایا اور مختلف علمی باتیں دریافت کیں جن کے جوابات سے نظام صاحب بہت متاثر ہوتے۔ ایک دفعہ نظام صاحب نے ملاقات کیلئے یاد فرمایا آپ تشریف لے گئے۔ نظام صاحب نے فرمایا کہ سر حیدری (وزیر اعظم حیدر آباد) کو میں نے وقت دیا ہے اور ۹ برار کے متعلق لندن جا رہے ہیں تھوڑا سا وقت ہے جو آپ کی ملاقات کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔ لیکن پھر نظام صاحب علامہ عثمانی سے بہت دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ علامہ کی تحقیقات اور علمی باتیں اتنی دلچسپ تھیں کہ نظام صاحب سر اکبر حیدری سے ملاقات ولاقات کو بھول گئے۔

حیدر آباد کا دوسرا سفر ۱۳۴۶ھ، ۱۹۲۸ء

علامہ پھر ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹۲۸ء میں حیدر آباد تشریف لے گئے اور آپ نے محکمۂ امور مذہبی کے اعلیٰ حکام کے مشورے سے فتح الملہم شرح مسلم کی طباعت کے اخراجات کے متعلق نظام صاحب کو درخواست پیش کی۔ چنانچہ درخواست اپنے مراحل سے گذرتی ہوئی نظام دکن نواب میر عثمان علی خاں صاحب تک پہنچی اور آپ نے اس سلسلے میں علامہ عثمانی کو ملاقات کے لئے بلایا۔ مسودہ پیش کیا جس کو دیکھ کر نظام صاحب بہت خوش ہوئے۔ اور پانچ جلدوں

کے لئے یکمشت پچیس ہزار روپیہ بحساب پانچ ہزار فی جلد منظور فرمایا۔ اور دو سال کے لئے فتح الملہم کی تیاری اور تصنیف کے دوران چار سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ مقرر فرمایا۔ مگر تین جلدیں چھپ کر تیار ہوئی تھیں کہ کچھ تو علامہ بیمار رہے اور کچھ پاکستان سے متعلق سیاسیات ملکی نے فرصت نہ لینے دی۔ پھر پاکستان بنا تو آپ یہاں تشریف لے آئے اور یہاں بھی ملکی امور سے متعلق کام کا اتنا ہجوم ہوا کہ فرصت نہ مل سکی۔

علامہ عثمانی سے کراچی میں میری ملاقات

مئی ۱۹۴۸ء میں جب میں کراچی گیا اور علامہ سے ملا تو میں نے فتح الملہم کی تکمیل کے لئے عرض کیا تو آپ نے فرمایا کہ ذرا کچھ سستالوں اور امور ملی سے فرصت پالوں تو اس طرف توجہ دوں گا مگر افسوس کہ آپ بیمار ہو گئے اور بیماری کی اس طوالت نے دسمبر ۱۹۴۹ء تک پہنچ کر دم لیا اور آپ دنیا سے رخصت ہو گئے۔[1]

بہر حال آپ کو ان وجوہات کے باعث نظام اور حیدرآباد اور وہاں کے لوگوں سے محبت اور دلچسپی ہو گئی اس لئے تقریباً ہر سال ہی حیدرآباد تشریف لے جاتے رہے۔

اصلاح فتنہ شیعہ وسنی صاحبان

حیدرآباد میں اسی دوران میں جب علامہ وہاں تشریف لے جایا کرتے تھے اوپر کے لوگوں میں سُنی اور شیعہ کا اختلاف کا فتنہ برپا ہونے والا تھا مولانا عثمانی نے اس کو فرو کرنے میں بڑی مدد کی اور اپنے حسن تدبر اور علمی بصیرت نیز خداداد تقریری قابلیت اور بڑے طبقے کے لوگوں میں رسوخ سے باہمی نزاع اور اختلاف کو ایسی خوبی سے دور کیا کہ اچھے اچھے مدبر اور حکام بھی ایسی صورت حالات سے مشکل ہی عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ

---

[1] ناظرین کی اطلاع کیلئے عرض ہے کہ اس کی تکمیل کی ذمہ داری حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم نے اپنے سر لی ہے، اور اس پر کام کرنا شروع کر دیا ہے بلکہ معتد بہ کام کر بھی چکے ہیں ناظرین سے اسکی تکمیل کی دعا کی درخواست ہے ۱۲ اشفاق احمد قاسمی

اور شیعہ سنی اختلافات کے فتنوں نے مسلمانوں کو کسقدر تباہ کیا ہے۔ استاذ محترم حضرت مولانا محمد طیب صاحب نے آپ کی وفات پر دارالعلوم کے ایک تعزیتی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"آپ نے تقسیم ملک سے پہلے اپنی مدبرانہ سیاسی قابلیت سے ریاست حیدرآباد کو ایسے وقت میں بعض مہلک مذہبی فتنوں سے بچانے کی سعی جمیل فرمائی جبکہ اس کے معاملات بہت زیادہ خطرے میں تھے"۔

(اخبار مدینہ بجنور اشاعت ۲۱ دسمبر ۱۹۴۹ء)

مدرسہ نظامیہ حیدرآباد دکن کی پرنسپل شپ!

نظام صاحب پر حضرت عثمانی کا اسقدر گہرا علمی اثر تھا کہ وہ اپنی ریاست میں ان کو کسی علمی خدمت پر مامور دیکھنا چاہتے تھے چنانچہ آپ کو مدرسہ نظامیہ کے پرنسپل کی پوسٹ کے لئے منتخب فرمایا۔ یہ واقعہ ۱۹۴۵ء کا ہے۔ جیسا کہ مکالمۃ الصدرین میں ہے:۔

"جب یہ حضرات (یعنی حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رح، حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب وغیرہم) علامہ عثمانی سے رخصت ہونے لگے تو مولانا احمد سعید صاحب نے دریافت فرمایا کہ آپ کو حضور نظام نے حیدرآباد بھی تو بلایا تھا آپ حیدرآباد کب تشریف لے جائیں گے۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ میں نے حضور نظام کو لکھا ہے کہ ابھی دو تین ماہ تک مجھے یہاں (دیوبند) بغرض علاج قیام کرنا ہے۔ سردی کم ہونے پر اگر اجازت ہو تو حیدرآباد آؤں۔ اب حضور نظام پر موقوف ہے کہ اگر اس کے باوجود انہوں نے مجھے طلب فرمایا تو مجھ کو بہر حال جانا پڑے گا۔ اور اگر اجازت دے دی تو ٹھہر جاؤں گا۔

(الحمدللہ اس تحریر کے مرتب کرتے وقت ہی حضور نظام کے چیف سیکرٹری کا تار بنام علامہ عثمانی پہنچا کہ آپ کو فروری تک قیام کی اجازت ہے)۔"

(مکالمۃ الصدرین ص۴۷)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ آپ کا حیدر آباد میں تقرر ہو گیا تھا یہ دسمبر ۱۹۴۵ء کی بات ہے اور فروری ۱۹۴۶ء کے بعد آپ کو حیدر آباد جانا تھا لیکن سیاسیات ملکی کے باعث فرصت نہ ملی اور پاکستان بننے تک مصروف رہے اور پھر پاکستان تشریف لے آئے، واپس نہ جا سکے۔

دارالعلوم دیوبند اور نظام دکن کی امداد

اس میں شک نہیں کہ دنیائے اسلام پر نظام دکن کی سخاوت بے حد تھی۔ ہند و بیرون ہند کے اسلامی اور قومی اداروں اور مدرسوں پر ان کا روپیہ پانی کی طرح بہتا تھا۔ علماء، صلحاء پر ان کا دست کرم پھیلا ہوا تھا۔ انہی اداروں میں دارالعلوم دیوبند اور اس کے متعلقین بھی ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کو میر عثمان علی خاں کے والد نے اڑھائی سو روپیہ ماہوار کا حکم دیا تھا۔ بعد ازاں میر عثمان علی خاں جب جانشین ہوئے تو انہوں نے ڈھائی سو روپیہ کا اور اضافہ فرمایا۔ لیکن رمضان ۱۳۳۴ھ اگست ۱۹۱۶ء میں جب دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا محمد احمد صاحب حیدر آباد تشریف لے گئے اور آپ نے مزید امداد کی تحریک کی تو نظام صاحب نے گرانٹ میں تین سو روپیہ کا اور اضافہ فرما دیا۔ اس خبر کو حلقہ دارالعلوم میں نہایت مسرت سے سنا گیا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں:۔

"شمس العلماء جناب مہتمم صاحب قبلہ حیدر آباد تشریف لے گئے..... اور دارالعلوم کی طرف حضور کی توجہ منعطف کی۔ اعلیٰ حضرت نے دارالعلوم دیوبند کے نام کو سنتے ہی اسی وقت تین سو روپیہ ماہوار مستقل وظیفے کی

اور بھی منظوری عطا فرمائی .... اس کی خبر جس وقت دار العلوم میں پہنچی تو مسرت و شادمانی کی ایک لہر تھی جو مدرسے کے ذرے ذرے میں دوڑ گئی .... حضرت مہتمم صاحب کی مراجعت کا انتظار شدت سے ہونے لگا۔ پرجوش ذہین طالب علموں نے عربی، فارسی، اردو میں قصائد مدحیہ لکھنے شروع کر دئے .... تار آیا کہ ۳۰ ر ذیقعدہ ۱۳۳۴ھ کو مہتمم صاحب رونق فرمائے دیوبند ہوں گے .... ہر صوبے کے طلبہ استقبال کے لئے اسٹیشن کے میدان میں پھیلے ہوئے تھے .... مہتمم صاحب گاڑی سے نزول فرما ہوئے تو مصافحوں کی بے تابیاں دلوں پر گہرا اثر ڈال رہی تھیں۔ ...... دوسرے دن نودرہ کے اندر شکریے کے لئے مدرسے کا ایک باضابطہ جلسہ قائم کیا گیا جس میں دار العلوم کے اساتذہ کرام نے سب سے پہلے قصائد سنا کر شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد طلبہ نے قصائد سنائے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی کی تقریر

آخر میں ترجمان القاسمؒ حضرۃ الاستاذ جناب مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے اپنے مشہور وقار و تمکنت کے ساتھ ایک بسیط تقریر مدرسے کے اساسی فلسفے پر کی۔ جس کے ہر ہر لفظ میں جزالت، روانی کے ساتھ ساتھ معنی خیزیوں کے سمندر امنڈ رہے تھے اور اسی پر جلسہ ختم ہو گیا وختامہ مسک ؎ (رسالہ القاسم ماہ محرم ۱۳۳۵ھ نومبر ۱۹۱۶ء صفحہ ۲-۳)

الغرض دار العلوم دیوبند، مسلم یونیورسٹی علیگڈھ اور دیگر ادارے ریاست دکن خاص طور پر آصف جاہ ہفتم میر عثمان علی خان کی نصرت دین و ملت کے سب ہی تو ممنون ہیں اور ان میں خصوصیت سے علامہ عثمانی بھی ہیں۔ دار العلوم دیوبند کی مزید گرانٹ پر جہاں تمام دار العلوم نے گھی کے چراغ جلائے ان میں علامہ کی

اپنے رنگ میں تقریر اور مدرسے کے اساسی فلسفے پر اظہار خیال ان کی خصوصی شخصیت کا آپ جوہر ہے جو سب سے ممتاز ہے۔ مولانا گیلانی کے ان الفاظ "ترجمان القاسمؒ حضرۃ الاستاذ جناب مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی" سے حضرت مولانا محمد قاسم کی ترجمانی کا شرف علامہ عثمانی کے لئے طے شدہ حقیقت کا اظہار کرتا ہے جو ان کے لئے مایۂ ناز ہے اس لئے جو لوگ مولانا عثمانی کو جانشین شیخ الہندؒ کہنے سے اک گونہ انکار کرتے ہیں ان سے اختلاف نہ کیا جائے بلکہ علامہ شبیر احمد صاحب کو **جانشین و ترجمان قاسم** کہا کیجئے۔

بھارت کا حیدرآباد پر حملہ اور مولانا عثمانی کا اضطراب

الحاصل مولانا عثمانی ہمیشہ میر عثمان کے شکر گذار رہے اور جب ۱۲ ستمبر ۱۹۴۸ء کو بھارت کی حکومت نے ریاست حیدرآباد پر حملہ کیا تو مولانا عثمانی تڑپ اٹھے آپ نے بھارت سرکار کے خلاف مذمت اور حکومت پاکستان کو نظام کی مدد کے لئے آمادہ کرنے پر کراچی میں زبردست تحریک کی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ پاکستان بھی میر عثمان علی خان کا بے حد ممنون ہے کہ انہوں نے پاکستان بننے پر اس کی اقتصادی بدحالی پر از رہ اسلامی ہمدردی اپنے روپیہ سے غیر معمولی مدد کی اور یہ حقیقت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔

ڈابھیل میں
۱۳۴۶ھ سے ۱۳۵۴ھ تک
۱۹۲۷ء ۱۹۳۵ء

ہم ابھی گذشتہ صفحات میں علامہ اور ان کے رفقاء کے ڈابھیل کی طرف رخت سفر باندھنے اور دارالعلوم دیوبند سے جدا ہونے کا ذکر کر چکے ہیں۔ قدرت کو یہاں علوم و فنون کے چشمے بہانے تھے اس لئے وہاں ان حضرات نے اس سرزمین پر علم و فضل کی بارشیں برسانا شروع کیں۔

ڈابھیل میں قیام

جامعہ ڈابھیل کا تاریخی پس منظر

ان حضرات کی تشریف آوری سے پہلے ڈابھیل (سملک، گجرات) میں یہ ایک مدرسہ تھا جس کو مولوی بام صاحب نے جاری کیا تھا اور جس کا نام مدرسہ تعلیم الدین تھا۔ ان حضرات کے پہنچنے کے بعد اس کا نام جامعہ اسلامیہ ہوگیا۔ ان صاحبان کو یہاں لانے کا سہرا مولانا محمد ولد محمد موسیٰ صاحب فاضل دیوبند کے سر ہے۔ جو میرے بھی دیوبند میں کلاس فیلو تھے۔

حضرت الاستاذ امام انور شاہ صاحب شیخ الحدیث اول اور علامہ عثمانی شیخ الحدیث دوم مقرر ہوئے، حضرت شاہ صاحب، بخاری اور ترمذی پڑھایا کرتے تھے اور علامہ، مسلم اور بیضاوی، حدیث اور تفسیر کی کتابیں پڑھاتے تھے۔

ڈابھیل میں جائے قیام اور اخراجات

حضرت شاہ صاحب اور علامہ جب ڈابھیل پہنچے تو پہلے حاجی محمد صاحب سورتی کے مکان پر قیام کیا۔ بعد ازاں مدرسے کے ایک بڑے کمرے میں اقامت اختیار فرمائی۔ یہ بڑا کمرہ اور دوسرے مفتی سیٹھ سورت والے نے اساتذہ کے لئے بنوائے تھے۔

مولانا عثمانی کی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں کوئی تنخواہ مقرر نہ تھی صرف گذارے کے طور پر سو روپیہ ماہوار ملتے تھے۔ بعد ازاں سو کی بجائے دو سو ملتے رہے۔

حضرت شاہ صاحب کا انتقال ۱۳۵۲ھ

حضرت شاہ صاحب کی وفات ۱۳۵۲ھ کے بعد علامہ، بخاری اور ترمذی پڑھانے پر شیخ الحدیث

مقرر کئے گئے۔ اب شاہ صاحب کی جگہ کام کرنے پر آپ کو بطور مصارف تین سو پچاس روپیہ ملتے تھے۔

سلسلۂ تقاریر

ڈابھیل کے دورانِ قیام میں علامہ عثمانی کی اس علاقے میں اکثر جگہ تقریریں ہوئیں۔ تبلیغی سفر ہوئے۔ بمبئی کئی دفعہ تشریف لے گئے جہاں آپ کے زبردست وعظ ہوئے۔ بمبئی کے علاوہ راندیر، نوساری تحصیل، موضع لاجپور، موضع کفلیتہ، سورت، رنگون، موضع گھلوٹر وغیرہ کے لوگوں کو اپنے مواعظ حسنہ سے مستفید فرمایا۔ ایک دفعہ مولانا شوکت علی مرحوم آپ کے پاس ڈابھیل تشریف لائے۔ وہ اس زمانے میں مسلم لیگ میں کام کر رہے تھے مولانا عثمانی نے انہیں چندہ کر کے ایک ہزار کی تھیلی پیش کی۔ غرض یہ ہے کہ اس گرد و نواح میں بھی مولانا نے دس بارہ سال دین کی خدمت انجام دی۔

تفسیر قرآن و شرح مسلم

اور سب سے بڑی حکمت ڈابھیل پہنچنے میں یہ نکلی کہ یہاں قرآن کریم کی تفسیر لکھنے اور مسلم کی شرح تحریر فرمانے کا موقع مل گیا۔ اگر آپ یہ تفسیر اور شرح نہ تحریر فرماتے تو وہ خصوصیات جو قدرت نے آپ کو عطا کی تھیں فنا ہو کر رہ جاتیں اور دُنیا فائدہ حاصل کرنے سے محروم رہ جاتی۔ یہیں کے قیام میں آپ نے خوارق عادات مقالہ لکھا جو اپنی نوعیت کا بے نظیر رسالہ ہے۔

علامہ عثمانی کی یاد دیوبند میں

پھر دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت مہتمم

دارالعلوم دیوبند میں حضرت انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی جگہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مرحوم نے اسٹرائک کے بعد حضرت مولانا حسین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو

شیخ الحدیث مقرر کیا تھا۔ مہتمم صاحب بڑے ماہر سیاست تھے انہوں نے اپنے تدبر کے ماتحت ایسا کرنے کو اپنی فتح سمجھی۔ اور یہ ایک حقیقت بھی ہے کہ حضرت شاہ صاحب اور علامہ عثمانی کے چلے جانے کے بعد حضرت مولانا مدنی سے بہتر اور کوئی شخصیت اس منصب کے لئے فٹ نہ تھی۔ لیکن دار العلوم کے منتظم اور ارکان انتظامیہ دار العلوم میں کسی صاحب اثر شخصیت کے تقرر کو بحیثیت ہائی کمان محسوس کرنے لگے۔ حضرت مولانا محمد طیب صاحب اپنی جگہ دار العلوم کے لئے بغایت مفید مہتمم ثابت ہوئے اور ان کے دور میں دار العلوم کو بہت ترقی ہوئی۔ میں علیٰ وجہ البصیرت یہ لکھتے ہوئے قلم میں پوری قوت محسوس کر رہا ہوں کہ ان کا عہد اہتمام دار العلوم میں بڑا سنہری دور ہے۔ لیکن پھر بھی بعض اراکین انجمن نے یہ محسوس کیا کہ دار العلوم جیسے مذہبی مشہور ادارے میں علامہ شبیر احمد کے ہوتے ہوئے جس کی دار العلوم سے متعلق بے شمار خدمات ہیں اس مادر علمی سے جدا رہنا ایک زبردست خلاء رکھتا ہے۔

خواجہ فیروز الدین کپورتھلوی کا بیان

مجھ سے خواجہ فیروز الدین کپورتھلوی ممبر مجلس شوریٰ دار العلوم دیوبند نے بیان کیا کہ مولانا عثمانی کو ہم چند اراکین مجلس منتظمہ جن میں حکیم مقصود علی خاں صاحب حیدر آبادی اور مولانا مناظر احسن گیلانی بھی تھے دار العلوم کے صدر مہتمم کی حیثیت سے لانا چاہتے تھے چنانچہ ہمیں معلوم ہوا کہ مولانا عثمانی تھانہ بھون تشریف لے گئے ہیں ہم مجلس منتظمہ کے جلسے میں دیوبند گئے ہوئے تھے۔ حکیم مقصود علی اور میں نے سوچا کہ حضرت عثمانی کو وہیں تھانہ بھون میں راضی کر لیں اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب جو کہ مدرسے کے سرپرست ہیں اور سیاسیات ملکی کے باعث ان کے اور مولانا عثمانی کے درمیان اختلاف رہا ہے اس کو دور کرا دیں۔ چنانچہ مولانا عثمانی ہمیں سہارنپور کے اسٹیشن پر مل گئے ہم نے اس بات کا ان سے تذکرہ کیا اور ان کو

ان کے سخت انکار کے باوجود مجبور کر کے منالیا اور حضرت تھانویؒ کی خدمت میں لے جانے پر بھی راضی کر لیا۔ جب ہم تھانہ بھون پہنچے تو ہم نے حضرت تھانویؒ کو بھی رضامند کر لیا اور وہ مولانا عثمانی کی صدارت اہتمام پر راضی ہو گئے۔ یہ سب کچھ جب ہو لیا تو ہم دیوبند لوٹے اور ہم نے مدرسے کی مجلس شوریٰ میں اس مسئلے کو پیش کر دیا۔ اس بات سے مدرسین اور اراکین میں ایک خاص قسم کی موافق اور مخالف حرکت پیدا ہوگئی، باہم سرگوشیاں اور کنویسنگ کا ردعمل جاری ہو گیا۔ اور ایسا ہونا فطری تقاضے کے موافق تھا۔ عرصہ ہوا علامہ دارالعلوم کے دائرۂ اہتمام سے ناراض ہو کر اس کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اُس وقت معاصرین مدرسین میں دو جماعتیں پیدا ہو چکی تھیں۔ ایسے بھی تھے کہ جن کے روابط دارالعلوم کو چھوڑ کر جانے والوں سے اچھے نہ رہے تھے اور ان میں کے کئی حضرات موجود تھے اور ایسے بھی تھے جو علامہ عثمانی کو دل و جان سے خوش آمدید کہنے کو تیار تھے۔ مجھے اس معاملے میں علم الیقین کا مقام حاصل ہے کہ حضرت میاں اصغر حسین صاحب محدّث دارالعلوم اور اکابر میں جو بڑی روحانی شخصیت کے مالک تھے علامہ عثمانی کی دارالعلوم میں آمد کو ضروری خیال کرتے تھے۔ میاں صاحب اگرچہ اسٹرائک والوں کے مخالف تھے لیکن اب ان کے حالات بدل چکے تھے اور مولانا عثمانی کے موافق تھے۔

حضرت مولانا محمد طیّب صاحب کا بیان

حضرت مولانا محمد طیب صاحب پر جب حلقۂ دارالعلوم میں علامہ عثمانی کی صدارت اہتمام کی تجویز کا انکشاف ہوا تو ان کے بیان کے مطابق جو میرے کانوں نے سُنا مدرسہ خیر المدارس ملتان کے سالانہ جلسے پر ایک صبح کی چائے نوشی کی مجلس میں ذکر کیا کہ کیا حضرت میاں صاحب کو مولانا عثمانی کے دیوبند میں آنے کے بارے میں کوئی کشف ہوا ہے تو ان کے برادر خورد مولانا محمد طاہر مرحوم نے کہا کہ ہاں کشف ہی ہوا

ہے جس کے باعث میاں صاحب مولانا عثمانی کی آمد کو مفید سمجھتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ مولانا محمد طاہر صاحب مرحوم بھی حضرت علامہ کی آمد کو بدل و جان چاہتے تھے اور اس بارے میں کوشاں تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مولانا محمد طاہر مرحوم تو کوشاں تھے مگر اس کوشش میں حاجی رشید صاحب میرٹھی حکیم مقصود علی حیدر آبادی، خواجہ فیروز الدین کپورتھلوی، مولانا مناظر احسن گیلانی ممبران مجلس شوریٰ اور بعض مدرسین مدرسہ جن میں حضرت میاں صاحب بھی شامل ہیں یہ پوری جماعت ان کو مدرسے میں لانے کی خواہشمند تھی۔

سرگوشیاں

بہرحال موافقین اور مخالفین میں نیچے سے اُوپر تک اور مدرسین سے لیکر مجلس شوریٰ تک ایک موافقانہ اور مخالفانہ رنگ آتا تھا اور جاتا تھا۔ لیجئے اس سلسلے میں ہم آپ کے سامنے حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی اور علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہما اللہ تعالیٰ کے دو خطوط پیش کرتے ہیں جن سے اس وقت کے ماحول اور اضطرابی کیفیت، مجلسوں کے جمنے اور منتشر ہو جانے کا پورا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجائے گا اور آپ کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ علمائے ربانی جب آپس میں اختلاف کرتے ہیں تو کس طرح وہ قرآن و سنت اور اسلامی تعلیم سے متاثر ہو کر معاملات کو خوش اسلوبی سے سلجھاتے ہیں۔ دراصل ہمارے نزدیک اختلاف تو کوئی بُری چیز نہیں البتہ اختلاف میں حد سے آگے نکل جانا اچھی بات نہیں اور نہ ہی اس سے معاشرے کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے۔

مکتوب گرامی شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رح

وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ

اور وہ لوگ جو غصّے کو پی جانے والے اور لوگوں کو معاف کر دینے والے ہیں

سیّدنا المحترم زادت معالیکم ۔ السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

عرصہ دراز سے ارادہ کر رہا ہوں کہ عریضۂ ادب ارسال خدمت کروں مگر عدیم الفرصتی نے آج تک اس شرف کے حاصل کرنے میں تعویق کی۔

مجھے افسوس اور صدمہ ہے کہ جو ابحاث مجلس شوریٰ میں پیش آئیں ان کا انجرار یہاں تک ہوا کہ ناقلین کے الفاظ باعث تکدر ہوئے۔

محترما! ابحاث اور ان کے نقل کے اندر ضرور افراط وتفریط سے کام لیا جاتا ہے مگر اتنی بات یقینی ہے کہ میں جناب کے لئے وظیفۂ اہتمام خواہ بصورت صدارت ہو یا بغیر صدارت مناسب نہیں جانتا ہوں (ممکن ہے کہ میرا خیال غلط ہو) میں نے اس مجلس میں آنجناب کے علمی کمالات تحریر و تقریر میں فائق و ماہر ذکاوت وحافظہ میں بے نظیر ہونے کا خود اقرار کیا تھا اور اب بھی اقرار کرتا ہوں اور اسی بناپر میں یہ خیال کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہوں کہ جناب کے لئے صدارت تدریس مناسب اور شایان ہے۔ اس کو لوگ پالیسی یا ڈپلومیسی پر محمول کرتے ہیں۔ میں قسمیہ کہتا ہوں کہ میں اپنی استعداد اور قابلیت علمی اور تقریری و تحریری آپ کے شاگردوں کے پایہ کی بھی نہیں پاتا۔

میرا پختہ اور صحیح خیال ہے کہ جناب کے شایان شان صدارت تدریس ہے اگر آپ کے لئے وہ جگہ تجویز ہو تو میں اپنا علیحدہ بھی ہونا بخوشی و خرمی منظور کروں گا اور ماتحت رہ کر خدمات مدرسہ بھی بخوشی منظور کر دوں گا۔ ہر دو میں

نہ مجھ کو عار ہوگا اور نہ مخالفت۔ میری کبھی بھی سعی اس کے نہ خلاف ہوئی اور نہ ہو گی (انشاء اللہ) مگر اسی کے ساتھ ساتھ یہ میرا خیال ہے کہ آپ میں بعض کمزوریاں بھی ہیں جن میں سے عدم استقلالی، اور کان کا کچا ہونا، اور انتظام سے طبعی تناسب نہ ہونا ہے۔ میرے نزدیک واقعات اس کے لئے موجود ہیں مثلاً آپ کو یہ خبر دی گئی کہ سیاہ جھنڈیوں سے آپ کا استقبال کیا جائے گا آپ نے اس کی تصدیق کر لی اور سخت متاثر ہوئے۔ واللہ باللہ اس امر کا ادنیٰ سا بھی خیال نہ آیا تھا۔ تذکرہ یا ارادہ تو درکنار اسی طرح عدم استقلال کی حالت ہے یہ امور اس عہدہ کے لئے مضر ہیں۔ ایک صدر اہتمام کے کان میں ہر صاحب غرض اپنی اغراض کو تزویر کر کے اس طرح ظاہر کرے گا کہ اس پر ظاہری طریقہ پر کوئی شبہ دروغ گوئی کا نہ کیا جا سکے گا۔ ایسی صورت میں اُذن ہوگا سخت مضر ہوگا۔ خلاصہ یہ ہے کہ میرا خیال (ممکن ہے کہ غلط ہو) یہ ضرور ہے کہ یہ کمزوریاں آپ میں ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ سینکڑوں کمالات بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسے عطا فرمائے ہیں جن کے سُر اوقات تک بھی ہم نالائقوں کی رسائی نہیں۔ جبکہ ممبران مشورہ نے کنجکاو کیا تو اس کا تذکرہ ضرور آیا مگر کوئی ایسی چیز جو کہ آپ کے اخلاق کریمانہ یا آپ کی شرافت شخصی میں اثر رساں ہو تذکرہ نہیں کی گئی۔

مَیں نہیں جانتا کہ آپ تک آیا یہی خبریں پہنچائی گئی ہیں یا کم و بیش۔ بہر حال میں نے جو کچھ کہا یا کیا وہ صفائی سے آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے اور مَیں اس اپنے عقیدہ اور خیال پر ابھی تک قائم ہوں۔ آپ کے لئے یہ عہدہ موزوں نہیں سمجھتا والعلم عند اللہ۔ پس اگر آنجناب کو صدمہ اور رنج مجھ سے ان اقوال کی بناء پر پہنچا ہے اور اخبار دلالت کرتی ہیں کہ ضرور پہنچا

ہے تو میں معافی کا طالب ہوں۔ خیال اب بھی اس وجہ سے وہی ہے کہ ہر شخص کے مناسب حال کوئی کام ہوتا ہے۔ جس طرح آپ کے مناسب طباعت، ڈاکٹری، انجینئری نہیں ہیں اسی طرح یہ عہدہ بھی آپ کے لائق نہیں ہے اس پر نہ آپ کو توہین کا خیال ہونا چاہیئے اور نہ صدمہ کرنا چاہیئے۔

میری اصل غرض اس عریضہ سے یہ ہے کہ جناب کے صدمہ کا ازالہ ہو جائے اور اگر میں خطاوار ہوں تو اس کی معافی ہو جائے۔ میں صدارت تدریس کے لئے آپ کی ذات کو بدل و جان قبول اور منظور کرنے والا ہوں۔ ایک مجھ جیسے پردیسی غریب الوطن کی حالت ہی کیا ہو سکتی ہے۔ بنا بریں اُمیدوار ہوں کہ دل سے رنج اور صدمہ کو میری طرف سے حسب ارشاد خداوندی نکال دیں۔ حقیقت وہ ہے جو عرض کی گئی۔ اور چونکہ خواشہ تاشی کی نعمت بفضلہ تعالیٰ حاصل ہے اس لئے ہمارا آپس کا جنگ وجدال اور تخالف وغیرہ بھی عداوت اور دشمنی پر محمول نہ ہونا چاہیئے۔ ایک وقت میں لڑیں گے اور دوسرے وقت میں ملیں گے۔ عداوت قائمہ اور عداوت قلبیہ نہ ہوگی۔ واللہ یصلح الاحوال ویرزقنا اتباع اسلافنا الکرام ثم لا یخفی لدیکم انی منغمس فی بحار الخطایا والذنوب وتقصیر حقوق من لہ الحقوق علی ومصر بسائر انواع التقصیر ولکم الفضل والمنۃ والسلام والسلام۔

۲۱ رجب ۱۳۵۳ھ

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

زبان قلم تنگ ہے کہ اس کو اصح سر کیا لکھے؟ رضی اللہ عنہ وارضاہ۔

خط حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ

بجواب

حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ

از بندہ شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ

بخدمت گرامی کرمفرما محترم مکرم و معظم دام مجدہم

بعد سلام مسنون نیاز مشحون آنکہ ۔ الطاف نامہ غیر متوقع طور پر پہنچا۔ جس محبت و اخلاص اور حسن نیت کے جذبہ سے وہ لکھا گیا ہے اُسی روشنی میں بندہ نے پڑھا ۔ سچ یہ ہے کہ یہ مکتوب میرے نزدیک جناب محترم کی سیادت و شرافت اور جانشینی استاذ مرحوم کا مرقع ہے ۔ آپ کے بزرگانہ اخلاق سے ہم نیاز مندیہی توقع رکھتے ہیں ۔ فجزاکم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء ووفقنا وایاکم لما یحب ویرضیٰ ۔

اس کے بعض چند حقائق عرض کرنا چاہتا ہوں ۔ اگر آپ اُن پر یقین کریں فبہا ونعمت ۔ ورنہ میں جانتا ہوں کہ زمانہ کسی سچی بات پر جو بلا آمیزش تکلّف و تصنّع کہی جائے یقین کرنے کا نہیں ہے تاہم آپ کی ذات سے امید رکھتا ہوں کہ مجھے اس بیان میں کاذب خیال نہ فرمائیں گے ۔

وظیفۂ اہتمام کی بحث میں جو کچھ گفتگو آپ نے مجلس شوریٰ میں فرمائی وہ بلاکم وکاست آپ کے تحریر فرمودہ الفاظ میں نہایت ثقہ راویوں کے ذریعہ سے مجھے پہنچی تھی ۔ جہاں تک اہتمام کے متعلق آپ کا دعویٰ ہے وہ بالکل صحیح اور درست ہے واللہ العظیم میں خوب جانتا ہوں کہ میں نہ اس کا اہل ہوں نہ میرے لئے مناسب ہے نہ بحمد اللہ ادنیٰ ترین خواہش دل میں ہے بلکہ اگر آپ یقین

فرمائیں تو کہہ سکتا ہوں کہ میں اس چیز سے انتہائی حد تک نفور اور کارہ ہوں جس کا اظہار بعض ان حضرت پر بھی قوت کے ساتھ کر چکا ہوں جو اس میں مساعی تھے۔ مجھے زیادہ صدمہ اس چیز سے پہنچا کہ جس مسئلہ سے میں خود اس قدر بیزار ہوں اسی کو زیر بحث لاکر ناخوشگوار مناقشات ومنازعات کا دروازہ کھولا گیا۔ اور خواہی نخواہی میرے ملکات وخصال پر آپ کو کلام کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لیکن جب یہ چیز زیر بحث آگئی تھی تو آپ کی رفعتِ شان اور خواجہ تاشی کا تعلق اس کو مقتضی تھا کہ آپ میری ذات کے متعلق یونہی بے تحقیق ریمارک شروع نہ کر دیتے۔ بحمداللہ آپ کا میرا ایسا انقطاع نہیں تھا کہ آپ میرے احوال وخیالات کے متعلق مجھ سے کوئی بات نہ کر سکیں۔ کبھی ایک مرتبہ بات کر کے تجربہ تو کر لیا ہوتا۔ یہی شکوی تھا جو میں نے مولوی سعید احمد صاحب بنگالی ممبر دارالعلوم کے سامنے کیا۔ میں نہایت صفائی سے کہتا ہوں کہ آپ کا دعویٰ کہ میں منصبِ اہتمام کے لائق نہیں یا اہتمام میرے مناسب نہیں بالکل صحیح ہے۔ لیکن جو دلائل پیش کی گئیں ان کے بعض اجزا یقیناً غلط ہیں۔ یہ بالکل درست ہے کہ طبعاً وفطرۃً مجھے کارِ اہتمام سے مناسبت نہیں اور اس سے زائد کہ جو شروط اہتمام دارالعلوم کے لئے میرے خیال میں معتبر ہیں ان سے میں محروم ہوں۔ مگر کانوں کا کچّا ہونا اور عدم استقلال۔ اللہ کے فضل ورحمت سے میں سمجھتا ہوں کہ آپ کسی صحیح معیار کے مطابق ان کو ثابت نہ کر سکیں گے۔ اور اگر کر دیں گے تو میں ممنون ہوں گا کہ آپ نے ان عیوب اور آفات نفس پر مجھے مطلع فرما دیا جن پر باوجود محاسبۂ نفس کے مطلع نہ ہو سکا تھا۔ آپ نے سیاہ جھنڈیوں کے جس قصّہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے وہ مجھ سے ایک ثقہ راوی نے جو آپ سے پوری عقیدت رکھتا ہے بیان کیا۔

لیکن اس نے یہ نہیں کہا نہ میں نے یہ سمجھا کہ یہ چیز آپ کے اشارے یا اطلاع سے ہوئی ہے نہ اس سیاق میں کبھی میں نے آپ کا نام لیا۔ ہاں مَنْ یسمع یخل[1] کے قاعدہ سے جب بعض طلبہ کی نسبت میں نے ایسا سُنا تو صدمہ کا اظہار کیا کہ آج ہمارے طلبہ کی حالت یہ ہوگئی ہے اور جب مجھ سے بعض طلبہ نے جامع مسجد میں بیان کرنے کی خواہش کی تو میں نے یہی جواب دیا کہ جو لوگ میرا سیاہ جھنڈیوں سے استقبال کرنا چاہتے ہیں وہ میرے بیان کو کیسے گوارا کریں گے معاف کیجئے اگر میں کہوں کہ آپ کانوں کے کچے ثابت ہوئے۔ آپ سے کسی نے کہہ دیا کہ میں آپ کی طرف اس تجویز کی نسبت کرتا ہوں۔ چنانچہ آپ مجھے اس خط میں یہی بطور تبری لکھ رہے ہیں کہ تذکرہ تو درکنار و اللہ باللہ اس امر کا ادنیٰ سا خیال نہ آیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ارادہ اور ادنیٰ ترین خیال کی نفی تو آپ اپنے ہی سے کرسکتے ہیں دوسروں کے قلوب پر کون ایسا جزم کرسکتا ہے۔ پس آپ کو راوی کی تصدیق کرنے سے پہلے ایک مرتبہ مجھ سے دریافت کرلینا تھا۔ میں بقسم عرض کرتا ہوں کہ میں نے اس سلسلے میں ایک حرف بھی آپ کی نسبت نہیں کہا نہ یہ خیال میرے دل میں گزرا کہ ایسے رکیک فعل کی نسبت آپ کی طرف کروں۔

میرے محترم اور بزرگ بھائی! اگر یہی معیار کانوں کے کچے ہونے کا ہے تو دنیا میں شاید ہی کوئی شخص کانوں کا پکا ثابت ہوسکے۔ پچھلے قصوں میں بڑے بڑے مستقل مزاجوں اور پکے کان والوں کو دیکھ لیا کہ کس طرح محض اپنے حاشیہ نشینوں کی رطب و یابس روایات پر اعتماد کرکے بُعد و ہجر اور اختلافات کی خلیج کو وسیع کرتے رہے۔ اگر اخبار میں تبیین و تثبت سے کام لیتے تو ہرگز یہ صورت پیش نہ آتی۔ اگر آپ چاہیں گے تو اس کا نہایت پختہ تحریری ثبوت پیش کرسکتا ہوں۔ مگر افسوس کہ ان کا اُذُنْ ہونا تو اُذُنْ خیر پر

---

[1] جو شخص سنتا ہے تو خیال کرتا ہے۔

حمل کر لیا جاتا ہے جو مضر نہیں لیکن میرا اُذن شر ہونا متعین ہے جو بجز ضرر کے کوئی دوسرا پہلو نہیں رکھتا۔

رہا میرا عدم استقلال۔ یہ وہ پروپیگنڈہ ہے جس کا ڈھول دسوں برس سے میرے حاسد بڑے زور شور سے پیٹ رہے ہیں۔ اگر عدم استقلال کے معنیٰ یہ ہیں کہ ایک کام کو اچھا سمجھ کر اختیار کرنے کے بعد محض کم ہمتی اور کسل کی بنا پر چھوڑ دیا جائے تو میں متمنی ہوں کہ آپ اسکی چند نظائر پیش فرما کر میرے نفس امّارہ کی اصلاح و تنبیہ کا اجر حاصل کریں اور اگر عدم استقلال سے یہ مراد نہیں تو کم از کم سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کا یہ قول ضرور مستحضر رکھیں:۔

الصادق يتقلب في يوم واحد مائة مرة والمرائي يثبت على حالة واحدة مائة سنة۔	(سچا آدمی ایک دن میں سو مرتبہ بدلتا رہتا ہے۔ اور ریا کار ایک ہی حالت پر سو سال تک قائم رہتا ہے۔) (مؤلّف)

دیکھیے بُرا نہ مانئے آپ خود سیاسیات کے کتنے تقلبات اور اطوار میں سے گذرے ہیں کیا اسے عدم استقلال کہیں گے۔ آپ نے فوائد قرآن کی تکمیل شروع کی فرصت نہ ہوئی نہ کر سکے اور خدا جانے کتنے کام ایسی نوعیت کے ہوں گے۔ میں تو بخدا آپ کو غیر مستقل مزاج نہیں سمجھتا بہرحال عدم استقلال کا کا لفظ استعمال کرتے ہوئے صرف عام شہرت اور طویل پروپیگنڈے کا شکار نہ ہونا چاہیئے۔ عوام اور عیار پروپیگنڈا کرنے والے تو شائد عدم استقلال کا صحیح مفہوم بھی ادا نہ کر سکیں۔ اہل علم و دیانت کی شان ان سے اعلیٰ و ارفع ہے وہ ایک لفظ زبان سے نکالیں تو

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اور مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ۔	(جس کا تجھے علم نہیں اس کے درپے نہ ہونا چاہیئے ۔ انسان جو کچھ زبان سے نکالتا ہے تو اس پر محافظ و نگران موجود ہے) (مؤلف)

کا پہلے خیال رکھیں۔ اور یہ بھی پیش نظر رہنا چاہیئے کہ انسان کے اصول بدلتے رہتے ہیں۔ اگر ایک وقت اس میں عدم استقلال ہو تو لازم نہیں کہ ہمیشہ ایسا ہی رہے۔

اس تحریر کا حاصل آپ یہ نہ سمجھیں کہ مجھے غیر مستقل یا اُذن کہنے پر غصہ آرہا ہے یہ تو کوئی چیز نہیں جو کمزوریاں اور نقائص مجھ میں ہیں ان کے سامنے تو یہ معائب شائد محاسن سمجھے جائیں اور مجھے مغتنم سمجھنا چاہیئے کہ اللہ کے بندوں کی نظر میرے ان واقعی معائب و مساوی پر نہیں پڑی۔

مجھے رنج اور تاسف اس پر ہے کہ آپ جیسی بزرگ اور عالی مرتبہ ہستی محض سُنی سُنائی چیزوں سے متاثر ہو کر بھرے مجمع میں عیب چینی کرنے لگے اور اتنی زحمت گوارا نہ کرے کہ خود صاحب قصہ سے تحقیق حال کرے۔

مولانا المحترم! آپ میرے معاملے میں اپنے ان بعض حاشیہ نشینوں پر اعتماد نہ فرمائیں جنہیں پندرہ۱۵ بیس۲۰ برس تک میرے کرش اور عیبہ رہنے کا دعویٰ ہے اور جن کے احوال سے میں بھی اسی قدر واقف ہوں جتنا وہ مجھے جانتے ہیں۔ ان کا اور میرا انصاف خدائے قدوس کرے گا۔ میں تو اپنی طرف سے ہمیشہ کے لئے یہ ہی کہوں گا۔

لَئِنْ بَسَطْتَ اِلَیَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِیْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ	(اگر تو میرے قتل کے لئے میری طرف ہاتھ بڑھائے گا تو میں ایسا نہ کروں گا

يَدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۔ | کہ تجھے قتل کرنے کے لئے تیری طرف دست درازی کروں) (مؤلف)

وہ میری طرف سے کسی انتقام کا خطرہ دل میں نہ لائیں ہاں وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰہَ غَافِلاً عَمَّا یَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ سے غافل نہ رہیں۔

رہا صدارت اہتمام یا صدارت تدریس کا مسئلہ۔ میں یہ تحریری دستاویز آپ کے ہاتھ میں دیتا ہوں کہ میں واللہ ان میں سے کسی چیز کا طالب نہیں! اور نہ دارالعلوم کے ان مناصب جلیلہ کا اپنے کو اہل سمجھتا ہوں بلکہ اس طرح کے تذکرے سے بھی تکلیف ہوتی ہے۔ جو لوگ اس میں کوشاں ہوں ان کو میری یہ تحریر دکھلا کر منع کر دیجئے۔ ہاں دارالعلوم بہرحال سب مسلمانوں کی متاع ہے جنہوں نے دو چار حرف وہاں رہ کر پڑھے ہیں ان کا عزیز ترین مربی ہے۔ اکابر رحمہم اللہ کی امانت ہے۔ ان بزرگوں کا لگایا ہوا پودا ہے جن میں ایک نام میرے والد مرحوم کا تھا۔ اگر کسی وقت کوئی خیر خواہی ہو سکے گی۔ اور طوعاً وتہم سے امن حاصل ہو سکے گا تو انشاء اللہ تا بمقدور دریغ نہ ہوگا۔ امید کرتا ہوں کہ آپ ان کلمات کا اثر نہ لیں گے۔ آپ کے لکھنے پر یہ چند الفاظ لکھے گئے ورنہ اس وقت اپنے عقیدہ میں دیوبند کی صدارت تدریس کے لئے آپ کو احق ترین سمجھتا ہوں۔ پھر آپ سے کینہ کپٹ کیسے رکھ سکتا ہوں۔

کفر است در طریقتِ ما کینہ داشتن
آئینِ ما است سینہ چو آئینہ داشتن

جو الفاظ آپ کی شان گرامی کے خلاف لکھے گئے ہوں ان سے کریمانہ مسامحت فرمائیں۔

بھلا دو میرے منہ سے بات اگر کوئی بری نکلی
یہ بیدردی ہے کہنا، آہِ بسمل بے سری نکلی

والسلام

تجزیہ ان ہر دو جلیل القدر شخصیتوں کے خطوط آپ کے سامنے ہیں۔ یہ خطوط تاریخی دستاویز اور مقدس ورثہ ہیں۔ ان کو یوں ہی خموشی کے گوشے میں ڈال دینا مناسب نہیں۔ یہ دونوں خطوط ہر دو حضرات کے لکھے ہوئے ہمارے پاس موجود ہیں۔ ان میں سے ہمیں یہ انمول جواہر ملتے ہیں۔ خطوط پر غور کرنے سے وہ تمام تاریخی پس منظر ہمارے سامنے آجاتا ہے جس میں علامہ کے صدر مہتمم بنائے جانے کی تجویز پر رونما ہوا۔ دونوں حضرات کے مکتوبات کا تجزیہ یہ ہے:۔

حضرت شیخ الاسلام مدنیؒ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب کو جب یہ علم ہو چکا کہ مولانا شبیر احمد عثمانی کو ہمارے ان خیالات کا علم ہو چکا ہے جو مجلس شوریٰ میں ان کی صدارت سے متعلق ظاہر کئے گئے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ نہایت صفائی سے وہ ان باتوں کو ان کے علم میں لے آئیں جو انہوں نے مجلس شوریٰ میں ان کے متعلق فرمائی ہیں تاکہ غلط فہمی نہ ہو۔

حضرت مولانا مدنی کے دل کی صفائی کا اندازہ کیجیئے کہ انہوں نے مولانا عثمانی کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ ان کے خیال میں مولانا عثمانی صدارت اہتمام کے اہل نہیں ہیں کیونکہ ان میں استقلال نہیں اور وہ کانوں کے کچے ہیں۔ کسی بات کا صاف صاف بیان کر دینا صفائی دل کی نشانی ہے۔

حضرت مولانا مدنی علم و فضل میں مولانا عثمانی کو اپنے آپ سے زیادہ تصور فرماتے ہیں اور دارالعلوم دیوبند کی صدر مدرسی کے لئے ان کو نہایت موزوں خیال فرماتے ہیں۔ بلکہ یہاں تک انکساری سے کام لے رہے ہیں کہ وہ ان کے شاگردوں کے برابر بھی اپنے آپ کو خیال نہیں فرماتے۔ اللہ اکبر! بزرگانِ دین کی ایک خصوصی شان حضرت مولانا مدنی کی تحریریں پائی جاتی ہے اور وہ انکساری ہے اور ہمارے اکابر تمام ہی دلی طور پر انکساری میں اپنے آپ کو ایسا ہی سمجھتے تھے۔

حضرت مولانا مدنی کے تقوے کا اس امر سے اظہار ہوتا ہے کہ وہ مولانا عثمانی سے ایک ہی شیخ کے دو شاگرد ہونے کی حیثیت سے، قطعاً تعلقات خراب کرنا پسند نہیں کرتے، بلکہ فرماتے ہیں۔ " ہمارا آپس کا جنگ و جدال اور تخالف وغیرہ بھی عداوت اور دشمنی پر محمول نہ ہونا چاہئے۔ ایک وقت میں لڑیں گے اور دوسرے وقت میں ملیں گے۔ عداوت قائمہ اور عداوت قلبیہ نہ ہوگی "۔ حضرت مدنی کی یہ عبارت ان کے تقوے کی بہترین ترجمان ہے۔ اور ان کی رواداری کی بہترین مثال ہے۔

علامہ عثمانیؒ حضرت مولانا مدنی کے خط کے جواب میں علامہ عثمانی جن امور کا اظہار فرما رہے ہیں ان میں پوری صفائی قلب، انکساری، تعلقات کے باقی رکھنے کا احساس ہے۔ مولانا عثمانی نے اپنے خط میں یہ فرمایا ہے کہ میں واقعی صدر مہتمم ہونے کے قابل نہیں اور نہ ہی صدر مدرس یا آپ کی جگہ شیخ الحدیث بننے کا اہل ہوں تا آنکہ آپ نے قسم کھا کر فرمایا ہے کہ میرے تصور میں بھی یہ نہیں ہے کہ مجھے صدر مہتمم یا شیخ الحدیث بنایا جائے۔ اور نہ ہی میں ان عہدوں کا طالب ہوں۔ بلکہ میں ان حضرات سے منع کر چکا ہوں جو اس امر میں کوشاں ہیں بلکہ مکتوب کی شکل میں آپ کے ہاتھ میں یہ دستاویز دیتا ہوں کہ ان حضرات کو آپ اس کوشش سے منع فرما دیں۔

البتہ مولانا عثمانی کو حضرت مدنی سے یہ شکوہ ہے کہ ایک شخص جو بالکل گوشہ نشین ہے اور دار العلوم میں کسی عہدے کا متمنی نہیں اس کی ذات کو بھرے مجمع میں نشانہ ملامت بنانا مناسب نہ تھا۔ اور اگر کوئی بات تھی تو براہ راست مجھ سے اس کے متعلق صحیح معلومات حاصل کر لی جاتیں۔ ان کا فرمانا ہے کہ میرے اور آپ کے تعلقات ایسے نہ تھے کہ آپ مجھ سے براہ راست گفتگو نہ فرما سکتے پھر پہلے مجھ سے حقیقت حال کیوں نہ معلوم کر لی یمعلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان حضرات کو یہ خیال ہوا کہ حضرت عثمانی اس معاملے میں خود کوشاں ہیں۔

علامہ عثمانی نے شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنی کی یہ بات تسلیم کرلی ہے کہ میں صدارت کا اہل نہیں لیکن ان دو باتوں یعنی کانوں کا کچا ہونا اور غیر مستقل مزاج ہونے کو رد کردیا ہے اور تسلیم کرنے سے انکار کردیا ہے۔

حضرت مولانا مدنی نے کانوں کے کچے ہونے کی دلیل میں فرمایا ہے کہ صدارت اہتمام کے عہدے پر سرفرازی کی حیثیت میں میری طرف سے سیاہ جھنڈیوں سے استقبال پر اعتماد کرلینا غلط فہمی ہے۔ مولانا عثمانی نے اس بات کے جواب میں فرمایا ہے:۔

> "آپ نے سیاہ جھنڈیوں کے جس قصے کی طرف اشارہ فرمایا ہے وہ مجھ سے ایک ثقہ راوی نے جو آپ سے پوری عقیدت رکھتا ہے بیان کیا لیکن اس نے یہ نہیں کہا نہ میں نے یہ سمجھا کہ یہ چیز آپ کے اشارے یا اطلاع سے ہوئی ہے نہ اس سیاق میں میں نے آپ کا نام لیا۔"

لہذا جس وجہ سے مولانا مدنی کو یہ خیال ہوا تھا اس کو مولانا عثمانی نے صاف کردیا۔

رہا تیسرا اعتراض عدم استقلال کا اس کے جواب میں مولانا عثمانی تحریر فرماتے ہیں:۔

> "رہا میرا عدم استقلال .... اگر اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک کام کو اچھا سمجھ کر اختیار کرنے کے بعد محض کم ہمتی اور کسل کی بنا پر چھوڑ دیا جائے تو میں متمنی ہوں کہ آپ اس کی چند نظائر پیش فرماکر میرے نفس امارہ کی اصلاح و تنبیہ کا اجر حاصل کریں اور اگر عدم استقلال سے یہ مراد نہیں تو کم از کم سید الطائفہ جنید بغدادی رحمہ اللہ کا یہ قول ضرور مستحضر رکھیں
>
> الصادق یتقلب فی یوم واحد مائۃ مرۃ و المرائی یثبت علی حالۃ واحدۃ مائۃ سنۃ

دیکھئے بُرا نہ مانئیے آپ خود سیاسیات کے کتنے تقلبات اور اطوار میں سے گذرے ہیں۔ کیا اسے عدم استقلال کہیں گے......... میں تو بخدا آپ کو غیر مستقل مزاج نہیں سمجھتا۔"

بہر حال مولانا عثمانی آخر کے دونوں اعتراضات سے اپنی پوزیشن صاف کرتے نظر آتے ہیں۔ اور آخر میں تعلقات اور صفائی قلب کے باعث فرماتے ہیں ؎

کفر است در طریقت ما کینہ داشتن ؎ آئین ما است سینہ چو آئینہ داشتن

اور پھر خط میں ہر قسم کی گستاخی سے معافی چاہتے ہیں ؎

بھلا دو میرے منہ سے بات اگر کوئی بُری نکلی ؎ یہ بیدردی ہے کہنا آہِ بسمل بے سُری نکلی

بہر حال ان دونوں حضرات کے خطوط میں وہ شان موجود ہے جو علمائے ربّانی میں ہونی چاہئیے لیکن ان دونوں حضرات کے متبعین پر اگر نظر ڈالی جائے تو ان میں سے بعض طلبہ اور بعض مدرسین کی سرگرمیاں نامناسب رنگ اختیار کر رہی تھیں بعض چاہتے ہیں کہ مولانا عثمانی مدرسے میں نہ آئیں اور اگر آئیں گے تو ہم سیاہ جھنڈیوں سے ان کا استقبال کریں گے۔ لیکن وہ مولانا عثمانی کے کیوں مخالف تھے وجہ اس کے سوا اور کچھ نہ تھی کہ وہ حضرت مولانا مدنی کی موجودگی میں ان کے وجود کو دیکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ لیکن یہ وجہ کوئی معقول وجہ نہ تھی۔

دار العلوم اینٹوں کا نام نہیں

اگر غور سے دیکھا جائے تو مجلس شوریٰ کے بعض ارکان نیک نیتی سے صدارت پر ایسی قابل اور مسلّمہ شخصیت کو لانا چاہتے تھے جو اپنی قوت علمی سے اثر انداز ہو کر بعض کام جو رکتے سے نظر آجاتے ہیں ان کو چالو کر دے۔ دراصل کسی ادارے کی شہرت اور ناموری اینٹوں کی دیواروں پر نہیں ہے بلکہ ان قابل شخصیتوں کے باعث ہوتی ہے جو اس کو چلاتے نظر آتے ہیں مجلس شوریٰ کے بعض ممبروں نے یہی سوچا تھا کہ دار العلوم

میں علامہ شبیر احمد صاحب کی سی شخصیت کو ہونا چاہیئے ۔ مولانا مناظر احسن گیلانی کی زبانی ہم آپ کے سامنے وہ نظریہ پیش کرتے ہیں جس کا اظہار انہوں نے اپنے ایک طویل مضمون میں الفرقان ماہ صفر ۱۳۵۸ھ میں کیا ہے ۔ لکھتے ہیں :۔

" (مولانا محمد طیب ، کو اہتمام کا صیغہ سپرد تو کر دیا گیا لیکن نو عمری کی وجہ سے عموماً اساتذہ و ملازمین اور طلبہ پر آپ کا اتنا اثر قائم نہ ہو سکا جتنا ایک معمر کہن سال آدمی کا ہونا چاہیئے اس لئے مجلس شوریٰ نے مختلف پیچیدگیوں کو دیکھ کر دو سال ہوئے کہ صدر مہتمی کا ایک نیا عہدہ بنا کر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی صدر دارالعلوم ڈابھیل کا اعزازی طور پر تقرر کیا ہے ۔"

(الفرقان سابق بریلی صفر ۵۸ھ ص ۳۵)

یہ بات جو مولانا مناظر احسن گیلانی نے کھل کر لکھدی میرے لئے لکھنی شایانِ شان نہ تھی لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ حضرت مولانا محمد طیب کے زمانے میں دارالعلوم کو بے حد ترقی ہوئی ۔

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

علامہ عثمانی جب آغاز ملازمت میں فتح پوری دہلی کے مدرسے میں صدر مدرس تھے تو ان کو وہاں سے بلایا گیا ۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی مہتمم مدرسہ کی وہ عبارت ملاحظہ فرمائیے جو ہم نے تجلیات عثمانی میں پیش کی ہے کہ مولانا شبیر احمد عثمانی جیسے قابل اور لائق عالم کے متعلق اراکین دارالعلوم کا یہ تقاضا تھا کہ ایسے شخص کو دارالعلوم سے باہر نہ رہنے دیا جائے اس لئے ان کو فتح پوری دہلی سے بلا کر دارالعلوم میں مقرر کیا گیا ۔ پس اگر ان کی موجودگی اس وقت دارالعلوم کے لئے باعث فخر تھی تو اب باعث صد افتخار کیوں نہ ہوگی اسی لئے بعض ممبروں کا یہ خیال مبارک تھا کہ ان کو دارالعلوم سے جدا نہ رہنے دیا جائے ۔

ہاں تو ہم عرض کر رہے تھے کہ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحبؒ اور علامہ عثمانیؒ کے جہاں تک کردار کا تعلق ہے وہ بے داغ ہے۔ بات بگاڑنے والے اور اِدھر کی اُدھر اور اُدھر کی اِدھر کر کے مزا لینے والے پارٹیوں کے افراد تھے۔ بہر حال اسی کشمکش میں حکم ربّی کے مطابق علامہ عثمانی کا دارالعلوم دیوبند کے صدر مہتمم ہونے کے متعلق مجلس شوریٰ نے فیصلہ کر دیا۔

علامہ عثمانی بحیثیت صدر مہتمم
دارالعلوم دیوبند

۳ ذوالقعدہ ۱۳۵۴ھ / ۱۹۳۵ء تا ۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۳ء

خواجہ فیروزالدین رکن مجلس شوریٰ کا بیان ہے کہ جب ہم نے اس تجویز کو مجلس شوریٰ میں پیش کیا تو حکیم مقصود علی صاحب اور دوسرے موافقین نے تائید کی۔ کہ مولانا شبیر احمد صاحب کو صدر مہتمم کے عہدے پر مقرر کیا گیا اور آپ صدر مہتمم بنا دئے گئے۔ اگلے روز مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی رکن مدرسہ عالیہ بھی دیوبند پہنچے اور انہوں نے صدارت اہتمام کے فیصلہ شدہ معاملے کو پھر اٹھایا لیکن خواجہ فیروزالدین کپور تھلوی نے کہا کہ جو معاملہ کثرت رائے سے کل طے ہو چکا ہے اصولاً پھر چھیڑنا درست نہیں ہے لہٰذا یہ بات یہیں ختم ہو گئی۔ لیکن چونکہ حضرت عثمانی کا تعلق ڈابھیل سے بھی تھا اس لئے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ سردست دونوں جگہ کے امور انجام دیتے رہیں چنانچہ آپ کا تعلق ڈابھیل سے بھی رہا اور امور مدرسہ دیوبند سے متعلق کاغذات وہاں جاتے اور آپ ان کا تصفیہ فرماتے اور رمضان کی تعطیل میں جب علامہ اپنے وطن دیوبند آتے تو دارالعلوم کا باقاعدہ کام انجام دیتے بلکہ حضرت مولانا محمد طیب صاحب جب کہیں تشریف لے جاتے تو اہتمام کا کام بھی آپ انجام دیتے۔

لیکن یہاں آپ کے علم میں یہ بات بھی ہونی چاہیئے کہ صدارت اہتمام کے زمانے میں علامہ عثمانی نے کوئی پیسہ دار العلوم سے تنخواہ کا نہیں لیا۔ صرف فی سبیل اللہ خدمت انجام دیتے تھے اور اس سے پہلے بھی چند سال کے سوا بغیر تنخواہ دار العلوم کی خدمت انجام دیتے رہے ہیں۔

بہر حال ۱۹۳۷ء مطابق ۱۳۵۴ھ سے علامہ کو قدرت نے دار العلوم جیسی مائیہ ناز مادر علمی کا صدر بنا دیا۔ ۱۳۵۴ھ میں جب مولانا محمد طیب صاحب حج کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو آپ نے ان کی جگہ بحیثیت مہتمم بھی کام کیا۔ ۱۳۵۴ھ کی رپورٹ میں ہے۔ مولانا محمد طیب صاحب مہتمم تحریر فرماتے ہیں:۔

"احقر کی غیبت (عدم موجودگی) میں بحیثیت قائم مقام مہتمم حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کا تقرر کیا گیا تھا۔ مولانا ممدوح اس عرصے میں دار العلوم کی خدمات میں مشغول رہے اور بعد واپسی کے ڈابھیل تشریف لے گئے اور پھر اجلاس شوریٰ منعقدہ ۱۳۵۴ھ میں مولانا ممدوح کا صدارت پر تقرر کیا گیا۔ مولانا ممدوح کا تعلق ملازمت مدرسہ ڈابھیل سے بھی بدستور باقی ہے اور سال کا اکثر حصہ وہیں گذارتے ہیں۔ ماہ شعبان میں تعطیل کے زمانے میں دیوبند تشریف لاتے ہیں۔ دوران غیبت میں بسلسلۂ معاملات مدرسہ مراسلت ہوتی رہتی ہے۔ درمیانی مدت میں شرکت جلسہ ہائے شوریٰ وغیرہ کے لئے دعوت و طلب پر تشریف آوری ہوتی رہتی ہے۔ دوران قیام دیوبند میں دار العلوم میں تشریف لاتے ہیں اور معاملات کی انجام دہی میں حصہ لیتے ہیں"۔ (روئداد ۱۳۵۴ھ صفحہ ب ج)

مولانا محمد طیب صاحب کے اس نوٹ سے پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اس نوٹ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اثنائے سال میں مجلس شوریٰ کے جلسوں میں بھی آپ دیوبند تشریف لاتے رہتے تھے۔

دارالعلوم دیوبند میں حضرت علامہ
شبیر احمد صاحب عثمانیؒ
کا
اساتذہ، طلبہ اور ملازمین کی طرف سے
پُرتپاک اور پُرجوش خیر مقدم

صدارت اہتمام ۳ ذوالقعدہ ۱۳۵۳ھ

علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے صدارت اہتمام پر جس کو یونیورسٹیوں میں وائس چانسلر کا عہدہ کہا جاتا ہے فائز ہونے کے بعد کی کیفیت دارالعلوم دیوبند کے ماہوار رسالہ القاسم میں ایڈیٹر صاحب نے ذوالحجہ ۱۳۵۴ھ کی اشاعت میں اس طرح درج کی ہے جو حسب ذیل ہے :۔

دارالعلوم دیوبند میں نزول رحمت و برکت

امسال دارالعلوم دیوبند میں چند قابلِ مسرت امور منصۂ شہود پر آئے ہیں۔ یقین ہے کہ یہ امور دارالعلوم کے لئے برکاتِ ظاہری و باطنی کا موجب ہوں گے (۱) ممبران دارالعلوم کی تجویز کے مطابق حضرت حکیم الامت مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب دامت برکاتہم نے دارالعلوم کی سرپرستی حسبِ روایات قدیمہ قبول فرما کر سبھی خواہان دارالعلوم پر احسان عظیم فرمایا۔

(۲) جناب مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے

زمانۂ حج بیت اللہ میں اراکین دارالعلوم کی تجویز اور حضرت حکیم الامتہ دام فضلہم سرپرست دارالعلوم کے امر و ارشاد سے فخر المتکلمین علامۃ العصر حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی شیخ الحدیث والتفسیر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل نے تا قیام دیوبند باوجود اپنی چند در چند مشکلات کے عارضی اہتمام کو قبول فرما کر تمام بہی خواہاں دارالعلوم کو مسرور کر دیا۔ ۳ ذی قعدہ ۵۳ھ کو اپنے تقرر کی اطلاع کے جواب میں حضرت مولانا نے ایک تحریر دفتر اہتمام میں ارسال فرمائی تھی۔ جس میں مرقوم تھا کہ آج بعد نماز ظہر مدرسین و ملازمین دارالعلوم ایک جا جمع ہو جائیں اور جو کاغذات میرے متعلق ہوں ان کو تیار رکھا جائے۔ چنانچہ بعد ظہر تمام مدرسین و ملازمین دارالعلوم دارالمشورہ میں جمع ہو گئے۔ جب حضرت مولانا مدرسہ میں تشریف لائے تو جوشِ عقیدت میں سینکڑوں طلبہ آپ کے ہمراہ دارالمشورہ میں جمع ہو گئے۔ جن کو مصلحتاً دارالمشورہ سے منتشر کر دیا گیا حضرت مولانا نے تمام مدرسین کے روبرو ایک مختصر پر مغز جامع و مانع تقریر فرمائی۔ جس میں پہلے اپنی حیثیت کو واضح فرمایا۔ اور اس کے بعد اس پر خدا تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا کہ جماعت دارالعلوم کے اندر حسب سابق اتحاد و اتفاق کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ اور توقع ظاہر فرمائی کہ سب ذمہ دارانِ دارالعلوم مل کر اس امانت الٰہیہ کی حفاظت کریں گے مولانا شبیر احمد صاحب خدمت اہتمام کے باضابطہ قبول کرنے میں جب کچھ پس و پیش کا اظہار فرماتے تھے تو حضرت مولانا حسین احمد صاحب فرماتے تھے کہ نہیں آپ کو باضابطہ کام کرنا پڑے گا۔ بعد ختم تقریر کے حضرت مولانا حسین احمد صاحب نے اپنی جانب سے اس تقریر کی خوشی

شیرینی تقسیم کرائی۔ ۴ ؍ ذی قعدہ ۵۳ھ کو حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے بعد نماز جمعہ مدرسین و ملازمین کو دار المشورہ میں چائے پر مدعو فرمایا اسی روز طلباء کی مختلف انجمنوں کی طرف سے بعد نماز عشاء دار الحدیث کے بڑے ہال میں خیر مقدم کا ایک شاندار جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں طلبا کی طرف سے خیر مقدم کے پرجوش قصائد پڑھے گئے۔ اس کے بعد حضرت مولانا نے ڈیڑھ گھنٹہ تک ایک بلیغ و جامع تقریر فرمائی جس میں اپنی حیثیت کو واضح فرماتے ہوئے دار العلوم کی اساس اور اس کی گذشتہ تاریخ پر تبصرہ فرماتے ہوئے اس کے فیوض و برکات کا تذکرہ فرمایا۔ طلبہ کو اصل مقصد یعنی تعلیم کی طرف انہماک کا شوق دلایا۔ حضرت مولانا کی تقریر کو تمام مجمع نے نہایت امن و سکون کے ساتھ حرز جاں بنایا۔ تقریر کا خلاصہ انشاء اللہ آئندہ اشاعت میں ہدیۂ ناظرین ہوگا۔ حضرت مولانا کی تشریف آوری سے دار العلوم اور طلبہ کے اندر مسرت و بہجت کے خاص آثار نمایاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کے قدوم میمنت لزوم کو دار العلوم کے لئے ترقیات ظاہری و باطنی کا ذریعہ بنا دے اور طلبۂ دار العلوم کو حضرت مولانا کے مستقل فیوض و برکات سے مستفید و متمتع ہونے کا موقع عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔"

جذبات عاقل

بمسرت قدوم میمنت لزوم علامۃ العصر حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی دیوبندی دام فضلہ

(از جناب منشی محمد عاقل صاحب مدرس درجہ فارسی و ریاضی دار العلوم دیوبند)

میں شاعر نہیں، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے تعلق دار العلوم

پر کچھ پراگندہ خیالات موجزن ہوئے جن کو فوری طور پر رشتہ نظم میں منسلک کر دیا گیا نظر ثانی کی بھی نوبت نہ آسکی۔ (محمد عاقل غفرلہٗ)

مبارک ہو ترا آنا تجھے آنا مبارک ہو
تجھے یہ مدرسہ اور مدرسہ کو تو مبارک ہو
بہی خواہ جسقدر ہیں خوش رہیں یارب!
حسین احمد ہوں طیب اور تو ہو اور مبارک ہو

الٰہی عارضیت اٹھ کے استقلال آجائے
الٰہی خرخشے مٹ جائیں اور اخلاص آجائے

تو آجا اور آکر مدرسہ کی آبیاری کر
مخالف بھی اگر ہوں ترے ان سے آپ یاری کر
زمین قلب جو ہے خشک اس پر آب جاری کر
غرض شاداب کر اس بوستاں کو آبیاری کر

حسینی اور شبیری فضا سے جان آجائے
علوم فیض کے دریا بہیں اور شان آجائے

کہیں فرزند کو کر کے جدا بھی چین ہوتا ہے
کہ قلب مادر و فرزند بس بے چین ہوتا ہے
جو حالت مادر علم و عمل کی بن ترے گذری
بیاں اس کا نہیں اچھا کہ دل بے چین ہوتا ہے

یہی جی چاہتا ہے لوٹ کر وہ آن آجائے
کہ پھر آغوش مادر میں پسر ذی شان آجائے

حبیبی عہد کا اور احمدی کا دور آجائے

وہ محمودی سبق کا پھر جہاں میں شور ہو جائے
مسلّم ہو چکا ہے جانشیں گر اک زمانہ میں
حقیقی جانشیں یارب اک ان کا اور ہو جائے

رشیدی قاسمی گلزار میں پھر جان آ جائے
گلستانِ محمدؐ میں الٰہی شان آ جائے

رسالہ القاسم کی اس رپورٹ سے واضح ہو جاتا ہے کہ کیا طلبہ اور کیا اساتذہ اور کیا ملازمین سب نے آپ کا پرجوش خیر مقدم اور پرتپاک استقبال کیا۔ منشی محمد عاقل نے جو اشعار پڑھے اگرچہ شاعری کی حیثیت سے اس میں سُقم ہے لیکن خلوص کا پورا جوش ہے۔

حضرت مولانا مدنی اور شیرینی

حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا عثمانی کے صدارت اہتمام کے عہدے پر فائز ہونے پر مٹھائی تقسیم فرمائی جو حضرت والا کے اخلاقِ کریمانہ کا خاص پہلو ہے۔ خود مولانا عثمانی نے بھی اساتذہ اور ملازمین کے اعزاز میں چائے پر مدعو کیا۔

طلبہ کی طرف سے استقبال

طلبہ نے جس احترام اور اعزاز سے مولانا کو خیر مقدم کہا وہ دارالعلوم کی تاریخ میں سنہری حرفوں سے لکھنے قابل ہے۔

طلبہ کے استقبالیہ میں علامہ عثمانی کی تقریر

علامہ عثمانی نے دارالحدیث کے ہال میں ایک زبردست ابتدائی تقریر کی جو آپ کی خداداد خصوصیت اور لیاقت کی شان کو ظاہر کر رہی تھی اور یہ تقریر اسی قسم کی

ایک تقریر تھی جو قدرت ربانی خاص اوقات میں آپ کی زبان سحر انگیز سے کراتی رہی ہے۔ تقریر کیا تھی ایک بادل تھا جو گرج رہا تھا، فصاحت و بلاغت کا ایک سمندر تھا جو ٹھاٹھیں مار رہا تھا، علم و فضل کا ایک دریائے بے کراں تھا جس میں تلاطم بپا تھا۔ حکمت و موعظت کی موجیں تھیں جو سر ابھار ابھار کر دیکھ رہی تھیں یا کوثر و تسنیم کی ضیا میں چمکتی ہوئی لہریں تھیں جو رواں دواں تھیں یا شیرینی و لطافت کے چشمے تھے جو فردوس سے اُبل اُبل کر دلوں کی خشک کھیتیوں کو سرسبز و شاداب اور جنت نگاہ بنا رہے تھے۔

علامہ کی یہ تقریر چھپ کر دارالعلوم میں تقسیم ہوئی تھی۔ آپ نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ:۔

"جس طرح سمندر سے بخارات اٹھ کر بادل کی صورت میں برستے ہیں اور پھر سمندر میں جا ملتے ہیں۔ گویا یہ بخارات اپنے مرکز سے جدا ہوتے اور مرکز کی طرف واپس ہوتے ہیں ٹھیک اسی طرح اب سے کچھ سال پہلے مجھے اپنے مرکز علمی کو چھوڑ کر جدا ہونا پڑا اور پھر آج وہ وقت آیا اس علم کے سمندر سے اٹھے ہوئے بخارات پھر اسی سمندر میں آ کر مل گئے ہیں۔"

الفاظ، مضمون اور معانی اسی طرح کے تھے۔ غرض یہ ہے کہ آپ کی یہ تقریر ایک تاریخی تقریر تھی۔

جب آپ نے چارج لیا تو حضرت مولانا مدنی سے لیکر ادنیٰ مدرسین تک سب نے آپ کو خوش آمدید کہا اور اب تک کی جو کدورت تھی وہ سب ڈھل گئی۔ تمام آ کر ملے اور معاملات صاف ہو گئے

۱۳۶۱ھ میں ڈابھیل سے بالاستقلال دیوبند میں

لیکن ارکان دیوبند کا یہ خیال تھا کہ آپ مستقل طور پر دیوبند تشریف لے آئیں چنانچہ ۱۳۶۱ھ میں پھر آپ مستقل طور پر دارالعلوم دیوبند کے کام میں منہمک ہو گئے۔

آپ کے عہد اہتمام میں وہ کام جن میں ایک قسم کی رکاوٹ سی ہو جاتی تھی چل پڑے اور اکابر میں ہونے کی وجہ سے سب اساتذہ آپ سے متاثر ہو کر مطیع ہو گئے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی تحریر فرماتے ہیں :۔

"آپ (علامہ عثمانی) نے جب سے دیوبند کی صدارت اہتمام کی باگ اپنے ہاتھ میں لی ہے بہت سے مشکلات حاضرہ جن پر اراکین قابو نہیں پا رہے تھے بحمد اللہ حل ہو گئے"۔ (الفرقان صفر ۱۳۵۸ھ صفحہ ۳۵)

شعبۂ تنظیم و ترقی ۱۳۵۵ھ ۱۹۳۶ء

آپ کا تقرر ذوالقعدہ ۱۳۵۳ھ میں صدر مہتمم کی اسامی پر ہوا تو آپ نے صدارت کا چارج لیتے ہی دارالعلوم کو ترقی پر گامزن کرنے کے لئے پہلا قدم جو اٹھایا وہ شعبۂ تنظیم و ترقی تھا۔ ۱۳۵۵ھ کی روئداد (رپورٹ) میں مولانا محمد طیب صاحب لکھتے ہیں :۔

"حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند کی تجویز کے مطابق بعد منظوری مجلس شوریٰ منعقدہ ۱۹ر جمادی الاولیٰ ۱۳۵۵ھ ۱۹۳۶ء اس شعبہ کا اجراء عمل میں آیا۔

اعلیٰ مقصد

عامۂ مسلمین کو حلقۂ بہی خواہان دارالعلوم میں داخل کرنا شعبے کے اعلیٰ مقاصد میں داخل ہے جس کے لئے اقرار نامے بنام "قرطاس بہی خواہان دارالعلوم" طبع کرائے گئے ہیں۔ ان میں کچھ شرائط ہیں جن پر بہی خواہ بننے والے کے دستخط لئے جاتے ہیں۔ ہر بہی خواہ کیلئے

کم ازکم ایک روپیہ سالانہ یا ڈیڑھ آنہ ماہوار چندے کی مقدار مقرر ہے اس شعبہ کے ذریعہ بحمداللہ دارالعلوم کو آمدنی ہو رہی ہے اور شعبہ اپنی خدمات میں مصروف ہے۔"

پھر سالانہ روئداد بابت ۱۳۶۰ھ دارالعلوم میں شعبہ تنظیم و ترقی کے ارتقائی حالات کے سلسلے میں مولانا محمد طیب صاحب مہتمم تحریر فرماتے ہیں:۔

"۱۳۵۵ھ کے آخر میں حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند کی تجویز کے مطابق مجلس شوریٰ نے اس شعبہ کا اجرا کیا تھا .... الحمدللہ کہ یہ شعبہ تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کرتا رہا۔"

(روئداد ۱۳۶۰ھ)

خوب یاد ہے کہ جب میں کپورتھلے میں پروفیسر تھا تو میرے پاس بھی شعبہ تنظیم و ترقی کے سلسلے میں سفیر دارالعلوم علامہ عثمانی کا پیغام لیکر آئے تھے اور چندے کی دورسیدی کاپیاں میرے سپرد کر گئے تھے۔ اس ناچیز نے بھی اسی سلسلے میں کئی سو روپے مولانا عثمانی کی خدمت میں ارسال کئے تھے۔ روئدادوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی اس تجویز سے دارالعلوم کو کافی مالی فائدہ پہنچا۔ ۱۳۵۸ھ میں مولانا کے ذریعہ سے اس شعبہ میں سترہ سو انیس روپیہ سات آنے چھ پائی کی صرف ایک رقم درج ہے۔ ۱۳۵۸ھ کی روئداد میں، صدر مہتمم مولانا عثمانی کے عنوان کے ماتحت درج ہے:۔

"شعبہ تنظیم و ترقی میں ابتدائے سال سے آخر ۵۸ھ میں چار سے آٹھ سفیر ہو گئے اور ان کی مساعی سے دارالعلوم کو اس سال میں سات ہزار سات سو چوہتر روپیہ گیارہ آنے تین پائی کی آمدنی ہوئی۔"

کسی سکیم کی بنیاد قائم کر کے تھوڑے سرمائے سے جو برکت ہوتی ہے

وہ لازوال نتائج کی حامل ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ روئداد کی رپورٹ کے مطابق اس شعبے نے بڑی ترقی کی جو علامہ کے حُسنِ خیال اور حُسنِ انتظام پر دال ہے۔

سٹیشن سے دارالعلوم تک جداگانہ سڑک

دارالعلوم کی روزافزوں وسعت اور ذاتی عظمت و امتیاز کے باعث یہ تجویز بھی پیش نظر رہی ہے کہ دیوبند کے سٹیشن تک جداگانہ سڑک بنوائی جائے۔

اس سلسلے میں علامہ کے عہد صدارت میں اس کوشش نے خصوصی عملی شکل اختیار کی، حافظ محمد ابراہیم نگینوی کو جو اس زمانے میں حکومت متحدہ آگرہ و اودھ کے وزیر اوقاف و انہار و رسل و رسائل تھے، دعوت دی گئی چنانچہ موصوف ۱۳۵۷ھ میں ۳۱ مئی ۱۹۳۱ء کو ۸ بجے صبح دارالعلوم میں تشریف لائے۔ آپ کا نہایت گرمجوشی سے استقبال کیا گیا۔ مولانا عثمانی نے استقبال کے انتظامات کیئے۔ اپنی جیب سے چائے کا انتظام کیا اور مدرسے کو اس خرچ سے محفوظ رکھا۔ چائے پر اراکین مجلس شوریٰ معززین شہر بھی مدعو کیئے گئے تھے۔ دارالعلوم کے ہال میں دس بجے جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت کے لئے مفتی کفایت اللہ صاحب کو منتخب کیا گیا۔ طلبہ نے وزیر موصوف کی شان میں قصیدے پڑھے۔ ایک طالب علم نے جس کا نام عبدالرشید بریلوی تھا قصیدے میں حافظ صاحب کو ابراہیم ثانی کہدیا۔ قصائد کے بعد علامہ عثمانی نے مبسوط تقریر فرمائی اور قصیدہ نگار کو ابراہیم ثانی پر فقہ کی روشنی میں تنبیہ کی جو نہایت ضروری اور برمحل تھی۔ آپ نے مختلف امور پر روشنی ڈالتے ہوئے سڑک کی تکمیل پر وزیر موصوف کی توجہ منعطف کرائی۔ سوا بارہ بجے یہ جلسہ ختم ہوا (روئداد ۱۳۵۷ھ ۱۹۳۸ء صفحہ ۵) بہرحال سڑک کے سلسلے میں علامہ کی سعی کو بھی دخل نصیب ہوا۔

تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند ۱۳۵۸ھ ۱۹۳۹ء

علامہ ہی کے عہد صدارت میں آپ کی تجویز پر ابنائے قدیم دارالعلوم کا

تحریک کا آغاز ہوا۔ ۱۳۵۸ھ کی رپورٹ میں "تنظیم ابنائے قدیم" کے عنوان کے ماتحت حسب ذیل تاریخی نوٹ ملاحظہ کیجئے:۔

"اس سلسلے میں محرم ۱۳۵۸ھ / ۱۹۳۹ء میں بمقام دہلی ابنائے قدیم کا ایک عظیم الشان جلسہ زیر صدارت حضرت مولانا شبیر صاحب عثمانی صدر مہتمم دارالعلوم منعقد ہوا جس صوبجات کے فضلائے دارالعلوم اکٹھے ہوئے۔ (مجھ سے مولانا خواجہ عبدالحی صاحب فاضل دیوبند سابق استاذ جامعہ ملیہ دہلی وحال پروفیسر اسلامیہ کالج نے فرمایا کہ میں اس جلسے کی مجلس استقبالیہ کا صدر تھا۔ انوار) اس کے بعد دوسرا اجلاس بمقام دربھنگہ زیر صدارت مولانا منت اللہ صاحب مونگیری ایم۔ ایل۔ اے فاضل دیوبند منعقد ہوا جس میں صوبہ بہار کے تمام فضلاء جمع ہوئے۔ توسیع بہی خواہان دارالعلوم کی تحریک پر تقریریں ہوئیں اور یہ تحریک عام ہوگئی اور بحمد اللہ روز بڑھتی جاتی ہے۔ تنظیم کی بنیادی سکیم کے پایہ تکمیل کو پہنچ جانے پر قوی امید ہے کہ یہ سلسلہ قوی اور نتیجہ خیز ہو جائے گا۔ کام اپنا راستہ پیدا کر رہا ہے اور بتدریج نتیجہ خیز ثابت ہوتا جارہا ہے۔"

ابنائے قدیم کی تنظیم (OLD BOYS ASSOCIATION) جو علامہ عثمانی کی تحریک کا نتیجہ تھا در حقیقت موصوف کی دور رس نگاہ کا ثمرہ تھا جس کی ہمیشہ ضرورت محسوس کی گئی ہے اور ہر دور میں اس کے متعلق عوام و خواص دارالعلوم کی زبان پر ذکر آتا رہا ہے مگر علامہ نے اس کو عملی طور پر منظم کیا۔ یاد ہے کہ بجنور میں بھی اس کا ایک جلسہ ہوا تھا جس میں راقم الحروف بھی شریک ہوا تھا۔

اردو زبان کی ترقی اور علامہ عثمانی

۱۳۵۶ھ کی مجلس شوریٰ میں جو تجویزیں پیش کی گئیں ان میں اردو زبان کی ترقی

سے متعلق ایک تحریک مولانا عثمانی نے پیش کی جو حسب ذیل ہے :-

"مولانا عثمانی کی اہم تجویز | تجویز ۳۳ ۔ باجازت صدر مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے تحریک کی کہ جناب حاجی سید محی الدین صاحب پرنسپل اورنگ آباد کالج کی زبردست خواہش کے موافق دارالعلوم میں فارسی کے ساتھ اردو کی تعلیم بھی جاری کی جائے اور اس کے لئے نصاب بنایا جائے۔ مجلس اسے منظور کرتی ہے۔ مجلس علمی نصاب مرتب کرے اور آئندہ جلسے میں پیش کرے۔"

(دارالعلوم رسالہ ۱۹ ربیع الاول ۱۳۵۶ھ)

غور سے دیکھا جائے تو اردو کی ترویج اور ترقی کی تحریک مسلمانوں کے قومی وقار اور کلچر کا سوال ہے۔ دارالعلوم ہی میں نہیں بلکہ تمام ہندو پاک میں آج کے دور میں اس کی ترقی نہایت ہی اہم اور مسلمانوں کی زندگی اور موت کا سوال رہا ہے محی الدین صاحب کے ایماء پر ہی سہی لیکن علامہ کی تحریک پر مجلس شوریٰ نے مجلس علمی کو نصاب مرتب کرنے کی خدمت سپرد کی۔ اس کا انجام کیا ہوا معلوم نہیں۔

دارالعلوم میں وفود کی آمد اور عثمانی

ایک طرف تو دارالعلوم کی انتظامی خدمات میں علامہ مصروف رہے اور دوسری طرف باہر سے جو وفود یا معزز شخصیتیں آتیں ان سے عہدہ برآئی یہ ساری ہی مصروفتیں دارالعلوم میں آپ کی زندگی کی جز بن گئی تھیں۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی وفدِ مصر تھا۔ ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۷ء کے واقعات میں رپورٹ بتلاتی ہے :-

"وفد مصر | ۲ ذیقعدہ ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۶ جنوری ۱۹۳۷ء شام کے چار بجے کی گاڑی سے وفد مصر دارالعلوم میں پہنچا۔ بعد مغرب ایک مجلس خاص میں علمائے دارالعلوم سے علمی مباحث پر گفتگو ہوتی رہی۔ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب کے ایک پُر مغز اور علمی مکالمے سے ارکان وفد بہت محظوظ ہوئے"

(روئداد ۱۳۵۵ھ ۱۹۳۷ء ص ۳)

استاذ محترم حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی نے مجھ سے فرمایا کہ اسی وفد کی آمد پر علامہ عثمانی نے عربی میں ایک فصیح و بلیغ خطبہ لکھا تھا جس کو اس وفد کی مجلس میں موصوف نے پڑھ کر سنایا تھا جس میں دار العلوم سے متعلق معلومات فراہم کی گئی تھیں۔

وفد مدراس

ماہنامہ دار العلوم شوال ۱۳۶۰ھ ۱۹۴۲ء میں وفد مدراس کی آمد اور حضرت عثمانی کی تقریر کا حال حسب ذیل عبارت میں اس طرح پیش کیا گیا ہے:۔

"۲۶ شوال کو وفد کے بے حد اصرار پر حضرت علامہ شبیر احمد صاحب صدر مہتمم دار العلوم کی تقریر ہوئی۔ معزز مہمانوں کے خیر مقدم کے لئے ۲۶ شوال کو دار العلوم کے وسیع ہال میں جلسہ منعقد ہوا جس میں پہلے حضرت مولانا محمد طیب صاحب نے سفر مدراس کے کوائف اور اہل مدراس کے اکرام و مہمان نوازی اور دار العلوم کے ساتھ قلبی روابط کا ذکر فرمایا ان کے بعد حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی مدظلہ العالی نے اپنے مخصوص و دلنشین انداز میں ایک عالمانہ تقریر ارشاد فرمائی جس میں مختلف مواعظ و پند کے ساتھ ہی دار العلوم کی عظمت و شان، اس کی خدمات اور ضرورت پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی گئی۔ اس کے بعد دعا پر جلسہ ختم کیا گیا۔"

(کوائف دار العلوم ماہنامہ شوال ۱۳۶۰ھ)

علامہ عثمانی کے عہدۂ صدارت کے وقت دار العلوم کی سیاسی فضا

حضرت عثمانی نے جب دار العلوم دیوبند کا بحیثیت صدر مہتمم (Vicc chanclor) چارج لیا تو اس وقت دار العلوم کی سیاسی فضا کیا تھی خود

مولانا عثمانی کی زبانی سُنئیے۔ اپنے بیان مورخہ ۹ رجب ۱۳۶۲ھ میں لکھتے ہیں:۔

"میری صدارت اہتمام سے تقریباً آٹھ نو سال پہلے جبکہ حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب مرحوم کی جگہ پُر کرنے کے لئے کسی مشہور شخصیت کی ضرورت تھی دارالعلوم کا اہتمام اور شوریٰ مولانا مدنی کی شرائط قبول کرنے پر مجبور ہوگیا۔ مولانا ممدوح اس وقت دارالعلوم میں بحیثیت صدر مدرس نو وارد تھے۔ دوسری طرف ایسی مقتدر ہستیاں موجود تھیں جو ان کے سیاسی[1] استثنا کے اثرات کو زیادہ پھیلنے سے بڑی حد تک روک سکتی تھیں۔ جب ان میں سے بعض اٹھ گئیں اور بعض کا تعلق بالکل مضمحل کر دیا گیا تو مولانا مدنی کا سیاسی استثناء اپنے قدرتی اثرات کے ساتھ بے روک ٹوک سامنے آنے لگا۔ مولانا کے حد سے زیادہ سیاسی انہماک و غلو کی موجودگی میں خود ان کی زبانی یا قلمی فہمائش میں بھی ایسی قوت نہ تھی کہ آثار کو ان کے طبعی اسباب پر مرتب ہونے سے روک دیتی۔ جیسا کہ میں اپنے سابق بیان میں واضح کر چکا ہوں۔ آخر وہ اثرات ادارے کے ہر جز و کل میں اس حد تک سرایت کر گئے کہ اس کی اصل پالیسی کے چلانے میں دقتیں پیش آنے لگیں اور کارکنوں میں وحدت مذاق مفقود ہوگئی بہرحال مجھے اسی ماحول میں صدارت اہتمام بدون میری ادنیٰ خواہش و استدعا کے تفویض کی گئی۔"

---

[1] حضرت مولانا حسین احمد رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم میں ملازمت کے وقت حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اور اراکین مدرسہ سے یہ شرط لگائی تھی کہ سیاسیاتِ مُلکی میں حصہ لینے اور ہر ماہ میں تین دن ایسے جلسوں میں شرکت کے لئے مجھے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ چنانچہ ان کی شرط مان لی گئی تھی۔ یہی ان کا سیاسی استثنا تھا۔ مصنف

جائزہ

اس میں شک نہیں کہ حضرت مولانا مدنی تحریک آزادئ ہند کے پرجوش رہنما تھے اور وہ انگریز کا ہندوستان سے اقتدار ہٹانے میں پیش پیش تھے اس لئے اثنائے ملازمت میں تحریک آزادی کے لئے سیاسی استثنا سے رُکنا ان کے بس کی بات نہ تھی لہذا مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اور ارکین مجلس شوریٰ نے ہنگامی حالات کے ماتحت حضرت مولانا مدنی کی شرائط کو منظور کرلیا۔ چنانچہ اسی استثنا کے باعث مولانا مدنی پر سیاسیات ملکی میں حصہ لینے پر کوئی نکتہ چینی نہیں کی جاسکتی۔ اُدھر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم اور ارکین دارالعلوم شاہ صاحب کی جگہ پُر کرنے کے لئے حضرت مولانا مدنی جیسی عظیم المرتبت شخصیت کو لینے پر مجبور تھے۔ اس لئے وہ بھی معذور تھے۔ ہاں افسوس یہ ہے کہ اس وقت کے اختلاف میں حضرت شاہ صاحب جیسی ہستی کو ہاتھ سے دے دینا دارالعلوم اور طلبہ کی بدقسمتی تھی۔ اگر شاہ صاحب دارالعلوم میں رہتے تو پھر صورت حالات کچھ اور ہوتی۔

علامہ عثمانی اپنی مذکورہ عبارت میں مولانا مدنی پر الزام نہیں لگاتے نظر آتے ہیں بلکہ وہ یہ فرما رہے ہیں کہ الناس علی دین ملوکھم کے قاعدے کی بنا پر مولانا مدنی کے طلبہ اور ملازمین کو سیاسیات میں حصہ لینے سے منع کرنے اور روکنے کے باوجود ان کا اثر طلبہ اور مدرسین پر پڑا۔ چنانچہ آگے چل کر علامہ اپنے مذکورہ ۹ رجب کے اعلان میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم کے شرطوں کے مان لینے اور سیاسی استثنا پر تنقیداً فرماتے ہیں:۔

علامہ عثمانی کی پالیسی دارالعلوم میں

”میں نے کسی وقت بھی دارالعلوم کے اصل مسلک و مقصد کے لحاظ سے اس عظیم التاثیر استثنا کو پسند نہیں کیا۔ نہ کبھی اس کو معقول

کہا۔ لیکن نفس استثنا کے خلاف اقدام کرنے میں فتنۂ عظیم تھا اور ماحول ایسا پیدا ہو چکا تھا کہ کوئی آواز اس سلسلے میں مؤثر نہ ہو سکتی تھی۔ تاہم مقدرت و مصلحت کے مطابق وقتاً فوقتاً معاملات کو اعتدال پر رکھنے کی کوشش کی گئی تاکہ دارالعلوم اپنے اصل موضوع سے قریب رہ سکے اور کسی ناقابل تحمل مہلکہ میں نہ پھنس جائے۔" (بیان ۹ رجب ۱۳۶۲ھ)

مولانا عثمانی کی مذکورہ بالا عبارت اتنے اختصار کے باوجود اس قدر جامع ہے کہ آپ کی صدارت اہتمام کے زمانے کی پالیسی پر بہترین روشنی ڈال رہی ہے۔ پالٹیکس اور پولٹیکل سائنس کے ماہرین فیصلہ کر سکتے ہیں کہ جن حالات میں حضرت عثمانی نے چارج لیا ان حالات میں اس سے بہتر اور پالیسی کیا ہو سکتی تھی؟

مولانا عثمانی کی مذکورہ عبارت اور مولانا مناظر احسن کی گذشتہ صفحات کی عبارت کو ملانے سے معلوم ہوا کہ حضرت عثمانی کی صدارت سے پہلے جو کام رُک جاتے تھے وہ رُک تو نہ سکے البتہ پالیسی میں مصلحت کو پیش نظر رکھنا پڑا۔

حضرت عثمانی نے فرمایا ہے کہ مقدرت و مصلحت کے مطابق وقتاً فوقتاً معاملات کو اعتدال پر رکھنے کی انہوں نے کوشش کی ہے تاکہ دارالعلوم اپنے اصل موضوع سے قریب رہ سکے اس کے متعلق وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"بہرحال میں نے دارالعلوم کی ہفت سالہ فضا میں برابر یہ سعی کی کہ ہم دونوں (میں اور مولانا مدنی) کو ایک دوسرے کا امکانی تعاون حاصل رہے اور مولانا کے سیاسی استثنا سے (جس کو میں دل سے ناپسند کرتا رہا ہوں) مناسب حد تک غض بصر (نظرانداز) کیا جائے۔ ....

.... ہاں بارہا ایسا وقت آیا ہے جبکہ سیاسی صورت حال پر خاموش رہنا ممکن نہ تھا۔ مثلاً دارالعلوم کے مکان پر جس میں حضرت مولانا مدنی

کا قیام رہتا ہے کانگریسی جھنڈا نصب کیا گیا۔ یا ایک مرتبہ دارالعلوم کے بہت سے ملازم مقامی کانگریس کے باقاعدہ ممبر یا عہدہ دار بن گئے اس طرح کی چیزوں کی مناسب طریقے سے روک تھام کی گئی جن ملازمین[۱] نے دارالعلوم کے مسلک کے خلاف اپنے رویہ پر اصرار کیا (گو وہ میرے ہی رکھے ہوئے تھے) ان کو معطل کیا گیا تا آنکہ انہوں نے باقاعدہ اس سے رجوع کر لیا۔ اس طرح کی متعدد مثالیں امسلہ دارالعلوم میں موجود ہیں۔"

اسی بیان میں ایک اور جگہ حضرت عثمانی فرماتے ہیں :۔

"میں بلا خوف تردید کہتا ہوں کہ مولانا کے سیاسی استثنا کو منظور کرتے وقت اس کے نتائج پر عمیق نظر نہیں ڈالی گئی۔ ایک طرف دارالعلوم کو سیاسی الجھنوں سے علیحدہ رکھنا اور دوسری جانب اس کے شیخ الحدیث کو اس سے مستثنیٰ کر دینا ممکن ہے ہنگامی طور پر معقول ہو لیکن دائمی طریقے سے اسے باقی رکھنے کے نتائج طویل تجربے کے بعد اب بالکل سامنے آچکے ہیں۔"

تبصرہ حضرت عثمانی کی مذکورہ تحریروں پر تبصرہ کرنا سوانح نگاری کی حیثیت سے ہمارا فریضہ ہے اس لئے ہمارے خیال میں جو کچھ موصوف نے فرمایا ہے وہ کسی درجے تک درست ہے۔ لیکن دارالعلوم کے بزرگوں نے سیاست میں ہمیشہ حصہ لیا ہے۔ حضرت شیخ الہند نے ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے جو

---

[۱] ان ملازمین میں مولوی عبدالوحید صدیقی مرحوم ایڈیٹر نئی دنیا دہلی، مولوی محمد عثمان صاحب، مولوی سلطان الحق وغیرہم تھے۔ مصنف

خفیہ سکیم مرتب کی تھی وہ تو اپنی انتہا پر پہنچنے والی انقلابی صورت رکھتی تھی جس کے عوض انہیں مالٹا میں نظر بند رہنا پڑا۔ خلافت کے زمانہ میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی، مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند اور خود مولانا عثمانی سیاسیات میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ جمعیۃ العلماء کی ورکنگ کمیٹی کے وہ ممتاز رکن رہے ہیں اور ان کی تقریروں سے سیاسی، ملی، مذہبی جلسہ گاہیں گونجتی رہی ہیں اس لئے اگر حضرت مولانا مدنی بھی سیاسیات میں حصہ لیتے رہے تو اس میں کیا مضائقہ ہے۔ لیکن مولانا عثمانی حضرت مدنی کا سیاسیات میں حصہ لینا درانحالیکہ وہ دارالعلوم کے شیخ الحدیث ہوں مناسب نہیں سمجھتے۔ حضرت شیخ الہند کے معاملے میں بھی دائرہ اہتمام و انتظام اسی الجھن میں تھا۔ دراصل کسی ادارے کی انتظامیہ کو ایسا سوچنا ہی پڑتا ہے۔ لیکن دوسری طرف ملک اور قوم کے رہنما ملک اور قوم کی غلامی کو بھی برداشت نہیں کر سکتے اس لئے بہترین صورت یہی ہوتی ہے کہ اس قسم کے اداروں سے باہر رہ کر رہنمایان ملت کے لئے آزادانہ سرگرمیوں کا موقع بہتر ہوتا ہے۔ دنیا کے تمام اداروں کے منتظم لوگوں کا یہی طریقہ رہا ہے کہ انہوں نے اداروں میں اس قسم کی سرگرمیوں کو جائز قرار نہیں دیا۔ مولانا عثمانی اپنے آئی بیان مورخہ ۹ رجب میں ان معاملات سے پردہ اٹھاتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"بلاشبہ میں اب تک جمعیۃ العلما کی ورکنگ کمیٹی کا رکن ہوں اور باوجود میری بار بار استدعا کے رکنیت سے مجھے علیحدہ نہیں کیا گیا۔ لیکن اس سیاق میں جو کچھ میری روش ہے سب جانتے ہیں۔ پھر علما کے لئے کوئی دوسرا پلیٹ فارم موجود نہیں۔ خالص مذہبی مسائل میں بھی بارہا علما کو اجتماعی آواز بلند کرنا پڑتی ہے۔ وہاں کے سیاسی مسائل میں اپنا نقطہ نظر آزادانہ واضح کر دیتا ہوں۔ نہ اس میں غلو ہے نہ انہماک۔ نہ میں دارالعلوم کے تدریسی

شعبے سے کوئی تعلق رکھتا ہوں جو بلا ارادہ ہی طلبہ میرے تاثرات قبول کریں۔ چنانچہ اس چیز سے ہندوستان کا ہر باخبر انسان واقف ہے۔ میں نے تو یہاں تک کہا ہے اور اب بھی کہتا ہوں کہ سیاست کوئی شجرۂ ممنوعہ نہیں ہے جسے ہاتھ لگانا ہی ناجائز ہو بشرطیکہ اسلامیت کا رنگ غالب رہے اور ہم سر بننے کی بجائے غیروں کی دُم نہ بن جائیں۔ اسی طرح کی سیاست میں ہمارے پیشرووں نے مناسب حد تک حصہ لیا ہے مگر ساتھ ہی دارالعلوم کو سیاست عصریہ کی خطرناک الجھنوں سے بچائے کی ہمیشہ کوشش کی ہے جس کی بدولت وہ بھی میری طرح مطعون کئے گئے۔"

ہمارے ذہن میں جو بعض الجھنیں اکابر دیوبند اور خود حضرت عثمانی کے سیاسیات میں حصہ لینے سے متعلق تھیں وہ موصوف کی اس عبارت سے صاف ہو گئیں۔

دور خلافت اور دور کانگریس میں فرق

جس دور خلافت میں علمائے دیوبند نے حصہ لیا ہے اس میں تمام مسلمان تحریک خلافت میں متحد تھے اس لئے علمائے دیوبند کا اس تحریک میں سرگرمی سے حصہ لینا قابل تحسین سمجھا گیا۔ لیکن مسلم لیگ اور کانگریس کی کشمکش میں چونکہ مسلم لیگ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اس لئے کانگریس میں شریک علماء یا خصوصی نیشلسٹ مسلمانوں کی شرکت مسلمانوں کی اکثریت کی نظروں میں کھٹکتی تھی اس لئے علماء دیوبند کا پہلی تحریک میں حصہ لینا قابل اعتراض نہ تھا البتہ کانگریس میں بعض حضرات کی شرکت کو گوارا نہیں رکھا گیا۔

حضرت مولانا مدنی اور حضرت مولانا عثمانی کا تعاون

دارالعلوم کے عہد صدارت میں مولانا مدنی سے سیاسی اختلافات کے باوجود مولانا عثمانی نے ان کے ساتھ موافقت اور تعاون کی فضا کو

کبھی خراب نہیں ہونے دیا۔ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے وہ ارکان جو خود کانگریس کے مخالف تھے اور مولانا مدنی کی کانگریس میں شرکت کے مخالف تھے وہ کسی وقت بھی ان کی سیاسی سرگرمیوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن جیسا کہ مولانا عثمانی نے فرمایا" کہ میں نے اپنے ہفت سالہ صدارت کے دور میں یہ امکانی کوشش کی کہ ہم دونوں کو ایک دوسرے کا امکانی تعاون حاصل رہے اور مولانا مدنی کے سیاسی استثنا سے جس کو میں دل سے ناپسند کرتا تھا مناسب حد تک چشم پوشی کی جائے" چنانچہ انہوں نے چشم پوشی کی اور ان سے تعلقات کو دوسروں کی شہ کے باوجود بگاڑنا ہرگز پسند نہیں فرمایا جو غایت درجے کی دوراندیشی تھی۔ اپنے ۹ رجب کے بیان میں عثمانی لکھتے ہیں :۔

"مولانا مدنی سے ہمارے دیرینہ تعلقات ہیں۔ ان کی عزت و آبرو جماعت کی عزت و آبرو ہے۔ وہ تو مشہور ترین عالم ہیں۔ کسی عالم کی توہین و تضحیک بھی ہمارے لئے تکلیف دہ ہے۔ گو نظریاتی اختلاف رائے ہو مگر طبقۂ علماء کی عظمت و وقار پر کوئی رکیک حملہ ہونے کی صورت میں اپنی قدرت کے موافق کچھ نہ کچھ مدافعت کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔"

مثلاً ۱۳۵۳ھ میں حاجی داؤد ہاشم رنگونی نے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی سرپرستی کی تائید کرتے ہوئے مولانا مدنی اور دوسرے کانگریسی خیال کے ممبروں کو گاندھی اور کانگریس کا متبع لکھا تھا جس کے جواب میں مولانا عثمانی نے اپنے مکتوب ۴ رذی الحجہ ۱۳۵۳ھ میں لکھا تھا :۔

"کسی بزرگ (حضرت تھانوی) کی عقیدت کے جوش میں اس طرح کا غلو ہرگز پسندیدہ نہیں کہ ان کے علاوہ اپنی ہی جماعت کی دوسری برگزیدہ ہستیوں میں سے کسی پر اعتماد باقی نہ رہے۔ میں ازراہِ اخوت اسلامی ضرور مشورہ

دوں گا کہ معاملات میں اس طرح کے غلو اور تعمق سے احتراز کرنا چاہیئے۔"

(ضمیمہ رسالہ ماہنامہ دار العلوم جمادی الاولیٰ وجمادی الاخریٰ ۶۲ھ ص ۳)

یہی وہ مدافعت ہے جو مولانا عثمانی نے مولانا مدنی کے لیئے کی ہے۔ اور یہ ایک حقیقت بھی ہے کہ مولانا مدنی کی سیاسی پالیسی سے مجلس شوریٰ کے بعض ممبر سخت مخالف تھے۔

مولانا عثمانی کی دار العلوم میں حکمت عملی کا اب تک خلاصہ یہ ہے:

۱۔ انہوں نے جب صدارت کا چارج لیا تو دار العلوم میں غیر شعوری طور پر سیاست متحدہ کا اثر تھا۔

۲۔ انہوں نے حتی الامکان ہر کسی کو ایسے سیاسی غلو و انہماک سے روکا جو مدرسے کے لئے ہلاکت آفریں ہو۔

۳۔ وہ دل سے مولانا مدنی کی کانگریسی سیاسی سرگرمیوں کے مخالف تھے لیکن وہ یہ پسند نہیں فرماتے تھے کہ باہمی آویزش اور کشمکش کا مظاہرہ کیا جائے۔ بلکہ حتی الامکان ان کی مناسب حد تک سیاسی سرگرمیوں سے چشم پوشی فرماتے رہے۔

حضرت مولانا تھانویؒ کا سرپرستیٔ دار العلوم سے استعفاٰ

راقم الحروف نے بحیثیت سوانح نگار مذکورہ بالا حوالوں سے جو کچھ پیش کیا ہے ان کے پیش نظر مولانا عثمانی کا رویہ بے داغ نظر آتا ہے۔ وہ ظاہری طور پر مولانا مدنی سے بگاڑنا بھی پسند نہیں فرماتے تھے اور کسی کے اکسانے پر بھی کان دھرنا پسند نہ کرتے تھے۔ وہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی سرپرستی کے بھی مؤید تھے اور اکابر میں اتحاد کے بھی قائل تھے۔ چنانچہ جب کانگریسی خیال ارکان نے ان کی سرپرستی کو چیلنج کیا تو مولانا تھانوی

نے استعفاٰ دے دیا۔ واضح رہے کہ دارالعلوم دیوبند کے عالمِ وجود میں آنے کے بعد سے کوئی نہ کوئی بزرگ اس کا سرپرست رہا ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، حضرت مولانا محمود حسن صاحب، حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب، رحمہم اللہ، کے بعد حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سرپرست تھے۔ سرپرست بعینہٖ وہی عہدہ ہے جو یونیورسٹیوں میں چانسلر کا عہدہ ہوتا ہے۔ ہاں تو مولانا عثمانی نے حضرت تھانوی کو جو خط ان کے استعفٰے کے بعد لکھا وہ حسب ذیل ہے :۔

مکتوب عثمانی

بنام

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

از بندہ شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ

بخدمت سراپا برکت مخدوم و مطاع بندہ حضرت مولانا صاحب

دامت برکاتہم

بعد سلام مسنون نیاز مشحون معروض آنکہ۔ حضرت والا سے رخصت ہو کر آج تک عریضہ لکھنے کی نوبت نہیں آئی یہاں آکر کچھ بیمار رہا پھر مشاغل درس و تالیف سے فرصت نہ ملی۔ امید ہے کہ حضرت کا مزاج بخیریت ہوگا۔

جو تجویز دارالعلوم دیوبند کی سرپرستی کے متعلق حضرت کے سامنے قرار پائی تھی اس پر دستخط ہونے میں خلاف توقع دیر ہوگئی۔ اب تقریباً آٹھ دس روز ہوئے شیخ رشید احمد صاحب نے دستخط کر کے واپس فرمائی ہے۔ چونکہ اب دونوں طرف سے دستخط ہو کر تحریر میرے پاس آگئی تھی میں نے اعلان اجمالی

اطلاع کے طور پر فضا کو قدرے پرسکون بنانے کے لئے بعض اخبارات میں بھیجدیا جو غالباً عنقریب ملاحظۂ سامی سے گذرے گا۔ لیکن کل غیر متوقع طور پر بعض خطوط سے حضرت والا کے استعفے کا حال معلوم ہوا جس سے تمام امیدوں کا خون ہوگیا۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت کی علحدگی خوشی سے برداشت کی جائے۔ میں فوراً حاضر ہو کر اپنے اور جماعت دیوبند کے جذبات زبانی عرض کرتا لیکن آجکل صحیح بخاری کے درس سے بالکل فرصت نہیں۔ امتحان قریب ہے اور کتاب کا ختم کرانا امتحان سے قبل ضروری ہے۔ سردست اپنے قدیم نیازمندانہ اور عقیدتمندانہ روابط کی بنا پر پوری قوت کے ساتھ استدعا ہے کہ حضرت استعفا کی اشاعت میں جلدی نہ فرمائیں کم از کم مجلس شوریٰ کا انتظار فرمالیں۔ اور یہ خادم بھی ۱۲ر شعبان تک انشاءاللہ دیوبند پہنچے گا۔ میری زبانی عرض معروض کے بعد جو رائے قائم فرمائیں حضرت بہرحال مختار ہیں۔ تجویز معہود کے بعد حضرت کی سرپرستی اور اس کی نوعیت کے متعلق کوئی اختلاف طرفین سے باقی نہیں ہے۔ والسلام

از ڈابھیل ضلع سورت (گجرات)

۱۵ر رجب ۱۳۵۴ھ

(مطابق ۱۴ر اکتوبر ۱۹۳۵ء مہر لفافہ)

مکتوب حضرت حکیم الامّت بجواب علامہ عثمانی

از اشرف علی عفی عنہ

بخدمت مشفقی مکرمی دامت فیوضہم

یاد آوری سے ممنون و مسرور ہوا۔ میں تو قلب سے تعلق کو کافی سمجھتا

ہوں گو خط یا ملاقات میں ظاہری دیری ہو۔ آپ نے جو کچھ دارالعلوم کی مصلحت اور میری محبت سے تحریر فرمایا ہے سراسر صواب ہے۔ اس پر عمل عین نفع تھا لیکن میں اعذار قویہ سے معذور ہوں۔ ان سب کا حاصل یہ ہے کہ اس صلح کے بعد جو واقعات جماعت مصلحین کی طرف سے پیش آئے اور آرہے ہیں ان سے بدلالت غیر مشتبہ واضح ہوتا ہے کہ جو صلح منعقد کی گئی ہے وہ محض لفظی صلح ہے۔ جیسے نزاع لفظی نزاع نہیں ہے اسی طرح صلح لفظی صلح نہیں۔ ان مصلحین کی نیت ہی اشتراک عمل نہیں ہے بلکہ محض اپنا انفراد و استبداد (ہے)۔ پھر انفراد کا بھی مضائقہ نہ تھا اگر بزرگوں کے مسلک پر کام ہوتا۔ میں تو علم الیقین سے بڑھ کر عین الیقین سے دیکھتا ہوں کہ کانگریسی مسلک کی روح مدرسے میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ یہ تو مصلحین کی حالت ہے۔ اب رہ گئی دوسری جماعت جس کا لقب مصالحین مناسب ہے ان کی یہ حالت ہے کہ وہ کچھ ضعف کے سبب اور کچھ حسن ظن کے سبب ان کے اتباع و موافقت ہی میں اپنی خیر سمجھتے ہیں۔ ضعف کی یہ حالت کہ جو تجویز مصالح دارالعلوم کے لئے ہوتی ہے اس پر نہ عمل کریں نہ رائے بدلنے کی اطلاع کریں۔ ہر وقت مصلحین کی ارضاء کی فکر میں سرگرم ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو دو چار مخلصین قوی الحزم ہیں ان کے ہاتھ میں کام ہی نہیں وہ بددل ہوتے جاتے ہیں۔ جب موافقین کی یہ حالت اور مخالفین کی وہ حالت تو بےچارہ مسکین سرپرست بجز سلامت برکنار راست کے کیا تجویز کرے۔ جتنا آپ نے اپنی محبت سے اس علیحدگی پر تاسف فرمایا دوسری جماعت نے تو اس سے عشر بھی نہ کچھ کیا۔ بلکہ واقعات سے معلوم ہوا کہ انہوں نے اس کو اپنے لئے نعمت و غنیمت سمجھا۔ اور اگر اس وقت

اس سے کوئی امر مانع تھا تو جیسے آپ نے محبت سے لکھا ہے کہ تیری علیحدگی خوشی سے گوارا نہیں کی جاسکتی اسی جلسے میں معلوم ہو جائے گا کہ اس جماعت میں سے کون کون اس خیال کے ہیں اور مجھ سے کیا کہتے ہیں۔ یہ تو اب بھی ان کے اختیار میں ہے۔ میں نے حلف تو نہیں کیا۔ جیسے پہلے استعفا کو واپس لے لیا اب بھی ممکن ہے مگر میں پیش گوئی کرتا ہوں کہ ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ اور اگر الفاظ کا استعمال بھی کیا (تو) آپ ہی وجدان سے فیصلہ کر لیجئے گا کہ الفاظ محض ہیں یا معنی سے بھی قرین ہیں اور مجھ کو جلسے کا انتظار کرنا بظاہر مصلحت تھا مگر بعد تامل اس انتظار میں اس مصلحت سے بڑھ کر ایک مفسدہ بھی تھا مجھ کو اسی کے مقتضا پر عمل کرنا راجح معلوم ہوا وہ یہ کہ اگر اس وقت کثرت رائے سے جیسا کہ مصلحین نے کثرت حاصل کر لی ہے میری علیحدگی (اور غلامی کی سرپرستی بھی علیحدگی ہی کے مرادف ہے) طے ہو جاتی تو کیا ذلت نہ تھی اور بلا ضرورت میں اس ذلت کو کیوں گوارا کرتا اور اگر فرضاً آزادی ہی کی سرپرستی باوجود مخالفت مصلحین کے کسی طرح کرالی جاتی اور خدا نہ کرے دارالعلوم میں کسی اور وجہ سے آمدنی میں قلت ہوتی جیسا چند روز میں ہو رہا ہے تو یہ جماعت ابھی سے کہہ رہی ہے کہ ایسی آزاد سرپرستی پبلک کے خلاف ہے اور اس لئے مدرسہ میں چندہ کم ہوتا جاتا ہے تو اس وقت زیادہ کہتے تو میں اپنے سر پر بدنامی کیوں لوں۔ اب استعفا دے کر میں نے میدان خالی کر دیا ہے۔ اگر جلسے میں کوئی فیصلہ متفقہ ہو گیا اور میرے نزدیک بھی خلاف مصلحت نہ ہوا میں پھر خادم ہوں اور اگر اختلاف رہا تو میں مسئلہ مختلف فیہا بننا نہیں چاہتا۔ یا مختلف فیہ بین الجماعت نہ ہوا لیکن میرا اختلاف ہوا تب بھی وہی معذوری۔ تطویل کلام معاف کیجئے حسب مخاطب اپنا ہمدرد

ہوتا ہے تو فریاد طویل ہو جاتی ہے ۔ اب تو یہی دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مدرسہ کی خیر کرے جس میں ہو۔ میرے تعلق میں ہو یا علیحدگی میں والسلام۔

از تھانہ بھون ۱۷ ررجب ۱۳۵۴ھ (مطابق ۱۷ ر اکتوبر ۱۹۳۵ء)

تبصرہ مذکورہ بالا مکتوب گرامی از حکیم الامت تھانوی بنام علامہ عثمانی ۱۷ ررجب کا ہے اور ڈاکخانے کی مُہر کے مطابق ۱۷ ر اکتوبر ۱۹۳۵ء کو روانہ ہو کر ۲۰ ر اکتوبر ۱۹۳۵ء کو ڈابھیل مولانا عثمانی کے پاس پہنچا ہے۔

حضرت حکیم الامت کا گرامی نامہ واضح کر رہا ہے کہ دار العلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ کے کتنے ایک ممبر حضرت تھانوی کی سرپرستی کو دار العلوم سے ہٹانا منجملہ دیگر اصلاحات کے ایک اصلاح کے ماتحت مناسب سمجھتے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مجلس شوریٰ میں ایسے عناصر کا غلبہ ہے جو ملکی سیاسیات میں کانگریسی خیالات کے ہیں۔ مولانا تھانوی کو یہ خطرہ درپیش تھا کہ وہ اس سے پہلے کہ مجھے سرپرستی سے علیحدہ کر دیں مناسب یہ ہے کہ میں ہی استعفا دے دوں۔ چنانچہ انہوں نے استعفا دیدیا علامہ عثمانی ان کو سرپرستی پر فائز دیکھنے کے متمنی ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ مصلحین کے ساتھ بات چیت کر کے پھر حضرت تھانوی سے کوئی مذاکرہ کریں اور اس سے پہلے موصوف استعفا نہ دیں۔ حضرت تھانوی نے پہلے استعفا دینے کی مصلحتیں بیان فرمائی ہیں اور یہ بھی فرمایا ہے کہ سردست میرا استعفا دینا ہی مناسب ہے لیکن اگر وہ جماعت میری سرپرستی کی خواہشمند ہو گی تو مجھے استعفا واپس لینے میں کوئی عذر نہیں۔

خواہ کچھ بھی ہو علامہ عثمانی اس خصوص میں دونوں کو ملانا چاہتے ہیں یعنی مصلحین اور سرپرست میں تعاون اور توافق کی راہ تلاش کرنے کی فکر میں ہیں اور ان کا یہ رول ادا کرنا بہترین تدبر پر دلالت کرتا ہے۔

ان خطوط سے آپ کو لقیناً شبہ ہو سکتا ہے کہ دار العلوم کی پالیسی میں کانگریس

کا سیاسی عنصر کیا اس لئے غالب ہو چلا تھا کہ دارالعلوم کا سیاسی مسلک کانگریس سے متفق تھا اس سلسلے میں ہم مختصراً اس حقیقت سے نقاب اٹھانا چاہتے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند اور کانگریس

کہا جاتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند نے کانگریس کا بھرپور ساتھ دیا۔ لوگوں کے یہ ریمارکس میرے دل کو کچوکے لگاتے ہیں۔ اسلامیہ کالج لائلپور میں جہاں میں آج کل بحیثیت پروفیسر کام کر رہا ہوں، پنجاب یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کو پولیٹیکل سائنس کی سوسائٹی کی طرف سے دعوت دی گئی انہوں نے کالج میں نظریہ پاکستان پر تقریر کرتے ہوئے برملا کہا :۔

"حیرانی ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے مولانا حسین احمد صاحب شیخ الحدیث نے پاکستان کی مخالفت میں سر دھڑ کا زور لگا دیا جس کی ان سے توقع نہیں کی جا سکتی تھی"

جب وہ تقریر کر چکے تو میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ نے دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث کے سیاسی افکار کو دارالعلوم دیوبند کی طرف جو نسبت دی ہے اسی کے ساتھ ساتھ آپ کو دارالعلوم دیوبند کے صدر مہتمم پاکستان کے شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کا بھی ذکر ان الفاظ میں کر کے منصف شعاری کا ثبوت دینا تھا اور یوں کہنا تھا کہ :۔

"حضرت مولانا حسین احمد صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کے برعکس حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند نے نظریۂ پاکستان اور مسلم لیگ کی وہ بھرپور حمایت کی کہ پاکستان کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی اور ان کی لیگ میں شرکت اور پاکستان کی حمایت

نے ہندوستان کے گوشے گوشے میں مسلمانوں کے اندر جوش بھر دیا اور شرعی حیثیت سے خصوصاً اور سیاسی حیثیت سے عموماً قائداعظم کی گاڑی جہاں رکتی نظر آتی تھی وہاں مولانا شبیر احمد صاحب نے اس کو آگے رواں دواں کیا۔“

میری اس جوابی تقریر سے پروفیسر صاحب مذکور پر خاصہ اثر پڑا اور انہوں نے میری بات کو تسلیم کر لیا لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ پاکستانی عوام و خواص میں یہ پروپیگنڈہ اثر کر چکا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کانگریس کا ہمنوا اور مسلم لیگ کا مخالف تھا۔

دارالعلوم دیوبند کا سیاسی مسلک

جیسا کہ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے فرمایا اور آپ نے گذشتہ سطور میں پڑھا ہے کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ میں نے دارالعلوم دیوبند میں حتی الامکان کانگریس کے اثر کو روکنے کی کوشش کی ہے اور یہ کوشش بھی کی ہے کہ دارالعلوم دیوبند اپنے مسلک سے ہٹنے نہ پائے اس سے واضح ہوتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا سیاسی مسلک کانگریس کی تائید ہرگز نہ تھا بلکہ یہ انفرادی رائے تھی جس کا اثر متاثرین میں نمودار ہوا۔

اس کے برعکس حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سرپرست دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب، حضرت مولانا رسول خان صاحب، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند، مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی مدرس دارالعلوم

دیوبند، مولانا محمد طاہر صاحب برادر خورد مولانا محمد طیب صاحب وغیرہم اور کتنے ہی ارکان مجلس شوریٰ مسلم لیگی تھے۔ اور حضرت تھانوی اور حضرت عثمانی سے عقیدت رکھنے والے سب ہی مسلم لیگ کا دم بھرتے تھے۔

حضرت مولانا محمد طیب صاحب چونکہ مہتمم تھے اس لئے انہوں نے اپنی کسی تحریر یا تقریر میں اپنے سیاسی افکار کا قطعاً اظہار نہیں فرمایا لیکن وہ خلیفۂ روحانی ہیں حضرت مولانا تھانوی کے اور مولانا تھانوی کا کوئی عقیدتمند، مرید اور خلیفہ کانگریسی نہیں ہوسکتا۔ مولانا محمد طیب صاحب ایک بے ضرر، سادہ طبع اور مسلمانوں کے حد سے زیادہ ہمدرد انسان ہیں۔ دوسری طرف ان کے کسی اشارے میں بھارت بں رہتے ہوئے وہاں کی حکومت کے خلاف کوئی بات نہیں نکلتی۔ نہایت عتدال پسند، استقامت پذیر اور سلیم الطبع شخصیت کے مالک ہیں جن کی نظیر ت مسلمہ کے موجودہ دور میں بعض حضرات کو مستثنیٰ کرتے ہوئے ملنی مشکل ہے۔ پاکستان میں جو حضرات علامہ شبیر احمد صاحبؒ عثمانی اور حضرت تھانویؒ ے عقیدت و محبت رکھتے ہیں ان کا مسلک آج بھی نظریۂ پاکستان کی ئید ہے۔

ضرت مولانا حسین احمد صاحب کا احترام

میں اس کتاب کا مصنف نظریۂ پاکستان کا زبردست حامی اور علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کے جان نثار شاگردوں اور عقیدتمندوں میں سے ہوتے ہوئے ، بخدا حضرت مولانا حسین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جلیل القدر عالم اور بم المرتبہ روحانی شخصیت خیال کرتا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کی شان ،گستاخی عاقبت کی خرابی کا موجب ہوسکتی ہے۔

⁂

مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا سیاسی تصور اور مسلم لیگ سے اختلاف

اگر غور سے دیکھا جائے تو ان کو لیگ سے اس لئے اختلاف تھا اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ لیگ میں کتنے ہی حضرات وہ ہیں جو گورنمنٹ برطانیہ کے خطابات یافتہ ہیں اور ان سے ہندوستان کی آزادی کے لئے جدوجہد کی توقع غلط ہے چنانچہ اپنے مکتوبات میں انہوں نے ان امور کی صراحت فرمائی ہے۔ لیکن مسلم لیگ اب وہ جماعت نہ تھی۔ اس کے امیر اب قائداعظم تھے جو بے لوث آدمی تھے۔ بہرحال مولانا انہی تصورات کے ماتحت لیگ کے موافق نہ تھے۔

دارالعلوم دیوبند کے خلاف پروپیگنڈہ اور علامہ عثمانی کا دفاع

ہم وہاں سے چلے تھے جس میں ان حالات کی وضاحت کی جارہی تھی کہ جب علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی نے دارالعلوم دیوبند کے وائس چانسلر کی حیثیت سے چارج لیا تو دارالعلوم کی فضا کیا تھی۔ مولانا مدنیؒ کے متعلق اخبارات میں جو مخالفانہ مضامین نکلتے تھے جن سے دارالعلوم دیوبند مسموم ہورہا تھا۔ عام خیال یہ تھا کہ کوئی عالم مسلم لیگ کے ساتھ نہیں ہے۔ اخبار "عصر جدید" کلکتہ کے ایڈیٹر نے مولانا عثمانی کے سیاسی افکار کے متعلق جب ایک خط کے ذریعہ معلومات چاہیں تو آپ نے اس کے ایڈیٹر کو حسب ذیل مکتوب لکھکر روانہ کیا جو عصر جدید میں شائع ہوا اور عصر جدید سے "طلوع اسلام" نے اپنی شعبان ۱۳۵۸ھ مطابق اکتوبر ۱۹۳۹ء کی اشاعت میں "عصر جدید" سے نقل کیا ہے۔ ہم نے یہ مکتوب طلوع اسلام کے مذکورہ پرچے سے اس نوٹ سمیت نقل کیا ہے جو طلوع اسلام نے اول میں لکھا ہے۔

واضح رہے کہ طلوع اسلام اس زمانے میں دہلی سے نکلتا تھا جس کے ایڈیٹر اس دور میں ظہیر الدین صاحب صدیقی تھے۔ مولانا عثمانی کا یہ خط ۳ رجب ۱۳۵۸ھ

کو لکھا ہوا ہے جبکہ آپ دار العلوم دیوبند کے صدر مہتمم تھے۔ مکتوب یہ ہے:۔

حق و صداقت کی راہ

اخبارات میں حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مدظلہ ناظم دار العلوم دیوبند و صدر المدرسین جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت کا ایک مکتوب گرامی شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے اس امر کی وضاحت فرمائی ہے کہ موجودہ سیاسی کشمکش میں مسلمانوں کے لئے صحیح راہ عمل کونسی ہے۔ ہم اس مکتوب کو جریدۂ عصر، عصر جدید (کلکتہ) کے شکریے کے ساتھ ذیل میں درج کرتے ہیں تاکہ وہ حضرات جو کہا کرتے ہیں کہ کوئی مقتدر عالم دین شرکت کانگریس کے مسلک کی مخالفت نہیں کرتا عوام کو دھوکے میں مبتلا نہ کر سکیں۔ (طلوع اسلام)

مولانا عثمانی صاحب کا مکتوب گرامی

مکرمی ایڈیٹر صاحب عصر جدید

بعد سلام مسنون آنکہ آپ نے شرکت کانگریس کے متعلق میرے خیالات دریافت کئے ہیں اس مسئلے کے متعلق میں اپنے خیالات کا اعلان پہلے بھی کر چکا ہوں اب پھر لکھتا ہوں کہ میں نہ کبھی کانگریس میں شامل ہوا اور نہ اب شامل ہوں بلکہ اس شمول پر میں نے کانگریسی علماء سے کئی دن تک بہت شد و مد سے بحث کی جس کا تذکرہ اخبارات میں آچکا ہے۔ قومیت متحدہ کا نظریہ جو کانگریس کے دستور اساسی کا بنیادی پتھر ہے اس معنی میں جو

کانگریس کے ائمہ اس سے ارادہ کرتے ہیں میرے نزدیک شرعی نقطہ نظر سے کبھی قابل تسلیم نہیں ہو سکتا۔

میں کوئی سیاسی آدمی نہیں ہوں نہ سیاسیات میں کوئی خاص اشتغال رکھتا ہوں تاہم اپنی قوم کے سود و بہبود کو سوچنا اس کا ایک جز ہونے کی حیثیت سے میرے لئے بھی ناگزیر ہے۔ جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ ہمارے لئے سب سے پہلے ایک اسلامی وحدت و مرکزیت پر زور دینے کی ضرورت ہے اس کے بدون کسی نام نہاد قومیت متحدہ کے تیز رو دھارے میں گھاس کے تنکوں کی طرح اپنے کو ڈال دینا خودکشی کے مرادف ہے۔

مسلمان دوسری قوموں سے صلح کر سکتے ہیں عہد و پیمان کر سکتے ہیں، بہت سے امور میں تعاون اور اشتراک عمل کر سکتے ہیں لیکن وہ اپنی ہستی کو دوسروں میں مدغم نہیں کر سکتے۔ میں اپنے لئے فرقہ پرست کا خطاب پسند کرتا ہوں مگر اپنی قوم کا غدار یا قوم فروش کہلانا کبھی قبول نہیں کر سکتا۔ شاعر حکیم اکبر مرحوم (الہ آبادی) نے خوب کہا ہے ؎

کامیابی خارج از ملت سے ناکامی بھلی
لطفِ دشمن ہی سے شہرت ہو تو گمنامی بھلی

بے وفا سمجھیں تمہیں اہل حرم اس سے بچو
دیر والے کج ادا کہہ دیں یہ بدنامی بھلی

پختہ ہو کر اپنی شاخ و بن سے ہوتا ہے جُدا
اے ثمر چشم محبت میں تری خامی بھلی

اس کے ساتھ میرا عقیدہ ہے کہ ہماری ناکامی و نامرادی کا اصل سبب شریعت کاملہ محمدیہ کے اصول و احکام سے اعراض و انحراف ہے

اور اسی کے نتیجے میں اس تخریب و تفریق کا عذاب ہم پر مسلط ہے جس کی طرف

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ	کہہ دیجئے کہ وہ اللہ اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ وہ تمہارے اوپر سے یا تمہارے نیچے سے تم پر عذاب بھیجدے یا تمہیں فرقہ فرقہ کردے اور بعض کو بعض سے تکلیف پہنچائے۔

میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ اس لئے میرا سب سے بڑا مطمح نظر یہ ہے کہ جہانتک استطاعت میں ہو مسلمانوں کو اتباع شریعت و تمسک اسوۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ کیا جائے نیز ان کی پارٹی بندیوں کو اگر بالکلیہ ختم نہ کیا جا سکے تو ان کو کم کرنے اور ایک کو دوسرے کے قریب لانے اور خلاف و شقاق کے مضار کو محدود کردینے کی سعی جاری رہے۔ رہا دارالعلوم دیوبند کا معاملہ جیسا کہ پہلے بھی بار بار اعلان کیا جا چکا ہے وہ مسلمانان ہند کی ایک محبوب اور مشترک متاع ہے سیاسی پارٹی بندیوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں یہی وہ مسلک ہے جو میرے زمانے میں مجلس عاملہ دارالعلوم نے بالاتفاق طے کیا ہے اور دارالعلوم کے تمام ملازمین و مدرسین کو سختی کے ساتھ اس کا پابند کیا جو خبریں اس کے خلاف شائع کی جا رہی ہیں بعض بالکل بے اصل اور بعض سخت مبالغہ آمیز ہیں۔

راقم شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ

از ڈابھیل ضلع سورت

۱۳ ر رجب ۱۳۵۸ھ (مطابق ستمبر ۱۹۳۹ء)

اس مکتوب سے صاف واضح ہوتا ہے کہ علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی
ے زمانے میں جبکہ وہ صدر مہتمم تھے اور یہ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۳ء تک کا زمانہ
ے علامہ عثمانی نے کانگریسی پالیسی کو دارالعلوم سے قطعاً دور رکھا اور یہی
سلک دارالعلوم کی مجلس عاملہ کا طے پایا۔ چنانچہ بقول مولانا عثمانی تمام
لازمین و مدرسین کو کانگریسی فضا سے دور رکھنے کی سختی سے کوشش کی گئی۔

علامہ عثمانی کے مذکورہ بالا مکتوب کو طلوع اسلام نے شائع کرنے کے بعد مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی کانگریس میں شرکت کے بارے میں درانحالیکہ وہ دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس تھے دریافت کیا۔ اس سوال کے جواب میں علامہ عثمانی نے طلوع اسلام کے مدیر کو جو مکتوب ارسال فرمایا وہ آپ کے سامنے آرہا ہے۔ یہ مکتوب علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی نے ۱۰ ر رمضان المبارک ۱۳۵۸ھ مطابق نومبر ۱۹۳۹ء کو دیوبند سے روانہ فرمایا جبکہ آپ ابھی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس اور دارالعلوم کے اعزازی صدر مہتمم تھے۔ ان دنوں علامہ رمضان المبارک کی تعطیل دیوبند میں گذار رہے تھے اور دارالعلوم دیوبند کے انتظامات میں مصروف تھے۔ بحیثیت صدر مہتمم مولانا عثمانی نے اپنی اور دارالعلوم دیوبند کی پوزیشن واضح کرنے کے لئے یہ مکتوب "طلوع اسلام" کے ایڈیٹر کو لکھا جو انہوں نے طلوع اسلام میں اکتوبر ۱۹۳۹ء مطابق شعبان ۱۳۵۸ھ ص ۳۸ پر شائع کیا۔

دار العلوم دیوبند اور مولانا حسین احمد صاحب

مکتوب علامہ عثمانی بنام مدیر طلوع اسلام

جناب مکرم مدیر صاحب طلوعِ اسلام دامت مکارمہم

بعد سلام مسنون آنکہ شعبان المعظم (۱۳۵۸ھ) کے طلوع اسلام میں میرا ایک مکتوب عصر جدید (کلکتہ) سے نقل کرنے کے بعد حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کی شرکت کانگریس کی نسبت سوال کیا گیا ہے جو بالکل قدرتی طور پر کیا جانا چاہیئے تھا لیکن پہلے اس کا اعلان یہاں سے متعدد بار کیا جا چکا ہے کہ حضرت مولانا ممدوح کی ذات کی استثنا ان شروط کی بنا پر ہے جو اب سے تیرہ چودہ سال پہلے وہ اپنے تقرر کے وقت دار العلوم کے ارباب اقتدار سے طے کر چکے تھے۔ وہ زمانہ جناب مولانا حافظ محمد احمد صاحب اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے اہتمام اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب دامت برکاتہم کی سرپرستی کا تھا۔ پھر مہتممین مرحومین کی وفات کے بعد ان شروط کی تجدید مولانا محمد طیب صاحب کے عہد اہتمام میں ہوئی۔

حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب مرحوم کی صدارت تدریس سے علیحدگی کے بعد غالباً دار العلوم کے ارباب اہتمام کے نزدیک کوئی ہستی مولانا حسین احمد صاحب سے زیادہ اس عظیم الشان علمی مسند کو زینت دینے کے لئے موجود نہ تھی یا ہاتھ نہ آسکتی تھی اس لئے انہوں نے مولانا ممدوح کی ممتاز و کارآمد شخصیت اور ان کے کمالات و محاسن

کے مقابلے میں دارالعلوم کے عام معمول اور مسلمہ پالیسی سے قدرے اغماض برتنے کو جائز سمجھا۔ اور ایک کلی منفعت کی خاطر جزئی مضرت کی پرواہ نہیں کی۔ اس نظریہ کے ماتحت آج ان کا یہ استثنار قائم ہے۔

فی الحقیقت کسی خاص شخص کو خصوصی حالات کی بنا پر کس حد تک عام قواعد وضوابط سے مستثنیٰ کرنے یا نہ کرنے کا اختیار صرف مجلس اعلیٰ شورائیہ دارالعلوم کو حاصل ہے اور وہی اس سلسلے میں مخاطب بن سکتی ہے۔ (طلوع اسلام اکتوبر سنہ ۱۹۳۹ء ۶ شعبان سنہ ۱۳۵۸ھ ص ۳۸)

والسلام

شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ

از دیوبند سہارنپور

۱۰ رشعبان سنہ ۱۳۵۸ھ (مطابق اکتوبر سنہ ۱۹۳۹ء)

علامہ کا یہ تاریخی مکتوب نہایت محتاط انداز میں لکھا ہوا ہے۔ علامہ کو بتانا یہ مقصود ہے کہ سنہ ۱۳۴۶ھ مطابق سنہ ۱۹۲۸ء میں جب کہ حضرت مولانا سید محمد انور شاہؒ صاحب، حضرت مولانا شبیر احمدؒ صاحب، مفتی عزیز الرحمٰن صاحب اور دیگر اساتذہ دیوبند سے ڈابھیل چلے گئے تھے اور وہاں جامعہ اسلامیہ قائم کیا گیا تو مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی نے اپنی سیاسی مصلحت کی خاطر حضرت مولانا حسین احمد صاحبؒ مدنی کو دارالعلوم کی مسند درس حدیث پر بٹھا دیا تھا۔ اس وقت مولانا مدنی نے یہ شرط لگائی تھی کہ میں اس شرط پر یہ تقرر قبول کرتا ہوں کہ مجھے سیاسی امور میں مستثنیٰ رکھا جائے۔ چنانچہ اس وقت کی مجلس شوریٰ نے اس شرط کو

قبول کرلیا تھا۔ لہذا یہ استثنا اسی وقت سے چلا آرہا ہے۔ جس کی ذمہ داری اس وقت کی انتظامیہ پر عائد ہوتی ہے یا جوابدہی موجودہ مجلس منتظمہ اور ارکان مدرسہ پر لازم آتی ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ آپ کو واضح رہنا چاہیئے کہ حضرت مولانا مدنی رح دارالعلوم کی طرف سے کانگریس کی نمائندگی نہیں کر رہے تھے بلکہ جمعیۃ العلماء ہند دہلی کے صدر اور ممبر ہونے کی حیثیت سے کر رہے تھے۔

علامہ کا دیوبند میں مستقل قیام

خدا خیر کرے

ہم یہ مضمون لیکر چلے تھے کہ علامہ نے جب دار العلوم دیوبند کی صدارت اہتمام کا چارج لیا تھا تو اس وقت فضا کیا تھی۔ تاہم وہ حکمت عملی سے کام کر رہے تھے علامہ ابھی تک دونوں جگہ کام کر رہے تھے۔ مگر آپ کا ڈابھیل میں قیام اور دار العلوم کا دور بیٹھے انتظام دار العلوم کی مجلس شوریٰ کے کئی ممبروں کی نظروں میں کھٹکتا رہتا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ موصوف ڈابھیل کو خیر باد اور خدا حافظ کہکر دیوبند میں مستقل قیام فرمائیں۔ چنانچہ مجلس شوریٰ کے رکن مولینا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں :۔

"افسوس ہے کہ ڈابھیل کی صدر مدرسی کی وجہ سے دیوبند میں آپ کا بہت کم وقت گذرتا ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ کسی طرح ان کو دیوبند میں زیادہ رہنے پر مجبور کیا جائے۔" (الفرقان صفر ۱۳۵۸ھ ص ۳۵)

لیکن راقم الحروف کا خیال یہ ہے کہ وہ دور سے ہی دار العلوم کی خدمت کرتے اور ڈابھیل کے تعلق کو نہ چھوڑتے تو بہتر تھا۔ لیکن نوشتہ تقدیر کے سامنے آدمی مجبور ہو جاتا ہے۔ علامہ کو دار العلوم کی صدارت سنبھالے اب چھ سال ہو چکے تھے کہ ارباب حل و عقد کے اصرار پر ۱۳۶۱ھ میں آپ نے ڈابھیل سے رخت سفر باندھا اور اپنے وطن دیوبند میں مستقل قیام کا خیمہ گاڑا۔ استاذ محترم مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی نے جو ڈابھیل کے مدرسین میں سے تھے اور دیوبند چھوڑ کر ڈابھیل گئے تھے قیام پاکستان کے بعد اشرفیہ نیلا گنبد لاہور کے جلسے میں مجھ سے

فرمایا کہ ہم نے مولانا عثمانی کو دیوبند جانے سے منع کیا تھا لیکن حالات نے مجبور کر کے اسی طرح جس طرح حضرت امام حسین کو کربلا لا پہنچایا تھا انہیں دیوبند پہنچا دیا۔

انوار! بھلا حضرت عثمانی صرف مہتمم بن کر رہ جائیں جبکہ ساری عمر محققوں کی طرح تقریروں اور تحقیقوں میں عمر گذارنے کے عادی ہوں، ناممکن سی بات تھی۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ ان کو شیخ التفسیر بھی بنا دیا جاتا اور اس چشمہ فیض کا فیض طلبہ کو پہنچانے کے لئے درس تفسیر کی خدمت بھی ان کے سپرد کر دی جاتی تاکہ وہ بخارات نکلتے رہتے جو علم و فضل کے ان کے دل و دماغ میں اٹھتے رہتے تھے۔ آپ ہی سوچئے کہ ایک ماہر ڈاکٹر کو اگر کسی دفتر کا انسپکٹر بنا دیا جائے اور اس کی تمام طبی مہارتوں کو ڈبے میں بند کر کے رکھ دیا جائے تو آخر وہ مہارتیں ڈبے ہی کو توڑ پھوڑ کر باہر نکل پڑیں گی۔ اسی طرح حضرت علامہ عثمانی جیسے گویا اور مقرر و معلم کو صدر مہتمم بنا کر صرف یہ لکھنے کے لئے کہ فلاں لڑکے کا وظیفہ جاری کر دیا جائے۔ فلاں ملازم کو ترقی دیدی جائے، ابنائے قدیم کی سوسائٹی قائم کر دی جائے غیر فطری چیز تھی۔ دارالعلوم میں رہتے ہوئے ایسے محقق کے چشمہ فیض سے فیضیاب نہ ہونا طلبہ کی سب سے بڑی بدقسمتی تھی۔ چنانچہ پیاسوں کو پیاس بجھانے کے لئے چشمہ شیریں کے پاس جانا ہی پڑتا ہے بقول شیخ سعدی ؎

ہر کجا چشمۂ بود شیریں ٭ ملخ و مرغ و مور گرد آیند
کس نہ بیند کہ تشنگاں حجاز ٭ بلب آب شور گرد آیند

آخر عثمانی جیسے علامہ میں کوئی بات ہی تو تھی جن کے فیض سے ہر شخص اکتساب کرنا چاہتا تھا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی اپنے مضمون "احاطۂ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن" میں لکھتے ہیں :۔

"یوں استاذ ہونے کی حیثیت سے دارالعلوم کے ان سارے اساتذہ کے ساتھ تلمذ کی نسبت اس فقیر کو حاصل ہے۔ لیکن سچی بات یہی ہے کہ حضرت کشمیری (مولانا محمد انور شاہ صاحب) مولانا (محمود حسن صاحب) شیخ الہند اور مولانا شبیر احمد نور اللہ قبورہم سے تمتع کے جو مواقع میسر آئے دوسرے اساتذہ کے متعلق دعویٰ نہیں کر سکتا۔" (رسالہ دارالعلوم دیوبند رمضان ۱۳۷۲ھ ص ۴۵)

دارالعلوم میں درس قرآن

اسی لئے علم کے پیاسے طلبہ صدارت اہتمام کے زمانے میں اس علم کے سمندر کے پاس پہنچے اور حضرت عثمانی سے درس قرآن کے لئے اصرار ہی نہیں بے حد اصرار کیا۔ ان طلبہ میں مولوی فضل منان پشاوری، مولوی ضیاء الحسن لدھیانوی وغیرہ پیش پیش تھے طلبہ کے بے حد اصرار پر علامہ نے اوپر کے دارالحدیث میں درس قرآن شروع فرمایا۔ یہ ۱۳۶۱ھ ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ درس میں شریک ہونے والوں اور آنکھوں سے دیکھنے والوں میں سے دارالعلوم دیوبند کے ایک ثقہ راوی مولانا سید محبوب رضوی مصنف تاریخ دیوبند کا مجھ سے بیان ہے کہ:۔

"درس کی اس قدر مقبولیت ہوئی کہ تمام دارالحدیث اور دارالحدیث کی گیلریاں کھچا کھچ بھر جاتی تھیں۔ نہ صرف تمام طلبہ بلکہ شہر کے آدمی بھی اس میں ذوق و شوق سے حصہ لیتے تھے۔"

علامہ عثمانی کے نام ایک گمنام خط

درس کی مقبولیت کا یہ عالم دیکھ کر کسی شخص نے ایک گمنام چٹھی علامہ عثمانی کو لکھی کہ آپ نے قرآن کریم کا یہ درس کسی خاص مقصد کے لئے جاری کیا ہے مزید وضاحت کے ساتھ بالفاظ دیگر اس طرح کہا جائے کہ آپ اپنا علمی رنگ چڑھانے کے لئے اور دوسروں کا رنگ پھیکا کرنے کے لئے یہ کچھ کر رہے ہیں۔ اور واضح الفاظ میں

خط کا مضمون یہ تھا کہ آپ مولانا مدنی کی قدر و منزلت گھٹانے کے لئے ایسا کر رہے ہیں۔

یہ گمنام خط کسی سطحی خیال اور معمولی ذہنیت کے انسان کا خط ہو سکتا ہے اور یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اس میں کسی بلند شخصیت کو دور کا بھی واسطہ نہیں ہو سکتا مگر کیا کہئے کہ غلط قسم کے لوگ اس قسم کا کردار پیش کرنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں۔ یہی صاحبان کبھی یوں بھی اڑا دیتے کہ مولانا مدنی پھر ہجرت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں جس پر لوگوں کے استفساری خطوط حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے پاس آتے۔

بہر حال حضرت عثمانی کا درس جاری کرنا ان کے لئے نظر بد کا سامان فراہم کرنے کا سبب بن گیا۔ اگلے درس میں علامہ نے اس گمنام خط کے مضمون کا راز شرکائے درس پر فاش کر دیا۔ اس خط سے آپ کے دل پر چوٹ لگی۔ وجہ صاف تھی کہ سب جانتے ہیں کہ طلبہ کے اصرار پر آپ نے ایسا کیا تھا اور اصل حقیقت کے خلاف اب کہا یہ جا رہا ہے کہ اپنا علمی رنگ دوسروں پر جمانا مقصود ہے۔ یہ خط، لکھنے والے کی غیر معمولی تنگ نظری کا مرقع تھا۔ حضرت عثمانی نے مجلس درس میں ذرا تیکھے انداز میں اس خط پر اظہار خیال فرمایا۔ بس یہیں سے معاملہ بڑھتا ہے اور اختلاف کی ہلکی سیاہ بدلی فضائے دارالعلوم پر منڈلانے لگتی ہے۔ اندر ہی اندر نیچے کے بعض لوگوں میں حضرت عثمانی کے خلاف، مخالفت کا دھواں سلگنا شروع ہوتا ہے اور طرح طرح کی چہ میگوئیاں، سرگوشیاں اور الجھنیں اندر ہی اندر جنم لینا شروع کر دیتی ہیں۔

حضرت مولانا حسین احمدؒ صاحب کی گرفتاری
۱۳۶۱ھ ۱۹۴۲ء
۱۰ رجمادی الاخریٰ ۲۴ رجون

حضرت مولانا حسین احمدؒ صاحب نے ہندوستان کی سیاسیات میں مالٹا کی اسیری سے رہائی کے بعد خلافت، جمعیۃ العلماء اور کانگریس کے ذریعہ برابر حصہ لیا اور آپ مختلف اوقات میں سیاسی

سرگرمیوں کے باعث قید فرنگ میں بھی رہے جس میں آپ نے اپنے مجاہدانہ صبر اور استقلال سے مصائب اور مشکلات کا مقابلہ کیا۔ ایسا ہی ایک وقت آپ پر آیا آیا جبکہ ۱۹۴۲ء میں اہل ہند کی سیاسی سرگرمیاں انتہا کو پہنچ گئی تھیں۔ ستیہ گرہ کا دور تھا اور لوگوں نے ریلوے لائنیں تک اکھاڑ ڈالی تھیں اور جوش آزادی شباب پر پہنچ رہا تھا گویا سول نافرمانی کا سال تھا۔ آپ کو ۲۴ جون ۱۹۴۲ء کی شب جبکہ آپ پنجاب کی ایک اتحاد کانفرنس میں شرکت کے لئے تشریف لے جا رہے تھے، سہارنپور اور دیوبند کے درمیان ٹپری ضلع سہارنپور کے سٹیشن پر گرفتار کر لیا گیا۔ اس گرفتاری کی وجہ علمائے حق کے مصنف مولانا محمد میاں صاحب لکھتے ہیں:

"جمعیۃ العلما ضلع مراد آباد نے ۲۳، ۲۴، ۲۵ ؍ ۱۹۴۲ء کو قصبہ بچھراؤں میں اپنی کانفرنس منعقد کی اور شیخ الاسلام مدظلہ العالی سے شرکت کانفرنس کی منظوری حاصل کر لی۔ حکومت نے اس موقع کو بہت غنیمت سمجھا اور حضرت موصوف کی تقریر کے نوٹ حاصل کرنے کے لئے خاص انتظام کیا گیا۔ نوٹ حاصل کرنے کے بعد مقدمہ درج کیا گیا اور وارنٹ جاری کر دیا گیا۔" (علمائے حق جلد دوم صفحہ ۲۲۸)

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا مدنیؒ کو آپ کی بچھراؤں والی تقریر پر گرفتار کیا گیا۔ "کرپس مشن" نے حکومت برطانیہ کا جو منصوبۂ آزادی اہل ہند کے سامنے پیش کیا تھا وہ ناکام ہو چکا تھا۔ اب حکومت یہ چاہتی تھی کہ آئندہ ستیہ گرہ کی تحریک کو قوت سے دبا دیا جائے اور یہ کہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب کو گرفتار کر لیا جائے تاکہ اس تحریک کو صرف ہندوؤں کی تحریک سمجھا جائے۔ مولانا محمد میاں صاحب لکھتے ہیں :-

"حضرت شیخ الاسلام مدظلہ العالی کی گرفتاری کم از کم مسلم حلقے میں

تحریک کے دائرے کو وسیع کر دیتی اور حکومت کی اس پالیسی پر زیادہ اثر انداز ہوتی کہ مسلمان تحریک سے علیحدہ رہیں تاکہ وہ کانگریس کی تحریک کو صرف ہندوؤں کی تحریک کہکر مقصد تحریک کو زیادہ سے زیادہ ناکام کر سکے۔"

(علمائے حق جلد دوم صفہ ۲۲۸)

مولانا محمد میاں صاحب کی مذکورہ اول الذکر اور آخر الذکر دونوں ہی صفحے کی متصل عبارتیں بتاتی ہیں کہ حضرت مولانا مدنیؒ کی گرفتاری خالص ملکی سیاست سے متعلق تھی اور بس ۔ الحاصل جب مولانا مدنی گرفتار کر لئے گئے تو حضرت کے حلقۂ تعلق اور بالخصوص دارالعلوم دیوبند میں خاص جوش پیدا ہو جانا معمولی بات تھی چنانچہ ایسا ہی ہوا ۔

دارالعلوم میں گرفتاری کا ردعمل اور علامہ عثمانی کی تقریر

مولانا مدنی کی گرفتاری پر کیا ردعمل ہوا اس کی وضاحت دیوبند کے رسالۂ دارالعلوم ماہ جمادی الاُخریٰ ۱۳۶۱ھ مطابق جون ۱۹۴۲ء میں مطالعہ کیجئے :

"۱۰ رجمادی الاخریٰ ۱۳۶۱ھ (۲۴ رجون ۱۹۴۲ء) مولانا مدنی کی گرفتاری بروز پنجشنبہ تقریباً آٹھ بجے صبح ٹیری کے سٹیشن پر ہوئی جس سے دارالعلوم میں ایک ہیجان برپا ہو گیا ۔

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی صدر مہتمم دارالعلوم نے دارالشوریٰ میں اساتذہ کو جمع فرما کر صورتِ حال کے متعلق مشورہ کیا ۔ طے پایا کہ دہلی سے دارالعلوم کی مجلس اعلیٰ کے ارکان مفتی کفایت اللہ مولانا حفظ الرحمٰن اور شیخ رشید احمد کو بذریعہ برقیہ دیوبند پہنچنے کی دعوت دی جائے ۔ اور سہارنپور سے حافظ محمد یوسف انصاری کو بلایا جائے ۔ اور حضرت شیخ کی اسارت سے پیدا شدہ حالات کے ضروری پہلوؤں پر ان حضرات

کے مشورے کے مطابق کوئی قدم اٹھایا جائے ۔

دارالعلوم میں جلسہ علامہ عثمانی کی صدارت

بعد نماز ظہر اساتذہ، طلبہ اور کارکنان دارالعلوم کا ایک مشترکہ جلسہ زیر صدارت حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی مدظلہ صدر دارالعلوم منعقد ہوا۔ تلاوت قرآن مجید کے بعد حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ نے جو اس وقت تشریف لا چکے تھے حضرت شیخ گرفتاری پر اپنے مخصوص عالمانہ انداز میں ایک پُر مغز تقریر فرمائی۔ اور حکومت کے اس اقدام کو غیر دانشمندانہ قرار دیا۔ اس کے بعد صدر جلسہ حضرت صدر مہتمم صاحب مدظلہ نے اپنی پرجوش تقریر میں فرمایا کہ اگر حکومت مولانا مدنی کو گرفتار کر کے دارالعلوم دیوبند و جماعت دیوبند کو چیلنج کرنا چاہتی ہے تو میں پوری جماعت کی طرف سے اس چیلنج کو قبول کرنے کے لئے تیار ہوں"

(رسالہ دارالعلوم رجب ۱۳۶۱ھ)

علامہ عثمانی کی مذکورہ بالا تقریر سے مولانا مدنی کے ساتھ ان کی ہمدردی اور تعلق کا صاف پتہ چلتا ہے۔ طلبۂ دارالعلوم نے بھی مولانا کی قید پر مظاہرے کئے مگر بے سود ثابت ہوئے۔ آپ پر مقدمہ چلایا گیا جس کے فیصلے میں آپ کو اٹھارہ ماہ کی قید بامشقت اور پانسو روپیہ جرمانہ کی سزا دی گئی۔ سزا کے خلاف دفاع کمیٹی نے اپیل دائر کی ۔ ۲۹ جولائی کو مسٹر آصف علی مراد آباد پہنچے اور چار گھنٹے مولانا مدنی کی وکالت میں بحث کی۔ جج نے ۱۳ اگست فیصلے کی تاریخ مقرر کی مگر

سول نافرمانی اور اسٹرائک وغیرہ ۸ اگست ۱۹۴۲ء

۸ اگست کو عام تحریک شروع ہو گئی۔ حکومت نے دوسرے لیڈروں کو بھی قید کرنا شروع کر دیا۔ جس کے نتیجے میں عام ہیجان پھیل گیا۔ بازار بند

ہوئے ۔ ہڑتالیں ہوئیں ، طلبہ نے کالجوں اور سکولوں میں اسٹرائک کر دی جلوس اور جلسے ملک میں گرمجوشی پھیلانے میں موثر ثابت ہوئے ۔ پُل توڑے گئے ، تار کاٹے گئے ، ریلوے لائن کئی جگہ سے اکھاڑ دی گئی ۔ حکومت کی طرف سے فائرنگ ہوئی ۔ ان حالات میں مولانا مدنی کو حکومت کیا چھوڑتی ۔

طلبہ دارالعلوم میں خلفشار

حضرت مولانا مدنی کی گرفتاری پر طلبہ میں بھی ہیجان فطری بات تھی انہوں نے اس سلسلے میں مظاہرے کئے ۔ پھر ہندوستان کی عام فضا ۸ ر اگست سنہ ۴۲ء سے خراب ہو جانے کے باعث طلبۂ دارالعلوم کو ہلڑ مچانے کا اور بھی موقع مل گیا ۔ یہ ۱۹۴۲ء کی تحریک کا زمانہ تھا جس میں کیا کچھ نہ ہوا ۔ مولانا محمد میاں لکھتے ہیں :۔

" ریلوں کی پٹریاں اکھاڑ دی گئیں ، تار کاٹ دئے گئے ، سرکاری عمارتوں کو نقصان پہنچایا گیا ۔ جگہ جگہ پنچایتی حکومتیں قائم کر لی گئیں اور گورنمنٹ کے ملازمین کو سبکدوش کر دیا گیا ۔ بعض بعض موقعوں پر پولیس کو بھی کافی نقصان پہنچا ۔ ۱۱ ر اگست کو دہلی میں تار کاٹ دئے گئے ۔ بیلی کوٹھی جس میں ریلوے کا پچاس سالہ ریکارڈ تھا جلا کر خاکستر کر دیا گیا ۔ ٹاؤن ہال کو بھی آگ لگانے کی کوشش کی گئی "

(علمائے حق جلد دوم صفحہ ۱۸۸)

حضرت مولانا مدنی کی گرفتاری کے بعد دارالعلوم دیوبند کے طلبہ مولانا سے مراد آباد جیل میں ملنے گئے ۔ اور مولانا مدنی کو دیکھ کر رونے لگے ۔ اس پر ناخوش ہو کر مولانا مدنی نے کچھ ایسے الفاظ فرمائے جس سے یہ طلبہ یہ سمجھے کہ حضرت کا منشا یہ ہے کہ طلبہ جیل جائیں ۔ حالانکہ مولانا کا یہ منشا نہ تھا ۔ بہر حال طلبہ نے جو کچھ کیا اس کا اندازہ استاذ محترم مولانا محمد طیب صاحب کے حسب ذیل مطبوعہ اعلان

سے واضح ہوتا ہے جو انہوں نے ۵ رشعبان ۱۳۶۱ھ کو شائع کیا۔ لکھتے ہیں :۔

"گذشتہ دو ماہ کے عرصے میں جس طرح کی غیر ذمہ دارانہ اور ناروا حرکات عامۂ طلبہ سے صادر ہوئیں (ان میں) اب حال میں جو مطالبہ اسقاط امتحان کا پیش کیا گیا اور سال بھر کی محنت اور خرچ کے ضائع ہونے کی کوئی پرواہ نہیں کی گئی۔ (مطبوعہ اعلان کا آخری حصہ)

ایک اور جگہ اسی گذشتہ تاریخ کے اعلان میں مولانا محمد طیب صاحب لکھتے ہیں:

"دائرۂ اہتمام کی طرف سے ان (طلبہ) سے کہا گیا کہ ہم اس مسئلہ (اسقاط امتحان) پر غور کر رہے ہیں اور اس کا فیصلہ تیسرے دن ہو جائے گا لیکن آپ حضرات تا فیصلہ اس درمیانی مدت میں پورے امن و سکون سے رہیں اور کوئی غیر آئینی اقدام نہ کریں لیکن طلبہ باوجود وعدہ کر لینے کے اتنی دیر کے لئے بھی اس وعدہ پر قائم نہ رہ سکے۔"

حافظ محمد یوسف صاحب گنگوہی رکن مجلس شوریٰ دیوبند اپنے ایک مکتوب بنام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی میں جس کا حسب ذیل اقتباس ہمارے پاس موجود ہے۔ لکھتے ہیں :۔

"اب تک جس قدر حالات پیش آئے بعض ایسے ہیں کہ آپ بھی باخبر ہیں بعض ایسے ہیں کہ محض مجھے اطلاع ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ عرض کرنا مشکل ہے۔ یہاں تحصیل پر اینٹیں پھینکنا، دکانیں جبر یہ بند کرانا، لاٹھیاں لیکر جلوس نکالنا، پہنچا کہ الحمدللہ اینٹوں کی بالکلیہ تردید ہوگئی باقی امور باقی ہیں۔۔۔۔۔۔ یہ رپورٹیں حکومت کو بھیجدی گئیں سر تھانہ میں احکام پہنچ گئے کہ یکصد جوان دیوبند کے لئے تیار رہیں۔ گورنمنٹ میں ایک کمپنی اور دیگر سامان کی طلبی کی رپورٹ گئی۔۔۔ مگر اب معاملہ

سنگین تردد پیش ہے .... جیل جانے کے خیال سے طلبہ باہر یا دیوبند میں تقریریں کریں گے ، دارالعلوم میں گرفتاریاں ہوں گی اب آپ دیکھیں اس سے کیا صورت پیدا ہو جائے گی۔" (بیان علامہ عثمانی ۹ رجب ۱۳۶۲ھ)

طلبہ کا اخراج

حضرت مولانا محمد طیب صاحب اور حضرت حافظ محمد یوسف صاحب کے بیانات سے واضح ہے کہ دارالعلوم کے طلبہ کس درجے تک تجاوز کر چکے تھے۔ ان حالات میں مولانا محمد طیب صاحب مہتمم خلفشار مچانے والے طلبہ سے سخت برہم ہوئے اور برہم ہونے کی بات بھی تھی۔ علامہ عثمانی بھی ان کے موئد تھے۔ بہرحال ان طلبہ کے اخراج کے سلسلے میں دونوں ہمنوا تھے۔ علامہ عثمانی نے اپنے بیان مؤرخہ ۹ رجب ۱۳۶۲ھ میں حضرت مولانا محمد طیب صاحب کی دو صفحوں کی تحریر کا طلبہ کے اخراج سے متعلق حوالہ دیا ہے۔

بہرحال صدر مہتمم اور مہتمم دونوں طلبہ کی ان ہنگامہ آرائیوں سے جن کا ذکر حافظ محمد یوسف صاحب رکن مجلس شوریٰ نے کیا ہے سخت برہم تھے اور انہی وجوہات کی بناء پر اس قسم کے ہنگامہ خیز انسٹھ (۵۹) طلبہ کو مدرسے سے خارج کر دیا گیا۔ اس قدر نازک حالات کے باوجود مولانا نجم الدین اصلاحی مکتوبات شیخ الاسلام میں مکتوب نمبر ۲ کے حاشیہ پر لکھتے ہیں :-

"۱۹۴۲ء کے ہنگامے میں پولیس نے مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مرحوم سے شکایت کی کہ کچھ طلبہ تحریک میں حصہ لے رہے ہیں اس کے نتیجے میں دارالعلوم کے لئے خطرات کا بھیانک نقشہ پیش کر دیا۔ مولانا مرحوم بھولے بھالے آدمی تھے اس سے متاثر ہو گئے اور طلبہ کی ایک معتدبہ تعداد کو خارج کر دیا۔"

(مکتوبات جلد ۱ صفحہ ۵۶)

مولانا اصلاحی نے علامہ عثمانی کو جس رنگ میں بھولا بھالا کہا ہے اس پر دیدۂ دل

نقد پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔ دیکھئے حافظ محمد یوسف صاحب اور مولانا محمد طیب صاحب نے حالات کا کس قدر بھیانک نقشہ پیش کیا ہے اور الزام علامہ عثمانی پر لگایا جا رہا ہے کہ پولیس کے بہکائے میں آگئے۔ اب سنئے حافظ محمد یوسف صاحب اپنے مذکورہ بالا خط بنام مولانا شبیر احمد عثمانی میں جو انہوں نے علامہ کو ۱۱ر جولائی ۱۹۴۲ء کو سہارنپور سے لکھا ہے، لکھتے ہیں:-

"اللہ تعالیٰ نے یہاں کے کوتوال کے دل میں دارالعلوم کی محبت ڈالدی وہ بتائید بخاری صاحب (ڈپٹی کلکٹر) معاملات کو ٹال رہا ہے"

(بیان علامہ عثمانی ۹ رجب ۱۳۶۲ھ)

صدر مہتمم کا فیصلہ اور ردِ عمل:

جہاں تک طلبہ کے اخراج کا تعلق ہے ہمارے خیال میں مذکورہ بالا حالات میں صاحب صدر مہتمم نے انہیں مدرسے سے علیحدہ کر کے دارالعلوم کو نازک صورت حال سے بچا لیا۔ البتہ طلبہ کی طرف سے اخراج پر ردِ عمل منطقی اور نفسیاتی امر تھا۔ وہ مدرسے میں اپنے آپ کو واپس لانے میں تا بمقدور ایڑی اور چوٹی کا زور لگانے پر مجبور تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے زمین و آسمان ایک کر ڈالے۔ مجلس شوریٰ کے ممبروں تک رسائی کی چنانچہ اُس دور کی مجلس شوریٰ میں ان کے سیاسی موید کافی تھے۔ حضرت مولانا حسین احمدؒ صاحب نے بھی جیل سے سفارش کی کوشش فرمائی چنانچہ مولانا اپنے ایک مکتوب گرامی میں تحریر فرماتے ہیں:-

"مولانا بشیر احمد صاحب بھٹہ کو زور دار طریقے پر لکھئے کہ وہ دیوبند جا کر صدر صاحب (علامہ شبیر احمد عثمانی) کو اپنے سحر بھرے کلام سے موم بنائیں اور آمادہ کریں کہ وہ تمام مخرجین طلبہ کو بلا استثنا داخل فرمالیں اور اپنے احکام کو واپس لے لیں کیونکہ انہوں نے حافظ محمد یوسف اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب

سے وعدہ فرمایا تھا کہ میں کسی سے انتقام نہیں لوں گا اور نہ خارج کروں گا۔ اور طلبہ ان دونوں حضرات کے حکم کے پابند ہو گئے تھے اور اس وعدے کو ان دونوں حضرات نے مجمع عام میں بھی طلبہ کو سنا دیا تھا۔ بہر حال مولانا بشیر احمد صاحب فوراً جائیں اور صدر صاحب کا غصہ ٹھنڈا کریں۔ اگر ایسا نہ کیا تو مولانا بشیر احمد صاحب کے کمالات دو کوڑی کے رہ جائیں گے۔"

(مکتوبات شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب جلد اول صفحہ ۵۶)

ظاہر ہے کہ مولانا شبیر احمد صاحب پر چاروں طرف سے زور پڑا اور اس سلسلے میں حافظ محمد یوسف گنگوہی، جو حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کے نواسے ہوتے ہیں اور جو دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ممبر بھی تھے اور ان کے علاوہ حضرت مولانا مدنیؒ، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، مولانا بشیر احمد بھٹہ سب ہی خواہاں تھے کہ طلبہ کو دوبارہ داخل کر لیا جائے۔ چنانچہ علامہ عثمانی مجبور ہو گئے اور آپ نے ایک لڑکے کے سوا تمام کو دوبارہ داخل کرنے کے احکام جاری کر دئیے۔ اپنے ایک بیان میں علامہؒ لکھتے ہیں :۔

"میں نے صرف ایک طالب علم کو مستثنیٰ رکھ کر بقیہ سب کے داخلے کی اجازت دی۔" (بیان ۹ رجب ۱۳۶۲ھ ڈابھیل)

علامہ عثمانی کا صدارت اہتمام سے تنفر اور دارالعلوم دیوبند سے خود علیحدگی کے اسباب

علامہ ان حالات میں گھر کر صدارت اہتمام سے بددل سے ہو گئے اور اس پر طرہ یہ کہ آپ کے اختیارات صدارت بھی محدود کر دیے گئے۔ اس لئے آپ نے خود بخود دارالعلوم میں آنا جانا بند کر دیا۔

اپنے ۹ رجب ۱۳۶۲ھ کے بیان میں فرماتے ہیں :۔

" واقعہ یہ ہے کہ شوریٰ کے ریزولیوشن میں اولاً تو صدر مہتمم کے جملہ فرائض

اور اختیارات سلب کر لئے گئے ، یہ تو تعطل ہوا۔ آخر میں یہ لکھ دیا کہ "جس وقت مہتمم صاحب موجود نہوں اور کوئی فوری ضرورت تقرر و برخاستگی کی پیش آئے تو صدر مہتمم صاحب عمل میں لاکر جلسۂ انتظامیہ میں پیش کر دیں"۔ یہ ہے وہ اختیار جو صدر مہتمم کو دیا گیا۔ یعنی تعطل کے بعد اس کا تنزل اس طرح کیا گیا کہ اسے صدر مہتمم ہونے کے بجائے فوری معاملات میں نائب مہتمم بنا دیا گیا ہے"۔

اختیارات کو محدود کئے جانے کے باعث آپ نے صدارت اہتمام پر رہنے کو اپنی غیور طبیعت کے خلاف سمجھا چنانچہ گھر بیٹھ رہے۔ اب جو دارالعلوم کی طرف سے کاغذات آپ کی طرف بھیجے گئے اور صدر مہتمم کے عہدے سے خطاب کر کے بھیجے گئے تو آپ نے ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا جیسا کہ مجلس انتظامیہ دارالعلوم دیوبند منعقدہ ۱۸ر جمادی الاخری ۱۳۶۲ھ زیر صدارت حضرۃ الاستاذ مولانا اعزاز علی صاحب کی دفعہ نمبر ۴ سے واضح ہے :

۴۔ "چونکہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی بکرات و مرات اپنی مطبوعہ اور قلمی تحریروں میں اس کا اعلان فرما چکے ہیں کہ وہ دارالعلوم سے عملاً یکسو ہو چکے ہیں نیز اپنے والا نامہ بنام مہتمم صاحب دارالعلوم مورخہ ۹ جمادی الاولے ۱۳۶۲ھ میں ان کے ایک مکتوب کا جواب دیتے ہوئے یہ بھی تحریر فرما دیا ہے کہ:

"اس خط میں اگرچہ مجھ کو خطاب بحیثیت صدارت اہتمام کیا گیا ہے تو میں اس سے عملاً یکسو ہو چکا ہوں"۔

جس سے ممدوح کا منشا واضح ہے کہ آئندہ انہیں بسلسلۂ معاملات دارالعلوم بحیثیت صدارت اہتمام خطاب بھی نہ کیا جائے۔ اس لئے مجلس نے باتفاق رائے فیصلہ کیا کہ آئندہ کاغذات دارالعلوم اور مراسلات وغیرہ ان کی خدمت

میں نہ بھیجے جائیں تاکہ ان کے لئے مزید اکراہ کا باعث نہ ہو۔"

(رسالہ دارالعلوم رجب وشعبان ۶۲ھ ص۱)

اس تحریر سے واضح ہے کہ تحدید اختیارات کے بعد مدرسہ کے امور میں دخل دینا وہ اپنی بے عزتی سمجھتے تھے اور اس لئے وہ اپنے گھر بیٹھ رہے۔ ۱۷ ررجب ۶۲ھ کی مجلس شوریٰ بروز سہ شنبہ کی نشست زیر صدارت حکیم مولانا محمد اسحاق صاحب جاری ہوئی جس میں حسب ذیل اراکین مجلس شوریٰ نے شرکت کی اس سے بھی مولانا عثمانی کی خود علیحدگی پر روشنی پڑتی ہے۔

ارکان مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند

(۱) حکیم مولانا محمد اسحاق صاحب (۲) مولانا حکیم محمد یٰسین صاحب (۳) مولانا مشیت اللہ صاحب بجنوری (۴) مولانا محمد اشفاق صاحب رائے پوری (۵) مولانا محمد ابراہیم صاحب راندیری (۶) مولانا محمد اعزاز علی صاحب (۷) مولانا مناظر احسن گیلانی (۸) نواب عبدالباسط خانصاحب حیدرآباد دکن (۹) خان بہادر شیخ ضیاء الحق صاحب (۱۰) مولانا حافظ محمد یوسف صاحب (۱۱) مولانا محمد طیب صاحب مہتمم (۱۲) خان بہادر حاجی شیخ رشید احمد صاحب

مگر حضرت مولانا حسین احمد صاحب ان دنوں جیل میں تھے اور ان کی جگہ مولانا اعزاز علی صاحب تھے۔

رسالۂ دارالعلوم دیوبند ماہ رجب وشعبان ۱۳۶۲ھ میں کارروائی اس طرح درج ہے:

"۱۷ ررجب کو صبح سے دوسری نشست شروع ہوئی۔ حضرت مولانا مناظر احسن صاحب نے اعتراض فرمایا کہ چونکہ اس جلسے کا دعوت نامہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کو باوجود رکن مجلس ہونے کے نہیں بھیجا گیا اس لئے

یہ جلسہ غیر آئینی ہے اور اس کی تلافی کی صورت یہ ہے کہ ان کو اب دعوت نامہ بھیجدیا جائے ۔ اس اعتراض کے جواب میں مجلس انتظامیہ منعقدہ ۱۸ر جمادی الاخری ۱۳۶۲ھ کی تجویز پیش کی گئی کہ چونکہ حضرت مولانا عثمانی کے ایک والا نامہ منسلکہ سے واضح ہے کہ بحیثیت صدران سے خطاب نہ کیا جائے (اور ان کی رکنیت شوریٰ بحیثیت صدر مہتمم ہی ہے) اس لئے انہیں دعوت نامہ نہیں بھیجا گیا۔" (رسالہ دار العلوم رجب و شعبان ۱۳۶۲ھ صـ ۲-۳)

علامہ عثمانیؒ کی اس جوابی تحریر سے کہ بحیثیت صدر مہتمم ان سے خطاب نہ کیا جائے اس امر کی غمازی ہوتی ہے کہ وہ صدارت سے خود یکسو ہو کر دار العلوم سے دستکش ہو گئے اور آپ کی وجہ سے نواب عبد الباسط خان صاحب حیدر آباد دکن ممبر مجلس شوریٰ دیوبند اور حکیم مقصود علی خاں صاحب حیدر آباد دونوں نے استعفا دیدیا تھا لیکن مجلس شوریٰ نے منظور نہیں کیا تھا اس لئے اصرار کے بعد نواب صاحب نے اپنا استعفا واپس لے لیا۔

اسی مجلس شوریٰ میں خان بہادر حاجی رشید احمد صاحب کی تجویز اور خان بہادر شیخ ضیاء الحق صاحب کی ترمیم حسب ذیل پیش ہوئی :۔

"شخصیت اور مصلحت کے لحاظ سے ضروری ہے کہ مولانا شبیر احمد صاحب کا تعلق دار العلوم سے کسی مناسب طریقے پر باقی رکھا جائے جس کی صورت یہ ہے کہ رکنیت مجلس شوریٰ کی (حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک روز پہلے انتقال پُر ملال کے باعث) خالی شدہ اسامی پر بحیثیت رکن مجلس شوریٰ کے لے لئے جائیں۔" (دار العلوم رجب و شعبان ۱۳۶۲ھ صـ ۴)

لیکن اس تجویز کی حافظ محمد یوسف صاحب نے سخت مخالفت کی اور فرمایا :۔

" مولانا عثمانی نے دار العلوم اور مجلس شوریٰ کے خلاف اخبارات میں

لہ یہاں سے کتاب کی تالیف کا کام عرصے تک چھوڑے رکھنے کے بعد ۶ر نومبر ۱۹۶۳ء سے پھر شروع کیا گیا ہے۔ مؤلف

جو بیانات دئے ہیں وہ ممبران شوریٰ کے لئے باعث توہین اور دارالعلوم کے لئے موجب نقصان ہیں تاوقتیکہ مولانا ممدوح ان کی تلافی نہ فرمائیں اس رکنیت کی تجویز کا نفاذ نہ ہوگا" (رسالہ مذکور ص۴)

درحقیقت جب مولانا عثمانی نے مدرسے کی صدارت کو خیرباد کہدیا وہاں آنا جانا ترک کر دیا۔ ان کی عدم موجودگی میں مولانا مناظر احسن گیلانی، نواب عبدالباسط خاں صاحب، خان بہادر شیخ رشید احمد صاحب، خان بہادر ضیاء الحق صاحب اور حکیم مقصود علی خاں صاحب یہ سب حضرات علامہ عثمانی سے دارالعلوم کے تعلق کو باقی رکھنے کے خواہاں تھے اس لئے حافظ محمد یوسف صاحب کی مخالفت مولانا عثمانی کی مخالفت نہ تھی بلکہ مجلس شوریٰ کے ممبروں کی مخالفت تھی۔

علامہ کی عالی ظرفی

اسی مجلس شوریٰ کے جلسے میں گڑبڑ پیدا کرنے کے لئے بعض مقتدر حضرات نے مولانا عثمانی کو کہا کہ فلاں صاحب کے ذریعہ اس مجلس میں رخنہ اندازی کی جاسکتی ہے لیکن علامہ عثمانی نے نہایت تلخ لہجے میں اس خیال کو مذموم قرار دیا۔ البتہ اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لئے بعض اخبارات میں مولانا کے بیانات ضرور شائع ہوتے۔ اور بعض ذمہ داران دارالعلوم کی طرف سے بھی ان مضامین اور بیانات کے جوابات شائع ہوئے۔

کانگریس سے مولانا عثمانی کی نفرت دارالعلوم سے جدائی کا باعث بنی

ہماری گذشتہ تمام عبارتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ دارالعلوم کا مسلک کانگریسی نہ تھا لیکن ۱۹۴۲ء کی طلبۂ دارالعلوم کی ہنگامہ آرائی جس کا باعث مولانا مدنی کی گرفتاری اور اس وقت کی سیاسی فضا میں ان کا انہماک اور مولانا عثمانی کا طلبہ کے اس غلو سے بیزار رہنا اور بعض کا مدرسے سے خارج کرنا یہ وہ امور ہیں جو حضرت عثمانی کے دارالعلوم کی صدارت سے دستکش ہونے کا باعث بنے۔

اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے
شعبان ۱۳۶۲ھ میں دارالعلوم سے جدائی

یہ ہے علامہ عثمانی صدارت اہتمام دیوبند سے متعلق تاریخی خاکہ جس میں قدرت نے علامہ کو دارالعلوم کے لئے آخری سات سالہ خدمت کے لئے منتخب کیا تھا جس میں ان کو مجبور کر کے لایا گیا تھا اور پھر آخر حافظ محمد یوسف صاحب کی مخالفانہ سرگرمیوں سے آپ نے اپنی خوشی سے دارالعلوم کو چھوڑ دیا۔ ؏ اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے ۔ اور اگر ان کے لئے ماحول خوشگوار قائم رہنے دیا جاتا تو وہ دارالعلوم کی خدمت سے منہ نہ موڑتے۔ بہر حال شعبان ۱۳۶۲ھ کے بعد دارالعلوم دیوبند کی صدارت اہتمام سے یکسو ہو گئے۔

علامہ عثمانی کا انتظامی کردار

آخر میں علامہ موصوف کے حسنِ انتظام کے متعلق ہم آپ کو ایک بار پھر یہ بتا دیں کہ علامہ نے اپنے عہدِ صدارت میں جہاں ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کی تنظیم، مالی استحکام، تعلیمی اصلاحات، مدرسے میں سیاسی صورت حال کو برنگ اعتدال لانے کی کوششیں کیں وہاں دفتری کام کے جائزہ لینے اور ملازمین میں کام اور یومیہ کارگذاری سے اطلاعات حاصل کرنے کے سامان بھی پیدا کئے اور دارالعلوم دیوبند کا انتظام خوب چلایا۔ وھذا من فضل اللہ۔

پھر جامعہ ڈابھیل کی صدارت

ربیع الاول سنہ ۱۳۶۲ھ مطابق سنہ ۱۹۴۳ء

جیسا کہ مذکورہ بالا بیانات کی روشنی میں واضح کیا گیا کہ علامہ موصوف نے دارالعلوم کی صدارت سے ہاتھ کھینچ لیا تھا اور آپ سنہ ۱۳۶۱ھ کے سیشن کے بعد مدرسے میں تشریف نہیں لے گئے۔ سالنامہ رسالہ دارالعلوم سنہ ۱۳۶۱ھ دیوبند کے صفحہ (۳۱) پر حسب ذیل نوٹ ہماری نظر سے گذرا جو ہمارے لئے تحقیقی دستاویز ہے کہ مولانا عثمانی دارالعلوم سے دست کش ہو کر پھر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (سورت) کی صدارت تدریس پر تشریف لے گئے۔ یہ نوٹ جناب مہتمم مولانا محمد طیب صاحب کی طرف سے ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مدظلہ ڈابھیل سے تعلق قطع فرما کر دیوبند بسلسلۂ صدارت اہتمام مستقلاً مقیم ہو گئے تھے۔ معلوم ہوا ہے کہ اب مدرسہ اسلامیہ ڈابھیل سے حضرت ممدوح کا تعلق ملازمت پھر قائم ہو گیا ہے۔ چنانچہ مولانا موصوف ۲۲ ربیع الاول سنہ ۱۳۶۲ھ کو ڈابھیل روانہ ہو گئے ہیں۔"

ربیع الاول سنہ ۱۳۶۲ھ جنوری سنہ ۱۹۴۳ء سے شعبان سنہ ۱۳۶۳ھ مطابق سنہ ۱۹۴۴ء تک ڈابھیل میں؛

آپ وہاں بخاری شریف کی جو صدر مدرس کے ذمے ہوتی ہے تعلیم دیتے تھے۔ حضرت سید محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سنہ ۱۳۵۹ھ کے بعد آپ ہی وہاں کے شیخ الحدیث

تھے ۔ الغرض ۲۴ ربیع الاول ۱۳۶۲ھ مطابق جنوری ۱۹۴۴ء سے آپ کا سلسلۂ تدریس پھر ڈابھیل میں شروع ہوا اور پھر آپ شعبان ۱۳۶۲ھ کے سالانہ امتحان کے بعد ڈابھیل سے دیوبند تشریف لائے اور پھر شوال ۱۳۶۳ھ میں جامعہ کھلنے کے بعد تشریف لے گئے اور ۱۳۶۳ھ مطابق ۱۹۴۴ء کے پورے تعلیمی سال میں شوال سے شعبان ۱۳۶۳ھ تک پڑھاتے رہے ۔ چنانچہ ۶ رجب ۱۳۶۳ھ مطابق ۲۸ جون ۱۹۴۴ء کو مولانا عثمانی نے ایک مکتوب مولانا ازہر شاہ ابن استاذی الشیخ المحدث مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام لکھا ہے اور اس پر مذکورہ بالا تاریخ ثبت ہے ۔

علامہ کو وجع مفاصل کا مرض

عربی مدارس میں سال شوال سے شروع ہوتا ہے مگر ۴ ذی الحجہ ۱۳۶۳ھ کو علامہ دیوبند میں نظر آتے ہیں کہ آپ نے اس تاریخ کو ۱۹۴۴ء میں ایک خط دیوبند سے مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کو جو آپ کے شاگرد رشید و فاضل ہیں ڈابھیل تحریر فرمایا ہے ۔ جس سے آپ کا دیوبند میں قیام اور وہ بھی ذی الحجہ میں معلوم ہوتا ہے ۔ اس خط میں علامہ لکھتے ہیں :۔

> "آپ کا مفصل خط پہنچا جس سے تمام حالات معلوم ہوئے ۔ میرے گھٹنوں میں اب درد اور ورم تو نہیں مگر چلنے پھرنے کی معذوری بدستور ہے اب اطبا نے مسہل کی تجویز کی ہے اور اس کے لئے منضج پی رہا ہوں ۔"

معلوم ہوتا ہے کہ ڈابھیل سے شعبان ۱۳۶۳ھ میں واپس آکر یہ مرض لاحق ہوا اور آپ اس لئے واپس تشریف نہ لے جا سکے ۔ یہ مرض آپ کے لئے ڈابھیل جانے سے رد کے رہا ۔ تا آنکہ ۲۴ ربیع الاول ۱۳۶۴ھ مطابق ۱۱ مارچ ۱۹۴۵ء کو آپ مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کو ان کے خط کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"چند روز سے کچھ خطوط خود لکھنے لگا ہوں۔ آپ کا محبت نامہ آیا تھا جواب میں تاخیر ہوئی مسامحت فرمائیں۔ الحمد للہ مجھے نسبتاً افاقہ ہے۔ گھر میں کچھ چل پھر سکتا ہوں مگر قضائے حاجت وغیرہ احوال میں معذوری باقی ہے۔ نماز بیٹھ کر پڑھتا ہوں۔ وضو بھی خود کرنا مشکل ہے۔ بہر حال بالکلیہ شفا نہیں ہوئی۔"

اس مکتوب گرامی سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۴۵ء ۱۳۶۴ھ میں شروع سال سے ہی مولانا کو گٹھیا کے درد نے بہت ہی پریشان کر دیا تھا اور اب تک ایک سال کے عرصے میں یہ بیماری آپ کو لاحق رہی۔ پھر ۲۱ مئی ۱۹۴۵ء مطابق ۷ جمادی الاخریٰ ۱۳۶۴ھ کے ایک خط میں مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کو تحریر فرماتے ہیں:۔

"علالت کی وجہ سے سب کام معطل ہیں اور ہمت لکھنے پڑھنے کی نہیں ہوتی۔ اس ایک ماہ میں تین مرتبہ انگوٹھے کے درد اور ورم کا دورہ ہوا۔ ہنوز قدرے ورم اور دُکھن پاؤں میں باقی ہے۔ آٹھ ماہ سے علالت کا سلسلہ قائم ہے افاقہ ضرور ہو جاتا ہے مگر استیصال مرض نہیں ہوتا اور معذوری ایک نوع کی باقی ہے۔"

اس خط سے جو مئی ۱۹۴۵ء میں لکھا ہوا ہے بیماری کی طوالت کا حال معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی کہ آٹھ ماہ سے مسلسل بیماری چلی جارہی ہے جس کی ابتدا آٹھ ماہ پہلے وسط اکتوبر ۱۹۴۴ء مطابق ذیقعدہ ۱۳۶۳ھ سے ہوئی ہے۔

۶ ذی الحجہ ۱۳۶۴ھ مطابق نومبر ۱۹۴۵ء کو آپ نے اپنے شاگرد مولانا عبد اللہ صاحب مرحوم فاضل دیوبند خلیفۂ مجاز مولانا ابو سعد صاحب خانقاہِ سراجیہ کندیاں ضلع میانوالی کو مولوی عبد الخالق صاحب مدرس دار العلوم دیوبند کو بیعت کرنے کی جو سفارشی چٹھی دیوبند سے تحریر فرمائی ہے اس میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"الحمدللہ مجھے اب بہت کچھ صحت ہے۔ کچھ خفیف سابقہ مرض ہے۔
انشاء اللہ وہ بھی زائل ہو جائے گا۔"

اس خط سے اُسی آٹھ ماہ کے مسلسل مرض سے افاقے کا پتہ چلتا ہے۔ البتہ مرض میں ذرا خفت باقی ہے۔ غرض یہ ہے کہ یہ سارا سال آپ کا دیوبند میں صاحب فراش رہ کر گذرا۔

میر عثمان علی خان نظام حیدر آباد دکن کی
مولانا عثمانی کو
ملازمت پر لینے کی خواہش

علامہ عثمانی کا یہ سال یعنی ۱۹۴۵ء تقریباً سارا ہی گٹھیا کی تکلیف میں گذرا لیکن اکتوبر نومبر میں تقریباً آرام ہو گیا۔ مگر آپ کا قیام دیوبند ہی میں رہا۔ دوران مرض میں حضور نظام میر عثمان علی خان نے آپ کو جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کے شعبۂ اسلامیات کی صدارت کے لئے دعوت نامہ بھیجا۔ عرض کر چکا ہوں کہ نظام حیدر آباد علامہ شبیر احمد عثمانی کے علم و فضل، تقریر و خطابت سے بہت متاثر تھے اور ۱۹۲۷ء کے آخر یا ۱۹۲۸ء کے آغاز سے علامہ عثمانی کی حیدر آباد دکن میں آمد و رفت تھی۔ نظام صاحب نے اسی زمانے سے آپ کی تقریریں سُن کر عقیدت کا اظہار کیا تھا۔ اس وقت بھی ۱۹۲۸ء میں آپ کو شعبۂ اسلامیات کی صدارت پر لینا چاہتے تھے مگر آپ نے انکار کر دیا تھا۔ لیکن ۱۹۴۵ء میں حیدر آباد سے تعلق کا آپ نے ارادہ کر لیا تھا۔ مکالمۃ الصدرین میں حضرات علمائے جمعیۃ العلمائے ہند دہلی سے علامہ کی سیاسی گفتگو کے دوران حیدر آباد کے تعلق کے متعلق صورت حال یہ ہے۔ مرتب مکالمۃ الصدرین مولانا محمد طاہر مرحوم لکھتے ہیں:

"جب یہ حضرات (مولانا حسین احمد صاحب، مفتی کفایت اللہ صاحب وغیرہما) علامہ عثمانی سے رخصت ہونے لگے تو مولانا احمد سعید صاحب (ناظم جمعیۃ العلمائے ہند دہلی) نے دریافت فرمایا کہ حضور نظام نے حیدرآباد بھی تو بلایا تھا۔ آپ حیدرآباد کب تشریف لے جائیں گے۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ میں نے حضور نظام کو لکھا ہے کہ ابھی دو تین ماہ تک مجھے یہاں بغرض علاج قیام کرنا ہے۔ سردی کم ہونے پر اگر اجازت ہو تو حیدرآباد آؤں۔ اب حضور نظام پر موقوف ہے کہ اگر اس کے باوجود انہوں نے مجھے طلب فرمایا تو مجھ کو بہرحال جانا پڑے گا اور اگر اجازت دے دی تو ٹھہر جاؤں گا۔"

(مکالمۃ الصدرین ص ۴۷)

اس گفتگو کے بعد مرتب مکالمۃ الصدرین قوسین میں لکھتے ہیں :۔

("الحمد للہ اس تحریر کے مرتب کرتے وقت ہی حضور نظام کے چیف سیکریٹری کا تار بنام علامہ عثمانی پہنچ گیا کہ آپ کو فروری تک قیام کی اجازت ہے۔ مرتب) (ص ۴۷ مکالمۃ الصدرین)

یہ عبارتیں واضح کرتی ہیں کہ نظام حیدرآباد دکن کے یہاں آپ کا تقرر ہو چکا تھا۔ لیکن کیا آپ فروری کے بعد حیدرآباد تشریف لے گئے یا نہیں کسی تحریری بیان سے آپ کا حیدرآباد جانا ثابت نہیں ہوتا بلکہ آپ کو ملکی سیاسیات اور مسلم لیگ میں شرکت کے باعث مصروفیات نے کسی بھی کام کرنے کا دم نہ لینے دیا۔

راقم الحروف کا دیوبند میں ورود اور علامہ شبیر احمد عثمانی سے ملاقات

اوپر کی سطروں میں واضح کیا گیا ہے کہ علامہ ۱۹۴۵ء کے پورے سال یعنی ۱۳۶۴ھ کے پورے سیشن (تعلیمی سال از شوال تا شعبان) دیوبند قیام پذیر رہے اور علاج میں مشغول رہے۔ اکتوبر ۱۹۴۵ء کے بعد

نومبر ۱۹۴۵ء تک بالکل صحتیاب ہو گئے تھے چنانچہ بندہ اس وقت کپورتھلے کے کالج میں بحیثیت پروفیسر مقیم تھا اور دسمبر ۱۹۴۵ء کی ۲۳ر تاریخ کو کرسمس کی تعطیل میں شیرکوٹ ضلع بجنور اپنے وطن جاتے ہوئے دیوبند پہنچا۔ ۲۴ر دسمبر کو صبح کے ۹ بجے علامہ عثمانی سے ملا۔ آپ اُس وقت اپنے نئے مکان میں تشریف فرما تھے اور بالاخانے پر اپنے کتب خانے میں بیٹھے تھے۔ بڑے تپاک سے مجھے خوش آمدید کہا۔ مزاج پرسی کے بعد کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں اور بعد ازاں ڈاک آگئی۔ بہت سے خطوط تھے بعض خطوط کے مضامین پڑھ کر بھی سُنائے۔ ایک خط مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے طلبہ کا بھی تھا جس میں تحریر تھا کہ اگر مسلم لیگ میں آپ کی شرکت کے باعث مخالفین سے آپ کو خطرہ ہو تو ہم آپ کے دولت خانے پر حاضر ہو کر آپ کے پسینے کی جگہ اپنا خون بہانے کے لئے تیار ہیں۔ علامہ مرحوم خطوط کے مضامین پڑھ کر سناتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ مولانا محمد طاہر صاحب کا مرتب کردہ "مکالمۃ الصدرین" کا مضمون آپ نے ملاحظہ فرمایا اور جہاں کہیں ترمیم کی ضرورت پڑی اس میں آپ نے میرے سامنے ترمیم فرمائی۔

★ اس کی حقیقت جاننے کیلئے حضرت مدنی رحمہ اللہ کا مرتب کردہ کتابچہ "کشف حقیقت" خود مطالعہ کیا جائے۔

مسلم لیگ اور نظریۂ پاکستان کا حامی

تعمیر پاکستان کا معمار ثانی

شیخ الاسلام

علامہ شبیر احمد عثمانی سابق صدر مہتمم و شیخ التفسیر والحدیث

دار العلوم دیوبند

مسلم لیگ میں شرکت

سیاسیات عثمانی کا چوتھا دور

ہم علامہ کی زندگی کے واقعات کو ترتیب وار بیان کر رہے ہیں۔ ہم ان کی بیماری کا تذکرہ کر رہے تھے لیکن اب علامہ موصوف اکتوبر اور نومبر ۱۹۴۵ء تک صحتیاب ہو چکے ہیں۔ باہر آنے جانے سے سر دست احتیاط فرماتے ہیں۔ لیکن یہ دور کانگریس اور مسلم لیگ کی کشمکش کا وہ سخت دور ہے جس میں ان دونوں سیاسی جماعتوں کا اختلاف نقطۂ عروج پر پہنچا ہوا ہے۔ مسلم لیگ خالص مسلمانوں کی جماعت ہے اور اس میں کوئی ہندو یا سکھ نام کو بھی شامل نہیں ہے۔ کیونکہ یہ جماعت صرف مسلمانوں کے حقوق کی نگراں ہے اور پاکستان ان کا مطالبہ ہے۔

اس کے برعکس کانگریس میں ہندو اور سکھ تمام کے تمام اور کتنے ہی مسلمانوں کے لیڈر اور کچھ عوام بھی شامل ہیں۔ احرار، خاکسار، اسلامی جماعت جس کے لیڈر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ہیں، صوبہ سرحد کے سُرخپوش جن کی قیادت خان عبد الغفار سرحدی گاندھی کے ہاتھ میں ہے اور جمعیۃ العلماء ہند اور ان کے متبعین، نظریۂ پاکستان کے مخالف تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نہ صرف کانگریس میں شریک تھے بلکہ کانگریس کے صدر بھی تھے اور ان ہی حضرات کے معتقد مسلمان کانگریس میں شامل تھے

مُسلم لیگ مسلم لیگ جس کے قائد اعظم محمد علی جناح ہیں جو مسلمانوں کی پچانوے فیصدی اکثریت کے لیڈر ہیں اور ہندوؤں اور ان کے لیڈروں

کی ہندو پرستا ذہنیت کا خوب اندازہ لگا چکے ہیں اور ایک عرصے تک کانگریس میں سفیر صلح رہ کر ان کو خوب آزما چکے ہیں وہ مسلمانوں کو ہندوؤں کی دسیسہ کاریوں سے چھٹکارا دلانے کے لئے اپنی قوم کو بیدار کر رہے ہیں اور بیدار کر چکے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں کو ہندوؤں کی اکثریت سے نہ نکالا گیا تو مسلمان ہمیشہ کے لئے ہندوؤں کی غلامی سے نجات حاصل نہیں کر سکیں گے۔ اور پھر مسلمانوں کی نکبت اور بدبختی کی کوئی انتہا نہ رہے گی۔

بات بھی حقیقت میں یہی تھی۔ کہ اس وقت مسلمانوں کے لئے پاکستان کے مطالبے کے سوا چارہ نہ تھا۔ کیونکہ مسلمان ہر حیثیت سے ہندوؤں سے ایک جداگانہ قوم ہے۔ چونکہ مسلمانوں کا مذہب، ان کی تہذیب اور ان کی ثقافت جدا ہے لہذا مسلمانوں کے لئے علیحدہ ملک کی طلب اور ضرورت ہے۔ جس میں وہ اپنے مذہب اور تہذیب کے تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں اور جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے ان کو ملا کر پاکستان بنا دیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۴۰ء کے سالانہ آل انڈیا مسلم لیگ کے جلسے میں جو لاہور میں منعقد ہوا یہ ریزولیوشن پاس ہوا۔ اور اس ریزولیوشن کی یاد میں مینارۂ پاکستان اقبال پارک لاہور میں شاہی مسجد کے بائیں جانب میدان میں بنایا گیا۔

کانگریس اپنے آپ کو تمام ہندوستان کے لوگوں کی نمائندہ جماعت سمجھتی تھی۔ لیکن قائداعظم کی قیادت میں مسلم لیگ نے یہ ثابت کر کے دکھا دیا کہ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت کانگریس نہیں بلکہ مسلم لیگ اور اس کے قائد محمد علی جناح ہیں جس کا فیصلہ شملہ کانفرنس اور ہندوستان کے انتخابات نے کر دیا۔

علامہ عثمانی اس پُرآشوب دور میں خاموش کیسے رہ سکتے تھے۔ وہ صحتیاب ہو کر میدان میں نکلے اور انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت کا اعلان فرمایا۔ اگرچہ گذشتہ

گذشتہ خطوط میں وہ تجویز پاکستان سے پہلے مسلم لیگ کی طرف مائل تھے۔

یوں تو علامہ کی سیاسی زندگی کا یہ حصہ تھا دور تھا۔ اس[۱] سے پہلے وہ سنہ ۱۹۱۱ء کی جنگ بلقان میں حصہ لیتے رہے۔ بعد ازاں[۲] دور خلافت میں جنگ عظیم کے بعد انہوں نے خاصہ حصہ لیا۔ جمعیۃ[۳] العلمائے ہند دہلی کے سنہ ۱۹۱۹ء سے سنہ ۱۹۴۴ء تک ممبر اور مجلس عاملہ اور مجلس خصوصی کے رکن رہے۔ لیکن سنہ ۱۹۴۵ء میں جمعیۃ العلمائے ہند دہلی کے مقابلے میں مسلم لیگ کے نظریۂ پاکستان کی حمایت اور تائید میں "جمعیۃ[۴] العلمائے اسلام" کے نام سے کلکتہ میں مذہبی اور سیاسی جماعت کی بنیاد ڈالی گئی۔

جمعیۃ العلمائے اسلام کلکتہ کا شاندار اجلاس اور علامہ عثمانی کا پیغام اکتوبر سنہ ۱۹۴۵ء:

جمعیۃ العلمائے اسلام کلکتہ کا سب سے پہلا جلسہ کلکتے میں ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹ اکتوبر سنہ ۱۹۴۵ء کو چار روز تک ہونا طے پایا۔ اس جلسے[۵] میں خصوصیت سے علامہ شبیر احمد عثمانی کو دعوت دی گئی۔ آپ میں ابھی اتنا طویل سفر کرنے کی طاقت نہ تھی البتہ موصوف نے ایک بیان جلسے میں پڑھے جانے کے لئے تحریر فرمایا۔ اپنے ایک خط میں ناظم جمعیۃ العلمائے اسلام کلکتہ کو تحریر فرماتے ہیں:۔

"میں بوجہ معذوری خود حاضر نہ ہو سکا۔ ایک مختصر پیغام بھیجنے کا خیال ہوا مگر لکھنے بیٹھا تو بلا ارادہ طویل ہو گیا۔ صاف کرانے میں دیر لگی ڈاک سے روانہ نہ ہو سکتا تھا اس لئے مجبور ہو کر بدست مولانا ظہور احمد صاحب مرسل ہے۔"

(۲۵ اکتوبر سنہ ۱۹۴۵ء ۱۸ ذیقعدہ سنہ ۱۳۶۴ھ) (پیغام کلکتہ ص۱)

اس پیغام کا جو تحریری شکل میں انتیس صفحات پر مشتمل ہے شرکائے جلسہ پر بے حد اثر ہوا۔ مولانا سید محمد قریش (شمسی)، ناظم کل ہند جمعیۃ العلمائے اسلام کلکتہ لکھتے ہیں:۔

"پیغام نے ایک عالم بے خودی پیدا کر دیا۔ عجیب محویت وکیفیت سی ہو

پر طاری ہوگئی۔ بار بار نعرہ ہائے تکبیر و علامہ شبیر احمد عثمانی زندہ باد بلند ہوتے رہے۔" (پیش لفظ پیغام کلکتہ ص۵)

غرض کہ اس پیغام نے ہندوستان کے شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک غلغلہ برپا کر دیا اور مسلم لیگ کو شریعت اور سیاست کی روشنی میں آگے بڑھنے کا موقع ملا۔ بے شمار مسلمان جو لیگ میں شریک ہونے سے ہچکچاتے تھے اور جمعیۃ العلمائے ہند اور حضرت مولانا ابوالکلام مرحوم کی شخصیت سے متاثر تھے وہ جوق در جوق لیگ میں شامل ہونے شروع ہو گئے۔ اس پیغام کو تمام لیگی اخباروں نے اُچھالا اور خاص طور پر "عصر جدید" کلکتہ نے اس پیغام کو جلی طور پر شائع کیا۔

دو قومی نظریہ

علامہ نے اپنے پیغام میں دو قومی نظرئے پر سخت زور دیا، اور فرمایا:۔

"اسلامی نقطۂ نظر سے گویا روئے زمین پر دو ہی قومیں آباد ہیں۔ ایک وہ قوم جس نے فاطر ہستی کی صحیح معرفت حاصل کر کے اس کے مکمل اور آخری قانون کو اس کی زمین پر رائج کرنے کا التزام کر لیا ہے وہ مسلم یا مومن کہلاتی ہے۔ دوسری جس نے اپنے اوپر ایسا التزام نہیں کیا اس کا شرعی نام کافر ہوا۔

فَمِنكُمْ كَافِرٌ وَّمِنكُمْ مُّؤْمِنٌ

اس اساسی نقطۂ نظر سے لامحالہ کل غیر مسلم قومیں دوسری قوم سمجھی جائیں گی اور اب اس چیز کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہتا کہ مسلم اور غیر مسلم دونوں کے امتزاج سے کوئی قومیت متحدہ صحیح معنیٰ میں بن سکتی ہے۔" (پیغام کلکتہ)

مسلم لیگ میں شریعت اور سیاست کی رُو سے شرکت کی تائید

موصوف نے شریعت اور سیاست کے اعتبار سے مسلم لیگ میں عام مسلمانوں کی شرکت کو ضروری قرار دیا۔ چنانچہ پیغام میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"اس وقت مسلمانوں کو حصول پاکستان کی خاطر مسلم لیگ کی تائید و حمایت میں حدود شرعیہ کی رعایت کے ساتھ حصہ لینا چاہیئے۔ میں یہ گمان کرتا ہوں کہ اگر اس وقت مسلم لیگ ناکام ہوگئی تو پھر شاید مدت دراز تک مسلمانوں کو اس ملک میں پنپنے کا موقع نہ ملے گا۔ اس لئے وقت کی ضرورت ہے کہ مسلمان مسلم لیگ کے بازو مضبوط کریں اور ساتھ ہی عوام مسلمین ہر قدم پر مختلف عنوانوں سے یہ ظاہر کرتے رہیں کہ ہم نے زعمائے لیگ کا ساتھ اپنے دین اور اپنی اصلی قومیت کی حفاظت کے لئے دیا ہے۔ اور تمام دینی معاملات میں ہم حاملین دین اور علمائے ربانیین کی آواز کو سب آوازوں پر مقدم دیکھنا چاہتے ہیں اگر خدانکردہ ایسا نہ ہوا تو ہم انشاء اللہ ایسے فاسد عناصر سے لیگ کو صاف کر کے دم لیں گے۔"

پاکستان کے حصول کی ضرورت

بلوچستان، پنجاب، سرحد، بنگال اور سندھ کے صوبوں کا پاکستان بنا کر جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اسلامی مرکز قائم کرنے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے علامہ نے پیغام کلکتہ میں تحریر فرمایا:۔

"ہندوستان میں دس کروڑ مسلمان ایک مستقل قوم ہیں۔ اس قوم کی وحدت اور شیرازہ بندی کے لئے ضرورت ہے کہ اس کا کوئی مستقل مرکز ہو جہاں سے اس کے قومی تحریکات اور عزائم فروغ پا سکیں اور جہاں سے وہ مکمل آزادی اور مادی اقتدار کے ساتھ اپنے خدائی قانون کو بے روک ٹوک نافذ کر سکیں۔"

(پیغام ص ۱۸)

آگے چل کر علامہ لکھتے ہیں:۔

"بہر حال اس (مرکز) کا نام پاکستان رکھو یا حکومت الٰہیہ یا اور کوئی۔

اتنی بات ضرور ہے کہ مسلمان ایک مستقل قوم ہیں اور ان کے لئے ایک مستقل مرکز کی ضرورت ہے جو اکثریت و اقلیت کی مخلوط حکومت میں کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتا۔" (پیغام ص ۱۹)

یہ چند عبارتیں ہم نے علامہ کے پیغام سے قارئین کے لئے نوٹ کر دی ہیں تاکہ ان کو پیغام کلکتہ اور علامہ کے سیاسی نظریات، نیز لیگ اور پاکستان کی حمایت و تائید کا اندازہ ہو سکے۔

ہندوستان کے طول و عرض میں پیغام کا اثر

اس سیاسی اور شرعی پیغام کا اثر اس قدر ہوا کہ تمام ہندوستان میں اس کا غلغلہ برپا ہو گیا۔ اور اس پیغام کو چھپوانے اور بکثرت شائع کرنے کے لئے لوگ بے تاب ہو گئے۔ ناظم کل جمعیۃ علمائے اسلام لکھتے ہیں:۔

" اس پیغام کے اکثر جملوں کو مکرر پڑھنے کی درخواست (جلسے میں) ہوتی رہی اور تقریباً پون گھنٹے تک اجلاس کی کوئی کارروائی نہ ہو سکی۔ پنڈال کے ہر گوشے سے لوگ اس کے خیر مقدم کے لئے وفور جوش سے ابلتے رہے اور اس کے شائع کرنے کے لئے چندہ پیش کرنے لگے۔ ایک صاحب نے بنگلہ ترجمہ و اشاعت کا ذمہ لیا اور دوسرے بزرگ نے گجراتی میں۔" (پیغام ص ۶)

اخبار عصر جدید کلکتہ نے اس پیغام کو اپنے اخبار مورخہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۵ء میں لفظ بلفظ شائع کیا اور اس کے اول میں اپنا ایک نوٹ لکھا جس کے چند جملے یہ ہیں:۔

" ذیل میں ہم حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی متع اللہ المسلمین بطول بقائہ کا روح پرور پیغام درج کرتے ہیں جو کل ہند جمعیۃ علمائے اسلام کے اجلاس کلکتہ میں پڑھ کر سنایا گیا اور جس کی خالص اسلامی روح اور دلنشین نکات، زبردست دلائل اور سچے مسلم دل سے نکلی ہوئی اپیل، ہزاروں ہزار (لاکھوں) شرکائے

اجلاس کے دل و دماغ پر چھاگئی .... ہم اس پیغام کو درج کرتے ہوئے مسلمانانِ ہند سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ اس کو بار بار پڑھیں، دوستوں کو سنائیں اور اس پمفلٹ کو اس ذیلی براعظم کے طول و عرض اور شمال و جنوب کے گوشے گوشے میں ہر ہر مسلم گھر میں پہنچا کر دم لیں۔"

(عصر جدید کلکتہ مورخہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۵ء)

اسی پیغام کلکتہ سے جمعیۃ علمائے ہند بھی چونک اٹھی۔ چنانچہ ایک ملاقات میں جو علامہ عثمانی اور حضرت مولانا حسین احمد صاحبؒ، حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ، حضرت مولانا احمد سعید صاحبؒ و مولانا حفظ الرحمٰن صاحب وغیرہم کی ۷ دسمبر ۱۹۴۵ء کو آپ کے مکان پر دیوبند میں ہوئی ان ہی حضرات میں سے ایک نے فرمایا:۔

"آپ کے اعلانات نے ملک میں ہل چل ڈال دی ہے۔" (مکالمہ ص ۴۴)

غرض آپ کے صرف اسی ایک ہی پیغام نے وہ کام کیا جو دوسرے لیڈروں کی برسوں کی تقریریں اور کوششیں نہ کر سکیں۔

علامہ عثمانیؒ کو جمعیۃ علمائے اسلام کلکتہ نے اسی اجلاس میں شرکت کے لئے جب خط لکھا تو آپ نے طویل بیماری سے کمزوری کے باعث معذرت لکھتے ہوئے اثنائے خط میں تحریر فرمایا:۔

"ہماری تیرہ بختی دیکھئے کہ آج ہم کو ہندوستان میں یہ دن دیکھنا پڑا ہے ہے جبکہ مسلمانوں کا قومی اور سیاسی استقلال ثابت کرنے کے لئے بھی دلائل کی ضرورت ہے اور اس استقلال کی مخالفت میں خود قوم کے بعض اعضا ہی سینہ سپر ہو رہے ہیں۔ گویا ان کو اس کا احساس ہی نہیں کہ ؎

کامیابی خارج از ملت سے ناکامی بھلی

لطف دشمن ہی سے شہرت ہو تو گمنامی بھلی
بے وفا سمجھیں تمہیں اہل حرم اس سے بچو
دیر والے کج ادا لکھ دیں یہ بدنامی بھلی

(اخبار عصر جدید کلکتہ)

علامہ کو اس بات کا سخت افسوس ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت کانگریس میں شریک ہو کر ہندوؤں کے ساتھ ہے اور وہ غیر مسلموں کے ساتھ مل کر کامیابی کی تلاش میں ہے۔ علامہ لکھتے ہیں :۔

"ہمارے فقہائے حنفیہ نے امام محمد اور امام طحاوی رحمہما اللہ سے لیکر علامہ ابن عابدین تک کسی نے اس مسئلے سے انکار نہیں کیا کہ ایک قوم کے مقابلے پر دوسرے کفار کو مدد دینا یا ان سے مدد لینا اسی وقت جائز ہے جبکہ حکم اسلام غالب ہو۔" (پیغام ص۲۵)

مسلم لیگ کو ووٹ دینا چاہئے

آپ نے اس وقت کانگریس کے مسلمانوں کے مقابلے میں مسلم لیگ کے افراد کو ووٹ دینا ضروری قرار دیا اور فرمایا :۔

"میرے نزدیک مسلم لیگ کی جانب کو ترجیح ہے لہٰذا شخصیات سے بے پروا ہو کر اس کے نامزد کردہ امیدوار کو ووٹ دینا چاہیئے۔" (بیان الیکشن)

"کیا کانگریس کے دائرہ میں جہاں ہندو عناصر کے کھلے غلبہ سے کوئی انکار نہیں کر سکتا مٹھی بھر مسلمان داخل ہو کر تو یہ امید کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے معاملات میں ان سب کو راہِ راست پر لے آئیں گے لیکن مسلم لیگ کے متعلق جو خالص مسلمانوں کی جماعت ہے ایسی امید کے سب دروازے بند ہو چکے ہیں۔ یہ چیز کم از کم میری سمجھ سے باہر ہے۔" (منشور دہلی ۱۲ نومبر ۱۹۴۵ء)

اسی بیان میں جو مسلم لیگ کو ووٹ دینے کے سلسلے میں علامہ نے دیا، تحریر فرمایا:۔

"اس وقت (مسلم لیگ) جس اصول پر الیکشن لڑ رہی ہے وہ عقلی اور شرعی حیثیت سے مرجح اور بے غبار ہے۔ اگر مسلم لیگ موجودہ الیکشن میں ناکامیاب ہوگئی تو قوی اندیشہ ہے کہ ایک سچا اصول ہی شاید ہمیشہ کے لئے دفن ہو جاتے اور مسلمانوں کے قومی اور سیاسی استقلال کی آواز فضائے ہندوستان میں پھر کبھی نہ سنائی دے۔

پاکستان ایک اصطلاحی نام ہے یہ نام سن کر کسی شخص کو بھی یہ غلط فہمی یا خوش فہمی پیدا نہیں ہوتی چاہیئے کہ اس خطے میں فوراً بلا تاخیر خلافت راشدہ یا خالص قرآنی اور اسلامی حکومت قائم ہو جائے گی۔ ضرورت سے زیادہ امیدیں دلانا یا توقعات باندھنا کسی عاقبت اندیش حقیقت پسند کے لئے زیبا نہیں۔ ہاں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان ایسا ابتدائی قدم ہے جو انجام کار قرآنی اصول کے مطابق احکم الحاکمین کی حکومت عادلہ قائم ہونے پر کسی وقت منتہی ہو سکتا ہے جس کے قیام کا نام نہاد قومیت متحدہ کی حکومت کے ذریعہ بظاہر کوئی امکان نہیں۔" (منشور دہلی ۱۲ نومبر ۱۹۴۵ء)

علامہ عثمانی کے بیانات کا ملک میں اثر

ان بیانات اور پیغامات کا ملک میں جو اثر ہوا ہم اس کے متعلق پہلے لکھ چکے ہیں کہ ہندوستان میں علامہ عثمانی کی ان تحریروں نے مسلم لیگ کو بے حد تقویت پہنچائی جمعیۃ العلمائے ہند بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ چنانچہ ۷ دسمبر ۱۹۴۵ء مطابق یکم محرم ۱۳۶۵ھ بروز جمعہ صبح کے وقت علامہ عثمانی کے دولت خانے پر دیوبند میں حضرت مولانا حسین احمد صاحبؒ، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ، حضرت مولانا احمد سعید صاحبؒ، مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ، مولانا عبدالحلیم صاحب

صدیقی ، مولانا عبدالحنان صاحب ، مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب رحمہم اللہ تشریف لائے ۔ مقصد نیک تھا اور یہ سب حضرات یہ چاہتے تھے کہ علمائے دیوبند کے سیاسی خیالات میں اتحاد اور یک جہتی پیدا ہو جائے ۔ چنانچہ ان حضرات کا مولانا عثمانی سے سوا تین گھنٹے تک سلسلۂ کلام جاری رہا ۔ گفتگو کا نقطۂ خیال یہ رہا کہ آیا مسلمانانِ ہند کے لئے مسلم لیگ میں شرکت کرنا اور پاکستان کا مطالبہ کرنا درست ہے یا کانگریس میں شریک رہ کر متحدہ ہندوستان میں ہندو مسلم دونوں کی متحدہ حکومت قائم کرنا ۔ علامہ عثمانی لیگ کے علمبردار اور بقیہ حضرات کانگریس کے طرفدار تھے ۔

یہ مکالمہ جو مکالمۃ الصدرین کے نام سے چھپا اور مولانا محمد طاہر صاحب نے مرتب کیا اہل بصیرت کے لئے سیاسیات ملکی کا بہترین ذخیرہ ہے اور اس میں اس دور کی سیاست کی رُوح موجود ہے ۔ ہم نے علامہ کے تمام خطبے ، بیانات وغیرہ خطباتِ عثمانی کے نام سے مرتب کر کے چھاپ دئے ان میں یہ سب امور درج ہیں ۔

لیگی اور کانگریسی مسلمانوں کا فارمولا

مکالمۃ الصدرین میں علامہ نے لیگی فارمولے اور کانگریسی مسلمانوں کے فارمولے پر جو کلام فرمایا وہ حسب ذیل ہے جس سے پاکستان کی صحیح پوزیشن کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے فرماتے ہیں :۔

" اس وقت ہم کو پاکستان کی مرکزی حکومت میں یہ دیکھنا چاہئے کہ مسلم اور غیر مسلم آبادی میں کیا تناسب ہے ۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی طرف سے کہا گیا کہ پاکستان میں مجموعی تعداد مسلمانوں کی چھ کروڑ ہوگی اور غیر مسلم تین کروڑ ہوں گے ۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ یہ تعداد غلط ہے ۔ مجموعے میں مسلمان تقریباً سوا سات کروڑ ہیں لیکن ہم سات کروڑ تسلیم کئے لیتے ہیں ، اور غیر مسلم جو تین کروڑ سے کم ہیں ان کو پورے تین کروڑ فرض کر لیا جائے اس

تعداد سے سات اور تین کی نسبت مسلم اور غیر مسلم کے درمیان ہو گی۔ اور مجموعہ آبادی میں آپ کے فرمانے کے مطابق ساٹھ اور چالیس کی نسبت ہوگی یعنی مسلمان ساٹھ فیصدی اور غیر مسلم چالیس فیصدی ہوں گے (حالانکہ اس صورت میں مجموعہ میں مسلمان واقعۃً ستر فیصدی اور غیر مسلم تیس فیصدی ہوتے ہیں)۔ .... اب آپ اپنے فارمولے پر نظر ڈالئے کہ اس میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا مرکزی حکومت میں کیا تناسب ہوتا ہے تو آپ کے فارمولا کی رو سے مرکز میں چالیس مسلمان ہوں گے اور چالیس ہندو اور بیس فیصدی میں دیگر اقلیتیں ہوں گی اس طرح آپ کے فارمولا کے لحاظ سے غیر مسلموں کی تعداد ساٹھ فیصدی اور مسلمانوں کی تعداد چالیس فیصدی ہوئی اور مسلم لیگ کے پاکستانی فارمولا میں (بقول آپ کے یہی نسبت علی العکس رہے گی، یعنی) ساٹھ فیصدی مسلمان اور چالیس فیصدی غیر مسلم ہوں گے۔ (حالانکہ حقیقی تناسب پاکستانی فارمولا میں ستر فیصدی اور تیس فیصدی کا ہوتا ہے) آپ آپ ہی انصاف سے فرمائیے کہ آپ کے اس فارمولا سے مسلمانوں کو کیا فائدہ پہونچا (ہم اگر ساٹھ فیصدی رہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکتے تو چالیس فیصدی میں کیا کر سکیں گے) ....

اس موقع پر کہا گیا کہ عیسائی ہمارے ساتھ ہو جائیں گے۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ یہ عجیب بات ہے کہ جب پاکستان سامنے آتا ہے تو عیسائی مسلمانوں سے علیحدہ غیر مسلم بلاک میں شمار کئے جاتے ہیں اور جب جمعیۃ العلماء ہند کا (مقدم) فارمولا پیش کیا جاتا ہے تو وہی عیسائی (گویا کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جاتے ہیں اور) مسلمانوں کے سائیڈ میں شمار کئے جانے لگتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ غیر مسلم سب کے سب بہر صورت ایک ہی شمار ہوں گے (الکفر ملۃ واحدۃ)

اور خالص مسلمانوں کو ان سب کے مقابل رکھکر مسئلہ پر غور کرنا چاہیئے۔

وفد جمعیۃ العلمائے نے آخر کار اس کو تسلیم کر لیا ....

(پھر علامہ عثمانی نے پوچھا) ...... کیا آپ بتلا سکتے ہیں کہ ہندو پاکستان سے پھر کیوں اس درجہ مضطرب و خائف اور اس کی انتہائی مخالفت پر تلا ہوا ہے ....

اس کے جواب میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ ان کی کوئی مصلحت ہوگی ...... علامہ عثمانی نے فرمایا کہ اس کی جو کچھ بھی مصلحت ہو آخر آپ حضرات نے بھی کچھ غور کیا کہ وہ مصلحت کیا ہو سکتی ہے۔ میرے نزدیک تو اس کی مخالفت کی وجہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ انگریزی کی حکومت سردست اوپر قائم ہے جسے آپ خود شروع میں تسلیم کر چکے ہیں۔ ہندو یہ چاہتا ہے کہ انگریزی حکومت کے زیر سایہ دس کروڑ مسلمانوں میں سے ایک شخص کی گردن پر سے بھی ہندو اکثریت کا جوا کبھی اور کہیں اتر نے نہ پائے اور اس طرح مسلمان ہمیشہ انگریز اور ہندو کی ڈبل غلامی میں باختیار خود پستے رہیں۔" (مکالمہ ص۱۳ تا ص۱۷)

علامہ عثمانی کے اس مکالمے سے پاکستان کے مطالبے کی صحیح صورت حال اور کانگریس کے فارمولے کی جو حقیقت معلوم ہوئی وہ اس قدر دلنشیں ہے کہ اس سے پاکستان کا صحیح نظریہ سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا۔ نیز اس مکالمے سے علامہ کی بے پناہ سیاسی فہم و فراست کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے۔

کل جمعیۃ العلمائے اسلام ہند کی صدارت کا سہرا علامہ عثمانی کے سر

جب کلکتے میں "کل جمعیۃ العلمائے اسلام ہند" کی بنیاد پڑی اسی وقت سے ان کی نظر انتخاب صدارت کے لئے علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی پر

پڑ رہی تھی۔ اسی لئے انہوں نے کلکتے کی "کل مؤتمر علمائے اسلام ہند" کے لئے علامہؒ کو دعوت دی تھی لیکن آپ بیماری کے بعد کے اثرات سے معذور تھے۔ ورنہ اس اجلاس کے موقع پر ہی آپ کو صدارت کی پیش کش کی جاتی۔ تاہم جمعیۃ العلمائے ہند دہلی اور دیگر علماء یہ تاڑ رہے تھے کہ "جمعیۃ العلمائے ہند دہلی" کے علی الرغم "کل جمعیۃ العلمائے اسلام ہند" کی صدارت کا تاج اگر کسی سر پر رکھا جا سکتا ہے تو وہ صرف مولانا عثمانی ہیں۔ ان کے مقابلے میں اگر ہندو پاک کے تمام علماء بھی مسلم لیگ کی طرف دست تعاون بڑھاتے تو وہ زور پیدا نہ کر سکتے تھے جو علامہ عثمانی نے اللہ تعالٰے کے فضل سے پیدا کیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ قدرت نے ان کو نظریۂ پاکستان کی حمایت میں تحریک کو آسمان پر پہنچانے کے لئے صحت بخشی تھی۔ چنانچہ اسی مکالمۃ الصدرین سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے عرض کیا کہ :-

"جمعیۃ العلمائے اسلام ہند" محض ہماری جمعیت کے مقابلہ میں اس کو توڑنے کے لئے قائم کی گئی ہے مناسب ہوگا کہ آپ کم از کم اس کی صدارت قبول نہ فرمائیں علامہ عثمانی نے فرمایا کہ میں نے ابھی صدارت کے قبول و عدم قبول کی نسبت کوئی باضابطہ فیصلہ نہیں کیا ہے لیکن کل کے لئے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کیا کروں گا"

(مکالمہ ص ۲۹ و ۳۰)

جمعیۃ العلمائے ہند دہلی کے حضرات یہ گوارا نہیں فرماتے تھے کہ علامہ عثمانی دوسری جمعیۃ کی صدارت قبول فرمائیں۔ وہ تو مولانا عثمانی کے اتنے ہی عمل اور لیگ کی حمایت و تائید کو پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ مگر علامہ نے ۷ دسمبر کے اس مکالمے اور گفتگو کے بعد جمعیۃ العلمائے اسلام کی صدارت کو قبول فرما لیا اور آپ صدر منتخب ہو گئے۔

جمعیۃ العلماءِ اسلام کی تحریک!

مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی اپنی سوانح عمری انوار النظر میں جمعیۃ العلماءِ اسلام کی تحریک اور بنیاد اور اس کے پس منظر کے متعلق لکھتے ہیں :۔

" یہ جولائی ۱۹۴۳ء کا واقعہ ہے اس وقت مسلم لیگ مطالبۂ پاکستان پر جمی ہوئی تھی اور حکیم الامت (حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ) کی جماعت اس (نظریۂ پاکستان) کی حمایت کر رہی تھی۔ پھر یہ رائے ہوئی کہ مطالبۂ پاکستان کے لئے علماء کو اپنا مستقل مرکز قائم کرنا چاہیئے۔ کیونکہ جمعیۃ العلماء ہند (دہلی) کانگریس کے ساتھ تھی۔ ہم نے اکتوبر ۱۹۴۵ء میں جمعیۃ العلماء اسلام کی بنیاد کلکتہ میں ڈالی چار دن تک اس کے اجلاس ہوتے رہے لوگوں کا بیان تھا کہ خلافت کانفرنس (کلکتہ) کے بعد ایسا اجلاس کلکتے میں کبھی نہیں ہوا۔

اس اجلاس میں حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی (رحمۃ اللہ علیہ) کو صدر مرکزی منتخب کیا گیا۔ حضرت مولانا اس وقت علیل تھے۔ اس لئے کلکتے تشریف نہ لاسکے مگر اپنا ایک پیام مولانا ظہور احمد دیوبندی کے ہاتھ اجلاس میں پڑھنے کے لئے بھیج دیا تھا۔ اسی پیام کو سنانے کے بعد میں نے تحریک کی کہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کو صدر جمعیۃ علماء اسلام منتخب کیا جائے۔ سب نے بالاتفاق اس کی تائید کی۔ اس قرارداد کو لیکر میں دیوبند حاضر ہوا تو آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ :

" بھائی میں تو سولہ مہینے سے صاحب فراش ہوں۔ مجھ میں سفر کی ہمت کہاں؟ اور اس کے لئے صدر کو جا بجا جلسے کرنا اور تقریر کرنا ہوگی۔ جیسا کہ مولانا حسین احمد صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند جا بجا جلسے کرتے اور مطالبۂ پاکستان کے خلاف تقریریں کرتے ہیں "

میں نے عرض کیا آپ صدارت قبول فرمالیں کام کی ذمہ داری میں اپنے سر لیتا ہوں مولانا (عثمانی) خوش ہوئے اور صدارت قبول فرماکر جمعیۃ العلماء اسلام کی بنیاد مضبوط کردی . . . .

یہ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم تھا کہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی صدر جمعیۃ علماء اسلام بننے کے بعد روبصحت ہوگئے کہ اب انہوں نے دیوبند، میرٹھ، دہلی وغیرہ میں پاکستان حاصل کرنے کے لئے مسلمانوں کو جوشیلے انداز میں تیار کیا۔

صوبائی الیکشن کی جدوجہد میں آپ نے بمبئی، لاہور اور پشاور تک متعدد جلسوں میں صدارت کی اور اپنی تقریروں سے مسلمانوں کو پاکستان کے لئے ووٹ دینے پر آمادہ کیا۔" (انوار النظر ص۵۸، ص۵۹، ص۶۲)

یہ تھا وہ پس منظر جو علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے صدر جمعیۃ العلماء اسلام بنائے جانے سے متعلق مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے تحریر فرمایا۔

یہ تاریخی مضمون تو علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کی صدارت سے متعلق درمیان میں آگیا۔ سلسلۂ کلام تو جمعیۃ العلماء ہند دہلی کے وفد کا تھا کہ انہوں نے کہا تھا کہ آپ اس جمعیت کی صدارت سے یکسو رہیں کہ یہ دہلی جمعیۃ العلما کو توڑنے کے لئے بنائی گئی ہے۔ مکالمۃ الصدرین کے مرتب لکھتے ہیں:-

"لیکن اس (گفتگو) کے بعد علامہ عثمانیؒ نے کل ہند جمعیۃ العلمائے اسلام کے ناظم کے تار کے جواب میں باضابطہ صدارت کی منظوری کا تار روانہ فرمادیا ہے۔" (مکالمۃ الصدرین ص۳۰)

مکالمۃ الصدرین کے مرتب لکھتے ہیں:-

"چلتے چلتے وفد کا منشا یہ معلوم ہوتا تھا کہ جو تحریرات آپ کی شائع ہوچکی

ہیں وہ بیان مسئلہ کے لئے کافی ہیں۔ اب اگر یکسوئی اختیار کرلی جائے تو کیا بہتر نہ ہوگا۔ لیکن علامہ عثمانی نے فرمایا کہ جس چیز کو میں حق سمجھتا ہوں ظاہر ہے کہ اس معاملہ میں میرے لئے سکوت کیسے مناسب ہے۔" (مکالمہ ص۳۰)

اس صورت حال سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ علامہ عثمانی کے ان چند بیانات سے ہندوستان میں لیگ کو زبردست تقویت پہنچی اور کانگریس کے محل میں رخنے اور شگاف پیدا ہو گئے۔

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کو مبارکباد

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تحریک خلافت کے زمانے سے ہی ہندوؤں کے ساتھ مل کر تحریک چلانے یا آزادی حاصل کرنے کے سخت خلاف تھے اور ان کی رائے صحیح تھی۔

جب مسلم لیگ میدان عمل میں نکلی تو آپ نے قائداعظم کو تبلیغ کے لئے کئی وفد بھیجے اور سب سے پہلے وفد کا امیر علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کو منتخب کیا۔ اس کے علاوہ بھی اور کئی وفد بھیجے جن کے ذریعہ قائداعظم کو اسلامی احکام پر چلنے کی دعوت دی گئی تھی۔ الغرض جب مسلم لیگ میں علامہ کی سرگرمیاں کا حال حضرت تھانوی کو معلوم ہوا تو انہوں نے علامہ عثمانی کو ایک خط لکھا جس میں مبارکباد کا پیغام تھا۔

مسلم لیگ کے میدان میں علامہ کی مزید پیش قدمیاں

اس مختصر سے عرصے میں علامہ کا سیاسیات ملکی میں اتنا بلند مقام ہو گیا کہ گھر گھر آپ کے چرچے ہونے لگے اور قائداعظم محمد علی جناح کے بعد جس شخص نے مسلم لیگ کو چار

چار چاند لگا دئے وہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ تھے بلکہ اگر مولانا لیگ کو مذہبی تقدس نہ بخشتے تو جمعیۃ العلمائے ہند دہلی کے مقابلے میں لیگ کو قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ اب علامہ لیگ کو لیکر آگے بڑھتے ہیں اور بیانات اور اعلانات کی دنیا سے نکل کر تقریروں اور جلسوں میں شرکت کے میدان میں قدم رکھتے ہیں کہ اب آپ کی صحت نے آپ کو باہر نکلنے کی اجازت بھی دے دی ہے یا قدرت کا ملہ نے لیگ کو مذہبی حیثیت سے آگے بڑھانے کے لئے جس شخص کو چن لیا تھا اس نے ان کو صحت اور قوت بخش دی ہے۔

مرکزی اور صوبائی اسمبلیاں

حضرت عثمانی نے جب مسلم لیگ میں شرکت کا اعلان کیا تو آئندہ مرکزی اسمبلی کے انتخاب ہونے والے تھے۔ ان کے اعلانات اور لیگ میں شرکت اور مسلم لیگ کے ممبروں کو ووٹ دینے کی تحریک کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ بالخصوص مرکز میں مسلم لیگ کو بہت کامیابی ہوئی۔ بہت بڑا مقابلہ لیاقت علی خاں مرحوم اور کانگریسی امیدوار محمد احمد کاظمی کا تھا چنانچہ لیاقت علی کامیاب ہوئے گویا ان کی کامیابی مسلم لیگ کی کامیابی تھی اور اس میں مولانا کی کوششوں کو بھی بہت بڑا دخل تھا۔ ہم ذیل میں سید یعقوب حسن صاحب کا تاریخی بیان جو علامہ عثمانیؒ کے برادر زادہ مولانا زبیر افضل عثمانی سے انہوں نے روایت کیا ہے پیش کرتے ہیں جس میں حضرت عثمانیؒ اور مولانا مدنیؒ کے ووٹ ڈالنے سے تاریخی خاکہ پیش کیا ہے۔ یعقوب حسن صاحب کا یہ بیان زبیر صاحب سے مروی اخبار نوائے وقت لاہور مورخہ ۱۰ رمضان المبارک ۱۳۹۲ھ مطابق ۱۹ اکتوبر ۱۹۷۲ء بروز جمعرات کی اشاعت میں ہوا ہے:۔

(بیان کا متن آئندہ صفحہ سے شروع ہے)

لیاقت علیخاں کا ایک عظیم انتخابی معرکہ

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے دوٹ

مولانا زبیر افضل عثمانی راوی ہیں کہ قائد ملت لیاقت علی خاں کی یاد آج بھی اسی طرح تازہ ہے جیسی کہ ان کے انتخاب کے وقت تھی۔ خوش قسمتی سمجھئے یا بد قسمتی کہ ان کا حلقۂ انتخاب ہمارا ہی ضلع سہارنپور تھا۔ خوش قسمتی اس لئے کہ انتہائی مایوس کن اور نامساعد حالات میں کل ہند مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری کو کامیابی سے ہمکنار کیا اور بد قسمتی یہ تھی کہ قریباً پورا ضلع مسلم اکثریت کے باوجود مولانا حسین احمد مدنی دیوبندی کے ارادتمندوں کا مخصوص علاقہ تھا۔ دوسری طرف مقابلہ بھی بہت ہی قدیم اور مقبول لیڈر محمد احمد کاظمی سے تھا جن کی کانگریس سے وفاداریاں کانگریسی حلقوں میں ضرب المثل تھیں۔ نہ صرف یہ بلکہ نہرو سے لیکر پٹیل و پنتھ تک سیم وزر کی تھیلیاں نچھاور کرتے وقت شب و روز حلقۂ انتخاب کا طوفانی دورہ کر رہے تھے۔ ٹاٹا اور برلا کی تمام دولت روپہلی چاندی بن کر صرف ایک نشست کے لئے وقف ہو کر رہ گئی تھی کیونکہ کانگریس نہیں چاہتی تھی کہ نوابزادہ اس حلقہ سے کامیاب ہوں۔

انتخاب کا وقت جتنا قریب آتا جا رہا تھا قائد ملت کی گھبراہٹ میں بھی اتنا ہی اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور ایک دن وہ مجسمۂ حزن و ملال بنے ہوئے علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی خدمت میں دعا کے لئے حاضر ہوئے اس وقت علامہ شبیر احمد عثمانی نے بڑے والہانہ انداز میں فرمایا :۔

"نوابزدہ صاحب ہم نے وحدانیت اور رسالت کا علم بلند کیا ہے

اور اگر خدانخواستہ ہمیں ناکامی ہوئی تو ہم یہ سمجھ لیں گے کہ ہماری ہی کسی خامی کی وجہ سے تمام تر سعی بارگاہِ الٰہی میں نامشکور ہوگئی۔ اللہ پر بھروسہ رکھتے ہوئے تائیدِ غیبی کا انتظار کیجئے۔"

اس کے بعد قائدِ ملت نے علامہ عثمانی کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت کانگریس ووٹوں کی خریداری پر بے دریغ روپیہ خرچ کر رہی اور لوگوں میں تقسیم کر رہی ہے۔ میں نے بھی جب قائدِاعظم سے ووٹوں کی خریداری کے لئے اجازت طلب کی تو قائدِاعظم نے فرمایا :۔

"اس کا تو بھول کر بھی تصور نہ کرنا کیونکہ جو لوگ آج اپنا ووٹ فروخت کر سکتے ہیں وہ کل پاکستان کو بھی بیچ ڈالیں گے۔ اور ہمیں ایسے کرائے کے ٹٹوؤں کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں سوچتا رہ گیا کہ قائدِاعظم کا یہ قول کتنا زبردست طمانچہ ہے اس قوم کے منہ پر جو چند کھوٹے سکّوں کے عوض اپنا ضمیر اور ایمان جیسی انمول شے کو بھی فروخت کرنے سے دریغ نہیں کرتی۔ قائدِ ملت کے رخصت ہو جانے کے بعد علامہ عثمانی نے ہمیں اور ہمارے چھوٹے بھائی عامر عثمانی ایڈیٹر "تجلی" کو بلوا کر فرمایا کہ "مرض اور ضعف کی وجہ سے میری جو حالت ہے وہ تم دونوں کے سامنے ہے لیکن میرا تمہارے لئے یہ حکم ہے کہ اپنا ہر لمحہ نوابزادہ کے انتخاب کی کامیابی کے لئے وقف کر دو۔"

چنانچہ ہمارا انتخابی ہیڈ کوارٹر رُڑکی میں قائم کیا گیا تاکہ سہارنپور سے دہرہ دون تک کام کرنے کا موقعہ مل سکے لیکن ہمارے پاس نہ تو جیپ تھی، نہ کار۔ صرف بیل گاڑیوں پر قریہ قریہ مسلم لیگ کا پیغام پہنچانے کے لیے نکل کھڑے ہوئے، جس کے نتیجہ میں ہمارا کہیں تو دشنام طرازیوں سے استقبال کیا گیا اور کہیں پر سودائی

کو سنگ و خشت کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ خیر یہ حادثات تو ہمارے لئے قطعاً متوقع تھے مگر ایک غیر متوقع حادثہ یہ پیش آیا کہ ہماری بیل گاڑی نشیب و فراز سے بے نیاز ایک گہرے گڑھے میں جا گری جس کی وجہ سے ہماری ایک ٹانگ قوت رفتار سے محروم ہی ہو کر رہ گئی لیکن ہماری نگاہوں میں پاکستان کا نقشہ تھا۔ مسلم لیگ کا سبز ہلالی پرچم ہماری نگاہوں میں فردوس بریں کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یہ چاند تارا فراز عرش سے قلب مومن پر ضیا پاشیاں کر رہا ہے حسن و صداقت کا یہ ہلالی پرچم سینۂ طاغوت میں اس طرح گڑ کر رہ گیا تھا کہ جس کی اذیت سے اسلام دشمن طاقتیں درد سے کراہ اٹھی تھیں۔ اس پرچم کی سربلندی کے لئے مسلمان نوجوان جان کی بازی لگاتے ہوئے ببانگ دہل کہتے پھرتے تھے:

"سینے پہ گولی کھائیں گے اور پاکستان بنائیں گے"

یہی وہ جذبہ قومی تھا جسے دیکھ کر قائداعظم نے گاندھی سے فرمایا تھا:

"گاندھی جی میری نگاہیں پاکستان کے سنہرے کلس دیکھ رہی ہیں"

اللہ اکبر کیا جذبہ تھا کہ حصول پاکستان کے وقت مسلمانوں کے عزم آہنی نے مشرکین و نصاریٰ کے فولادی پنجوں کو مروڑ کر رکھ دیا تھا۔ تمام شیطانی منصوبے ناکام ہو کر رہ گئے تھے اِدھر انتخابی سرگرمیاں بھی تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھیں اور ہمیں ہر گام پر دشمنان مسلم لیگ مسلمانوں سے واسطہ پڑ رہا تھا لیکن دار و رسن کے شیدائی یقین محکم کی بیڑیاں پہنے قید و بند اور شکوک و شبہات سے بے نیاز، رسم منزل سے ناآشنا محض اپنے مولیٰ کی خوشنودی اور رضا جوئی میں ایک نادیدہ منزل کی طرف بڑھے چلے جا رہے تھے۔ انجام کی بے خبری نے آغاز کو اور بھی تابناک بنا دیا تھا۔ بس ایک ہی دھن تھی اور ایک ہی لگن تھی جس نے مسلمانوں کو کفن بدوش کر کے شہادت کی مقدس راہیں دکھا رہی تھیں اور ہم بھی طاؤس و

رُباب کو خیر باد کہہ کر تیغ و سناں کے زمرے میں شامل ہو چکے تھے اور وہ یومِ حساب بھی قریب آتا جا رہا تھا جس دن اعمال شماری کے بجائے رائے شماری کے ذریعہ تقدیرِ مسلم کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ پاکستان وجود میں آتا یا نہ آتا ہمیں تو بس یہ فکر دامن گیر تھی کہ کہیں اسلام کی سربلندی کفر کی برتری سے مجروح اور بت شکنوں پر بت گروں کا غلبہ نہ حاصل ہو جائے۔

اسی انتخابی مہم کے سلسلے میں سردار عبد الرب نشتر مرحوم بھی دیوبند پہنچ گئے ان کا قیام علامہ شبیر احمد عثمانی کے یہاں ہوا اور مہمان نوازی اور میزبانی کے فرائض ہم جیسے ناشناس آداب کے سپرد کر دیئے گئے لیکن مہینوں کی تکان و شب بیداری کے بعد گرم کھانے اور نرم بستر نے ہمارے اندر شاعری کے ذوق کو جنم دینا شروع کر دیا اور ہم نے بھی یہ سوچ کر اُسے پروان چڑھانے کا موقع دیدیا کہ معزز مہمان نشتر کی میزبانی کے لئے اس سے بہتر کوئی صورت ممکن نہیں کہ ہم بزبانِ شاعری ان کی خدمت میں ایک سپاسنامہ پیش کر دیں۔ شب میں جب علامہ عثمانی کی صدارت میں جلسہ شروع ہوا تو سب سے پہلے قرعۂ فال اسی دیوانے کے نام نکلا۔ اس سپاسنامہ کے آخری تین بند ہمیں آج تک یاد ہیں جو سماعت کے لئے ہدیۂ قارئین ہیں:۔

حق کے سانچے میں ڈھل گیا ہے نشتر ☆ رگِ باطل کو دیدو جا کے خبر
دشمنِ قوم دیکھ لیں اگر ☆ کیسی تیزی ہے کیا روانی ہے
شیر سرحد کا پیار بھی دیکھیں ☆ حق کے نشتر کی دھار بھی دیکھیں

اس منظوم سپاسنامے کے خاتمے پر علامہ عثمانی اور نشتر مرحوم نے مسکراتے ہوئے ہماری میزبانی پر مُہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ سہارنپور کے ایک منچلے رئیس نے اپنی کار ہمارے لئے وقف کر دی تاکہ ہم تمام انتخابی حلقوں کا بعجلتِ ممکنہ جائزہ لیتے رہیں جس کے بعد بیل گاڑیوں سے نجات مل گئی اور ہم خورد و نوش سے بے نیاز مکمل جوشِ عمل

کے ساتھ اپنے فرائض کی انجام دہی میں ہمہ تن مصروف ہو گئے اور اگر کبھی احساس ناکامی کا وسوسہ پیدا بھی ہوا تو ہمارے عزم وعمل میں اور بھی تیزی وتندی آتی چلی گئی۔ اسی دوران گاہے گاہے قائد ملت لیاقت علی خاں سے بھی ملاقات ہو جاتی اور ان کا بھولا بھالا بھاری بھر کم مسکراتا چہرہ ہماری سعی پیہم پر مسکراہٹیں بکھیر دیتا آخر کار وہ یوم حساب آ ہی گیا جس کے لئے یہ تگ و دو جاری تھی۔ اس دن ہماری ڈیوٹی اپنے ہی وطن دیوبند میں لگا دی گئی اور ہم نے اذان سحری کے بعد ہی ایک تانگہ میں مائیکروفون فٹ کر کے کوچہ گردیاں شروع کر دیں اور ہر ہر بام و در کو مسلم لیگ کا پیغام سناتے چلے گئے۔

اس جوش وخروش نے لوگوں میں حرارت ایمانی کو اس درجہ فروزاں کر دیا کہ کانگریسی مسلمانوں کو مسلم لیگ میں شمولیت کے متعلق نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہونے لگی ۔۔۔۔۔ کانگریسی حلقہ اپنی یقینی کامیابی کے زعم میں بینڈ باجے سے لیس نتیجہ کے انتظار میں کھڑا تھا لیکن مشیت کا مقابلہ کون کر سکتا ہے یکایک مائیکروفون پر غیر سرکاری طور پر اعلان ہوا کہ کانگریس کے مقابلے میں مسلم لیگ کو ۲۲۱ ووٹ زیادہ ملے ہیں۔ اس خبر سے کانگریسی حلقوں پر کیا گذری اس کا علم تو خدا ہی کو ہے لیکن ہمیں اپنی سماعت پر قطعاً یقین نہیں آ رہا تھا اور جب مسلم لیگ کے کارکنوں نے ایک دوسرے کو مبارکباد پیش کی اس وقت یقین ہو گیا کہ سعی انسانی کے مقابلے میں خدا کی طاقت بہت ہی بلند و بالا ہے۔ دیوبند مسلم لیگ کی کامیابی مسلم لیگ کے تمام حلقوں کی کامیابی کی ضامن تھی چنانچہ یہی ہوا کہ ہر ہر حلقہ سے قائد ملت اور مسلم لیگ کی کامیابی کی اطلاعات پہنچنی شروع ہو گئیں اور اس کامیابی پر علامہ عثمانی کا سجدۂ شکر تصدیق بنکر قیامت تک کے لئے ثبت ہو کر رہ گیا۔"

مسلم لیگ کانفرنس میرٹھ کی صدارت

یہ کانفرنس جو صوبائی اسمبلی کے الیکشن میں لیگ کے نمائندوں کو ووٹ دینے کے سلسلے میں کی گئی میرٹھ میں ۳۰ دسمبر سنہ ۱۹۴۵ء کو مولانا عثمانی کی زیر صدارت منعقد ہوئی علامہ اس میں خود شریک ہوئے۔ اپنے خطبۂ صدارت میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"میری ان چند سطور کو جو بہت عجلت میں اختصار کے ساتھ لکھی گئی ہیں اگر آپ نے توجہ سے سنا اور سن کر کسی فیصلے پر پہنچ گئے تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت بیکار نہیں گئی اور علالت و مجبوری کے باوجود جو سفر میں نے بادل ناخواستہ اختیار کیا اس کا پھل مجھے مل گیا۔" (خطبۂ صدارت میرٹھ ص۳-۴)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ موصوف اب باہر نکلنے کے قابل ہو چکے تھے۔ خود فرمایا کہ علالت کے باوجود بادل ناخواستہ جلسے میں شرکت کی اور خطبۂ صدارت بھی اسی حالت میں لکھ ڈالا۔ آپ نے اپنے خطبۂ صدارت میں لیگ کی موافقت کا مشورہ دیا اور فرمایا کہ جو کانگریسی مسلمان کانگریس میں کام کر رہے وہ دراصل ہندوؤں کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا :۔

"مسلم لیگ قدرتی طور پر کانگریس کے ساتھ اس کی امدادی یا معاون جماعتوں اور اشخاص کا مقابلہ کرنے پر مجبور ہوئی۔ کیونکہ یہ جماعتیں اس وقت جو کچھ کہہ رہی ہیں وہ فی الحقیقت ہندو اکثریت کے مطلب کی باتیں ہیں جو ان کی زبانوں سے ادا ہوتی ہیں۔ جدوجہد، محنت و مشقت اور دوڑ دھوپ ان کی ہے اور اس کا میٹھا پھل آخر کار اسی ہندو قوم کو ملنے والا ہے۔ گویا بقول اکبر مرحوم ان کی زبان حال اس طرح گویا ہے ؎

انہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات ان کی
انہی کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے رات ان کی

سُنے جو اس کو اسے تردّد جو اس کو دیکھے اسے تحیّر

ہماری نیکی اور ان کی برکت عمل ہمارا نجات ان کی

اکبر الہ آبادی کے اشعار پر علامہ سر دُھنتے تھے اور اپنے مطلب کے اشعار اس خوبصورتی سے فٹ کرتے تھے کہ زبان چٹخارے لینے لگتی تھی۔ علامہ نے فرمایا کہ جو مسلمان کانگریس میں شامل ہو کر کوشش کر رہے اس کا فائدہ ہندوؤں کو پہنچے گا۔ اس لئے مسلمانوں کو لیگ میں شامل ہو کر اپنے علیحدہ حقوق منوانے چاہئیں چنانچہ آگے چل کر اسی خطبۂ میرٹھ میں علامہ لکھتے ہیں :۔

"مسلم لیگ کا کہنا یہ ہے کہ جب دو قومیں جُدا جُدا ہیں تو آزادی ان میں سے ہر ایک کا حق ہے ان میں سے ایک ہمیشہ دوسرے کے رحم وکرم پر کیوں رہے .... اس لئے ہم کم ازکم یہ چاہتے ہیں کہ آج کل کے اصول کے مطابق جن صوبوں میں جس قوم کی اکثریت ہو وہاں اس کی آزاد حکومت ہو"

(خطبۂ میرٹھ ص)

میرٹھ کی مسلم لیگ کانفرنس کا مقصد

اس کانفرنس کا مقصد جو میرٹھ میں منعقد ہوئی اور جس کی صدارت علامہ نے کی، خود علامہ کی زبانی سُنئے۔ اپنے اسی خطبۂ صدارت میں لکھتے ہیں :۔

"مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں حق سبحانہٗ تعالیٰ نے مسلم لیگ کو جو بے مثال کامیابی عطا فرمائی سب سے پہلے بارگاہِ رب العزت میں اس پر شکر ادا کرنے اور اس کی تسبیح وتحمید اور استغفار میں مشغول رہنے کی ضرورت ہے۔ خداوند قدوس کی نصرت واعانت سے اس عدیم النظیر کامیابی نے مخالفوں کے حوصلے پست کر دئے اور لیگ کے حامیوں کی ہمتیں بڑھا دیں۔ مگر صوبجاتی الیکشن ابھی باقی ہے جو پہلے سے کہیں زیادہ طویل وعریض اور سخت جد وجہد، جانفشانی اور

تندہی کا محتاج ہے ۔ مبادا کامیابی ادھوری رہ جائے اس لئے میں چند الفاظ صوبجاتی الیکشن کے ووٹروں کی خدمت میں بطور مشورہ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

موجودہ الیکشن میں جو نمائندے کسی قوم کی طرف سے جائیں گے ملک ہند کا آئندہ مستقل دستور بنانے میں انہی کا دخل ہوگا اس لئے ووٹ دینے والوں کو قرابت، پارٹی، لالچ، دوستی، تلمذ (شاگردی) پیری مریدی اور عقیدت وغیرہ کے تمام تعلقات سے قطع نظر کر کے اپنی عظیم ذمہ داری کو اچھی طرح محسوس کر لینا چاہیئے۔" (خطبۂ صدارت ص۵)

تلقین پابندی احکام اسلام

علامہ نے اپنے خطبوں میں نہ صرف سیاسیات کی گتھیاں سلجھائیں بلکہ ہر خطبے میں مسلم لیگ کے کارکنوں اور عوام کو احکام اسلام کی پابندی کرنے کی تلقین فرمائی چنانچہ میرٹھ کے خطبے میں بھی فرماتے ہیں :۔

"قرآن کریم کی ہدایت و احکام پر عمل کرنے کے لئے کچھ قیام پاکستان ہی کی ضرورت نہیں بلکہ سچ پوچھیئے تو پاکستان کا ملنا احکام شرعیہ اور تعلیمات قرآنیہ پر استقامت کے ہمارے عمل درآمد رکھنے کا ثمرہ ہوگا۔

فرض کیجیئے کہ پاکستان ملے نہ ملے۔ جلد ملے یا دیر سے ملے قرآنی احکام تو کسی وقت بھی معطل نہیں ہو سکتے۔ تا بحد استطاعت ہم کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ہمہ وقت احکام اسلام کی پابندی ضروری ہے۔" (خطبہ میرٹھ ص۲۱)

آگے چلکر علامہ تحریر فرماتے ہیں :۔

"خدا کی قسم اگر ہماری قوم کے بڑے آدمیوں نے عملاً قرآنی احکام کی پابندی بلا تاخیر اور بلا کسی ہچکچاہٹ کے شروع کر دی تو موجودہ تحریک میں بے حد

حساب زور پیدا ہو جائے گا ۔" (خطبۂ میرٹھ ص۲۴)

ایک اور جگہ اسی خطبے میں لکھتے ہیں :-

"میں تمام ذمہ دار قائدین کو ایک ادنیٰ خادم کی حیثیت سے نہایت پُرزور طریق پر دعوت دیتا ہوں کہ خود اپنے اعلان کردہ الفاظ کے مطابق قرآنی احکام کی سرًّا و علانیۃً پابندی فرمائیں ۔ اور مسلمانوں کو برابر یہ اطمینان دلاتے رہیں کہ الیکشن میں کامیابی کے بعد دستور سازی کے وقت ہم اپنی امکانی حد تک کوئی ایسا قانون بنائے جانے کی اجازت نہ دیں گے جو ہمارے پرسنل لا اور شرعی معاملات کے بارے میں علمائے اسلام کے طے کردہ فیصلے کے خلاف ہو ۔"

خطبے کے آخر میں حضرت عثمانی فرماتے ہیں :-

"خاتمۂ کلام پر ایک اور ضروری چیز پر تنبیہ کرنا ہے وہ یہ کہ آپ پورے جوش ، ولولہ ، عزم اور استقلال کے ساتھ مسلم لیگ کو آگے بڑھانے ، ابھارنے ، سنوارنے اور نکھارنے میں سرگرم رہیے اور ساتھ ہی اس کے نام کی لاج رکھئے دیکھئے یہ مسلم لیگ ہے اور حدیث شریف میں آیا ہے اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ (مسلمان وہ ہے کہ اس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں) جو لوگ آپ کے سیاسی افکار کے مخالف ہیں ان سے بھی آپ کا معاملہ شرافت ، صبر و تحمل اور حسن اخلاق کے ساتھ ہونا چاہیئے گو دوسری طرف سے کچھ زیادتی اور اشتعال انگیزی بھی کی جائے ۔ بعض مقامات پر جو ناشائستہ برتاؤ مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے ساتھ کیا گیا ہے اگر اس کے متعلق اخبارات کی روایات صحیح ہیں تو میں اس پر اظہار بیزاری کئے بدون نہیں رہ سکتا ۔ مولانا کی سیاسی رائے خواہ کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو ان کا علم و فضل بہرحال مسلّم ہے ۔" (خطبۂ میرٹھ ص۲۶)

علامہ میدانِ عمل میں

تحریروں اور بیانوں کی دنیا سے نکل کر میرٹھ کی مسلم لیگ میں شرکت کرنے کا یہ پہلا قدم تھا جو علامہ نے اٹھایا اور بعد ازاں ملک میں مسلم لیگ اور پاکستان کی خاطر دورے کئے۔ ان تمام سرگرمیوں کو ہم تفصیل کے ساتھ "تجلیاتِ عثمانی" کے "سیاسیات" کے حصے میں تحریر کر چکے ہیں۔ البتہ یہاں بھی بعض خطبوں اور کانفرنسوں کی اجمالی کارروائی پیش کرتے ہیں۔

میرٹھ کانفرنس کا اثر

مولانا محمد متین خطیب صاحب جو پاکستان کے عالم وجود میں آنے سے پہلے جمعیۃ العلماء صوبہ پنجاب کے صدر بھی رہے ہیں اپنے مضمون میں لکھتے ہیں :-

"میرٹھ میں ایک عظیم الشان کانفرنس ہوئی جس میں نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب، چودھری خلیق الزمان اور دیگر علماء اور زعماء بکثرت شامل ہوئے۔ شیخ الاسلام (علامہ عثمانی) نے صدارت کی ..... میرٹھ کمشنری کے حالات ایک دم میں مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے حق میں بدل گئے"

(انقلاب کراچی ۲۴ مارچ ۱۹۵۶ء کالم ۳)

صوبہ پنجاب جمعیۃ علمائے اسلام کانفرنس لاہور کی صدارت

۲۵-۲۶-۲۷ جنوری ۱۹۴۶ء مطابق ۲۰-۲۱-۲۲ صفر ۱۳۶۵ھ کو اسلامیہ کالج لاہور کے گراونڈ میں صوبہ پنجاب کی جمعیۃ العلماء کی زبردست کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے کی۔ اس کانفرنس کا خطبۂ صدارت سیاست ملکی اور بننے والے پاکستان نیز مسلم لیگ کے جسم میں تازہ رُوح پھونکنے والا صور تھا جس نے سیاست کا رُخ بدل کر رکھ دیا۔ یہ خطبہ علامہ کا زبردست سیاسی، مذہبی، اقتصادی شاہکار ہے جو $\frac{20 \times 30}{16}$ (سائز) کے اسّی صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس خطبہ میں علامہؒ نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی اور مدنی

زندگی کا نقشہ کھینچ کر مدینہ کو عرب کا پاکستان ثابت کرنے اور وہاں مسلمانوں کے اقتدار اور قوت کے حصول کے باعث مسلمانوں کا ایک مرکز ظاہر کرتے ہوئے ہندوستان میں بننے والے پاکستان کو مطابق کر کے دکھایا ہے۔ بعد ازاں مسلمانوں کی تحریک خلافت، ہندوؤں کی اس میں شرکت اور کانگریس کا فروغ ہندو مسلم اتحاد اور بعد ازاں شدھی، سنگھٹن اور نہرو رپورٹ کے باعث ہندو مسلم افتراق کا نقشہ کھینچتے ہوئے اس دور تک پہنچے ہیں جس میں ودیا مندر سکیم اور کانگریسی دور کی وزارتوں اور ہندوؤں کے مسلمانوں پر مظالم کا نقشہ کھینچا ہے۔ لکھتے ہیں :-

"کانگریس کی ڈھائی سالہ وزارتوں میں جو دردناک، سفاکانہ اور وحشیانہ مظالم مسلمانوں پر کئے گئے میں ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ کیونکہ وہ مدت سے منظر عام پر آچکے ہیں اور ڈان نیز منشور کے پچاس ساٹھ نمبروں میں مسلسل شائع کئے گئے ہیں .... مسلمانوں نے آخر سمجھ لیا کہ جب ہندو کا نشہ حکومت وزارتی اقتدار میں اس قدر تیز ہے تو آزاد حکومت میں کیا کچھ نہ ہوگا چنانچہ انہوں نے طے کر لیا کہ ہندوستان کے سیاسی مسئلے پر از سر نو غور کیا جائے آخر کار آپ کے اسی تاریخی شہر لاہور میں (پاکستان کا) دوٹوک فیصلہ کر لیا۔" (خطبۂ لاہور ص ۲۱ - ۲۲ - ۲۳)

ایک اعتراض اور اس کا جواب

پاکستان بننے کی صورت میں اعتراض کیا گیا کہ اگر مسلمان ہندو کی حکومت میں احکام اسلام ادا کرنے سے روک دئے جائیں تو ان کا کیا بنے گا اور اگر وہ ہجرت کر گئے تو ان کی مسجدوں اور مقدس دینی مدارس کا کیا بنے گا۔ علامہ ان باتوں کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"آخر یہ مسئلہ تو اب بھی فقہا کے نزدیک مسلم ہے اگر دار الحرب میں کفار

ارکان دین کے ادا کرنے سے روک دیں اور چارۂ کار باقی نہ رہے تو ایسے ملک سے ہجرت کرنے والے مسلمان کیا اپنے معابد و معاہد کو اٹھا کر اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ یا غیر مستطیع (کمزور) مستضعفین (ضعیف لوگوں) کی وجہ سے ہجرت ترک کرنا ضروری سمجھیں گے؟"

علامہ نے اس صورت میں مسئلے کی نوعیت صاف واضح کر دی کہ ہجرت کی صورت میں بہر حال مسلمان اپنے گھروں، باغات، کھیتوں اور عبادت گاہوں کو چھوڑ کر چلے آنے پر مجبور ہوں گے۔ لہذا آج جو عبادت گاہیں مشرقی پنجاب میں رہ گئی ہیں ان کے چھوڑنے پر مسلمان مجبور ہو گئے تھے۔

مسئلۂ اقلیت اور اس کا جواب

پاکستان بننے کی صورت میں ہندوستان کی مسلم اقلیت کا ہندو حکومت میں کیا بنے گا۔ اس خدشے کا جواب علامہ عثمانی نے اپنے خطبۂ لاہور میں اس طرح دیا ہے:۔

"رہا یہ سوال کہ قیام پاکستان کی صورت میں ان دو ڈھائی کروڑ مسلمانوں کا کیا بنے گا جو ہندو اکثریت کے ماتحت رہیں گے۔ تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح ہم کو اپنی اقلیت کی فکر ہے ہندوؤں کو اپنی تین کروڑ اقلیت کے تحفظ کا کوئی احساس نہ ہو گا جو پاکستان میں آباد ہو گی .... پاکستان میں ہم غیر مسلم اقلیتوں کو جس قسم کی مراعات کھلے دل سے دیں گے ہم توقع رکھیں گے کہ اسی قسم کی مراعات ہندوستان میں ہمارے مسلم بھائیوں کو ملیں۔ ....

اچھا اسے چھوڑیئے۔ اکھنڈ ہندوستان کی صورت میں ملک کی $\frac{1}{4}$ مسلم اقلیت کا تحفظ کس طرح ہوتا اور کس طرح آئندہ ہو گا اقلیت بہر حال اقلیت ہے۔ مرکز حکومت ایک ہو یا دو۔ ملکی حکومت ہو یا اجنبی، اقلیت کو اکثریت کے برابر کر دینا تو کسی کی قدرت میں نہیں۔ اب اگر دس کروڑ میں سے سات کروڑ

مسلمان ہی رام راج کی تیاری کرنے والے ہندوؤں کی گرفت سے آزاد اور محفوظ ہو جائیں تو کیا یہ کوئی فائدے کی چیز نہیں۔" خطبہ لاہور ص ۴۵ تا ۴۶)

تجزیہ علامہ کا بیان مسلمان اقلیت کے ہندوستان میں تحفظ کے متعلق دو حصوں پر مبنی ہے۔ اول یہ کہ چونکہ ہندو اقلیت پاکستان میں ہوگی اس لئے ہندوستان کا مسلمان محفوظ رہ سکے گا اور دوم یہ کہ سات کروڑ مسلمان اگر پاکستان کے باعث رام راج کے پنجے سے نکل جائیں تو پاکستان بننے سے پھر بھی فائدہ ہے۔ علامہ کی دونوں باتیں درست ہیں۔ چنانچہ لیاقت نہرو پیکٹ اقلیت کی حفاظت کے متعلق ہوا ہے اس کے باوجود ہندوستان میں مسلمانوں پر اب تک ایک ہزار سے زیادہ مرتبہ حملے کئے گئے ہیں۔ ان کے گھروں کو جلایا گیا ہے۔ ان کے سامانوں کو لوٹا گیا ہے۔ ان کے خون سے بارہا ہولی کھیلی گئی ہے۔ اور سب سے بڑا المیہ کلکتے میں ہوا کہ وسیع پیمانے پر سوچی سمجھی سکیم کے ماتحت مسلمانوں کو بے دریغ قتل کیا گیا۔ گھروں سے نکالا گیا، مسلمان عورتوں کی عصمتیں لوٹی گئیں۔ اس کے برعکس پاکستان میں ایک آدھ دفعہ ہندوؤں پر بعض ناعاقبت اندیش مسلمانوں نے کشمیر سے موئے مقدس کی چوری کے سلسلے میں کھلنا میں دست درازی کی جو حکومت پاکستان نے روک دی۔ حتیٰ کہ اب ہندو جنہوں نے مشرقی پاکستان چھوڑ دیا تھا واپس آ رہے ہیں۔

ہندوستان کی حکومت سے کوئی بھلائی کی توقع بے سود ہے درحقیقت دنیا میں یوں تو ہزاروں سلطنتیں ہیں لیکن ہندو ذہنیت اور ہندو راج سے بدتر اور بے رحم حکومت شاید ہی کوئی ہو۔ جن کا نظریہ مسلمانوں کے متعلق یہ ہو کہ یا ان کو قتل کر دو یا ہندوستان سے نکال دو یا ان کو ہندو بنا لو۔ اس لئے علامہ عثمانی کا خطبے میں یہ نظریہ کہ "اگر دس کروڑ میں سے سات کروڑ مسلمان ہی رام راج کے پنجے سے نکل جائیں تو کیا یہ کم فائدہ ہے۔" بالکل درست ہے۔

آگے چل کر ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ پاکستان کے مسلمانوں سے تعلقات کا اظہار کرتے ہوئے علامہ لکھتے ہیں :۔

پاکستان پر ہندوستانی مسلمانوں کا حق

" ہم پاکستان کا تحفظ اس لئے کر رہے ہیں کہ ملتِ اسلامیہ کا بہیئت مجموعی اس میں فائدہ ہے ۔ پاکستان پر ہندوستانی مسلمانوں کا اتنا ہی حق ہے جتنا ہمارا ہے ۔ کیونکہ وہ ہماری ملی جائے پناہ اور ان کا اخلاقی سہارا ہوگا ۔ ہمارا ہندوستان سے کٹ جانا ہندی مسلمانوں سے کٹ جانے کے مرادف نہیں سمجھنا چاہیئے ۔ مسلمانوں کے باہمی تعلقات کے راستے میں جغرافیائی حدود بندی کوئی شے نہیں ؛" (خطبہ لاہور ص ۴۴ و ۴۵)

مولانا ابوالکلام آزاد کا بیان ؛

جب پاکستان بن چکا تھا اور ہندوستان میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جارہی تھی ۔ دہلی میں بھی مسلمانوں کا خون بہایا جارہا تھا اور ان کو نکالا جارہا تھا تو اس زمانے میں مولانا ابوالکلام نے دہلی کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کے بعد اپنی ایک پُرزور تقریر میں کہا تھا کہ مسلمانوں ! تم نے ہماری بات نہ مانی ۔ لیگ کے ذمہ دار تمہیں چھوڑ کر چلے گئے ۔ اس بات کا جواب علامہ شبیر احمد سے سنئیے :

علامہ عثمانی کا جواب

" آپ کو معلوم ہوگا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے جب مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی تو مکہ معظمہ کے معابد (عبادت گاہیں) اپنے ساتھ اٹھا کر نہیں لے گئے اور بے کس و بے بس مستضعفین (کمزوروں) کو وہیں چھوڑنا پڑا جن کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے :۔

وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ | " اور ان کے واسطے جو مغلوب

وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝

ہیں مرد اور عورتیں اور بچے جو کہتے ہیں اے رب ہمارے نکال ہم کو اس بستی سے کہ ظالم ہیں یہاں کے لوگ اور کر دے ہمارے واسطے اپنے پاس سے کوئی حمایتی اور کر دے ہمارے واسطے اپنے پاس سے کوئی مددگار ۔"

کفار مکہ ان ہی بعض مستضعفین کو بجبر و اکراہ میدان بدر میں مسلمانوں کے مقابلے پر بھی کھینچ لائے تھے تو کیا ان تصورات و امکانات کی موجودگی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے کو پاکستان بنانے کا خیال ترک کر دیا تھا ہاں ہوا تو یہ ہوا کہ قرآن کریم میں حق تعالیٰ نے تمام غیر مہاجر مسلمانوں کے متعلق صاف اعلان کر دیا

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ۔

" اور جو ایمان لائے اور گھر نہیں چھوڑا ۔ تم کو ان کی رفاقت سے کچھ کام نہیں جب تک وہ گھر نہ چھوڑ آئیں ۔ اور اگر وہ تم سے مدد چاہیں دین میں تو تم کو لازم ہے مدد کرنی ۔ مگر مقابلہ میں ان لوگوں کے کہ ان میں اور تم میں عہد ہو "

تجزیہ | علامہ شبیر احمد عثمانی کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہندوستان کی حکومت

مسلمان اقلیت کو احکام اسلام ادا کرنے سے روکے تو پھر ان پر ہجرت کرنی ضروری ہو جائے گی۔ البتہ ہجرت کی شرطیں جو فقہ کی کتابوں میں درج ہیں ان پر عملدرآمد کرنا ہو گا۔

لیکن موجودہ دور ۱۹۶۴ء میں اور اس سے پہلے سالوں سے ہندوستان کی حکومت کا رویہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو خود زبردستی ہندوستان سے نکال رہی ہے۔ چنانچہ مغربی بنگال اور آسام سے اب تک کئی لاکھ مسلمانوں کو نکالا جا چکا ہے۔ ادھر راجستان سے بھی مسلمانوں کو نکالا گیا ہے۔ بلکہ لاہور اور امرتسر کی سرحد کے راستے سے بھی مسلمانوں کا اخراج ہوا ہے۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ ہندوستان کی حکومت وہاں کے چھ کروڑ مسلمانوں کو نکال سکے۔ اس سلسلے میں حکومت پاکستان نے حکومت ہندوستان سے بار بار اپیل کی لیکن اس کا تا ہنوز کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ البتہ پاکستان سے گئے ہوئے ہندوؤں کو حکومت پاکستان بڑی فراخدلی سے واپس لے رہی ہے اور ان کے مواشی، غلے، مکان اور سامان ان کو واپس دئے جا رہے ہیں۔ یہ رواداری محض اس لئے ہے کہ ہندوستان کی حکومت بھی نکالے ہوئے مسلمانوں کو بلا کر دوبارہ بسائے۔

پاکستان کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے یہ بھی اعلان کیا ہے کہ وہ حکومت ہندوستان کے مسلمانوں کے اخراج کا معاملہ اقوام متحدہ میں پیش کریں گے۔ آج مورخہ ۹ جولائی ۱۹۶۴ء کے کوہستان اخبار لاہور نے ملک امیر محمد گورنر مغربی پاکستان کا یہ اعلان بھی شائع کیا ہے کہ حکومت پاکستان ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے ملک میں نہیں آنے دے گی۔ ایسا کرنے سے ممکن ہے ان کا اخراج بند ہو جائے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پاکستان جتنا مضبوط ہو گا اتنا ہی ہندوستان کے مسلمانوں کو فائدہ پہنچے گا۔ چنانچہ علامہ عثمانی لاہور کے اسی خطبے میں لکھتے ہیں:-

"پھر یہاں نہ تو سر دست (ہندوستان کے مسلمانوں کی) ہجرت کا سوال ہے نہ کئی کروڑ مسلمانوں کا عدد ایسا ہے کہ بالکلیہ بے دست و پا ہو کر بیٹھ رہے، خصوصاً اس حالت میں جبکہ ان کے پڑوس میں مسلمانوں کا طاقتور پاکستان بھی موجود ہو اور اس کو ان کی امداد و تحفظ کا پورا خیال بھی ہو اور پاکستانی خطہ دوسرے آزاد اسلامی ممالک سے متصل بھی واقع ہوا ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اصل یہ ہے کہ ابھی تک آزاد اور طاقتور پاکستان کا تصور ہی ان کے ذہن میں نہیں ورنہ اس طرح کے رکیک شبہات دق نہ کرتے۔" (خطبۂ لاہور ص ۴۹-۵۰)

حضرت عثمانی کی مذکورہ بالا تحریر نہایت ہی پُر مغز اور مسلمانان ہند کے مستقبل اور پاکستان کی تعمیر پر نہایت روشن خیال پیش کرتی ہے۔ ان کا خیال آئیڈیل ہے مگر اس کا کیا علاج کہ نہ تو پاکستان اب تک ہندوستان کے مسلمانوں کے قتل و غارت کا انسداد کر سکا اور نہ پاکستان کے متصل ممالک اسلامیہ کو اتنا احساس ہے کہ وہ ملکر ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ڈھال بن جائیں۔ البتہ ہمارے صدر محمد ایوب خاں نے ایران اور ٹرکی اور پاکستان کے اتحاد اور باہمی مسائل پر اتفاق پر زور دیا ہے اور بات چیت ہو رہی ہے اور ۲۰ جولائی ۱۹۶۴ء کو صدر ایوب دولت مشترکہ کے اجلاس سے لندن سے انقرہ پہنچ رہے ہیں۔ بہر حال علامہ عثمانی کے خطبۂ لاہور میں مسلمانان ہندوستان کے متعلق بس آخری بات یہی ہے کہ پاکستان بننے کی صورت میں سات کروڑ مسلمانوں کا بچ جانا ہی غنیمت ہے۔ البتہ ہندوستان کی حکومت کا مسلمانوں پر ظلم اس کو ضرور لے ڈوبے گا۔

خطبۂ لاہور کے بقایا مضامین

مذکورہ بالا مسائل کے علاوہ، علامہ عثمانی نے اپنے خطبے میں پاکستان کی صنعتی، اقتصادی، تجارتی اور معدنی ترقیات پر بحث کی ہے اور بتلایا ہے کہ پاکستان ایک ایسا ملک

ہوگا جو اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہو سکتا ہے اور اس کی زندگی ہندوستان پر موقوف نہ ہو گی چنانچہ علامہ ماہرینِ اقتصادیات کے حوالے سے لکھتے ہیں :۔

" اطلاعات سے پایا جاتا ہے کہ سندھ اور بلوچستان کے صوبجات میں مٹی کے تیل کے چشمے برآمد ہوئے ہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہاں سے اتنا تیل دستیاب ہو سکے گا جو کُل ہندوستان اور پاکستان کے لئے کفایت کرے گا۔ علاوہ ازیں پاکستان کی زمین ہندوستان کی زمین سے زیادہ زرخیز ہے اور اس میں ہر قسم کی پیداوار ہو سکتی ہے۔

فوجی طاقت | آبادی کے لحاظ سے پاکستان ایک بہت بڑا طاقتور ملک ہوگا اور اس کے باشندے نہایت خوبصورت، لانبے، مضبوط اور سڈول جسم کے ہوتے ہیں۔ ہندوستان کی موجودہ فوج میں ساٹھ فیصدی بھرتی اسی خطۂ پاکستان سے لی جاتی ہے۔ اس کی آبادی قدرتی طور پر سپاہی ہے .... معدنیات کے لحاظ سے (خطۂ پاکستان) معدنیات سے بھرپور ہے۔ نمک (کھیوڑہ) اور مٹی کا تیل (اٹک) پنجاب میں کافی مقدار میں موجود ہے اور سیمنٹ کے لئے بھی یہاں بہت بڑا وسیع میدان موجود ہے۔" (ص۵)

صنعت و تجارت کے متعلق علامہ عثمانی اپنے خطبے میں ماہرین کے خیالات کے مطابق لکھتے ہیں :۔

صنعت و تجارت | کشمیر اور بلوچستان کے خشک اور تر میوہ جات پاکستان کی آبادی کی صحت اور خوشحالی میں بہت معاون ہو سکتے ہیں......... دودھ گھی اور مکھن کے لئے مویشی انسانی زندگی کی جان ہیں اور یہ بات ہر شخص پر عیاں ہے کہ پنجاب کے پاکستانی علاقے میں بہترین مویشی پالے جاتے ہیں۔ بنگال

اپنی ضروریات سے کہیں زیادہ چاول اور پٹ سن پیدا کرتا ہے۔ اس کی تجارت بہت کامیاب ہوسکتی ہے۔ (صفحہ ۶۰-۶۱)

آگے چل کر علامہ لکھتے ہیں:۔

"اچھا ان سب باتوں کو رہنے دیجئے پھر کیا کوئی قوم اپنے موجودہ اقتصادی وسائل کی قلت پر نظر کر کے غلامی کی ذلت کو آزادی کی زندگی پر ترجیح دے گی۔ آپ سرحدی آزاد قبائل کا حال نہیں دیکھتے کہ وہ اتنی بڑی قاہر سلطنت کے مقابلے میں باوجود انتہائی بے سروسامانی کے کب سے اپنی آزادی کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ (صفحہ ۶۳ و ۶۴)

جمعیۃ العلمائے ہند سے

جمعیۃ العلمائے ہند اپنا فارمولا کانگریس وغیرہ سے تسلیم کرائے تب دوسری مسلم جماعتوں سے دریافت کرے کہ تم اسے تسلیم کرتے ہو یا نہیں۔ عجیب بات ہے کہ کانگریس میں دوسری اقوام غالبہ کی شرکت کے لئے تو ہم کو معاہدے کی ضرورت نہیں مگر مسلم لیگ میں شریک ہونے یا اس کی تائید کرنے کے لئے جس کا دروازہ تمام مسلمانوں کے لئے کھلا ہوا ہے پہلے معاہدے کی ضرورت ہے۔ گویا مشرکین کی بات پر تو ہم اعتماد کر سکتے ہیں لیکن مسلمانوں کے ساتھ کسی درجے میں بھی حسن ظن باقی نہیں رکھ سکتے" (خطبۂ لاہور صفحہ ۶۰)

"مسلم لیگ میں جمہور اہل اسلام کی طاقت کو ساتھ لیکر وعدے وفا کرانے کا ہر وقت موقع ہے مگر کانگریس میں کبھی یہ امکان ہی نہیں بجز اس کے کہ اکثریت اپنے لطف و کرم سے ہم کو بھی زندہ رہنے کا حق عنایت فرما دے"۔ (صفحہ ۶۷)

جمعیۃ احرار سے

ہمارے احرار بھائی پہلے مسلم لیگ کے ساتھ ہو کر ہندوستان میں کوئی مناسب زمین حاصل کر لیتے پھر وہاں

حکومت الٰہیہ کی مضبوط عمارت بنوانے کی خدمت پوری قوت کے ساتھ انجام دیتے ۔"

اور کیا غضب کا ادبی ٹکڑا ہے یہ اور کتنی خوبصورت ہے یہ عبارت اور عقیدت جو علامہ نے لاہور کے خطبے میں تحریر فرمائی اور جس میں پاکستان کی پیشین گوئی کی گئی ہے:

"ہمارا عقیدہ ہے کہ تقدیر نے ہمیں پاکستان کے تحفظ کے لئے انتخاب کیا ہے اور یہ چیز آئندہ نسلوں کو ورثہ میں ملے گی ۔ امروز شائد ہمارا مذاق اڑائے لیکن ہماری آنکھیں صبح فردا کے اس دلفریب خندہ کا نظارہ کررہی ہیں، جس کے پردے سے ہماری کامرانیوں کا مہر منیر طلوع ہوگا ۔ اس صبح امید کی نمود تک ہم نامیدیوں کی شب تار کو اپنی قربانیوں کے نور سے روشن رکھیں گے اور اسلام کے سچے فرزندوں کی طرح ہر مصیبت کو خندہ پیشانی سے برداشت کریں گے ۔" (ص ٦٠)

آگے چل کر پھر علامہؒ لکھتے ہیں :۔

"فی الحال تو ہماری تمام تر مساعی اس نقطے پر مرکوز ہونی چاہیئے کہ ایک طرف حکومت اور دوسری جانب ہندوستان میں بسنے والی قوموں پر یہ ثابت کردیں کہ یہاں کے جمہور مسلمانوں نے آخری طور پر فیصلہ کرلیا ہے کہ ہم پاکستان لیکر رہیں گے . . . . ضرورت ہے کہ اس ایک دو ماہ میں (جو صوبائی الیکشن کا دور ہے) مسلمان چین سے نہ بیٹھیں اور ہر فرد مسلم اپنی اپنی جگہ مطالبۂ پاکستان کو حق بجانب ظاہر کرنے کے لئے ہر امکانی کوشش عمل میں لائے ۔ کاش جو مسلمان اس مطالبے سے علیحدہ ہیں وہ بھی اس وقت متفق ہوتے یا کم از کم برسر پیکار نہ ہوتے ۔" (ص ۳۷)

ایک جگہ علامہؒ اسی خطبہ میں لکھتے ہیں :۔

"حالات کا آخری نتیجہ کچھ بھی ہو اور اس منزل کے قطع کرنے میں کچھ بھی مصائب کسی طرف سے پیش آئیں مگر ہندی مسلمان اب جاگنے کے بعد پھر سونے کا اور اٹھنے کے بعد بیٹھ جانے کا ارادہ نہیں رکھتا ہے

سینے میں دل آگاہ جو ہو کچھ غم تو نہ کر ناشاد سہی
مشغول تو ہے بیدار تو ہے نغمہ نہ سہی فریاد سہی
ہر چند بگولا مضطر ہے اک جوش تو اس کے اندر ہے
اک وجد تو ہے اک رقص تو ہے بے چین سہی برباد سہی
وہ خوش کہ کروں گا قتل اسے یا قید قفس میں رکھوں گا
میں خوش کہ وہ طالب تو ہے مرا، صیاد سہی جلاد سہی

(خطبہ ص ۷۵-۷۶)

یونینسٹ پارٹی سابق صوبۂ پنجاب میں برسر اقتدار تھی۔ یہ ہندو مسلمان اور سکھوں کی متحدہ پارٹی تھی جو حکومت کے بہی خواہوں کی جماعت تھی۔ اس زمانے میں گیلنسی حکومتِ برطانیہ کی طرف سے پنجاب کا گورنر تھا اور خضر حیات وزیر اعظم۔ خضر حیات نے قائد اعظم اور مسلم لیگ سے بے وفائی اور غداری کی۔ یہاں تک کہ خضر حیات نے ایک حکم جاری کیا کہ مذہب اور خدا کا نام لیکر کوئی شخص الیکشن کے میدان میں نہ آئے۔ قانونی طور پر مقصد یہ تھا کہ مسلم لیگ کے علماء اور لیڈر جو مذہب کے نام پر پاکستان کا نعرہ بلند کر رہے ہیں ان کو ایسا کرنے سے روک دیا جائے۔ علامہ شبیر احمد رحمۃ اللہ علیہ مسلمان یونینسٹوں کو مخاطب کرتے ہوئے فہمائش کرتے ہیں، اور اللہ اور دین اسلام کے نام پر ہی ان کو للکار کر ان کے قانون کی دھجیاں اڑاتے ہوئے خطبے میں فرماتے ہیں:-

"اب رخصت ہونے سے پہلے مجھے دو لفظ اور کہنے دیجیے جو یہاں کی

برسرِ حکومت پارٹی سے متعلق ہیں۔ میں ابھی تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ یونینسٹ پارٹی کے مسلم ارکان باوجود پاکستان کے حامی ہونے کے کس نوعیت کا اختلاف مسلم لیگ سے رکھتے ہیں۔ میں ایک غیر سیاسی آدمی ہوں۔ ایسے دقیق سیاسی اختلافات کا سمجھنا شاید میری دسترس سے باہر ہے۔ اخبارات و جرائد سے جو کچھ مجھے اندازہ ہوا وہ یہ ہے کہ اصولاً اختلاف زیادہ شدید قسم کا معلوم نہیں ہوتا۔ مگر اس نے عملاً ایک سخت نوعیت اختیار کر لی ہے۔ کیا پنجاب میں کوئی سمجھدار اور با اثر ایسا نہیں جو اختلاف کی اس گتھی کو سلجھا سکے۔ اوس و خزرج کی ایک سو بیس سالہ جنگ کے اثرات کو اسلام کی ربانی تاثیر نے ایک آن میں ختم کر دیا تھا کیا آج ہمارا مشترک جذبۂ اسلامیت اور اعلیٰ قومی مفاد کا تصور ایسے حقیر نزاعات کو ایسے نازک موقع پر ختم نہیں کر سکتا۔ ضرور کر سکتا ہے۔ مگر وہ ختم کرنا اسی خداوند قدوس کے نام پر ہوگا جس کا واسطہ دینا الیکشن کے زمانے میں جرم قرار دے دیا گیا۔ اکبر مرحوم نے شاید اسی دن کے لئے کہا تھا ؎

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اِک زمانے میں

اب فرمایئے کہ اگر گلیمنسی ہمارا خضر بن جائے اور خضر راہ ہی راستے سے ہٹانے لگے تو صحیح رہنمائی کی توقع کس طرح کی جا سکتی ہے۔"

(خطبۂ لاہور ص ۷۶-۷۷)

یہ ہیں وہ اقتباسات اور خیالات جو علامہ عثمانیؒ کے خطبات سے جستہ جستہ ہم نے قارئین کی ضیافتِ طبع کے لئے پیش کر دئے ہیں۔ ان عبارتوں میں علامہ مرحوم کے تمام سیاسی خیالات اور جذبات، مسلم لیگ میں شرکت کی دعوت، مطالبۂ پاکستان،

الیکشن میں لیگ کو کامیاب بنانے کی اپیل، اقلیت کی حفاظت پاکستان بننے کے فوائد، کانگریس میں شرکت کے نقصانات غرضکہ کوئی پہلو ایسا نہیں رہا ہے جو علامہؒ کے مذکورہ بالا پیغام، مکالمہ، خطبہ ہائے صدارت میں نہ آگیا ہو لہذا مزید خیالات کو پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

ہاں یہ کہنا پڑے گا کہ علامہ عثمانیؒ کے خطبوں کا ملک کے طول وعرض میں بڑا اثر ہوا۔ ہم ان خطبات اور سیاسی خطوط کو علیحدہ کتاب کی شکل میں انشاء اللہ تعالیٰ طبع کرا کر شائع کریں گے۔ اگرچہ ہم نے "انوارِ عثمانی" مکتوبات عثمانی میں ان سیاسی خطوط کو شائع کر دیا ہے۔ یہ دو سطریں ہم آج جولائی ۱۹۶۹ء میں نظر ثانی کرتے ہوئے بڑھا رہے ہیں حالانکہ ہم نے اس کتاب کا اکثر حصہ ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۰ء میں لکھ لیا تھا۔ اور آخری کچھ اوراق اب ۱۹۶۹ء میں لکھ رہے ہیں۔ اور اب جولائی و ستمبر ۱۹۷۲ء میں یہ خوشخبری دیتے ہیں کہ علامہ کے یہ تمام خطبات، بیانات، پیغامات، فتوے اور تقریر چھپ چکی ہیں۔ صرف خطبات کی جلد بندی باقی ہے اور امید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ اکتوبر یا نومبر ۱۹۷۲ء میں قارئین کے سامنے آجائیں گے۔ اب ہم ۱۹۷۲ء میں کتاب پر نظر ثالث ڈال رہے ہیں جبکہ اب اس کی کتابت ہو رہی ہے[1]۔

مجدّد کی تلوار

جب علامہ عثمانیؒ مسلم لیگ کی حمایت اور پاکستان کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا رہے تھے تو آپ کے ایک دوست نے آپ کو لکھا:۔

"میں نے خواب میں حضرت مجدّد الف ثانی علیہ الرحمۃ کو دیکھا جو مجھے ایک

---

[1] ۱۹۷۲ء میں نذر سنز لاہور نے اس کتاب کو شائع کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر بوجوہ اشاعت نہ ہوسکی۔ مصنف کی رحلت کے بعد مکتبہ دار العلوم نے اس کی اشاعت کا ارادہ کیا ہے۔ آج ۱۷ نومبر ۱۹۸۱ء کو کتابت یہاں تک پہنچی ہے۔ حسین احمد نجیب سابق رفیق دار التصنیف دار العلوم کراچی ۱۴۔

چمکدار تلوار عطا کرتے ہوئے ارشاد فرمارہے ہیں کہ عزیزم تم دیوبند جا رہے ہو میں تمہیں یہ تلوار دیتا ہوں وہاں پہنچکر میرا یہ تحفہ بعد سلام مسنون شبیر احمد عثمانی کو دے دینا اس کے بعد آنکھ کھل گئی۔

یہ سُنکر علامہ عثمانیؒ نے فرمایا تھا کہ بھائی مسلم لیگ کی فتح یقینی ہے۔ یہی وہ مجددی تلوار ہے جس سے اکبر کی قومیت متحدہ اور دین الٰہی کو فنا کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اب انشاء اللہ العزیز ہم اس مجددی حربہ سے کانگریس کی قومیت متحدہ اور گاندھی ازم کو ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سُلا دیں گے۔"

(حیات شیخ الاسلام ص۴۳)

متحدہ ہندوستان میں مسلم لیگ اور تعمیر پاکستان کیلئے علامہ کی دیگر کوششیں

ان کانفرنسوں کے علاوہ علامہ عثمانی نے ہندوستان کے طول و عرض میں تعمیر و تائید پاکستان اور مسلم لیگ کی خاطر دورے کئے۔ چنانچہ بڑے بڑے شہروں میں تقریریں کیں جلسوں میں شرکت کی۔ بجنور، سہارنپور، مظفر نگر، لکھنؤ، بمبئی، کانپور، دہلی وغیرہ کے دورے اور ہر جگہ تقریریں فرمائیں۔

پاکستان کے معرض وجود میں آنے کیمتعلق ضلع اعظم گڈھ میں علامہ کی غلغلہ انگیز تقریر اور پیشینگوئی، ۱۸ مئی سنہ ۱۹۴۶ء

۱۸ مئی سنہ ۱۹۴۶ء کو ضلع اعظم گڈھ میں جمعیۃ العلماء اسلام کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا آپ نے اس میں ایک زبردست غلغلہ انداز تقریر فرمائی۔ آپ نے فرمایا:۔

"پاکستان مسلمانوں کا پیدائشی حق ہے کہ اس وقت انگریز اور ہندو دونوں پاکستان کو نہیں مانتے لیکن ایسا وقت آئے گا جب یہ دونوں

قومیں ازخود پاکستان دے دیں گی۔ لیکن اس کے لئے ہم کو اپنے بھولے ہوئے فریضے اسلامی جہاد کو پھر سے یاد کر کے عمل کرنا ہوگا۔"

(عصر جدید کلکتہ یکم جون سنہ ۱۹۴۶ء)

حضرت علامہ عثمانی کی تقریر کو بغور ملاحظہ فرمائیے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ پاکستان کی پیشینگوئی فرما رہے ہیں جو پوری ہو کر رہی اور انگریز اور ہندوؤں نے پاکستان کو تسلیم کر لیا۔

علامہ کی صدارتی تقریر بمبئی میں مارچ سنہ ۱۹۴۶ء

عصر جدید کلکتہ مورخہ ۱۲ / مارچ سنہ ۱۹۴۶ء کی اشاعت میں علامہ کی بمبئی جمعیۃ العلمائے اسلام کی پہلی کانفرنس کی تقریر کے ایک جزکا حوالہ ان الفاظ میں پیش کرتا ہے۔

علامہ نے بمبئی کانفرنس کی صدارت فرمائی اور چند دیگر صاحب، مسٹر عبد القادر اور مسٹر عبد العزیز صاحب ایڈووکیٹ نے اس کانفرنس کا انتظام کیا۔ علامہ نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا:۔

"پاکستان نہ کوئی نعرہ ہے نہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفی قدم۔ یہ نفرت کی پیداوار نہیں جیسا کہ کہا جا رہا ہے۔ یہ نظریہ اس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ مختلف صوبوں میں کانگریسی وزارت کے قیام کے بعد لاہور میں قرارداد منظور کی گئی۔ میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ قرارداد لاہور کا مطالعہ کریں۔ آپ پر حقیقت منکشف ہو جائے گی۔ ہندوستان ہم لوگوں کا ہے۔ برطانوی حکمرانوں کو چاہیئے کہ وہ اسے مسلمانوں کے حوالے کر دے۔ گو فی الحال ہم صرف ایک تہائی حصے کے خواستگار ہیں۔" (عصر جدید ۱۲ / مارچ سنہ ۱۹۴۶ء)

⁂ ⁂ ⁂

اردو پارک دہلی میں علامہ کی تقریر، اپریل ۱۹۴۶ء

اردو پارک دہلی میں جناب نواب قدیرالدین صاحب کی صدارت میں جو مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہوا اس میں تقریر فرماتے ہوئے علامہ عثمانی نے کہا :-

" مسلمان اس کے قائل نہیں کہ حکومت بعد از آزادی ہندوؤں کو مل جائے اور مسلمان ان کے محتاج ہو جائیں ۔ مسلمانوں نے اس مطالبۂ پاکستان کو بروقت پیش کر دیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کو بیک وقت آزادی مل جائے " ..... میرے بھائیو یاد رکھو کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے سوچ لو اور سمجھ لو یہ دیکھو کہ کہنے والا کیا کہہ رہا ہے ۔ خواہ کہنے والا کوئی ہو ۔ ور اگر تمہارے مفاد کی بات پیش کرے تو اس کو قبول کر لو " (عصر جدید ۲۷ اپریل ۱۹۴۶ء)

" یہ ڈاڑھی منڈے گنہگار سہی ، مسلمان تو ہیں ۔ ہم ان سے وقت آنے پر خدا اور رسول کا واسطہ دے کر مذہب کے نام پر ان کو خاموش تو کروا سکتے ہیں ۔ ہم کو یہ تو بتلاؤ کہ گاندھی اور نہرو کو کس کا واسطہ دے کر تم خاموش کروا سکتے ہو " (عصر جدید ۲۷ اپریل ۱۹۴۶ء)

کابینہ مشن کی اپریل ۱۹۴۶ء میں آمد علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کا وفد کو تار

۱۹ فروری کو دارالامراء میں لارڈ لارنس نے اور دارالعوام میں مسٹر ایٹلی نے یہ اعلان کیا کہ ہندوستانی کی موجودہ سیاسی کشمکش کے حل کرنے کے لئے ایک وفد ہندوستان روانہ کیا جائے گا ۔ چنانچہ برطانوی کابینہ نے مارچ ۱۹۴۶ء میں اس تجویز کے مطابق تین آدمیوں کا وفد روانہ کیا ۔ اس وفد کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے آئین کی کوئی تشکیل سوچی جائے اور اس کے دستور کی کوئی صورت نکالی جائے ۔

۱۵ مارچ ۱۹۴۶ء کو لارڈ اٹیلی نے دار العوام میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اقلیت کے حقوق کا ہمیں پورا احساس ہے اور یہ کہ اقلیت خوف سے محفوظ اور آزاد رہ سکے لیکن دوسری طرف ہم یہ اجازت نہیں دے سکتے کہ اکثریت کی ترقی کے خلاف اقلیت ویٹو (اختیار امتناع) استعمال کرے۔ (پاکستان ناگزیر تھا از سید حسن ریاض کراچی ۱۹۶۷ء ص ۳۸۳)

جب یہ وفد ہندوستان پہنچا تو حضرت علامہ عثمانی نے وفد کو ایک تار بھیجا جس میں پاکستان کے مطالبے پر شد و مد سے زور دیا گیا تھا۔ آپ نے وفد کو متنبہ کیا کہ اگر آپ لوگوں نے ہمارے نظریۂ پاکستان کو نظر انداز کیا تو اس کے نتائج نہایت سنگین ہوں گے۔ آپ نے تار میں تحریر فرمایا:-

"پاکستان ہماری قوم کا کم از کم مطالبہ ہے۔ ہر دو اقوام ہند کے مراکز اقتدار و حکومت خود اختیاری الگ الگ اور جداگانہ ہوں۔ مسلم لیگ کو نظر انداز کرنا پوری مسلم قوم کو نظر انداز کرنا ہوگا۔ اس تاریخی قوم کے برانگیختہ جذبات کو سخت آزمائش وابتلاء میں کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ کہیں ایسے خوفناک نتائج پیدا نہ ہوں جو سب کے لئے ناخوشگوار اور نقصان دہ ہوں۔ ہندوستان کے ایک اہم حصے کو معطل کر کے کابینہ مشن اپنے اعلیٰ مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔" (عصر جدید کلکتہ ۱۴ اپریل ۱۹۴۶ء)

کانپور کانفرنس کی صدارت

مذکورہ بالا کانفرنسوں اور جلسوں کے سوا آپ نے کانپور میں مسلم لیگ کی ایک سہ روزہ کانفرنس میں شرکت کی جس کا انتظام مولانا حکیم سعید الرحمٰن صاحب مہتمم مدرسہ جامع العلوم کانپور نے کیا۔ بلکہ اس کانفرنس کی صدارت فرمائی۔

۲۹ اگست ۱۹۴۹ء کے بعد

۲۹ اگست ۱۹۶۹ء تک مذکورہ بالا مواد راقم الحروف کے قلم سے مسودے کے دو سو اٹھاسی صفحات پر

فل سکیپ کے سائز میں ترتیب میں آیا جو حیات عثمانی کے لئے میری کاوشوں کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوا۔

ترتیب حیات عثمانی کا ایک اور دور بروز منگل ۲۶ ستمبر ۱۹۷۲ء

آج شعبان کی ۱۷ اور سنہ ۱۳۹۲ھ ہے اور ستمبر کی ۲۶ اور سنہ ۱۹۷۲ء منگل کا دن ہے کہ مدت کے بعد حیات عثمانی کی بقیہ تسوید کے لئے راقم الحروف نے قلم اٹھایا ہے جبکہ اس کتاب کی کتابت کا آغاز ہو چکا ہے اور دس پندرہ کاپیاں کاتب صاحب زیر کتابت لا چکے ہیں۔ اس قدر بقیہ مسودے کے لئے تحریر میں تاخیر کی وجہ یہ ہے کہ حیات عثمانی کی کتابت اور طباعت کا کوئی معقول انتظام نہ ہو سکا تھا۔ الحمدللہ کہ قدرت نے اب اس کی طباعت و کتابت کا سامان پیدا کر دیا لہٰذا اشہب قلم بھی اب جولانگاہ میں آ پہنچا۔

دہلی کنونشن سنہ ۱۹۴۶ء میں علامہ عثمانی کی شرکت

مسلم لیگ کا کوئی اہم اجلاس ایسا نہ ہوتا جس میں علامہ شرکت نہ فرماتے۔ انہی کانفرنسوں میں سنہ ۱۹۴۶ء کی دہلی کنونشن ہے۔ اس کنونشن میں دیکھنے والوں کی زبانی میں نے سُنا کہ اجلاس کی شان دیکھنے کے قابل تھی۔ قائد اعظم بھی کنونشن میں تشریف لا چکے تھے لیکن اتفاق سے علامہ کچھ تاخیر سے پہنچے۔ آپ کی وجہ سے کنونشن کی کارروائی قدرے ملتوی کرنا پڑی اچانک علامہ عثمانی کنونشن میں تشریف لا رہے ہیں۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ قائد اعظم ان کے استقبال کے لئے آگے بڑھے اور پرتپاک خیر مقدم کیا اور تمام ممتاز ارکان و رہنما احترام میں کھڑے ہو گئے[۱]

---

[۱] مؤلف کی وفات حسرت آیات کی وجہ سے یہ کتاب یہیں ختم ہو گئی، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

؎ زمانہ بڑے غور سے سن رہا تھا ؛ تم ہی سو گئے داستاں کہتے کہتے

اشفاق احمد قاسمی
۲۳ نومبر سنہ ۱۹۸۱ء

کتابت: حسین احمد نجیب، ۲۰ محرم سنہ ۱۴۰۲ھ

مراثی!

بر وفاتِ

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی

وصال شیخ الاسلام

مکمل ہوتا جاتا ہے زوالِ آدم خاکی
مماتِ کرۂ ارضی مسلّم ہوتی جاتی ہے

حیات اپنے قدم کیونکر جمائے فرشِ گیتی پر
اجل تو مدعی نظمِ عالم ہوتی جاتی ہے

زمانہ جس قدر تاریکیوں میں کھوتا جاتا ہے
اسی نسبت سے دیں کی شمع مدھم ہوتی جاتی ہے

چراغِ علم و عرفانِ سیاست بجھتے جاتے ہیں
یہ محفل اور ویراں اور برہم ہوتی جاتی ہے

تقاضے جیسے جیسے بڑھتے جاتے ہیں تبسم کے
مری آنکھ اور گریاں اور پرنم ہوتی جاتی ہے

سنواروں تو سنواروں کس طرح گیسوئے دوراں کو
سنورتی جاتی ہے یہ زلف برہم ہوتی جاتی ہے

وہاں شیخ الاسلام آہ یہ باور کراتا ہے
کہ ہستی کفر کی ہر لحظہ محکم ہوتی جاتی ہے

وہ عالم وہ فقیہِ دین وہ خضرِ جادۂ عرفاں
وہ علم و فضل کا دریا عمل کا بحرِ بے پایاں

وہ جس نے قولِ پیغمبر کا مطلب ہم کو سمجھایا
کئے ملت پہ جس نے آشکارا معنیٔ قرآں

نکل کر آگیا ملت کی خاطر کنجِ عزلت سے
حقیقت بن گیا اس کی بدولت خوابِ پاکستاں

خدا کا خوف رکھتا تھا خدائی کا فدائی تھا
اِدھر شیدائیِ یزداں اُدھر سودائیِ انساں

اسے چھینا ہے ہم سے موت کے بے رحم ہاتھوں نے
رہا جاتا ہے یہ ظلماتِ غم بے چشمۂ حیواں

مگر اے موت یہ سُن لے ہمارا دین ہے امید
مسلماں کو شکارِ یاس کر لینا نہیں آساں

اُفق کے اُس طرف سے یہ صدا آتی ہے کانوں میں
یقین اے مردِ مومن، عزمِ محکم اے مسلماناں

٭

اخبار امروز ۱۵ دسمبر ۱۹۴۹ء

٭

شیخ الاسلام

علامہ شبیر احمد عثمانی

(از شجاع احمد زیبا)

تقدیر پہ شکوہ نہ فلک پر الزام
ہے موت ہی دراصل بشر کا انجام
کیا کم تھا غمِ وفاتِ قائدِ زیبا
اب ہم سے جدا ہو گئے شیخ الاسلام

(امروز اخبار لاہور)

رحلتِ شبیر

(حافظ امرت سری)

ایک چرکا فلک نے اور دیا
موت کی زد میں آ گئے شبیر
خون روتے ہوئے ستاروں کے
منہ سے نکلا کہ مسلمِ دلگیر
بجھ گیا تیری انجمن کا چراغ
اٹھ گیا ایک اور عالی دماغ

آہ! علامہ شبیر احمد عثمانی

(از راز یوسفی)

کیوں نہ سکوں ہو درہم برہم — موت العالِم، موت العالَم
کوچہ بہ کوچہ، خانہ بہ خانہ — برپا ہے شبیرؒ کا ماتم
ملت بیضا تیری قسمت — آہ و بُکا اور نالۂ پیہم
ٹوٹ پڑا ہے کوہِ الم اِک — قلب ہے بھاری آنکھیں پُرنم

چرخ ستمگر تیرا بُرا ہو
چھین لیا اسلام کا ضیغم

آپ تھے پیکر فہم و ذکا کے — اور پیمبر دینِ ہُدیٰ کے
چشمِ فلک نے کم دیکھے ہیں — ماننے والے ایسے خدا کے
شمعِ رسالت کے پروانے — اور دل دادہ اہل وفا کے
علم و عمل کے سچے پیکر — ایک نمونہ صدق و صفا کے

مکر و ریا سے پاک تھا سینہ
سرچشمہ تھے جود و سخا کے

تو ہی بتا اے چرخِ ستمگر — اس کی تلافی ہوگی کیوں کر
کس دنیا سے ڈھونڈھ کے لائیں؟ — آپ سے بڑھکر آپ سے بہتر
کہاں ہے تیری نظر میں کوئی؟ — آپ کا ثانی آپ کا ہمسر
کیوں کر وہ خاموش رہے گا — چھوٹ گیا ہو جس کا مقدر

اس کشتی کا اللہ حافظ
ٹوٹ چکا ہو جس کا لنگر

(زمیندار ۲۴ دسمبر ۱۹۴۹ء)

وفات علامہ عثمانی

(مکتوب مولانا محمد یحییٰ بنام مولانا خیر محمد صاحب)

مکرم و محترم حضرت مولانا خیر محمد صاحب دامت برکاتہم۔

بعد سلام مسنون آنکہ گرامی نامہ صادر ہوا۔ اس حادثۂ جانکاہ سے دل و دماغ متاثر ہے۔ آپ کے تسلی آمیز کلمات سے سکون ہوا۔

حضرت (مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی) رحمۃ اللہ علیہ کی تقریباً ویسی ہی حالت تھی جیسی کہ چند روز قبل آپ نے دار العلوم کے جلسے کے موقع پر دیکھی تھی یعنی عام صحت پہلے سے بہتر ہی تھی، جامعہ عباسیہ بہاولپور کی تعمیر جدید کا سنگ بنیاد رکھنے اور نصاب وغیرہ کے سلسلے میں مشورہ کیلئے ۸ ردسمبر کو بہاولپور کے لئے روانہ ہوئے۔ ۱۲ ر کو رات بالکل اچھے تھے۔ ۱۳ ر کی شب میں بخار ہوا اور سینہ میں کچھ تکلیف رہی۔ صبح کو طبیعت ٹھیک ہوگئی تھی۔ ۹ بجے پھر سینہ میں تکلیف ہوئی سانس میں رکاوٹ اور گھٹن محسوس ہوئی۔ علاج اور تدبیر بے سود رہی اور گیارہ بجکر چالیس منٹ پر واصل بحق ہو گئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حق تعالیٰ ان کے مدارج بلند فرمائے اور ہم کو جنت الفردوس میں ان کے ساتھ جمع کرے۔ آپ حضرات کی محبت اور ہمدردی کے لئے ہم سب وابستگان خاندان بدل شکر گذار ہیں۔ والسلام

محمد یحییٰ۔ کراچی

۲۰ ردسمبر ۱۹۴۹ء

نوٹ:- علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات وزیر تعلیم بہاولپور اسٹیٹ کی کوٹھی پر واقع ہوئی ۔ مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ متوفی اکتوبر ۱۹۶۵ء بمقام مدینہ منورہ جو اس وقت بہاولپور میں مقیم تھے مولانا عثمانی کو غسل دیا ۔ پھر آپ کی میت کو لکڑی کے تابوت میں بند کر کے کراچی لایا گیا جہاں بے شمار مسلمانوں نے نماز جنازہ پڑھی اور مفتی محمد شفیع صاحب نے نماز پڑھائی اور آپ کا جسد خاکی اسلامیہ کالج جمشید روڈ کراچی میں سپرد خاک کر دیا گیا ۔ اسلامیہ کالج تو بعد میں بنا جو دراصل اسلامک ایجوکیشنل سوسائٹی کے ماتحت کھولا گیا ۔ علامہ اس سوسائٹی کے صدر تھے ۔ میں کئی بار مزار پر انوار پر حاضر ہو کر فاتحہ خوانی کرتا رہا ہوں اور مزار کا گرد و غبار بھی بعض اوقات صاف کیا ہے ۔ برابر میں جناب مولانا سید سلیمان ندوی کا مزار ہے جو اس وقت زمین میں دھنس گیا تھا ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

تاریخہائے وفات مولانا شبیر احمد عثمانی

حفیظ ہوشیار پوری

امام المتقین شبیر احمد عثمانی

۱

رختِ ہستی از جہاں بربست آں عالی مقام
جانبِ ملکِ بقا، از عالمِ فانی برفت
او بہ جنّت آرمیدہ ما بہ دنیا سوگوار
اشکِ غم در چشم و برلب "ہائے عثمانی" برفت

۲

شیخ الاسلام از جہاں رفت
کز خلد بریں رسید پیغام
رضواں اورا چو دید گفتا
شیخ الاسلام خلد آرام
۶۱۹ ۴۹

آہ وصال شبیر احمد عثمانی

آہ وصال علامہ روزگار شبیر احمد عثمانی
وائے شیخ الاسلام شبیر احمد مرحوم
۱۹ ۶ ۴۹

(روزنامہ امروز کراچی جمعرات ۱۵ دسمبر ۱۹۴۹ء)

تاریخ وفات
شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی

(علامہ سیماب اکبر آبادی)

افسوس کہ علامہ شبیر احمد — دُرِ بہا و لیپور کرد از دہر خرام
بست و یکم از صفر بُد سہ شنبہ — از بزم جہاں رفت علیم علّام
آں عالم دین و مفتئ پاکستان — در خُلد گزید بعد وقائد آرام
خاکش بہ کراچی چو سپردند بہ خاک — از خلق بلند شد صدائے کہرام

سیماب بسال رحلتش تعجیلاً
گفتم قدسی اساس شیخ الاسلام
۶۹ ھ ۱۳

(روزنامہ امروز کراچی ۱۹ / دسمبر ۱۹۴۹ء)

تاریخ وفات حضرت شیخ الاسلام

(از ریاض محمود صاحب بخاری)

دریغ روپوش گشت از چشم لولوئے آب و تابِ ملت
مزید کردند حیف بابِ غمِ دِگر در کتاب ملت
چو سوزِ داد وقتِ فرصت برائے تاریخ وصال رحلت
ریاض محمود! گفت حکمت "نہاں شدہ آفتابِ ملت"
۱۳۶۹ ھ

(روزنامہ زمیندار ۳۱ / دسمبر ۱۹۴۹ء)

قطعہ تاریخ وفات حضرت شیخ الاسلامؒ

(از پیر غلام دستگیر صاحب نامی)

مرتحل شد چوں شیخ عثمانی — دلِ ما شد ز تیغِ غم دو نیم
گفت نامی بسالِ رحلتِ او — شیخ الاسلام قدوۂ اقلیم
۱۳۶۹ھ

زمیندار ۱۶ر دسمبر ۱۹۴۹ء

تاریخ وفات

(از قریشی احمد حسین احمد قلعداری)

بروفات حضرت شبیر احمد پاک زاد! — نالہ ہا افتاد، در دل رنج و غمہا شد مکیں
آہ رفت از ما امام و افتخار عالماں — خادم شرع متیں و رونق دنیا و دیں
چوں برائے سال عام الحزن کردم جستجو — بروفات فخر ملت بادل اندوہگیں

با حساب ابجد۔ ایں با من سروش غیب گفت
"آسماں راحق بود گر خون ببارد بر زمیں"
۱۸۶۸+ ۸۱ ء ۱۹۴۹ ء

دریغا کہ شبیر فرخ نہاد — ز باغ جہاں رفت خود چوں بہ بست
ز دردش سن اوست۔ آشوب سخت — وگر از "امام بلند اختر" است
۱۳۶۹ھ — ۱۳۶۹ھ
رفت چوں از دھر مولانائے ما — با فروشان و شکوہ و تمکنت
چوں زتخت سلطنت برداشت پا — سال او بشمرز "تخت سلطنت"
۱۳۶۹ھ
رفت بفردوس امام زماں — یعنی کہ از بزم جہاں خوش بخفت
دید بفردوس چو رضوان اورا — "خسرو فرخندہ قدم" سال گفت

(زمیندار ۲۵ر دسمبر ۱۹۴۹ء)

مادۂ تاریخ وفات حسرت آیات؛

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

(از نتیجۂ فکر جناب مولانا محمد ادریس صاحب صدر مدرس
مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی)

علم و عمل، بذل و بحث، حکمت، کلام و اتقا
دستِ قضا نے آہ سب کو بے سروپا کر دیا

ل	۳۰۰
م	۴۰
ذ	۷۰۰
ح	۸
کم	۶۰
لا	۳۱
تق	۵۰۰

۱۳۶۹ھ

ل = ۳۰۰   م = ۴۰

ذ = ۷۰۰   ح = ۸

تاریخ الوصال

۶۹ ھ ۱۳

"صاحب جاہ رکن محترم دستور ساز اسمبلی"

۴۹ ء ۱۹

"نور اللہ تربتہم"

۶۹ ھ ۱۳

شیخ الاسلام و شیخ پاکستان — آہ دنیا سے ہو گئے رخصت
وائے قسمت لکھے تھے قسمت میں — یاس و حرماں غم و الم حسرت
مہر دینِ متین غروب ہوا — سارے عالم پہ چھا گئی ظلمت
موت عالِم ہے موت عالَم کی — ہر زباں پر ہے "یہ" بصد حسرت
زندگی بے ثبات ہے۔ لیکن — جاودانی ہے یہ غمِ فرقت
اٹھ گئے ایک باکمال بزرگ — حیف اے نامرادیٔ قسمت
ہے دعائے عزیز محشر میں — ان پہ ہو خاص سایۂ رحمت

سرِ حسرت سے کہئے سال وفات
"شیخ الاسلام کر گئے ہجرت"

تاریخ الوصال

۱۳ ھ ۶۹

علامۂ دہر قبلۂ طالباں مولانا شبیر احمد عثمانی

۱۹ ع ۴۹

شیخ الاسلام والا قدر پاکستان

۱۹ ــــــ ء ــــــ ۴۹

ادخلہ اللہ المحی فی الجنۃ

۱۳ ــــــ ھ ــــــ ۶۹

"از خامہ سید حبیب احمد اُفق کاظمی"

۱۹ ء ۴۹

فاضلے جامعہ اسلامیہ شہر امروہہ

۱۹ ء ۴۹

مولانا شبیر احمد عثمانی ! — علامۂ خوش نصیب اسلام گذشت

شیخ المتکلمین و رازیٔ زمان — دانشمند لبیب اسلام گذشت

بیمثل امام فقہ و تفسیر و حدیث — اہل قلم و خطیب اسلام گذشت

امراض قلوب را دمش بود مسیح — آں روحانی طبیب اسلام گذشت

تاریخ وصالِ او ہمین است اُفق

"شیخ الاسلام ، ادیب اسلام گذشت"

۱۹ ع ۴۹

(زمیندار ۲۹ دسمبر ۱۹۴۹ء)

تاریخ وفات حضرت شیخ الاسلام

(از مضطر نظامی بی۔ اے)

جس کی شمع علم سے پُر نور کل تک بزم تھی
بزم میں اس صاحب تنویر کا ماتم ہے آج
آہ اب صدق و یقین کی راہ دکھلائے کا کون
سالکوں میں ایک مرد پیر کا ماتم ہے آج
کون اب کوثر لٹائے گا ہمارے واسطے
مردِ مومن، عالمِ تفسیر کا ماتم ہے آج
اب دلوں کی کھیتیاں سرسبز ہو جانے کو تھیں
ابر رحمت بار کی تاثیر کا ماتم ہے آج
از سرحیف دیا! لکھ اے نظامی سال داغ
سارے پاکستان میں شبیر کا ماتم ہے آج
۱۹۳۹ + ۱۰ = ۱۹۴۹ء

امیرِ ملّت سے

(صوفی شیدا کاشمیری)

⁂ ⁂ ⁂

اے کہ تو ہے پیکرِ روحِ صداقت بالیقیں
اے کہ تو ہے مایہ دارِ شان سطوت بالیقیں
اے کہ تو ہے مردِ مومن جانِ ملّت بالیقیں
اے کہ تو ہے مظہرِ اسرارِ وحدت بالیقیں
قلبِ مومن میں مگر سوزِ محبّت کیوں نہیں ؟

ہم نے قیصر اور کسریٰ کو مٹایا ! یاد ہے
آدمی کو خوابِ غفلت سے جگایا ! یاد ہے
نعرۂ تکبیر سے محشر اٹھایا ! یاد ہے
جو نہ کوئی کر سکا وہ کر دکھایا ! یاد ہے
آج ہم میں جذبۂ شوقِ شہادت کیوں نہیں ؟

زندگی و موت کا ربطِ بہم ہے لازوال ،
آج تیری قوم کا کوئی نہیں پرسانِ حال ،
قوم کے سردار سے ہے قوم کا بھی اک سوال
تو نے سوچا بھی کبھی قومِ مسلماں کا مآل
ہم مسلمانوں میں وہ رسمِ اخوّت کیوں نہیں ؟

تو امیر المومنین ہے قوم کا سردار ہے
تو فروغِ انجمن تو رونقِ گلزار ہے
حکمراں ہے تو قوم کا مختار ہے
قوم کا معمار ہے تو قوم کا غمخوار ہے
عدلِ فاروقی کا منظر پھر دکھا دے ایک بار
وارث قرآں کو پھر مسلم بنا دے ایک بار

قطعۂ تاریخ وفات حضرت شیخ الاسلام

(از پیر غلام دستگیر صاحب نامی)

مرتحل شد چوں شیخ عثمانی — دل ما شد ز تیغِ غم دو نیم
گفت نامی بسال رحلت او — شیخ الاسلام قدوۂ اقلیم

۱۳۶۹ھ

✲ ✲ ✲

عاطر

آہ! شبیر احمدؒ

شد ہویدا قیامت صغریٰ — یعنی بگذشت از جہاں شبیرؒ
عاطر ارکانِ عرش می گویند — حیف زیرِ زمیں مہرِ منیر

کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ

سرزمینِ پاک کا ہے آج ہر ذرّہ اُداس — آج پہنا ہے فضاؤں نے بھی ماتم کا لباس
آج روتی پھر رہی ہے آرزوئے پختہ کام — آج محوِ رنج وغم ہے عقل و دانش کا مقام
آج ہے ہنگامِ دردو نالہ و آہ و فغاں — آج ہے چشمِ تصور سے بھی جوئے خوں رواں
ہو رہا ہے خلوتوں میں صرصرِ غم کا گذر — آج ہے کھوئی ہوئی سی زیبِ آغوشِ نظر
چھا چکا ہے مطلعِ منطق پہ آج ابرِ ملال — سوچتا ہے فلسفہ اپنی تمنّا کا مآل
آہ کے ہاتھوں ہے سینہ کوبیٔ لیل و نہار — علم و حکمت کی نگاہوں میں ہیں اشکِ سوگوار
بے خودی کے دوش پر ہے نالہ و شیون کا زور — ضبط کی دنیا پہ قابض ہو چکا ہے آج شور
غمزدہ ارماں، امیدیں آج محوِ اضطراب — کھا رہی ہیں فکر کی گہرائیاں بھی پیچ و تاب
طائرانِ خوش نوا مبہوت ہیں خاموش ہیں — گلستاں کے گلستاں مغموم ہیں بیہوش ہیں
سنسناہٹ کر رہی ہے محفلِ عرفاں پہ راج — ولولے پہنے ہوئے ہیں سر پہ کلاِ یرانی کا تاج

سوچ میں ہیں کوہ و دشت و بحر و بر یہ کیا ہوا؟
کون آخر اس جہاں سے کوچ یکدم کر گیا؟

کون آخر دے گیا داغِ جدائی قوم کو؟ — کس نے آخر پا لیا ہے جاودانی "نوم" کو؟

کس کے غم میں ہے نشاط دو جہاں اندوہناک؟ کس کا ماتم کر رہی ہے آج روحِ ارضِ پاک؟

آج بس اتنا ہی سمجھا دے ہمیں ربِّ غفور!
کون تھا وہ؟ آج کیوں بیتاب ہیں عقل و شعور

دفعتاً آئی ندا! اے رہروانِ جستجو! ہم بتا دیتے ہیں تم کو لیکن فاصْبِرُوْا
تم جسے شبیر عثمانی کہا کرتے رہے آج ہم نے لے لیا آغوشِ رحمت میں اُسے

کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَۃٌ[۱] سے آشنا تم بھی تو ہو
رحمتوں کا لینے والے آسرا تم بھی تو ہو

غمِ شبّیرؒ

(حکیم ناظر حسین شاہ زنجانی)

جادہ نوردِ منزلِ عرفاں چلا گیا
آئینِ مصطفٰے کا نگہباں چلا گیا
محمود[۲] کے چمن سے نسیمِ سحر گئی
لالہ طرازِ بزمِ گلستاں چلا گیا
اس بزم میں تھا قائدِ اعظم کا ہم نشیں
یا رب کہاں وہ مردِ مسلماں چلا گیا
تربت پہ اس کے رحمتِ ربِ قدیر ہے
حلقہ بگوشِ خواجۂ گیہاں چلا گیا

---

۱ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ۲ شیخ الہند محمود الحسنؒ

آہ! شبیرؒ

(شریف فاروق)

ناموسِ مصطفےٰؐ کا نگہبان چل بسا!
سرمایہ دارِ حاصلِ قرآن چل بسا!

سر پیٹتی ہے دیکھ وہ ملت کی تیرگی
ہم بے کسوں کا مایۂ عرفان چل بسا

تاریکیوں کا دور ہے غمناک ہے فضا
ملت کا درد مند نگہبان چل بسا

شعلہ بھڑک اٹھا مرے قلب و جگر میں آج
وہ پیکرِ جلیل و حُدی خوان چل بسا

تاکا ہے آج موت نے کیوں مرا گھر حضورؐ
وہ شیخِ دین و صاحبِ ایمان چل بسا

وفاتِ امامِ ملّتؒ

٭ ٭ ٭

(صوفی شیدا کاشمیری)

امیرِ قوم و شبیر احمد عاملِ قرآں
فروغِ ملت بیضا، چراغِ محفلِ عرفاں

رموزِ دیں کا ماہر، عزم و استقلال کا پیکر
جو پاکستان میں تھا عالمانِ دیں کا سلطاں

منور جس کے فیضِ علم سے تھی شمع ایمانی!
گنہ کارانِ ملّت میں تھا بیشک صاحبِ ایماں

وہ آغوشِ اجل میں سو رہا ہے وائے ناکامی
غلامِ خواجۂ یثرب، ندیمِ قومِ پاکستاں

ذہانت میں فطانت میں بصیرت میں لیاقت میں
نہ ہم سر اس کا پیدا کر سکے گی گردشِ دوراں

ہے قانونِ الٰہی گرچہ کل من علیہا فان
فنا ہوتا نہیں لیکن نشانِ بندۂ یزداں

علامۃ العصر

مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ

کی یاد میں

از جناب مولینا محمد یوسف صاحب بنوری (نور اللہ مرقدہٗ)

(سابق شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (و بانی جامعۃ العلوم الاسلامیہ، کراچی)

البرہان جنوری ۵۰ء

ہمارے فاضل رفیق مولانا محمد یوسف صاحب بنوری نہ صرف یہ کہ حضرت علامہ مرحوم کے مخصوص تلامذہ میں سے ہیں بلکہ سالہا سال تک انہیں مرحوم کی معیت و رفاقت کا شرف حاصل رہا ہے ان دنوں آپ ہی مرحوم کی جگہ جامعہ ڈابھیل کے شیخ الحدیث ہیں

(مدیر)

یا عین جودی بعقد الدمع کالدرر
جودی بدمع فلا تبقی ولا تذر
جودی بدمع غزیرہا مہطل
ینزری بمزن ہمی من صیب المطر
جودی بدمع شجی ہائد قلق
جودی بفقد شئون غیر منحدر

اخری العیون بان تذری مدامعها
عین بکت خطبها من غیر مصطبر
انعی الیک اماماً عالماً فطناً
شیخاً کبیراً جلیل القدر والفخر
انعی الیک وحید الدهر عالمه
بحراً محیطاً ملیئ القعر بالدرر
شبیر احمد شیخ القوم قدوتهم
دعاه رب کریم واسع القدر
لبّا الالٰه کریماً اذ دعاه ضُحیً
ضیفاً نزیلاً غریباً راح فی سفر
محدّث بارع مفسر ندُس
حبر کبیر دقیق البحث والفکر
علامة ذُکیٌ فهامة لَسِنٌ
روض انیق جمیل النَّور والزهر
محقق العصر فی علم وفی حکم
مُحَنّک الدهر فی صعب وفی حصر
فی قلبه علم قرآن وحکمته
یبدی معارفه فی کل محتضر
کم من مشاکل علم غاص لجتها
وحلها بدقیق الفکر غیر مقتصر
کم من دقائق بحث تام یکشفها
کم من حقائق ابدت دقة النظر

اذا ارتقى فى اعـال الربى لاح لـه
مـا فى الغيوب هنـا من كل مستتر
تريك نور الـذكاء سيماء غرته
اذا ابتلج فى مستصعب الخبر
مفكر طالمـا اشجت بدائعه
اولى النهى ببديع الرأى كالزهر
مـدبر طالمـا اذهت محاسنه
فى كل معترك من كل مستعر
حلـم وقـار اناءة تـزينه
خطابتـه، منطق كاللؤلؤ النثر
غور وفكر فراسة وحليته
خطابـه فى الندى عقد من الدرر
اضحت لخطبته الالباب حائرة
ترى سكارى رحيق النطق من سكر
يموج موجا كموج البحر ملتطما
اذا قام حبرا خطيبـًا ناشر الحبر
اضحت عبارته من حسن عارضة
تجلو الغياهب والاوهام كالقمر
بالفضل متسم بالنبل مرتسم
بالصدق معتصم فى كل مشتجر
بالعلم مدثر بالفهم متزر
بالحزم مشتمل فى كل مغتمر

جلا الظلام بنور راق منظره
بفتح ملهمه فی خدمة الاثر
فاحت بلاد بعرف من فوائره
جاءت کدرّ یتیم غالی الدرر
تجلو غیاهب ذی زیغ اذا قرأت
بحسن فکر وطبع صافی الکدر
حاز المفاخر والعلیاء مرتدیا
بثوب عز رفیع طیب عطر
له المفاخر فی الاعیان ناطقة
له المآثر فی ذهو وفی نضر
له البدائع فی الافکار بادیة
له الروائع تترى عند ذی النظر
سل ارض هند تسند من مفاخره
جاءتک ناطقة من کل مفتخر
سل دولة فی بسیط السند قائمة
تنبیک دستوره بالدین فاعتبر
هو المشمر فی تائید مقصده
حتی تاکد منه العقد بالبصر
خطب الم علی الاسلام حین قضی
نحبا وامر الوری لم یقض من وطر
فالقلب فی عمد والروح فی کمد
والنفس فی کبد والعین فی همر

هذا الذی ملأ الأفاق سمعته
درسا و تالیف کتب خیر مدخر
ترثیه جامعة تبکیه عاصمة
جلیدة کمدًا فی صیب العبر
ترثیه اقلام علم ثم حجرة
مدارس کتب مکاتب الزبر
یرثیه منبرهم ویبکیه جامعهم
ترثیه حفلتهم فی البدو والحضر
یا قلب مه هذه دنیا و نعمتها
تفنی سریعًا و قد جاءتك بالعبر
یبقی الاله ولا یبقی بریته
فاصبر بصبر جمیل وارض بالقدر
فکل حی من الدنیا مفارقها
وکل جاء غریب جاء للسفر
یارب انزل علیه صوب غادیة
وطفا تسقی ثراه نائض الدرر
وارفعه عندك فی الفردوس منزلة
یاوی الی کتف فی غایة الحضر
وطفاء دیمتك المدرار نائفة
ترجی لمحل من الغبراء مفتقر
ثم الصلوٰة علی خیر الوریٰ ابدًا
من جاء بالنور فی الظلماء للبشر

شیخ الاسلام کی وفات حسرت آیات

پر

حزن و ملال کا اظہار

زمیندار (اخبار) کے اپنے نامہ نگار سے

شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی کی رحلت کی خبر نے دنیائے اسلام کو ایک آزمائش میں مبتلا کر دیا ہے۔ شام کو میں نے جب شہر کا چکر لگایا تو ہر چہرہ کو غم کی تصویر میں پایا۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں لوگوں کی زبان پر ایک ہی بات تھی۔ وہ یہ کہ اب اسلامی تعلیمات کمیٹی کو قرآن کے رموز کون سمجھائے گا۔

(زمیندار، ۱۶ر دسمبر ۱۹۴۹ء)

آہ! شیخ الاسلام

(حضرت مولانا ظفر علی خان کے قلم سے)

ایک زمانہ تھا جب خواجہ شیرازی نے فرمایا تھا کہ

حسن ز بصرہ بلال از حبش سہیل از شام
ز خاک مکہ ابو جہل ایں چہ بو العجبی ست؟

دنیا سمجھتی تھی کہ خواجۂ شیراز کے حیرت میں ڈوبے ہوئے قول کا اطلاق حسن، بلال اور سہیل کی مدح اور ابو جہل کی مذمت ہی تک محدود رہے گا لیکن کسی کو کیا معلوم تھا کہ حضرت مولینا محمد قاسم علیہ الرحمہ کی درسگاہ سے بھی ایسے صاحب فضیلت اٹھیں گے جن کے متعلق علامہ اقبال مرحوم کو کہنا پڑے گا کہ

عجم ہنوز نہ داند رموز دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بو العجبی ست
سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بیخبر ز مقام محمد عربی ست

... واقعات نے بتایا کہ دیوبند سے .... ایسے علمائے کرام بھی جلوہ گر ہوئے ہیں جو مولانا محمد قاسم کی تعلیم و حریت کے صحیح معنی میں علمبردار تھے، ان علمائے حق میں سے حضرت شیخ الحدیث مولینا محمد انور شاہ مرحوم اور امام المفسرین حضرت مولینا شبیر احمد عثمانی خاص طور پر شہرت رکھتے ہیں

تقسیم ملک سے پہلے ہندوستان کے جلیل القدر علماء میں سے صرف مولانا شبیر احمد عثمانی تھے جو پاکستان کی تائید و حمایت کرتے رہے جب پاکستان قائم ہوا تو مولینا کراچی تشریف لے آئے اور پاکستان کا نظام اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے کوشش فرماتے رہے، میں مرحوم کا صرف اس لئے معترف نہیں کہ ان کا اٹھنا بیٹھنا کھانا

پینا کتاب وسنت کے مطابق تھا میں اس لئے بھی مرحوم کا مداح ہوں کہ وہ ان چند علمائے کرام میں سے تھے جو کتاب اللہ کے حقائق و معارف پر بالغانہ نظر رکھتے تھے جنہیں شاہ عبدالعزیز، شاہ ولی اللہ اور مولینا محمود الحسن کے بعد قرآن دانی و قرآن فہمی کی پوری صلاحیت تھی، جن لوگوں نے مرحوم کی تقریریں سنی ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مولینا کے ایک ایک لفظ میں علم وعرفان کا سمندر موجزن ہوتا تھا اور ایک ایک بات میں دنیا بھر کے حقائق پوشیدہ ہوتے تھے، میرے وطن کی بدقسمتی ہے کہ وہ ایسے عالم باعمل سے محروم ہوگیا جس کی فکر ونظر نے پاکستان کے مادی خاکے میں شرعی نظام کا رنگ بھرنا شروع کیا تھا۔ اور جو ملک و اہل ملک کو اسلام کی سیزدہ صد سالہ روایات سے منور کرنا چاہتا تھا۔ جو اسلام کے لئے جینا چاہتا تھا اور اسلام ہی کے لئے مرا۔ اللہ تعالیٰ اس بزرگ ملت کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ملت کو اس کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(زمیندار، ۱۶؍دسمبر سنہ ۱۹۴۹ء، ۲۴؍صفر سنہ ۱۳۶۹ھ بروز جمعہ)

اخبار احسان کے ایڈیٹر ابوسعید بزمی اپنے مقالہ اداریہ میں لکھتے ہیں:۔

صبر آزما رحلت!

کل شام یکایک کراچی سے یہ صبر آزما خبر موصول ہوئی ہے۔ کہ مولانا شبیر احمد عثمانی رہگرائے عالم جاودانی ہوگئے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن۔ یہ صحیح ہے کہ اس دنیا میں جو بھی آیا ہے۔ کوچ کرنے کے لئے آیا ہے۔

کسی کا پیدا ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے۔ کہ ایک دن اسے موت سے ہمکنار ہونا ہے۔ آدمی ہر مصیبت سے بچنے کی آس باندھ سکتا ہے۔ لیکن موت کے چنگل سے بچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا ؎

ہر آنکہ زاد، بناچار بایدش نوشید
ز جام دہر مئے کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَان

اس لئے مولانا شبیر احمد عثمانی کا سانحۂ ارتحال اس کارگاہِ عالم کی سُنّتِ جاریہ کی رُو سے تو کوئی ایسا حادثہ نہیں۔ جس پر حیرت و استعجاب کا اظہار کیا جائے۔ لیکن مولانا کی ذات گرامی کو پاکستان کے ساتھ جو وابستگی تھی۔ اور جن کی شخصیت قائداعظم کی رحلت کے بعد ایک واحد مرکزی نقطے کے مانند تھی۔ ان کا یکایک ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جانا ایک ایسا صبر آزما سانحہ ہے۔ جس سے چشم ماتم گسار خدا جانے کب تک اشک بار رہے گی۔ علمائے کرام کی صف میں مولانا شبیر احمد عثمانی اپنی علمی فضیلت اور کردار کی بلندی دونوں اعتبار سے اتنا بلند مقام رکھتے تھے۔ کہ پاکستان تو درکنار دنیائے اسلام میں بھی آپ کے پائے کی ہستی کوئی نہ تھی۔ قائداعظم کی رحلت کے بعد پاکستان کے لئے مولانا محترم جیسی ہستی ایک بہت بڑا ستون تھی۔ جس پر عوام و خواص اعتماد کر سکتے تھے۔ دستور ساز اسمبلی میں اسلامی نکات کی توضیح و تشریح کرنے اور آئین و قوانین کی دفعات کو اسلامی احکام کے سانچے میں ڈھالنے کے معاملے میں ہمیں مولانائے محترم کی ستودہ صفات پر زبردست اعتماد تھا۔ ہم مطمئن تھے کہ جب تک یہ برگزیدہ شخصیت موجود ہے۔ ہمیں یہ یقین رکھنا چاہیئے۔ کہ دستور کی عملی شکل اسلامی احکام کے عین مطابق ہو گی۔ لیکن وائے ناکامی کہ آپ کا سایہ عین اس وقت ہمارے سر سے اٹھا لیا گیا۔

جب کہ ہمیں اس سائے کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔

مولانائے محترم ذہانت و فطانت اور علمی بصیرت و تبحر کے اعتبار سے علمائے کرام میں گلِ سرسبد کی حیثیت رکھتے تھے۔ جس وقت متحدہ ہندوستان کے ظلمت کدے میں کفر والحاد کی تاریکیاں برطانوی اقتدار کے سائے میں پرورش پا رہی تھیں۔ مولانائے عثمانی کی ذات گرامی ہی وہ واحد ذات تھی۔ جس نے عقل و دانش کی روشنی میں اسلامی احکام کی مصلحتیں آشکارا کیں۔ اور متحدہ ہندوستان کے طول و عرض سے متفقہ طور پر "متکلمِ اسلام" کا لقب حاصل فرمایا۔ اس کے علاوہ علماء کی صف آپ اُن چند اکابر میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ جو وقت کی زبان میں سلاست و فصاحت کے ساتھ عام فہم طریقے پر موثر انداز سے اپنا مافی الضمیر بیان کر سکتے تھے۔ یہی خوبی آپ کی تقریر میں بھی تھی۔ پرجوش قسم کا خطیب آپ کو یقیناً نہیں کہا جا سکتا۔ اور اس مقصد کے لئے آپ نے کبھی کوئی جد وجہد بھی نہیں کی۔ اس کے برعکس آپ کا اندازِ گفتار ہمیشہ منطقی ہوتا تھا۔ جو دل سے زیادہ دماغ کو حرکت میں لاتا تھا۔ جن لوگوں کو آپ کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا ہے وہ جانتے ہیں کہ آپ نہایت سلجھے ہوئے اور انتہائی شگفتہ انداز سے بولتے تھے۔ دوران تقریر میں مناسب مواقع پر مناسب اشعار بھی چسپاں کرتے جاتے تھے۔ مگر اس کے باوجود طرزِ کلام کی عالمانہ ثقاہت میں مطلق کوئی فرق نہ آتا تھا۔ آپ کی کوشش ہمیشہ یہ ہوتی تھی۔ کہ سننے والے جو کچھ سُنیں اس پر صرف جذباتی اعتبار ہی سے ایمان نہ لے آئیں۔ بلکہ عقل و دانش کی روشنی میں اس کو صحیح سمجھیں۔ آپ کی یہ خوبیاں دراصل آپ کے سلجھے ہوئے دماغ کا کرشمہ تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ آپ نے شروع میں سیاسیات سے کنارہ کشی اختیار کئے رکھی۔ اور

صرف علوم کی وادی میں گلگشت کرتے رہے۔ لیکن چند سال ہوئے جب کانگریس کے نام پر ہندو امپریلزم کے بڑھتے ہوئے فتنے اور ------- سیلاب کو روکنے کی خاطر مسلم لیگ کے ہمنوا بنے۔ تو عوامی اعتماد و ہردلعزیزی کی جس راہ کو طے کرنے میں دوسرے لیڈروں کو سالہا سال صحرا نوردی کرنی پڑی۔ اُسے آپ نے چند ہفتوں میں طے فرمالیا۔ قائداعظم مرحوم و مغفور پہلی ملاقات ہی میں آپ سے اتنے متاثر ہوئے کہ غالباً یہ کہنا غلط نہ ہوگا۔ کہ علمائے کرام میں سے کسی نے قائداعظم کے قلب کو اتنا تسخیر نہیں کیا۔ جتنا مولانا عثمانی نے کیا۔ قائداعظم کی رحلت کے بعد آپ کے جانشین افراد کا بھی یہی حال تھا۔ اور آج اس واقعے سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا۔ کہ علماء میں مولانا کی ذات گرامی ہی وہ واحد ذات تھی جسے مرکزی کابینہ کے ارکان پر زبردست اثر و رسوخ حاصل تھا۔ آپ صوفی منش بزرگ تھے۔ اور اقتدار و اختیار کے ماحول سے بچ کر چلتے تھے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی۔ تو آج آپ کی حیثیت کابینۂ حکومت کے ایک ذمے دار رکن کی ہوتی۔ دستور ساز اسمبلی کی رکنیت کو بھی آپ نے بادلِ ناخواستہ قبول کر رکھا تھا۔ ورنہ حقیقۃً آپ ان رسمیات سے بہت بلند تھے۔ چنانچہ آپ کئی بار اس اسمبلی سے استعفیٰ دینے کا خیال ظاہر کیا۔ مگر وزیراعظم کے انتہائی اصرار کی بنا پر خاموش ہوگئے۔

لیکن مولانا عثمانی کی خوبیاں ہم کہاں تک گنائیں گے ــــــ سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لئے ــــــ وائے افسوس کہ اب ہمارے

لئے صرف ان کی یاد باقی رہ گئی ہے۔ اور وہ متحرک پیکرِ لطیف ہم سے ہمیشہ کے لئے چھین لیا گیا ہے۔ جو قیام پاکستان کے بعد ہمارے لئے ایک انمول جوہر تھا۔ اور جس نقصان کی تلافی خدا جانے ہو یا نہ ہو اور ہو تو کب تک ہو!

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

پاکستان کے طول و عرض میں شیخ الاسلام کا ماتم

جہلم

(۱۸ر دسمبر) ۱۷۔ دسمبر کو ٹمبر ایسوایسی ایشن جہلم کی ایک میٹنگ زیر صدارت حاجی محمد عمر صاحب سوداگر چوب منعقد ہوا۔ جس میں شیخ الاسلام مولینا شبیر احمد عثمانی وفات حسرت آیات پر افسوس کا اظہار کیا گیا اور ان کے پسماندگان سے اظہار ہمدردی کیا گیا۔ (محمد احسان بٹ)

وزیرآباد

(ڈاک سے) ۱۴ر دسمبر کو مہاجر لیگ وزیرآباد کے زیر اہتمام مسلمانان وزیرآباد کا ایک عظیم الشان جلسہ زیر صدارت مولوی محمد رمضان صاحب خطیب جامع مسجد بازار کلاں منعقد ہوا۔ جس میں حسب ذیل قرارداد پاس کی گئیں:۔

یہ جلسہ حضرت شیخ الاسلام مولینا شبیر احمد عثمانی کی وفات حسرت آیات کو تمام عالم اسلام کا ایک المناک حادثہ تصور

کرتا ہے۔ اور مسلمانان پاکستان سے درخواست کرتا ہے۔
کہ حضرت مولانا کی مساعی جمیلہ کو عملی جامہ پہنانے کی سرگرم کوشش
کریں۔ جو قانون شریعت قائم کرنے کے سلسلہ میں مرحوم انجام
دیتے رہے۔

علاوہ ازیں حسب ذیل مقامات پر مختلف انجمنوں اور اداروں کی طرف سے ماتمی جلسے منعقد کر کے تعزیت کی قرار دادیں پاس کی گئیں۔ ایصال ثواب کے لئے قرآن خوانی کی گئی۔ کاروبار بند رکھے گئے اور مساجد میں مغفرت کی دعائیں کی گئیں:

اسلامیہ ہائی سکول منٹگمری (ساہیوال) کریانہ مرچنٹس ایسوایسی ایشن سرگودھا۔ وکیشنل ٹریننگ سنٹر سیالکوٹ۔ انجمن اصلاح المسلمین پنڈی بھٹیاں ضلع گوجرانوالہ۔ بلوکی ضلع لاہور۔ گوندل۔ دارالعلوم حقانیہ و مدرسہ اسلامیہ تعلیم القرآن اکوڑہ خٹک۔ مسلم نیشنل گارڈ لاہور چھاؤنی۔ مغل پور (لاہور) سٹی مسلم لیگ پشاور۔ انجمن اتحاد و ترقی رشی نگر لاہور۔ کوئٹہ (بلوچستان)۔ نیشنل گارڈ بھکر ضلع میانوالی۔ انجمن اسلامیہ لاہور چھاؤنی۔ پیس گڈز ایسوسی ایشن پشاور۔ حلقہ ادب اسلام کراچی۔ مومن کانفرنس خلاص پور ضلع جہلم۔ چیمبر آف کامرس رحیم یار خان ریاست بہاولپور۔ ضلع جمعیت الانصار ملتان۔ جمعیت العلمائے اسلام فورٹ سنڈیمن (بلوچستان)۔ جامعہ محمدی شریف ضلع جھنگ۔ مدرسہ عربیہ اسلامیہ منڈی بوریوالہ۔ انجمن مدرسہ اسلامیہ حلیمیہ چک $\frac{60}{5-L}$ ضلع منٹگمری۔ اسلامیہ آئین ساز مجلس العلماء پرانی انارکلی لاہور۔ ڈیرہ اسماعیل خاں۔ گورنمنٹ ہائی سکول سرگودھا۔ مجالس اطبائے پاکستان لاہور۔ ٹیچر ایسوسی ایشن اسلامیہ ہائی سکول راولپنڈی۔

ہول سیل کلاتھ مارکیٹ سوسائٹی لاہور۔ بزم توحید میر پور خاص (سندھ)
مسلم پنچایت و کشمیر کمیٹی جیمس آباد (سندھ) سٹی مسلم لیگ مظفر گڑھ۔ ضلع مسلم نیشنل
گارڈ مردان۔ انجمن ضیاء الاسلام فیض باغ لاہور۔ شیعہ اثنا عشری جماعت
پشاور۔ مدرسہ عربیہ نعمانیہ و جمعیت المسلمین کہروڑ پکا ضلع ملتان۔ شجاع آباد،
خاکوانی ضلع اٹک۔ ضلع و سٹی مسلم لیگ شیخوپورہ۔ حافظ آباد ضلع گوجرانوالہ۔
موضع سفرونہ، موضع گیانکل، موضع چار باغ، موضع نواکلی، موضع شیخ جاز
وغیرہ تحصیل صوابی ضلع مردان۔ مدرسہ عربیہ حنفیہ ٹمپل روڈ لاہور۔ مزنگ لاہور۔
مسیحی ہمدرد سوسائٹی لاہور۔ قومی رضا کاران لاہور۔ سٹی لیگ کونسل و ینگ
ورکرز ایسوسی ایشن جہلم۔ انجمن اساتذہ ایم۔ بی ہائی سکول منڈی بہاؤالدین
ضلع گجرات۔ نظامی آرٹ سوسائٹی بھکر ضلع میانوالی۔ مہاجر لیگ راولپنڈی۔
آڑھتی ایسوسی ایشن منڈی بہاؤالدین ضلع گجرات۔ سٹی مسلم لیگ گجرات۔
انجمن تبلیغ الاسلام چونڈہ ضلع سیالکوٹ۔ چوہا سیدن شاہ ضلع جہلم۔
مسلم لیگ رینالہ خورد ضلع منٹگمری۔ جماعت اسلامی ضلع مظفر گڑھ۔ مسلم لیگ
رنگ پور بگور تحصیل خوشاب۔ مسلم لیگ ہنڈری کیمپ۔ جمعیۃ العلمائے پاکستان
سلانوالی ضلع سرگودھا۔ گوگڑاں ضلع ملتان۔ چک 62/E-B ضلع منٹگمری۔
پوڑمیانہ ضلع اٹک۔ بہاولنگر ریاست بہاولپور۔ پراونشل مسلم لیگ
پشاور۔ پاکستان اجمل طبی ایسوسی ایشن راولپنڈی۔ ماڈل ٹاؤن پارہ چنار۔
انجمن اسلامیہ سیالکوٹ بالاکوٹ۔ حلقہ مسلم لیگ پشاور۔ جویلیاں ضلع ہزارہ۔
سنٹر کوآپریٹو بنک لائلپور۔ مارکیٹ کمیٹی چوہڑ کانہ منڈی چیچا وطنی برج والا۔
جماعت اسلامی رحیم یار خاں ریاست بہاولپور۔ گڈمرچ ایسوسی ایشن پشاور۔
لالہ موسیٰ پرائمری سکول شاہ پور۔ انجمن مہاجرین للیانی تحصیل قصور ضلع لاہور۔

سرحدی یتیم خانہ مردان ۔ فرینڈز کلب ڈیرہ غازیخاں ۔ انجمن فروغ اردو نوشہرہ ہاکرز یونین راولپنڈی ۔ انجمن خدام المجاہدین راولپنڈی ۔ انجمن انصار و مہاجرین جمعیت نوجوانان اسلام ، ڈسٹرکٹ انجمن مہاجرین ، مجلس منتظمہ جامع مسجد راولپنڈی ۔

دار العلوم دیوبند پر شیخ الاسلام علامہ عثمانی کے حادثہ ارتحال کا اثر

دار العلوم کی فضا رنج و غم میں ڈوب گئی ، تمام دفاتر بند کر دیئے گئے

شیخ الاسلام مولانا مدنی اور شیخ الجامعہ مولانا قاری محمد طیب صاحب کی تقریریں

مسلمانان ہند و پاکستان عموماً اور متوسلین دار العلوم دیوبند کے حلقوں میں خصوصاً یہ خبر انتہائی رنج و غم کے ساتھ سنی گئی ہے کہ ۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء یوم شنبہ کو حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی دیوبندی نور اللہ مرقدہٗ نے داعی اجل کو لبیک کہا اور ہمیں داغ مفارقت دیکر رہگرائے عالم جاودانی ہو گئے ——

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔

علامہ مرحوم بغداد الجدید (بہاولپور) میں وزیر تعلیمات ریاست کی دعوت پر تشریف لائے اور بغرض تبدیل آب وہوا کچھ قیام کے ارادے سے تشریف لائے ۔ مگر قیام کو تین ہی دن گذرے تھے کہ وقت مقدر آپہونچا ۔

مولانا مدنی کی تقریر

دار العلوم دیوبند میں ۱۴ دسمبر کی شب میں یہ خبر موصول ہوتے ہی غم د

اندوہ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ علی الصباح نماز فجر کے بعد مسجد دار العلوم میں حضرت مولانا کے سانحہ ارتحال کا تذکرہ کر کے ختم کلمہ شریف، ختم قرآن مجید کا اعلان کیا۔ جس میں تمام اساتذہ وطلبہ اور کارکنان دار العلوم شریک ہوئے۔ بعد ختم مہتمم کی درخواست پر حضرت مولانا مدنی نے چند کلمات مجمع کے سامنے علامہ مرحوم کی نسبت ارشاد فرمائے جس میں مولانا کے سانحہ ارتحال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت مرحوم کی شخصیت بے مثال تھی۔ علم وفضل میں میں آپ کا پایہ بلند تھا اور ہندوستان کے چیدہ علماء میں سے تھے۔ ہم میں سیاسی اختلافات ضرور پیدا ہوئے مگر وہ اپنی جگہ ہیں۔ مولانا مرحوم کے متبحب علم وفضل اور بلند پایہ شخصیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ یقیناً ان کی یہ دائمی مفارقت ہم سب کے لئے باعثِ صد رنج وملال ہے۔ مولانا مرحوم نے دار العلوم میں تعلیم پائی۔ حضرت شیخ الہند اور بہت سے اکابر دار العلوم سے انہیں نسبتی تعلق تھا۔ اور علمی طور پر ان کی شخصیت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ تقریر وتحریر کا خداداد ملکہ مولانا مرحوم کا حصہ تھا۔ اور بہت سی خوبیوں کے حامل تھے۔

اس کے بعد طویل وقفہ تک دعاء مغفرت کی گئی اور دار العلوم کو قرآن خوانی اور ختم ایصال ثواب کے سلسلہ میں ایک دن کی تعطیل دی گئی۔ دفاتر بند کر دیئے گئے اور اس اعلان پر یہ مجلس ختم کی گئی کہ بعد ظہر دوسری مجلس قرآن خوانی کی منعقد ہوگی۔ بعد ظہر پھر قرآن خوانی ہوئی اور کلمہ طیبہ کا ختم پڑھا گیا۔

مولانا محمد طیب صاحب کی تقریر

احقر مہتمم نے ایک مفصل تقریر کی جس میں علامہ مرحوم کی علمی، دینی اور

سیاسی خدمات اور خصوصیات پر روشنی ڈالی اور بتلایا کہ جماعت علماء میں حضرت مرحوم نہ صرف ایک بہترین عالم فاضل ہی تھے بلکہ ایک صاحب الرائے مفکر بھی تھے۔ آپ کا فہم و فراست اور رفقہ نفس بے نظیر تھا۔ آپ اس علمی ذوق کے امین تھے جو اکابر دار العلوم سے بطور وراثت آپ کو ملا تھا حضرت قاسم العلوم والخیرات بانی دار العلوم دیوبند کے مخصوص علوم پر آپ کی گہری نظر تھی اور درسوں میں ان کے علوم کی بہترین تفہیم کے ساتھ تقریر فرماتے تھے۔ علوم میں نظر نہایت گہری اور عمیق تھی۔ علمی لائنوں میں آپ کا درس و تدریس اور مختلف مدارس، مدرسہ فتحپوری دہلی، دار العلوم دیوبند اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے ہزارہا طلبہ کو یکے بعد دیگرے افادہ ایک امتیازی شان رکھتا تھا۔ تصنیفی لائینوں میں آپ کی متعدد تصانیف اور قرآن حکیم کی تفسیر بصورت فوائد اور مسلم شریف کی عربی شرح یادگار زمانہ رہیں گی۔ جو پوری دنیائے اسلام میں نہایت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی گئی ہے۔ سیاسی لائن میں آپ نے تقسیم ملک سے پہلے اپنی مدبرانہ سیاسی قابلیت سے ریاست حیدرآباد کو ایسے وقت میں بعض مہلک مذہبی فتنوں سے بچانے کی سعی جمیل فرمائی۔ جبکہ اس کے معاملات بہت زیادہ خطرہ میں تھے۔ آزادی ملک کی جدوجہد میں آپ نے کافی حصہ لیا اور آپ کی فصیح و بلیغ تقریروں سے لاکھوں باشندگان وطن آزادی وطن کی حقیقت سے آگاہ ہوئے۔ تقسیم ملک کے بعد آپ نے پاکستان کو اپنا مستقل وطن بنا لیا اور کراچی میں مقیم رہ کر پاکستان کی بہت سی دینی و ملی خدمات انجام دیں۔ پاکستان کے ارباب حکومت پر آپ کی علمی اور سیاسی خدمات کا خاص اثر تھا اور وہاں کی گورنمنٹ کے ہائی کمانڈ میں آپ کو عالمانہ اور مفکرانہ حیثیت سے خاص عظمت حاصل تھی۔

آپ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے رکن اور مذہبی قانون کمیٹی کے صدر تھے۔ بلاشبہ وہاں کی حکومت نے آپ کے ساتھ حیات اور ممات میں وہ معاملہ کیا جو ایک قدر شناس حکومت کو اپنے ایک مخلص خیر خواہ اور ملک کے ایک ممتاز عالم دین دین کے ساتھ کرنا چاہئے۔

علامہ کی ان چند در چند فضیلتوں اور پھر ان مخصوص نسبتوں سے کہ اولاً آپ دارالعلوم کے مایہ ناز فرزند تھے پھر اس کے قابل قدر مدرس بنے اور آخر کار ادارہ کے صدر مہتمم ہوئے ان کے حقوق ہم پر عائد ہوتے ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ ہم بطور ادائے حق نہیں بلکہ بطور ادائے فرض ان کے لئے دعائے مغفرت اور ایصال ثواب کریں اور نہ صرف آج ہی بلکہ آئندہ بھی برابر کرتے رہیں۔

طلباء اور علماء کے بھرے مجمع نے دعائے مغفرت اور ایصال ثواب کیلئے ہاتھ اٹھائے اور کافی وقت تک لوگ خضوع وخشوع کے ساتھ دعاء تضرع میں مشغول رہے یہاں تک کہ یہ مجلس برخواست ہوگئی۔

مہتمم دارالعلوم اور جماعت دارالعلوم کی جانب سے تعزیت کے تار مولانا کے اہلبیت اور حکومت پاکستان کے گورنر جنرل اور وزیراعظم اور ایسوسی ایٹڈ پریس پاکستان کو روانہ کئے گئے جن کی عبارت حسب ذیل ہے:

گورنر جنرل اور وزیر اعظم پاکستان کے نام تار

"علامہ شبیر احمد عثمانی کی وفات نہ صرف پاکستان بلکہ عالم اسلامی کا ایک شدید حادثہ ہے۔ میں خود اور تمام جماعت دارالعلوم آپ سب کے غم میں شریک ہیں اور تعزیت پیش کرتے ہیں۔ دارالعلوم کو تعطیل دی گئی اور ختم قرآن کرایا گیا"

مہتمم دارالعلوم دیوبند۔

راولپنڈی میں علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا سوگ

باشندگان راولپنڈی کا ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں مولانا شبیر احمد عثمانی کی موت پر تعزیتی قرار دادیں منظور کی گئیں۔

مقامی جناح گرلز کالج میں بھی ایک میٹنگ ہوئی جس میں مس عرفان زبیری نے ایک مختصر سی تقریر کی۔ اور پاکستان کے شیخ الاسلام کے انتقال پر تعزیتی قرار دادیں منظور کی گئیں۔ (زمیندار)

علامہ عثمانی مرحوم کے غم میں گوجرانوالہ میں مکمل ہڑتال

گوجرانوالہ ۱۵ ر دسمبر۔ ضیاء الحق صدر سٹی مسلم لیگ نے مندرجہ ذیل اخباری تار زمیندار کو ارسال کیا ہے:۔

شیخ الاسلام مولانا عثمانی کے المناک حادثۂ ارتحال ... کی ہولناک ... خبروں نے شہر گوجرانوالہ کو سوگوار بنا دیا۔ شہر میں مکمل ہڑتال رہی۔ سٹی مسلم لیگ کے زیر اہتمام ایک عام جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں ... انتہائی رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔ قرار داد میں اعلان کیا گیا۔ کہ ان حوادث سے ساری اسلامی دنیا کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے (زمیندار ۱۶ ر دسمبر ۱۹۴۹ء)

آہ ہادیِ روحانی

مرکز تعلیم امروہہ کی عمارت میں بسلسلۂ انتقال پُر ملال جناب مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی ایک تعزیتی جلسہ زیر صدارت حافظ محمد اسرائیل صاحب منعقد ہوا جس میں جمیع اساتذہ اور طلبا و چند معزز حضرات نے شرکت کی،

ایک تعزیتی قرارداد منظور کی گئی جس میں حضرت عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی اچانک وفات حسرت آیات پر قلبی رنج وافسوس کا اظہار کیا گیا اور اسے اسلامی دنیا کا ناقابل تلافی نقصان تصور کیا گیا۔

زیر نگرانی حافظ پیر جلیل صاحب نے قرآن خوانی اور فاتحہ کے بعد عام تعطیل کا اعلان کیا گیا۔ (نامہ نگار)

مدرسہ حسین بخش دہلی میں جلسہ تعزیت

مدرسہ حسین بخش مورخہ ۲۴ صفرالمظفر بروز پنجشنبہ صبح سے حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی کے ایصال ثواب کے لئے قرآن خوانی ہوئی جس میں طلبہ اور اساتذہ مدرسہ اور محلہ کے دیگر حضرات نے شرکت فرمائی۔

بعد ختم کلام مجید جلسہ ہوا۔ جس میں حضرت مولانا محمد مظاہر امام صاحب مدرس مدرسہ نے حضرت علامہ کے سانحۂ ارتحال پُرملال کو علمی دنیا کا ناقابل تلافی نقصان بتایا اور آپ کی علمی اور قومی خدمات کو مختصرًا مگر جامع الفاظ میں نہایت ہی رقت انگیز لہجہ میں بیان فرمایا۔ بعدہٗ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب نے علامہ کے خصوصی حالات جس کا مولانا کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ بہت ہی پُردرد طور پر بیان فرمانے لگے۔ اور رقت اس درجہ طاری ہوئی کہ کچھ زیادہ بیان نہ فرما سکے۔ اور روتے ہوئے بیٹھ گئے۔

جلسہ بعد دعا کے ختم ہوا اور حضرت صدر مدرس نے بقیہ اوقات کے لئے اسی غم میں مدرسہ کے لئے تعطیل کا اعلان فرمایا۔

مولانا عثمانی کے لئے ایصال ثواب

۱۴ر دسمبر کو بازار جامع مسجد نواب دوجانہ مٹیا محل میں ۹ بجے شب کو بعد

ترجمہ قرآن شریف علاقہ کے مسلمانوں نے مولانا شبیر احمد عثمانی کے لئے ایصال ثواب کیا اور مرحوم کے لئے رفع درجات کی دعا کی۔

ایصال ثواب سے قبل مفسر قرآن مولانا اخلاق حسین قاسمی نے مولانا مرحوم کی زندگی پر روشنی ڈالی۔

(جمعیۃ دہلی مورخہ ۷ر دسمبر ۱۹۴۹ء)

لاہور میں صفِ ماتم

(زمیندار کے نامہ نگار خصوصی سے)

آج حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کی رحلت کی وجہ سے لاہور میں غم کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ بازار سنسان، دکانیں بند، کاروباری اداروں پر اداسی، کالجوں اور اسکولوں کی رونق مفقود، عدالتیں اور دفاتر اور سنیما مرکزِ حزن و ملال بنے ہوئے تھے۔

ایک دکاندار اپنی دکان کے پٹڑے پر گردن جھکائے بیٹھا تھا میں نے پوچھا بھائی دکان کیوں بند ہے؟ بولا، مولانا صاحب جنہوں نے صوبہ سرحد میں الیکشن جیتا تھا کل گزر گئے۔

لاہور میں شیخ الاسلام کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی۔ شام کو اسلامیہ کالج کے میدان میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس میں مسلم لیگی رہنماؤں نے تقریریں کیں اور تعزیتی قرار دادیں منظور کیں۔

متحدہ بنگال کے آخری وزیر اعظم کا بیان

غیر منقسم بنگال کے آخری وزیر اعظم مسٹر حسین شہید سہروردی نے ایک بیان میں شیخ الاسلام کی وفات پر اظہار رنج والم کرتے ہوئے کہا کہ مولانا شبیر احمد عثمانی کی رحلت ایک ایسا نقصان ہے جس کا الفاظ میں اظہار ممکن نہیں۔ مولانا کی شخصیت زہد، تقویٰ، علمی فضیلت اور سیاسی بصیرت کا اجتماع تھی۔ وہ علوم دینیہ اور قانون شرعیہ کے متبحر عالم تھے۔ انہوں نے اسلامیانِ ہند کی جس انداز سے قیادت اور رہنمائی کی اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ خدائے تعالیٰ انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔

(روزنامہ زمیندار، ۱۶ر دسمبر ۱۹۴۹ء)

لاہور میں تعزیتی جلسہ

لاہور ۱۵ر دسمبر۔ معلوم ہوا ہے کہ سول مسلم لیگ کے زیرِ اہتمام بعد از نماز جمعہ مسجد نیلہ گنبد میں مولانا شبیر احمد عثمانی اور جرنیلوں کے انتقال پر تعزیتی جلسہ منعقد ہوگا جس میں زعمائے ملت تقاریر کریں گے۔

مجلس طلباء علوم مشرقیہ دار العلوم چلہ کی قرارداد تعزیت

امروہہ، ۱۴ر دسمبر۔ دار العلوم چلہ امروہہ میں مجلس طلباء علوم مشرقیہ الٰہ آباد بورڈ کے اہتمام سے ایک جلسہ عام زیرِ صدارت جناب مولانا حکیم عبدالودود صاحب منعقد ہوا جس میں حضرت علامہ عثمانی کے لئے دعائے مغفرت کی گئی، اور

قرارداد ذیل بہ اتفاق آراء منظور کی گئی :

"مجلس طلباء کا یہ جلسہ شیخ الاسلام رئیس المفسرین حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی کے انتقال پُرملال کو دنیائے علم و ادب کا نقصان عظیم اور علوم مشرقیہ کو ایک مُربی سے محرومی تصور کرتا ہے۔ نیز یہ جلسہ موصوف کے لئے دُعائے مغفرت اور پسماندگان کے ساتھ شرکت غم کا اظہار کرتا ہے۔"

(روزنامہ زمیندار لاہور)

یاربِ انزل علیہ صوب غادیۃ
وطفا تسقی ثراہ فائض الدِرر
وارفعہ عندک فی الفردوس منزلۃ
یاوی الیٰ کنف فی غایۃ الحضر